ب نہیں آتی رے۔"

"اب یہاں سے اُسی کے پاس چلیں گے..." فیصلہ کن لہجے میں کہا، "اور بہت دنوں تک تم وہیں فیض آباد میں اپنی بٹیا کے پاس، بل کہ میں تو کہتا کہیں آنے جانے کا سلسلہ ہی بند کر دینا چاہیے اب... نہیں آتا ہمیں۔ اِتنے زمانے سے خاک چھان رہے ہیں... حاصل ہوا۔ اُلٹی ہر جگہ یہ دیواریں، خنجر چاقو، خون..." جی میں آئی، اُسے بتاؤں کہ اُس کی بیماری ہی نے کچھ کم پریشان نہیں کیا تھا کہ اِس دوران مجھ پر جو گزرتی رہی ہے، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ بروقت مجھے خیال آ گیا کہ یہ وقت تو اُس کی دل دہی و دل جوئی کا ہے۔ مجھے تو سیورین اور ایکی کو بھی ہدایت کرنی ہے کہ وہ اُس کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات نہ کریں۔ پہلے وہ پوری طرح تن درست ہو جائے۔ بعد کو تو اُسے سارا کچھ معلوم ہو ہی جائے گا۔ اکبر علی خاں جیسا نادر اور مہربان آدمی اور انتھونی جیسا جرأت مند اور ایثار پیشہ نوجوان... اُن کے گھر اُجڑ گئے۔ اُن کی طرف دھیان جاتا ہے تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔ ہزار تاویلیں ڈھونڈتا ہوں کہ اس میں میری لغزش کیا ہے، لیکن کوئی ایک تاویل ضرور ہے جو کانٹے کی طرح میرے سینے میں چبھتی رہتی ہے اور شاید یہی ہے کہ اگر ہم یہاں، اِس منحوس شہر میں نہ آتے تو..."

بھجل نے یہاں سے فیض آباد واپس جانے اور مستقل وہیں رہنے کی بات سن لی تھی، وہ مسکناتے ہوئے بولا، "دیکھیں گے رے۔"

"اب اور دیکھنا دِکھنا کچھ نہیں... اور کیا، کتنا دیکھنا ہے، میں تمہیں یاد دلاؤں سارا۔"

اُس نے سر اُٹھا کے گھورتی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ "بہت گھوما ہوا لگتا ہے۔ تیرے بارے میں بھی ڈاکٹر صاحب سے بات کرنا پڑے گی۔" وہ تیکھی آواز میں بولا۔

"ہاں ہاں، ٹھیک ہے، کر لینا بات۔ بولنا کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔" میں نے جھلا کے کہا، اور مجھے خود کو باز رکھنا پڑا۔ یہ میں کس زبان اور لہجے میں کس شخص سے ایسی باتیں کر رہا ہوں جو بستر پہ دراز ہے اور خدا خدا کر کے کہیں آج اُس کے بے خبر وجود میں زندگی جاگتی نظر آتی ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔

سیورین کی مضطرب نظریں مجھ پر ایک لمحے کے لیے منڈلائی تھیں۔ مجھے پُرسکون دیکھ کے وہ بستر کے کنارے پُر مُرا کے بیٹھ گئی۔ اُس کا ریشم ہاتھ بھجل نے سینے سے لگا لیا۔ "یہ تو بالکل اپنی بٹیا کی طرح لگتی ہے۔" اُس کی آواز سے یاسیت اور حسرت اُمڈ رہی تھی۔

سیورین کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ "کون بٹیا؟" اُس نے اٹکتی زبان سے پوچھا۔

"ہے ان کی ایک بیٹی" میں نے اُسے بتایا، "بہت لاڈلی۔"

"تیری کچھ نہیں ہے۔" بھجل چہچہا کے بولا۔

"میری! میری بھی بہت کچھ ہے، مگر تم سے زیادہ نہیں۔" میں نے تیکھی آواز میں کہا، "سوچا تھا، تار دے کے اُسی کو بلا لوں۔ وہ بھی تمھارا ایک علاج ہے، لیکن پھر تمھارا ہی خیال آ گیا۔ تم ناراض نہ ہو جاؤ کہ اُسے کیوں پریشان کیا۔"

"ٹھیک کیا تو نے، وہ تو رستے میں آدھی ہو جاتی۔"

"اُس کی یاد آ رہی ہے تمھیں؟"

مکان کے نزدیک جن تین آدمیوں کا خون ہوا تھا، اُن کے بھی تو کچھ نام لیوا، کچھ قریبی ساتھی اڈے پر ہو سکتے ہیں۔ اُنھیں معلوم ہوگا کہ کس نے اُنھیں اُن کے عزیز سے جدا کیا ہے، وحشوا کے فدائیوں کی طرح۔"

"کیا یہ بھی ممکن ہے۔"

"سب کچھ ممکن ہے۔"

"یعنی وہ میدا کو ختم کر سکتے ہیں؟" اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

"اب ایک سلسلہ شروع ہو گیا ہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا، "لیکن ابھی کیا کیا جا سکتا ہے، اور کوئی بات بھی ہو سکتی ہے۔ آپ کی اجازت ہو تو میں صدر دروازے پر جا کے دیکھوں؟"

"نہیں۔" اُس نے فیصلہ سنانے میں ایک لمحے تامل نہیں کیا۔ "تمھارا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔"

"مگر جانا تو پڑے گا۔"

"ابھی دیکھتے ہیں۔" اُس نے ہاتھ اُٹھا کے کہا، "اسپتال کے کئی ملازم باہر ہیں۔ کچھ معلوم ہوا تو آ کے بتائیں گے۔ تم بیٹھتے کیوں نہیں۔" پھر اُسے کچھ خیال آیا، اپنی مخصوص کرسی کے بجائے وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ "کچھ پیو گے؟"

"نہیں شکریہ۔" میں بھی اُس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ لمحوں تک وہ اپنے آپ میں گم کچھ سوچتا رہا۔ مجھے اپنی جانب سے کچھ کہنا نہیں تھا کہ میرے پاس لب کشائی کے لیے تھا ہی کیا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے آئی جی کا فرستادہ ایک پولیس افسر یہاں آیا تھا۔" ڈاکٹر نے چونک کے کہا، "میں تمھیں بتانا ہی بھول گیا۔ جیسا کہ میں نے کل رات خیال ظاہر کیا تھا، اکبر علی خاں کے بڑے بھائی نے تم سے ملنے کا مطالبہ کیا ہے۔ مطالبہ میں یوں کہہ رہا ہوں کہ مجھے یہی بتایا گیا ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ وہ ریاست حیدرآباد میں نظام سرکار کا کوئی بڑا عہدے دار ہے۔ پولیس اُس کے اثر و رسوخ کے دباؤ میں ہے۔ مرکزی حکومت کی طرف سے پٹنا پولیس کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اصل مجرم جلد از جلد عدالت کے حوالے کیے جائیں اور مرکزی حکومت کو مرحلہ وار کارروائی سے آگاہ کیا جاتا رہے۔ اکبر علی خاں کی تدفین کے فوراً بعد اُن کے گھر آئی جی سمیت پولیس کے تمام بڑے افسر جمع ہوئے تھے۔ رات گئے تک اُن کے درمیان بات چیت جاری رہی اور تمھارا ذکر بار بار ہوتا رہا۔ میں سنتا گیا۔ ایک بھائی کے اِس طرح جدا ہو جانے سے کسی بھی بھائی پر کیا قیامت گزر سکتی ہے، اور اگر وہ صاحبِ اثر بھی ہو۔ ڈاکٹر رائے نے مجھے بتایا کہ اسپتال میں مجھ سے مل کے آئی جی پولیس بڑی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ یہ کمال شرافت، کس درجے کی بزرگی اور شفقتِ خسروانہ تھی کہ ڈاکٹر رائے مجھے کچھ جتا نہیں رہا تھا، لیکن میں جانتا تھا، اپنے اطمینان کے باوجود آئی جی مجھے ساتھ لے جانے کے لیے کس قدر بے چین تھا۔ ڈاکٹر رائے درمیان میں نہ پڑتا تو آج میں پولیس کی تحویل میں ہوتا اور جانے کب تک رہتا۔ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق آئی جی نے اکبر علی خاں کے بھائی کو یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ اسپتال میں کئی دن سے پولیس نے جال بچھا رکھا ہے اور مجھ پر کڑی نظر رکھی جاتی رہی ہے۔ گو میرا تعلق بھی اڈے سے ہے، لیکن اس معاملے میں میرے کسی تعلق کے شواہد نہیں مل پا رہے۔ ظاہر ہے، آئی جی نے اکبر علی خاں سے میری شناسائی کی تمام رُوداد بھی اُس کے بھائی کو سنائی ہوگی۔ ڈاکٹر رائے کہہ رہا تھا کہ آئی جی نے اکبر علی خاں کے بھائی کو باور کرایا ہے کہ اپنے بھائی کی بیماری کی وجہ سے میں مسلسل اسپتال میں رہا ہوں، اور پولیس نے اچھی طرح تحقیق کر لی ہے کہ ایک اکبر علی خاں ہی تھے جن سے شہر میں میری رسم و راہ ہوئی تھی۔ میں نے فرار ہو جانے کی بھی جستجو نہیں کی ہے۔ شہر آ کے کسی ٹھکانے کے لیے جس ہوٹل میں، میں نے کمرا لیا تھا، وہاں میں ایک رات بھی نہ ٹھیر سکا۔ کمرے میں سامان رکھنے کے بعد ایک لمحہ ضائع نہیں کیا، بھائی کو لے کے سیدھے اسپتال کا رُخ کیا۔ پولیس نے ہوٹل کے کارندوں سے پوچھ گچھ کی ہے۔ میرا سامان وہیں پڑا ہے اور کچھ نقدی مینیجر کے پاس امانت رکھی ہوئی ہے۔ پولیس نے اُس تانگے والے کو تلاش کر کے اپنی تسلی کر لی ہے جو مجھے اور ٹھل کو اسٹیشن سے ہوٹل اور ہوٹل سے اسپتال لے گیا تھا۔ اسپتال کے ڈاکٹروں نے تصدیق کی ہے کہ میرا بھائی سر کی شدید چوٹ کی وجہ سے ابتر حالت میں اسپتال آیا تھا اور اُس کا علاج خاص توجہ سے کیا جاتا رہا ہے۔ یہ بھی سراغ نکالیا گیا ہے کہ اکبر پور اسٹیشن پر ریل کا انجن اچانک خراب ہو جانے سے بہت سے مسافر متاثر ہوئے تھے۔ اسی

گاڑی میں میرا بھائی موجود تھا۔

خدمت گار کے چائے لانے کی وجہ سے ڈاکٹر رُک گیا۔ اُس کے اشارے پر خدمت گار نے ہم دونوں کے لیے چائے بنائی اور بسکٹوں کی تشتریاں سامنے رکھ کے چلا گیا۔

"اور اُسے جلدی ہے... اکبر علی خاں کے بھائی کو۔" ڈاکٹر نے بھاری آواز میں کہا اور اُلجھ کے بولا، "کیا نام بتایا تھا پولیس افسر نے اُس کا؟"

میں نے زیرِ لبی سے کہا۔ "شاید سکندر علی خاں۔"

"ہاں، ہاں کچھ ایسا ہی۔" اُس نے تیزی سے سر ہلا کے تصدیق کی۔ "گویا اس کا آبائی شہر ہے، مگر معلوم ہوا ہے، اُدھر حیدرآباد میں اُس کی منصبی ذمے داریاں یہاں طویل قیام میں حارج ہیں۔ اُس کا ارادہ ہے کہ اپنی بیمار ماں، مرحوم بھائی کی بیوہ اور بچوں کو ساتھ لے جائے۔ حیدرآباد سے بھیجے جانے والے اُس کے معتبر کارندے یہاں کی جائداد، زرعی زمینیں اور دیگر معاملات دیکھتے رہیں۔ پولیس کا قیاس ہے کہ اکبر علی خاں کی بیوہ پٹنا چھوڑنے پر شاید آمادہ نہ ہو سکے۔ یہاں کالج میں وہ پڑھاتی ہے، اپنی زمینوں پر بسنے والے کسانوں کی فلاح و بہبود میں دل چسپی لیتی ہے، گاؤں میں اُس نے ایک اسکول کھولا ہوا ہے۔ بچے یہاں کی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اُن کے تعلیمی سال متاثر ہو سکتے ہیں۔ یہی ہو سکتا ہے کہ مستقل طور پر نہیں تو چند ہفتوں، مہینے دو مہینے کے لیے حیدرآباد چلی جائے۔ تمام آسائشوں سے آراستہ نظام اسٹیٹ ریلوے کا ایک سرکاری ڈبا پٹنا ریلوے اسٹیشن پر کھڑا ہوا ہے، لیکن روانگی سے پہلے سکندر علی خاں اپنے بھائی کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانے کے لیے خاصا مضطرب نظر آتا ہے۔ اُسے بتایا گیا ہے، پولیس کی تفتیش کے مطابق وہی تین آدمی اُس کے بھائی کے قاتل تھے جن کی لاشیں اُس کے آبائی گھر کے قریب پھینک دی گئی تھیں۔ پولیس کو اب اُن تین آدمیوں کے قاتل، یا قاتلوں کی تلاش ہے، اور اُسے کچھ اندازہ ہے کہ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں، اور یوں محض شبے کی بنیاد پر کسی کو گرفت میں لینے سے پہلے وہ یقینی ثبوت فراہم ہو جانے کی تگ و دو میں ہے۔"

ڈاکٹر رائے، ایک معروف ترین ڈاکٹر کس انہماک، کتنی جزئیات اور کیسی یگانگت سے مجھے یہ ساری رُوداد سنا رہا تھا۔ مجھ میں تو ممنونیت کے دو لفظ کہنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ میں سرنگوں بیٹھا رہا۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ دونوں کو خیال ہی نہیں رہا تھا۔ اُس کے ٹوکنے پر میں نے ایک گھونٹ میں پیالی ختم کر دی۔ اُس نے گھونٹ لیا تو چہرہ بگڑ گیا۔ ناگواری سے پیالی پرچ پر رکھ کے تازہ چائے کے لیے وہ خدمت گار کو طلب کیا چاہتا تھا کہ پھر جیسے بھول گیا، بے چینی سے کہنے لگا۔

"ہاں... اور سکندر علی خاں نے تمھارے بارے میں بہت سوال کیے۔ پولیس نے اُسے قائل کرنے کے بجائے محض آثار و شواہد پیش کرنے کی احتیاط کی۔ آئی جی نے اُس سے کہا، یقیناً گھر والوں نے بھی گھر میں جا قوتان کے گھس آنے والے نوجوان کے بارے میں اُسے کچھ بتایا ہوگا۔ جہاں تک آئی جی کی معلومات ہیں، اُس کے بھائی سے نوجوان کی چند روزہ شناسائی کی ابتدا نہایت ناشائستہ اور جارحانہ انداز میں ہوئی تھی، لیکن نوجوان کا ماجرا سن کے اکبر علی خاں نے اُس کی بے چارگی محسوس کی اور ساری اذیت بھلا کے وہی کیا جو ایک کشادہ دل

کا ذخیرہ ہوسکتا ہے۔ بعد کو نوجوان کے
عزم و حوصلے، اُس کی سچ بیانی کے اکبر علی خاں ایسے شیدائی
ہوئے کہ اجنبیت کی ساری دیواریں ایک ہی جست میں
پھلانگ لیں۔ صبح و شام اسپتال جا کے دوست کی دل دہی،
خاطر داری معمول بنالی۔ اُس رات، رات گئے نوجوان نے
انھیں اسپتال کے صدر دروازے پر رخصت کیا تھا۔ اسپتال کا
عملہ گواہ ہے کہ نوجوان واپس اپنے کمرے میں آگیا تھا۔
اکبر علی خاں کے گھر والے کچھ ٹھیک بتا سکتے ہیں کہ اسپتال سے
گھر واپس آ کے وہ نوجوان کا ذکر کس اشتیاق سے کیا کرتے
تھے۔ سو نوجوان، یا اُس کے ایما پر اُس کے آدمیوں کے ذریعے
انھیں ختم کر دینے کا کوئی جواز ہونا لازم ہے۔ ایسے سنگین جرم
کے ارتکاب کے لیے کوئی بڑی علت پس منظر میں ہونی چاہیے،
بہت سی آگ، یا دیوانگی، اس منطق کے باوجود پولیس اپنے
اخذ کیے ہوئے نتائج پر مُصر نہیں، ایک ذرا سا اشارہ ملا تو
خاطر جمع ہے، نوجوان اور پولیس کے درمیان کوئی حدِ فاصل
نہیں ہے۔ نوجوان عملاً پولیس کے حصار میں ہے۔

ڈاکٹر رائے کو از خود کچھ احساس ہوا اور اُس کے لہجے میں
کسی قدر بے اعتنائی در آئی، پہلو بدلتے ہوئے بولا، "یہ سارا
کچھ اِتنی تفصیل سے میں تمھیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم
کشاکش سے باہر آسکو۔"

"میرے لیے اس وقت سب سے بڑی کشاکش اور
کشمکش میرا بھائی ہے۔" اچھا اس صاف گوئی پر مجھے خجالت
بھی ہوئی۔ کہتے ہیں، آدمی کے جسم میں سب سے زیادہ بے قابو
چیز دل ہے، لیکن یہ زبان بھی کچھ کم نہیں۔

"اور جو تمھارا بھائی نہیں ہے۔" وہ نکیلی آواز میں بولا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا، میرے لیے وہ بھائیوں سے
ڑھ کے ہے۔ اُس کے میرے بہت سے رشتے ہیں، بھائی کا تو
یک ہی رشتہ ہوتا ہے۔"

اُس نے لمبی سانس لی اور سر ہلانے لگا، پھر کچھ توقف بعد
م لہجے میں بولا۔ "میں سمجھتا ہوں، یہ اطمینان کی صورت
۔ مجھے سکندر علی خاں کی طرف سے خدشہ تھا کہ وہ پولیس پر
بے جا اثر نہ ڈالے اور پولیس بدحواسی میں اُلٹے سیدھے
نہ کرنے لگے اور تم مزید مصائب میں نہ گھر جاؤ، لیکن وہ
ایک تعلیم یافتہ اور جہاں دیدہ آدمی ہے، قاعدے قانو
پوری طرح آگاہ۔ کوئی نواب جاگیردار نہیں، جو آدمی کم
جاگیردار زیادہ ہوتے ہیں۔ اُس نے پولیس کی دلیلیں تحم
سنیں اور اپنے زور و اثر کے غیر ضروری اظہار سے اجتنا
مگر وہ تمھیں دیکھنے، تم سے ملنے کے مطالبے، یا خواہ
شدت سے قائم ہے۔ پولیس نے اُس سے درخواست کی
کہ تمھارا اُس کے گھر جانا بہ وجوہ سر دست مناسب نہیں
یہی سبب تھا کہ تمھیں اکبر علی خاں کی تدفین میں شرکت
روک دیا گیا تھا۔ سارے شہر میں اُس آدمی کا چرچا ہے
اُستاد میدا جیسے سرکش چاقو باز کے اڈے پر جا کے سینہ سپ
ہو گیا تھا اور اُس کے بعد خونی واقعات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا
اُس کے بعد پانچ آدمی مارے گئے۔ سکندر علی خاں ذرا زحمت
کرے تو بے شک اسپتال میں تم سے ملاقات ہو سکتی ہے، لیکن
سکندر علی خاں اِس زحمت پر آمادہ نہیں ہوا۔"

"میرا خیال ہے، اب ایسی کوئی بات نہیں۔ میں خود
اُس کے پاس چلا جاتا ہوں، اور مجھی کو جانا چاہیے۔ حالاں کہ
اکبر علی خاں کے گھر والوں کا سامنا کرنے کے تصور سے دل..."

"جا سکتا ہوں، تم جا سکتے ہو۔" اُس کے ہونٹوں پر تلخی
عود کر آئی۔ "تم کبھی بھی جا سکتے ہو۔"

"کبھی نہ کبھی تو مجھے باہر نکلنا ہی ہے۔"

"کبھی تو تم ایک چھوٹے بچے کی طرح معلوم ہوتے ہو اور
ویسے یہ... یہ اچھی بات ہے، آدمی کو بچہ بھی ہونا چاہیے۔" وہ
مسکرا پڑا اور مفاہمت کے انداز میں بولا، "تم سمجھتے کیوں نہیں،
گزشتہ رات ہی اکبر علی خاں کی تدفین ہوئی ہے، ایک مشتعل
ہجوم اس موقع پر موجود تھا۔ شہر میں بڑی کشیدگی ہے، فرقے
وارانہ رنگ بھی دیا جا رہا ہے۔ سارا شہر ہی ہراساں ہے۔ بازار
بند پڑے ہیں، کاروبار چوپٹ ہے۔ طلبہ نے پروفیسر کے قاتلوں
کی گرفتاری تک کلاسوں کا بائیکاٹ کیا ہوا ہے، طرح طرح کی
افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔ جگہ جگہ پولیس گشت کر رہی ہے اور حالات
معمول پر لانے کے جتن کر رہی ہے، ایسے میں..."

دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔ ڈاکٹر رُک گیا۔ "آ جاؤ۔"
وہ دھیمی آواز میں بولا۔ اجازت ملنے پر انگریزی لباس میں،
سانولی رنگت کا ایک باوضع ادھیڑ آدمی جھجکتے ہوئے اندر آیا۔ وہ

ڈاکٹر معلوم ہوتا تھا، یا اسپتال کا کوئی افسر۔ ”ہاں چھاگلا! کیا ہے؟“ ڈاکٹر رائے نے اُچکتی آواز میں پوچھا۔

چھاگلا نے مؤدبانہ جواب دیا۔ ”جناب! باہر خاصی بڑی تعداد میں وہ لوگ جمع ہو چکے ہیں اور منضبط ہیں۔ فی الحال کسی قسم کا ہنگامہ نہیں۔“

”کیا... کیا چاہتے ہیں؟“

”ابھی کچھ صاف نہیں، لگتا ہے، کسی کا انتظار ہے انھیں۔“

”کس کا... کس کا انتظار؟“

”کچھ دیر میں سب کچھ واضح ہو جائے گا جناب! پولیس بھی خاصی تعداد میں چار دیواری کے باہر موجود ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر جھنجلا کے بولا، ”ہم یہیں بیٹھے ہیں، اُن کا مقصد معلوم کرو... اور ہاں بہ راہِ مہربانی کچھ چائے کافی وغیرہ کا بندوبست کرواؤ۔“

چھاگلا سر جھکائے واپس چلا گیا۔

”کہیں ایسا تو نہیں۔“ میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا، ”پولیس نے میدا جی کو گرفتار کر لیا ہو؟“

ایک لحظے کے شش و پنج کے بعد وہ بھڑک اُٹھا۔ ”نہیں، پولیس افسر تھوڑی ہی دیر پہلے میرے پاس آیا تھا، ایسا کچھ ہوتا تو اُسے معلوم ہوتا، مگر تمھیں یہ خیال کیوں آیا؟“

”یوں ہی... یوں ہی ذہن میں آیا، کچھ سمجھنے کی جستجو میں، کہ ایک وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے، میدا کی گرفتاری کے بعد اُدھر کے آدمیوں کو نئی صورتِ حال میں میری ہی جانب رُخ کرنا چاہیے۔“

”ہاں، یہ تو ضوابط کی بات ہے۔“ اُس کا طنز ڈھکا چھپا نہیں تھا، اس لیے ایسا کاری بھی نہیں تھا۔ ”مگر تم تو کہتے تھے کہ میدا پر ہاتھ ڈالنا پولیس کے لیے اِتنا آسان نہیں ہوگا۔“

”ہونا تو یہی چاہیے، مگر چوک تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے اور گواہ تو کبھی کبھی اندھیرا بھی بن جاتا ہے، اور اپنا سایہ بھی۔ دباؤ کے ایسے وقت میں پولیس کو اپنی کارکردگی کی بڑی بے قراری ہوتی ہے۔ شک کرنا، آدمی پکڑنا، کسی معذرت کے بغیر اُنھیں چھوڑ دینا، پولیس کا ایک آزمودہ اور فرسودہ مشغلہ ہے۔“

”تمھارا مطلب ہے، وہ کسی کو بھی گرفت میں لے سکتے ہیں، خواہ متعلق اور مطلوب ہو نہ ہو؟“

”شک کا ایک جواز، اُن کے پاس ہتھیار کے مانند ہوتا ہے۔“

”اُدھر یورپ میں ایسا نہیں ہوتا۔“

”اکبر علی خاں صاحب وکیل تھے اور آپ کی طرح یورپ میں ایک عرصے رہے تھے۔ وہ بھی یہی کہتے تھے، ناحق کسی کو گرفتار کرنے پر پولیس کی بن آتی ہے۔ بہت دیکھ بھال کے بعد پولیس کسی کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے، مگر یہاں کا معاملہ دوسرا ہے اور شاید یوں کہ یہاں آدمی کی بڑی ارزانی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں، گھیے سیرل جاتے ہیں۔ مغرب میں کسی کو اِس طرح پکڑ کے خانہ پُری نہیں کی جاتی۔ یہاں تو چوپایوں سے آدمی کا کوئی ایسا امتیاز نہیں۔ اُن کے بھی ریوڑ ہوتے ہیں، آدمی بھی یہاں ریوڑوں کی طرح ہنکائے جاتے ہیں، بعض جگہوں پر تو یہاں آدمی، آدمی سے زیادہ جان ور ہے، جان وروں سے مشابہ جو اپنے حق سے آگاہ نہیں ہوتے۔“

”اِس کی بنیادی وجہ عمومی جہالت ہے۔“ اُس نے تاسف سے کہا۔

”اور جہالت کی بنیادی وجہ عمومی غربت ہے۔“

”ہوں ۔۔“ اُس کے شانے ڈھلک گئے۔

”تم اِس وقت کسی کامریڈ کی طرح لگ رہے ہو۔“

”میں کیا... میں تو...“ میری زبان تلملا کھا گئی۔ میں نے ندامت سے کہا۔ ”شاید مجھ سے زیادہ کوئی سرزد ہو رہی ہے۔“

اُس نے میری عذر خواہی نظرانداز کر دی اور کہنے لگا، ”لندن میں میرے ایک دوست برِصغیر کے متعلق کچھ اِسی قسم کی باتیں کیا کرتے تھے، پُرجوش اور شعلہ خو دروَیش، لیکن میں سمجھتا ہوں، وہ بہت انتہاپسند تھے۔ اُن میں لچک کی بڑی کمی نظر آئی مجھے۔ کسی ملک، قوم اور قبیلے کے معروضی حالات، اُس کا پس منظر اور پیش منظر اور اُس کی نفسی کیفیات کے تجزیے کے بغیر وہ فیصلے صادر کرتے رہتے تھے۔ بہت عجیب لوگ تھے وہ...“ ڈاکٹر رائے کہیں کھو سا گیا، پھر جھرجھری لے کے بولا، ”خیر... ہم بہک رہے ہیں۔ مناسب ہوگا، سر دست یہ فکر انگیزی کسی اور وقت کے لیے موقوف کی جائے۔ تم میدا اُستاد کی بات کر رہے تھے۔“

میں نے اپنے بھٹک جانے پر معافی چاہی۔ ”میں کہہ رہا تھا۔“ میں نے نسبتاً دھیمی اور تھمی ہوئی آواز میں کہا، ”کچھ ایسا ہے، میں نے کہیں پڑھا تھا کہ پولیس کا جواز ہی جرم سے ہے۔ جرم نہ ہو تو پولیس کا یہ لاؤ لشکر کیوں۔ مجرموں کی افزائش سے پولیس کا

کاروبار قحروں ہوتا ہے، چشم پوشی سے مراد پشت پناہی ہے۔ سو کبھی پشت پناہی، کبھی سرکوبی، معاملہ حد سے گزر جائے تو آخر پولیس کو وہی کرنا پڑتا ہے جو اُسے ابتدا میں کرنا چاہیے۔ اڈّے اور پولیس کے درمیان ایک ربط خاطر تقریباً ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ کسی کو پکڑ کے چھوڑ دیا جائے تو وہ شک سے بری ہو جاتا ہے، اُس کا سینہ چوڑا ہو جاتا ہے۔ اُسے الزامات کے نشتروں اور رسوائیوں سے نجات مل جاتی ہے۔ اِس باہمی ربط و ارتباط کی وضع میں پولیس کی آبرو بچانے کے لیے کبھی اڈّے کے آدمی خود چارا بن جاتے ہیں، کبھی چارا بنا لیے جاتے ہیں۔ اِس طرح پولیس کی مستعدی، سرگرمی اور اہمیت کا اظہار ہوتا رہتا ہے، میدا کی گرفتاری بھی کچھ اِسی طرح کی ہو سکتی ہے۔ میدا کا اڈّا بُری طرح الزامات کی زد پر ہوگا، کیوں کہ چار مرنے والوں کا تعلق اُسی کے اڈّے سے تھا۔ اِدھر پولیس بھی اڈّے کے آدمیوں، خصوصاً اُستاد سے چشم پوشی پر ملامتوں کا ہدف بنی ہوگی۔"

"تو... تو پھر؟" ڈاکٹر نے سرگرانی سے پوچھا۔

"ابھی کیا کہا جا سکتا ہے، ایک دوسرے کی ضرورت اور معاونت کی بات ہے تو میدا چند دنوں میں باہر آ جائے گا اور واقعی کوئی بُرا اُل جانے کے بعد اُسے گرفت میں لیا گیا ہے تو اپنے انجام کو پہنچے گا۔ ہر صورت میں پولیس بالا رہتی ہے۔ پولیس کو آنکھیں پھیر لینا بھی خوب آتا ہے۔"

ڈاکٹر کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ "تم نے کیا سوچا ہے پھر؟"

"اگر وہ اِسی وجہ سے آئے ہیں تو مجھے کل کا آموختہ دُہرانا ہوگا۔ مجھے اُن میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا چاہیے۔"

"اور اگر کوئی تیار نہیں ہوا؟"

"یہ ممکن نہیں ہے، اڈّے کی چوکی ہر کسی کا خواب ہوتی ہے۔"

"اِن حالات میں شاید کوئی تیار نہ ہو۔"

"دیکھتے ہیں" میں نے جز بز ہو کے کہا۔

"مگر ایک بات کا دھیان رکھنا۔ یہ اسپتال ہے۔ ایک بار کی بات ٹھیک تھی۔ وہ دوسری بار آ گئے ہیں۔ میں نہیں چاہوں گا۔ پھر وہ یہاں اِس طرح..."

"آپ کچھ نہ کہیے۔ مجھے اِس کا احساس ہے۔" میں نے لجاجت سے کہا۔ "میں اِس کا انتظام آج کر دوں گا۔"

"کیا کرو گے تم؟ مجھے کچھ بتاؤ۔"

"اُن سے دوبارہ یہاں آنے کو صاف منع کر دیا جائے گا، آپ اطمینان رکھیے ورنہ... ورنہ مجھے یہاں سے جانا پڑے گا۔"

اِدھر خدمت گار خورد و نوش کی چیزوں سے بھرا تشت لے کے آیا، اُدھر چھاگلا بدحواسی کے عالم میں کمرے میں داخل ہوا۔

"جناب! ابھی اُن سے میری بات ہوئی ہے۔ میں صدر دروازے سے آ رہا ہوں۔" چھاگلا کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔

"کیا... کیا چاہتے ہیں؟" ڈاکٹر نے کشیدہ لہجے میں پوچھا۔

"اندر آنا چاہتے ہیں جناب!"

"اندر آنا چاہتے ہیں۔" ڈاکٹر نے برہمی سے دُہرایا۔ "تم نے بتایا نہیں کہ اسپتال میں ملاقاتیوں کی آمد و رفت کا وقت مقرر ہے۔ یہ وقت ختم ہو گیا ہے... اور ہم اِتنے لوگوں کو ایک ساتھ اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ کبھی نہیں۔"

"بتایا، بتایا جناب!" چھاگلا نے جسم سیدھا کر لیا۔ "صدر دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ وہ سارے کے سارے نہیں، صرف چند آدمی اندر آنے کی درخواست کر رہے ہیں۔ اُن کی خاصی بڑی تعداد کی وجہ سے کچھ شور مچنا شروع ہوا تھا۔ ٹوکنے پر کہ اسپتال کا خیال رکھا جائے، اُنھوں نے احتیاط کی۔"

"کیا کہا تم نے؟" ڈاکٹر رائے نے چونک کے پوچھا۔

"صرف چند آدمی اندر آنا چاہتے ہیں، مگر کیوں؟"

"وہ اُستاد مُحل کا نام لے رہے ہیں۔ کہتے ہیں، صرف ایک دو منٹ کے لیے وہ اُستاد مُحل کو دیکھنا چاہتے ہیں۔"

ڈاکٹر اور میں نے منتشر نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "کون ہیں وہ؟"

"اُستاد میدا اور اُس کے چند ساتھی۔"

"اُستاد میدا؟" ڈاکٹر کی نظریں سیدھی مجھ پر منڈلائیں اور اُس نے چھاگلا سے پوچھا۔ "تم پہچانتے ہو اُسے؟"

"جی، جی ہاں، کل بھی تو اُسے دیکھا تھا یہاں۔" چھاگلا نے گھبرائے انداز میں کہا۔ "وہی ہے جناب۔"

"کیا وہ واقعی اُستاد مُحل کا نام لے رہا تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" چھاگلا نے اکڑ کے کہا۔

"اُن سے کہو، اسپتال کے قاعدے کے مطابق اَب شام 4 بجے سے 6 بجے کے دوران ہی ملاقات ہو سکتی ہے۔"

ڈاکٹر رائے نے بپھری ہوئی آواز میں فیصلہ سنا دیا۔

"میں نے کہا تھا جناب! اُنھوں نے کہا، بس ڈاکٹر صاحب تک ہماری درخواست پہنچا دو۔ وہ مہربان آدمی ہیں۔ نہیں مانے تو ہم چار بجنے تک کا انتظار کر لیں گے۔"

"چار بجے تک وہ یہیں بیٹھے رہیں گے۔" ڈاکٹر برانگیختہ ہو گیا۔ "ٹھیک ہے بیٹھیں، بیٹھیں۔ اُن سے صاف کہہ دو کہ اُنھوں نے اسپتال کا سکون درہم برہم کرنے کی کوشش کی تو پولیس حرکت میں لائی جا سکتی ہے۔"

"بہتر جناب۔" چھاگلا نے مؤدبانہ سر خم کیا۔

وہ واپس جانا چاہتا تھا کہ میں نے اُس سے ٹھہر جانے کو کہا اور ڈاکٹر رائے سے گزارش کی۔ "مجھے اجازت دیجیے، میں اُن سے ملتا ہوں۔ یہ کوئی دوسری بات معلوم ہوتی ہے۔ وہ نہیں جو ہم قیاس کر رہے تھے۔ آپ نے غور کیا، میدا اُستاد وہاں موجود ہے اور وہ مُحل بھائی کا نام لے رہا ہے۔"

ڈاکٹر کو جواب دینے میں تامّل ہوا۔

"بڑے ضدی اور ڈھیٹ قسم کے لوگ ہوتے ہیں، یہیں بیٹھے رہیں گے۔" میں نے تمام تر متانت سے کہا، حالاں کہ مجھے خود بڑی وحشت ہو رہی تھی۔

"دیکھتے ہیں پھر۔" ڈاکٹر پست آواز میں بولا۔

خدمت گار نے چائے پیالیوں میں اُنڈیل دی تھی۔ چھاگلا بھی منتظر کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے لباس کھینچ کر شکنیں درست کیں، بالوں پر ہاتھ پھیرا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

میں لپک کر اُس کے برابر ہوا اور دبی زبان میں مشورہ دیا کہ وہ میرے ساتھ نہ جائے۔

"مجھے معلوم ہے، نہیں جانا چاہیے، لیکن میں اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھنا چاہتا ہوں۔" اُس نے آزردہ مسکراہٹ سے کہا۔ وہ مجھے کچھ نہ کہہ رہا تھا، اُس وقت وہ خود بچوں جیسی خواہش کر رہا ہے، بار بار اُسے اُن لوگوں کے سامنے نہیں ہونا چاہیے، تجسس و اضطراب اپنی جگہ، لیکن اُس کا ایک مرتبہ ہے۔ میں کچھ نہ کہہ سکا۔ یہ ادب کی حدود کا لحاظ بھی بڑا جبر ہوتا ہے۔

"وہ میرے ساتھ رہنے سے سنبھلے رہیں گے۔" یہ کہتا ہوا سب سے پہلے وہی دروازے سے باہر نکلا، پھر میں اور چھاگلا۔ ہمیں دیکھ کے عمارت کے وسیع استقبالی ہال میں تعینات پژمردہ سپاہیوں میں جیسے جان آ گئی۔ چند قدم کی دوری طے کر کے ہم عمارت سے نکل آئے۔ سامنے ایک بڑے بیضوی دائرے کی شکل میں سبزہ زار پھیلا ہوا تھا، اطراف میں پام کے بلند قامت درخت ایستادہ، سبزہ زار کے اُس طرف صدر دروازہ اور صدر دروازے کے دائیں بائیں لوہے کی سلاخوں کا جنگلا بنا ہوا تھا۔ سلاخوں سے جگہ جگہ مختلف رنگوں کے پھولوں کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ سبزہ زار کے دائرے کے دونوں جانب گھومتی ہوئی لال بجری بچھی گھومتی روش پر چلنے کے بجائے ڈاکٹر رائے سبزہ زار کے بیچوں بیچ اینٹوں سے بنے پگ ڈنڈی جیسے راستے پر آ گیا۔ یہ راستہ سیدھا صدر دروازے پر ختم ہوتا تھا۔ اِس طرح فاصلہ مختصر ہو گیا۔

وہ بڑی تعداد میں باہر بکھرے ہوئے تھے۔ چھاگلا تیز قدموں سے آگے چلا گیا تھا۔ ہم سے پہلے دربان کے پاس جا کے اُس نے صدر دروازے کا بغلی دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی یکا یک شور اُٹھا، لیکن چھاگلا کی بروقت مداخلت سے بھن بھناہٹ میں تبدیل ہو گیا۔ دروازہ کھلنے پر ہمیں جگہ دینے کے لیے وہ پیچھے ہٹنے لگے اور چھاگلا کی تقلید میں اَور بہت سوں نے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے لوگوں کو خاموش رہنے کی تلقین شروع کر دی۔

اِتنے قریب جانے پر اُن کے چہرے نمایاں ہو گئے اور یہ

مینارِ پاکستان

برصغیر میں عالم گیری مسجد (لاہور) کے میناروں کے بعد جو پہلا اہم مینار مکمل ہوا ہے، وہ مینارِ قراردادِ پاکستان ہے۔ یوں تو مسجد اور مینار آمنے سامنے ہیں، مگر اُن کے درمیان یہ ذرا سی مسافت، جس میں سکھوں کا گردوارہ اور فرنگیوں کا پڑاؤ شامل ہیں، تین صدیوں پر محیط ہے۔ میں مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھا اُن تین صدیوں کا ماتم کر رہا تھا۔ مسجد کے مینار نے جھک کر میرے کان میں راز کی بات کہہ دی۔ جب مسجدیں بے رونق اور مدرسے بے چراغ ہو جائیں، جہاد کی جگہ جمود اور حق کی جگہ حکایت کو مل جائے، ملک کے بجائے مفاد اور ملت کے بجائے مصلحت عزیز ہو اور جب مسلمانوں کو موت سے خوف آنے اور زندگی سے محبت ہو جائے تو صدیاں یوں ہی گم ہو جایا کرتی ہیں۔

"آوازِ دوست" از مختار مسعود ❖ تعاون: ابو الفرح ہمایوں

میرے ہوش و حواس کی کوئی آزمائش تھی۔ اُستاد میدا، برجو دادا اور اُن کے معتمد ساتھیوں کے درمیان جامو اور زورا بھی موجود تھے۔ پہلے جامو نے مجھے دیکھا، پھر زورا نے، اور وہ اُچھلنے لگا۔ جیسے ہی ہم دروازے سے باہر نکلے، وہ بیچ میں کھڑے لوگوں کو ہٹاتا دیوانہ وار پاس آ کے مجھ سے چمٹ گیا اور میرے سینے سے سر رگڑنے لگا۔ اِدھر جامو نے مجھے پہلو سے دبوچ لیا۔ چند لمحوں تک میں خود سے بیگانہ سا رہا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں اور جی چاہا، اپنا سارا وجود اُن کے حوالے کر دوں، میں بے اختیار ہو جاؤں۔ اِسی دوران میری نظر ڈاکٹر رائے پر گئی، اور مجھے اپنے آپ کو پھر سمیٹنا اور باندھنا پڑا۔ میں نے جکڑی ہوئی آواز میں اُن سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب... ڈاکٹر رائے... اسپتال کے سب سے بڑے ڈاکٹر۔“

اُن دونوں نے مجھے چھوڑ دیا اور سٹ پٹاتے ہوئے ڈاکٹر کو سلام کیا۔

”اُستاد کیسے ہیں۔“ جامو نے بے تابی سے پوچھا۔

”ٹھیک ہیں اَب۔“ یہ بتاتے ہوئے میری آواز حلق میں پھنس گئی۔ میرے تو دست و بازو، سارا جسم ہی دُکھنے، ڈھیر ہونے لگا تھا۔

اِتنے میں اُستاد میدا، برجو دادا میرے سامنے آ گئے۔ دونوں کے ہاتھ جُڑے ہوئے تھے، اور شکل و صورت سے سرگردانی جھلک رہی تھی۔ میدا نے خیال رکھا۔ پہلے ڈاکٹر کے پاؤں چھوئے، پھر میرے پیر پکڑ لیے۔ ”ہمرے کو معافی دے دیو اُستاد!“

مجھے حیرت ہوئی، وہ بلک رہا تھا، میں نے اُس کے شانے پکڑ کے اُسے پیروں سے اُٹھایا، لیکن وہ اپنے بال نوچنے کھسوٹنے اور پیشانی کوٹنے لگا۔ میں نے اُسے روکا تو وہ بے طرح میرے سینے سے لگ گیا۔ ”ہمرے کو کچھ پتا ناہیں تھا لاڈلے بابو، کون سامنے ہے، اپنا متھا ہی پھر گیا تھا، کچھ پوچھا نہ جانا، ایسے کون سینہ تان کے اپنے سامنے آ سکت ہے۔ اُستاد مخمل کا لاڈلا ہی ہوئے گا، کوئی

ایسو۔ انڈھا ہی تھو تھا ہم... اور تم... تم بھی تو کچھ ناہیں بولے۔ اُستاد مخمل اپنے شہر میں ہو اور ہمرے کو بالکل خبر ناہیں۔ کیسو گھور پاپ ہوگیو ہمرے سے۔“ میدا کا حال دِگر تھا۔

جامو نے اُسے کھینچ کے میرے پاس سے ہٹایا۔ میدا، برجو، زورا اور جانے کون کون، وہ سبھی اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے، اور اُدھر ڈاکٹر رائے موجود تھا۔ میرا دماغ ہی معطل ہو گیا تھا، کس طرف دیکھوں، کس کی سنوں اور کسے کیا جواب دوں۔ ہجوم میں ہر شخص ہم سے قریب ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور دھکم پیل سی ہونے لگی تھی۔ میں نے بے چارگی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا، وہ ذہین و فطین آدمی لمحوں میں ساری صورتِ حال سمجھ گیا۔ اُس نے پہلو میں کھڑے چھا گلا کو سرگوشی میں کوئی ہدایت کی۔ ایک ثانیے کی تاخیر کیے بغیر چھا گلا نے میدا کے بجائے عمر رسیدہ برجو کا باز و تھام کے اُسے ڈاکٹر رائے کا حکم منتقل کر دیا۔

جواب میں برجو منّت سماجت کرنے لگا۔ ”سارے اُستاد مخمل کے درشن واسطے آیو ہیں مہاراج۔“

”وہ یہاں نہیں آ سکتا۔“ ڈاکٹر رائے نے درشتی سے کہا۔ ”نہ اُس کے کمرے میں اِتنے لوگوں کو جانے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔“

ناچار برجو دادا نے دربان کی کرسی پر کھڑے ہو کے ہجوم کو واپس چلے جانے کی تاکید کی۔ ”بڑے ڈاکٹر ساب کا حکم ناہیں ہے بھیّا، ابھی اُستاد مخمل باہر نا آ سکت ہیں۔ ڈاکٹر ساب کچھ اور اِنتجار کرنے کو بولے ہیں۔“

ڈاکٹر رائے کے ایما سے چند آدمیوں کو اندر جانے کی اجازت دے دی گئی۔

خلافِ توقع ڈاکٹر پھر وہاں نہیں ٹھیرا۔ میرا شانہ تھپک کے وہ تنہا واپس ہو گیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا، لیکن مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کیا کہنا چاہیے۔ چھا گلا نے پھرتی سے کام لیا۔ دربان اور اردگرد کھڑے سپاہیوں نے میرے اور چھا گلا کے علاوہ آٹھ آدمیوں کو اسپتال کی چار دیواری میں داخل کر دینے کے بعد دروازہ بند کر دیا، اندر ہمارے قدم رکھتے ہی ہجوم کی گونج تیز ہو گئی تھی، لیکن ہم اُن سے دُور ہوتے گئے، زورا اور میدا میرے دونوں بازو جکڑے جیسے مجھ میں پیوست ہوئے جاتے تھے۔ سبزہ زار کے بیچ میں تنگ راستے پر چلتے ہوئے ہم مرکزی عمارت

میں آ گئے۔ میدا کے ساتھ کیلے کے تازہ پتوں سے ڈھکی اور کلاوے سے بندھی ٹوکریاں سر پر اُٹھائے تین اور آدمی بھی تھے۔ ڈاکٹر رائے کے کمرے سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے صاف ستھرے اور روشن کمرے میں چھا گلا ہمیں لے آیا۔ کمرے کے دو اطراف دیواروں کے ساتھ صوفے لگے ہوئے تھے اور ایک گوشے میں بڑی گول میز اور اُس کے گرد درجن بھر کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ٹوکریاں میز پر رکھ کے تینوں آدمی باہر چلے گئے۔ کمرے میں میرے اور چھا گلا کے علاوہ صرف پانچ ہی افراد رہ گئے۔ زورا، جامو، میدا، برجو اور ایک پختہ کار آدمی، جو کل بھی میدا کے ساتھ اسپتال آیا تھا اور جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ چھا گلا کی درخواست پر جھجکتے ہوئے وہ پانچوں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ میدا اور جامو میرے دائیں بائیں بیٹھے۔ چھا گلا نے مجھ سے کسی خدمت کے لیے پوچھا۔ میں کیا کہتا، مجھے تو اُس کا شکریہ ادا کرنے کا بھی یارا نہیں تھا۔ میرے بجائے اُن سب نے انکار کر دیا، پھر چھا گلا بھی کمرے میں نہیں رُکا۔

کچھ دیر خاموشی رہی، جیسے اُن کے پاس کوئی موضوع ہی نہ ہو، یا پھر احوال بے شمار اور کثرتِ ماجرا اور ناگفتنی کو گفتنی کرنے کی فکر میں بات شروع کرنی مشکل ہو جاتی ہے۔

”کیا ہوا تھا اُستاد کو؟“ جامو نے بوجھل آواز میں پہل کی۔

پھر تو اُن میں سے کسی کو قرار نہیں رہا۔ ایک چپ نہیں ہوتا تھا کہ دوسرا بول پڑتا۔ وہ سارے وضاحتیں، صراحتیں اور تاویلیں کرتے رہے۔ جو گزر چکا تھا، اُس کا ملال، اُس کا بَین۔ اکبر علی خاں کے دونوں تار کلکتے پہنچ گئے تھے۔ اڈّے پر نہ جامو تھا، نہ زورا اور جمرو۔ وہ تینوں اڈّے کے چند اور ساتھیوں کے ہم راہ اُستاد سامی بابو کی ناگہاں موت پر کھلنا گئے ہوئے تھے۔ سامی بابو کے آبا و اجداد آسام سے آ کے کھلنا شہر میں بس گئے تھے۔ آسام کی نسبت سے سب اُسے سامی کہتے ہیں، میں بھی اُسے خوب جانتا تھا، ہاتھ کا بڑا صاف، جی داری میں یکتا، مخمل کا مقربِ خاص تھا۔ ایک زمانے سے کلکتے کے اڈّے سے وابستہ تھا۔ جامو کے کہنے کے مطابق ماں کی موت کی خبر ملنے پر عرصے بعد سامی بابو کھلنا گیا تھا کہ وہاں کسی سے لڑائی جھگڑے میں مارا گیا۔ جامو، جمرو، زورا وغیرہ کو

تیسرے چوتھے روز کلکتے واپس آ جانا تھا۔ اڈّے پر سبھی آج کل میں اُن کی واپسی کے منتظر تھے، مگر اپنے اڈّے کے آدمی کے خون کا حساب صاف کیے بغیر، صرف آنسو بہا کر اُنھیں واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔ کھلنا میں ابھی ایک دو روز اُنھیں اور ٹھیرنا تھا۔ کلکتے کے اڈّے والوں نے ایک دن اور اُن کی راہ دیکھی، پھر ہرکارہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ہرکارے کے پہنچتے ہی جامو، جمرو، زورا وغیرہ نے سب کچھ اُدھورا چھوڑ کے فوراً کلکتے روانگی کا قصد کیا۔ شدید بارشوں نے راستے مسدود کر دیے تھے، بہرحال، کسی نہ کسی طرح وہ کلکتے پہنچے اور لباس کی تبدیلی کے لیے کچھ دیر اڈّے ٹھیر کے پہلی گاڑی سے پٹنے روانہ ہو گئے۔

بارشوں کی وجہ سے گاڑی کی رفتار سُست تھی۔ تین گھنٹے تاخیر سے پہنچی۔ رات 9 بجے پٹنا اسٹیشن اُتر کے اُنھوں نے سیدھے گرانڈ ہوٹل کا رُخ کیا۔ تار میں اُسی ہوٹل کا پتا مندرج تھا۔ اسٹیشن سے باہر آتے ہی اُن کا ماتھا ٹھنکا تھا، راہ گیروں کی تعداد کم، دکانیں بند، پولیس کا گشت اور سناٹا سا، تھوڑی بہت تانگے والے سے اُنھوں نے سُن گُن لی۔ ابھی وہ کچھ اور جاننے بُوجھنے کی ٹوہ میں تھے کہ پولیس نے تانگا روک لیا، اُنھوں نے احتیاط کی کہ ہوٹل کے بجائے اپنی منزل میدا کا اڈّا بتائی۔ پولیس اُنھیں تھانے لے گئی۔ رات گئے مختلف افسران اُن سے سوالات کرتے، دھمکیاں دیتے اور پولیس والوں کی طرح پیش آتے رہے۔ اُن کی تلاشی لی گئی۔ دونوں کی جیبوں

سے چاقو برآمد ہوئے، لیکن یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی بتا چکے تھے کہ اُن کا تعلق کلکتے کے اڈّے سے ہے۔ احتیاطاً اُنھوں نے میرا اور جھل کا کوئی حوالہ نہیں دیا، کیوں کہ تار میں طلبی کی وجہ کا ذکر نہیں تھا، اور اَب شہر کے حالات کے پس منظر میں وہ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ اِس اچانک طلبی کی وجہ سنگین ہی ہو سکتی ہے۔ بڑی بحث و تکرار اور سفر کے دوران بعض شہادتوں کی تصدیق کے بعد پولیس کو یقین آ گیا کہ واقعی وہ کلکتے سے تازہ تازہ آئے ہیں اور گزشتہ دنوں شہر میں ہونے والے خوں ریز واقعات میں ملوث نہیں ہیں۔ پولیس نے میدا سے رابطہ کیا تو وہ خود تھانے پہنچ گیا اور اُس نے اپنی ضمانت پر دونوں کو پولیس سے نجات دلائی۔

جامو کے بہ قول، میدا اور اُس کے ساتھی اِس انکشاف پر ششدر رہ گئے کہ جامو اور زورا تو جھل کے بلاوے پر یہاں آئے ہیں۔ گویا جھل پہنچے ہیں، گرانڈ ہوٹل میں موجود ہے۔ جامو اور زورا کو ساتھ لے کر میدا اُسی وقت ہوٹل پہنچا۔ وہاں اُنھیں معلوم ہوا کہ جھل تو کئی دن سے اسپتال میں ہے۔

رات بہت گزر چکی تھی۔ ہوٹل سے وہ اسپتال گئے، لیکن اُن کا اندر جانا ممکن نہ ہو سکا۔ اسپتال سکوت میں ڈوبا ہوا تھا، اور بڑی تعداد میں پولیس پہرا دے رہی تھی۔

زنجیر کی کڑیاں پھر ملتی ہی گئیں۔ میدا کہہ رہا تھا، اُس پر تو قیامت گزر گئی؛ جو نوجوان اُس کے اڈّے پر اِس دیدہ دلیری سے آیا تھا، کوئی اور نہیں، اُستاد جھل کا 'لاڈلا' تھا۔ وہ نوجوان، جس کی وجہ سے جھل عملاً اڈّے سے دست بردار ہو گیا ہے، اور شہروں شہروں اُسی کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ برجو دادا نے بتایا کہ رات بھر میدا تڑپتا، بلکتا رہا، وہ کیسا بد بخت ہے، اُستاد جھل بیماری کی حالت میں اُس کے شہر میں موجود ہو، اور اُسے خبر نہ ہو پائے۔ صبح ہوتے ہی اُس نے اپنے ذرائع سے جھل کی خیر خبر حاصل کی اور یہ جان کے چین نصیب ہوا کہ جھل رُو بہ صحت ہے اور آج صبح اُس نے کچھ دیر چہل قدمی بھی کی ہے۔

کسی ردّ و قدح کے بغیر میدا اعتراف کر رہا تھا کہ اُس نے اور برجو دادا نے مبارزت ملتوی کرنے کا فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنے اڈّے پر بلائے ناگہانی کی طرح وارد ہونے والے نوجوان کے عزم و ہمت سے وہ سحر زدہ ہو چکا تھا۔ اُس وقت بھی ایک تدبیر قرینِ مصلحت تھی کہ کوئی خطرہ مول نہ لیا جائے اور کسی طور یہ وقت ٹال دیا جائے اور مبارزت کے التوا کے بعد ملنے والی مہلت کے دوران نوجوان کے کوائف کے بارے میں آگہی حاصل کی جائے۔ اَب اُسے احساس ہو رہا ہے، وہ مبارزت پر آمادہ ہو جاتا تو نتیجے میں کیسی ذلّت کا سامنا کرنا پڑتا۔

یہ اتفاق ہے کہ اُسے مجھ سے ملنے کا موقع بھی نہ مل سکا تھا، لیکن وہ مجھ سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ میں جھل کا منتخب اور تربیت یافتہ ہوں۔ میری نگاہ کی تیزی، بازوؤں کے بل اور چاقو پر دست رس کی بڑی دھوم ہے۔ میں نے بمبئی کے کئی باڑوں کے داداؤں کو یکے بعد دیگرے بے دخل کر دیا تھا۔ حیدر آباد اور جانے کہاں کہاں اڈّوں پر قبضے کے واقعات اُس کے علم میں تھے، اور یہ بھی کہ سات سال جیل میں مَیں نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا تھا۔ اڈّے پر جب میں نے کسی موقع پر اکبر علی خاں کو مداخلت سے باز رہنے کے لیے ٹوکا تھا تو اُسے میری انگریزی دانی پر حیرت ہوئی تھی، لیکن اُس کی عقل خبط ہو چکی تھی، اُسے ذرا بھی شک نہیں گزرا کہ میں جھل کا لاڈلا، لاڈلا اُستاد ہو سکتا ہوں۔ ایک ذرا چھو جانے کی حد تک یہ گمان اُس کے دماغ میں دَر آتا تو ساری صورتِ حال بدلی ہوئی ہوتی۔ میدا اور اُس کے ساتھی گزشتہ رات ماتم کرتے رہے کہ پھر پے در پے یہ سانحے رُونما ہوتے۔

اڈّے کے وہ چند آدمی جو بُری طرح مشتعل تھے کہ ایک اجنبی کی وجہ سے اُن کا عزیز ترین ساتھی ڈھنوا جدا ہو گیا اور میدا تماشائی بنا رہا۔ اُنھیں قلق تھا کہ چنگل میں آئے اُس اجنبی کو میدا نے اتنی آسانی سے کیوں جانے دیا... وہ پاگل بھی میری حقیقت سے آگاہ ہو جاتے تو اُن کا جنون کبھی اِس انتہا کو نہ پہنچتا۔ میں جھل کے نام سے وابستہ تھا، اور جھل اُن کے لیے جتنا واجب احترام تھا، اُتنا ہی ہیبت کی علامت بھی۔

میدا کے اعتراف میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آتی تھی، کیوں کہ اُس کا تعلق تو تنگی سے شاید کبھی نہیں رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اُسے مجھ سے کوئی دل چسپی تھی نہ میرے بیار بھائی سے۔ میرے لیے تو عداوت اُس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ پہلے دن، شام کو جو دو پولیس والے سادہ لباس میں مجھ سے ملنے اسپتال آئے تھے، اُن کا تعلق واقعی پولیس سے تھا، لیکن اصل میں وہ اُس کے فرستادہ تھے۔ اُنھیں بھیج کر وہ میرا عزم جانتا اور میری بازپرس کرنا چاہتا تھا، اور یہ سن کے اُس کا اضطراب دو چند ہوا کہ میں اپنے ارادے میں اٹل ہوں اور بھائی کی طبیعت ٹھیک ہوتے ہی اپنا چاقو واپس لینے، یعنی میدا سے پنجہ آزمائی کے لیے اڈّے ضرور جاؤں گا، چناں چہ رات کو جب مجھے ختم کرنے کے لیے میدا کے سرد ردّیے سے نالاں ڈھنوا کے جاں نثار ساتھیوں نے اسپتال میں داخل ہونے کی جرأت کی تھی تو میدا کو اُن کے اِس سفاکانہ اقدام پر کسی قدر تسلّی ہوئی کہ اُس کے ایما سے نہ سہی، مگر چند لوگ میرے خاتمے کے تو درپے ہیں، اور میدا کا کہنا تھا کہ اُس سے یہی چُوک ہو گئی۔ اُس کی خاموشی اور چشم پوشی نے ڈھنوا کے دوستوں کا حوصلہ مہمیز کیا۔ اُسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ مجھ سے نفرت اور اپنے غیظ و غضب میں وہ جنگلی حد سے گزر جائیں گے۔ اُن کے ہاتھ میں نہ آ پایا تھا تو کسی طور پر مجھے زک پہنچانے کے لیے وہ میرے مربی، ایک بے گناہ، غیر متعلق شخص کو نشانہ بنا دیں گے۔

اُس رات اسپتال میں ایک نوجوان اختونی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، لیکن میدا کی نظر میں یہ اتنا بڑا سانحہ نہیں تھا۔ اختونی نے خود اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ وہ اُن بھاگتے ہوئے لوگوں کے آڑے نہ آ جاتا تو اِس انجام سے دوچار نہ ہوتا۔ بھاگتے ہوئے چور کی راہ میں کوئی رُکاوٹ اُسے حیوان بنا دیتی ہے، مگر اکبر علی خاں کس کے آڑے آئے تھے۔ میدا کہہ رہا تھا کہ اُسے اکبر علی خاں کی موت کا بڑا صدمہ ہے، اُنھوں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ شہر کے ایک معزّز، بڑے نام ور، بہت مہربان آدمی تھے۔ ایسے لوگ تو کم کم پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کیا ہو گیا۔ میدا کے بہ قول، اُس کا دماغ ہی پھر پلٹ گیا۔ اُسے اڈّا، اڈّے کی چوکی حقیر لگنے لگی۔ اُسے تو اپنے آپ سے چڑ ہونے لگی تھی۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ اَب جو کچھ بھی ہو، وہ اُن تین وحشیوں کو زندہ نہیں رہنے دے گا۔ اِس طرح اکبر علی خاں کی موت کی تلافی تو نہ ہوگی، مگر میدا کو اپنے آپ کو بھی تو کوئی جواب دینا تھا۔ اُسے میری آگ کا بھی احساس تھا کہ بجا طور پر میرا ردِّ عمل اَب کتنا شدید ہو سکتا ہے۔ اِس لیے اُس نے کل شام اسپتال آ کر میرا چاقو واپس کر کے اڈّے سے دست برداری کا اعلان کر دیا، اور یہ کوئی اپنے دفاع، اپنی جان بچانے کا کوئی حیلہ و حربہ نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو ترک کر چکا تھا۔

میدا سے جھل کا واسطہ کوئی نیا نہیں تھا۔ ایک زمانے میں جھل کی قدم بوسی کے لیے مہینے ڈیڑھ مہینے بعد کلکتے جانا اُس کا معمول تھا۔ وہ کہہ رہا تھا، جھل بھی کبھی پٹنے بہت آیا جایا کرتا تھا۔ جھل سے میدا نے بہت ہنر سیکھا تھا۔ پٹنے کے اڈّے کی چوکی کا منصب بھی اُسے جھل کے سائے؛ جھل کی تربیت کے طفیل مل پایا تھا۔ اُس کے چوکی سنبھالنے کی رسم ادائی کی تقریب جھل کی سرپرستی میں ہوئی تھی۔ اَب بہت عرصے سے اُس کی ملاقات نہیں ہو پائی تھی، لیکن جھل سے تو اُس کا رشتہ قلبی اور دائمی ہے۔ اِس دوران بھی وہ کئی بار کلکتے گیا اور اپنے ولی نعمت کے دیدار سے محروم لوٹ آیا۔ جھل تو کلکتا شہر جیسے بھول ہی گیا ہے۔ جھل کا نام لیتے ہوئے میدا کا لہجہ محبت و عقیدت سے معمور تھا۔

میں نے کچھ نہیں کہا، کہنے کو اَب رہ بھی کیا گیا تھا۔ میری خاموشی پر شاید اُسے گمان ہوا کہ جس صمیمِ قلب سے اُس نے اپنا احوال بیان کیا ہے، میں نے اُسی دردمندی سے نہیں سنا ہے۔ مجھے اُس سے کیا کہنا چاہیے تھا، کہ میرا سینہ بہت بھرا ہوا ہے۔ ہزار نظریں چراؤں، اکبر علی خاں کا چہرہ بار بار سامنے آ جاتا ہے، اور ایک ہُوک سی اُٹھتی ہے، اور کچھ بس میں دکھائی نہیں دیتا تو

انصاف

عدالتوں میں انصاف رائج کرنے کی ایک انوکھی ترکیب کمبوجیہ نامی بادشاہ نے نکالی تھی۔ اُس کے عہد سے پہلے کسی کو یہ ترکیب سوجھی نہ اُس کے بعد کسی کو اِس پر عمل کرنے کی توفیق ہوئی۔ بادشاہ کمبوجیہ کے حکم کے مطابق بے انصاف اور بے ایمان جج کی کھال بہ طورِ سزا کھینچ لی جاتی۔ چوں کہ یہ کھال یتیم خانے کے کسی مصرف کی نہ ہوتی، اِس لیے اُس سے سرکاری فرنیچر کی پوشش کا کام لیا جاتا۔ جج صاحب کی کھال اُن کی کرسیِ عدالت پر مڑھوا دی جاتی۔ پھر آں جہانی کی جگہ اُس کے بیٹے کا تقرر کیا جاتا تا کہ وہ اُس کرسی پر بیٹھ کر آغوشِ پدر کی گرمی اور انجامِ پدر کی تپش محسوس کرے اور مقدمات کا فیصلہ کرتے وقت انصاف اور صرف انصاف سے کام لے۔

لوحِ ایام از مختار مسعود ❖ تعاون: اشتیاق خان

اپنا وجود ہی زہر لگتا ہے۔ میدا سے آپ کوئی پرخاش رکھنے سے حاصل بھی کیا تھا۔ لوٹ پھیر کے پس ماندگانِ حسنگاں کو اِسی ایک سنگ دلانہ قول اور بے رحمانہ ارشاد پر تکیہ کرنا پڑتا ہے کہ جس کی موت جس طرح لکھی ہے، اُسی طرح آئے گی۔

میدا یک لخت اپنی جگہ سے اُٹھ کے میرے سامنے آ کے فرش پر بیٹھ گیا اور اُس نے پہلے کی طرح پھر میرے پیر پکڑ لیے اور گھٹنوں پر سر رکھ کے مچلنے بکھرنے لگا۔ وہ رو رہا تھا۔ اُس کے پاس آنسو تھے، مگر جس کے پاس آنسو بھی نہ رہے ہوں؟

جامو نے پھر اُسے میرے پاس سے ہٹایا۔

چھاگلا نے یقیناً ڈاکٹر راے کی ہدایت پر چاے اور دیگر لوازم فراہم کیے تھے۔ خدمت گار مہمانوں کی طرح اُن سب کی خدمت بجالایا تھا۔ وہ جھل کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھے، اور ڈاکٹر راے کے عندیے کے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔ میں نے خدمت گار سے چھاگلا کو بلانے کے لیے کہا۔ وہ کہیں قریب ہی تھا، جلد ہی پُرتپاک انداز میں حاضر ہو گیا۔ میرے استفسار پر اُس نے بتایا کہ ڈاکٹر راے مریضوں کے معائنے کے لیے معمول کی گشت پر ہے اور واپس آیا ہی چاہتا ہوگا۔ ہم انتظار کرتے رہے اور اس درمیان جامو، بر جو دادا، اُس کا ساتھی میدا کی کیفیت کی توثیق و تصدیق کرنے، اور ایک طرح اُس کی وکالت کرنے لگے۔ میدا کو پھر بے کلی سی ہوئی، بھڑکتے لہجے میں خود پر لعن طعن کرنے لگا کہ کل شام وہ سُر نگوں جب میرے پاس اپنا چاقو لوٹانے اور اڈّے کی چوکی، اڈّے کے ماحول اور اس شہر ہی سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کا ارادہ کر کے اسپتال آیا تھا، اور اُس نے اپنے آپ کو میری صواب دید پر چھوڑ دیا تھا کہ جو چاہوں، اُس کے لیے سزا تجویز کر دوں، اُس وقت بھی اُس کی آنکھ نہیں کھلی، اُسے مطلق خیال نہیں آیا کہ یہ فیاضی اور دریا دلی تو جھل کی کسی نظیر، کسی پرچھائیں ہی کی ہو سکتی ہے جو میں نے اُس سے روا رکھی تھی۔ یہ تو صاف صاف اُس کے آقا جھل کے تیور ہیں، یہ تو اُس کا پرتو ہے۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ چھاگلا نے آ کے بتایا، ڈاکٹر راے واپس آ گیا ہے، اور اپنے کمرے میں میرا منتظر ہے۔ اُن سب کو وہیں چھوڑ کے میں فوراً چھاگلا کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔ ڈاکٹر کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ اُس کی اجازت سے میں اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"ہاں لاڈلے صاحب... راجا... اور بابر اُستاد! کیا حال ہے؟" وہ اینٹھی ہوئی آواز میں بولا۔

"اور بھی ایک دو نام ہیں... ظہیر بھی ایک نام ہے میرا۔ گھر میں امی کبھی ظہیری اور ظہیر بھی کہہ دیتی تھیں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"ہاں، ہاں، تین ہو سکتے ہیں تو چار پانچ بھی۔"

"کیا ایک شخص کا ایک ہی نام لازم ہے؟"

"نہیں، نہیں، بالکل نہیں۔" وہ تیزی سے بولا، "اُس کی مرضی ہے، نام بدلتا رہے، سو نام رکھ لے، جہاں جائے، نیا نام، اور کوئی نام ہی کیوں رکھے، بے نام ہی رہے۔"

"ناموں میں کیا رکھا ہے جناب!"

اُلجھا ہوا جو اُس نے موضوع بدل دیا، منہ پُھلا کے بولا، "تم بتاؤ، کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

"کیا آپ کچھ سننا چاہیں گے؟"

"سنانے کے لیے کیا کچھ نیا ہے؟"

"اتنا نیا تو نہیں، لیکن چوں کہ آپ شامل رہے ہیں... تو شاید دل چسپی کا باعث ہو۔"

"شکر ہے، تشویش کا نہیں کہا تم نے۔"

"مگر مایوسی اور اُداسی سے عاری نہیں۔"

اُس نے سر کو خفیف جنبش دی۔ مجھے معلوم تھا، عمر ڈھل چکی ہے، لیکن وہ پسپا نہیں ہوا ہے۔ اُسے سب کچھ جاننے کی بڑی جستجو ہوگی۔ وہ صدر دروازے سے واپس چلا آیا تھا، پھر جس کمرے میں چھاگلا نے ہمیں بٹھایا تھا، وہاں بھی موجود نہیں رہا۔ دونوں جگہوں پر اُسے ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ یہ مرتبہ و مقام بھی دیواروں کی طرح ہوتے ہیں، آدمی کو جکڑے رکھتے ہیں، ڈاکٹر نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور بے وجہ نہیں۔ اُسے تردد ہوگا کہ میں اِدھر اُدھر کی کسی بات میں اُلجھ نہ جاؤں۔ میں نے بھی مدّعا بیان کرنے میں دیر نہیں کی اور مختصراً میدا کے اعترافات کے بارے میں بتایا۔ میں نے کہا، "میدا مسلسل خود کو ملامت کر رہا تھا کہ اتنی جراتیں دیکھتے ہوئے اُسے کسی لمحے جھل بھائی اور میرا خیال آنا چاہیے تھا۔ کاش کہ ایسا ہوتا، کچھ میری بھی کوتاہی تھی۔ اُس کے اڈّے پر جا کے اُسے زچ کرنے کے لیے میں نے دانستہ بڑی بڑی باتیں کی تھیں۔ اپنی دعووں سے وہ متزلزل ہو گیا تھا۔ کہیں اگر جھل بھائی سے اپنی وابستگی، اُن کا نام میری زبان سے ادا ہو جاتا، کوئی ایک اشارہ بھی، لیکن جانے کیوں میرے سان و گمان میں نہیں تھا کہ جھل سے میدا کا اتنا گہرا ربط و ضبط ہو سکتا ہے۔ وہ اِسی کا ماتم کر رہا تھا کہ جھل کا تو نام سن کے وہ تینوں پاگل بھی ٹھنڈے پڑ جاتے۔ اُنھیں اچھی طرح علم تھا کہ جھل بھائی کون ہیں۔"

"کیا بہت بڑا اُستاد ہے تمھارا بھائی؟ وہ کیا کہتے ہیں، منہ بولا بھائی۔"

"معاف کیجیے، منہ بولا کہہ کے آپ میرے اُس کے تعلق کا درجہ گھٹا رہے ہیں۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ میرے اُس کے..."

"یاد آیا۔ تم نے یہی کچھ کہا تھا۔" اُس نے میری آواز کی تپش پر توجہ نہیں دی اور بڑبڑاتے ہوئے بولا، "ٹھیک ہے۔"

"اور وہ صرف کسی اڈّے، یا اڈّوں کے اُستاد نہیں، ایک بہت مختلف آدمی ہیں۔ میں آپ سے کیا کہوں، اُن جیسا مشکل سے کوئی ہوتا ہے۔"

"ہوں، اُوں... واقعی!" وہ دیدے گھماتے ہوئے بولا۔

اُس کا مضحک انداز میں نے بہ جبر نظر انداز کیا۔ اُسے کچھ میری بے لطفی و دل گیری کا احساس ہوا اور اُس نے لہجے میں نرمی پیدا کی۔ "بہ ہر حال کم ہوتا ہے ایسا۔ یہ یگانگت قابلِ رشک ہے۔ مجھے بتاؤ، اَب میدا کیا چاہتا ہے؟ تمھارے بھائی سے ملنا؟"

"جی ہاں۔"

"ٹھیک ہے، مگر بہتر ہوگا، وہ زیادہ دیر وہاں نہ ٹھیرے اور گزرے ہوئے واقعات کی کوئی بات نہ کرے۔"

"ظاہر ہے، وہ ایسا نہیں کرے گا، اور اُسے تنبیہ بھی کر دی جائے گی۔ اڈّے کی چوکی پر بیٹھا آدمی عام آدمی نہیں ہوتا۔"

"بہت خاص ہوتا ہے کیا؟"

"خاص نہیں ہوتا تو اڈّے کی چوکی پر تا دیر ٹِک بھی نہیں سکتا۔"

"اُس سے کہہ دینا، کوئی شور شرابا نہیں۔"

"وہ بھی سمجھتا ہے، یہ کون سی جگہ ہے۔" میں اُٹھ گیا اور دروازے سے نکلتے نکلتے بے ارادہ میرے قدم رُک گئے، کچھ تامّل کے بعد میں نے پلٹ کے ہچکچاتے ہوئے کہا، "آپ کے لہجے سے کچھ بیزاری اور ناپسندیدگی محسوس ہو رہی ہے، مگر میں کیا کروں، یہی کچھ ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ نے میرے بارے میں نظرِ ثانی کی ہو۔"

ایک پل کے سکوت کے بعد وہ کرسی پر اُچھل سا گیا۔ "نہیں نہیں، مجھے تو تم اور دل چسپ اور عجیب لگ رہے ہو۔" وہ زور دے کے بولا۔

میری آنکھوں کو کیا ہو گیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر جلنے لگی تھیں۔ دوسرے لمحے میں کمرے سے چلا آیا۔

اُن کی درخواست پر چھاگلا نے اسپتال کے تین ملازموں کا انتظام کر دیا۔ تینوں نے ٹوکریاں سروں پر اُٹھا لیں۔ زورا، جامو، میدا، بر جو دادا اور اُن کا ساتھی راہ داریوں، وارڈوں اور جگہ جگہ تعینات سپاہیوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے جھل کے کمرے تک آ گئے۔ سارے راستے زورا نے میرا اچھے پکڑ رکھا تھا اور قدم سے قدم ملا کے چلتا رہا تھا، جیسے میرا جزو بن جانا، مجھ میں سما جانا چاہتا ہو۔ اُس کے جسم کی لپک، ہاتھ کی گرمی مجھ سے ہم کلام رہی، اپنی وارفتگی اور شدّتوں کا اظہار کرتی رہی۔ اُنھیں کمرے کے باہر روک کے میں نے جھانک کے اندر دیکھا۔ جھل بستر پر بیٹھا ہوا تھا، سینے کے آگے چھوٹی میز لگی ہوئی تھی اور وہ اپنے ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ سیورین بستر کے کنارے بیٹھی اُس کی نگرانی کر رہی تھی۔ میں نے اُن سے کچھ توقف کے

لیے کہا اور توقف کی وجہ بھی بتائی۔ وہ کمرے کے دروازے کے ساتھ دم سادھے کھڑے رہے۔ ہیجان اُن کے چہروں سے عیاں تھا۔ انھیں باہر ہی ٹھہرا کے کچھ دیر بعد میں نے آہستگی سے کمرے میں قدم رکھا۔ بہلول اور سیورین چونک سے پڑے۔

''کدھری تھا رے؟'' بہلول نے شکایتی لہجے میں پوچھا۔

''یہیں تھا، ڈاکٹر صاحب کے پاس۔'' میں نے سادگی سے بتانے کی کوشش کی۔ سیورین نے کچھ نہیں کہا، لیکن اس کی نظریں میرے چہرے پر تنکوں کی طرح چبھتی رہیں۔ اسپتال کے ملازموں کے ذریعے اُسے لمحے لمحے کی خبر ملتی رہی ہوگی۔ ایک بڑا ہجوم اسپتال کے باہر دوسری بار جمع ہوا تھا۔ یہ ایک خلافِ معمول واقعہ تھا۔ اسپتال کے ہر فرد کو مضطرب ہونا چاہیے تھا کہ وہ شہر کے اڈّے کے آدمی تھے، بھتہ خور، چاقو باز...

بہلول نے کھانا ختم کرلیا اور گلاس بھر پانی پی لیا تو میں نے پوچھا، ''طبیعت بہتر ہے نا؟''

اُس نے مایوسی سے کہا، ''بستر پہ ہوں۔''

''کچھ وقت کی بات ہے۔'' میں نے بے پروائی ظاہر کی۔

''کچھ بات ہوئی ڈاکٹر سے؟''

''کیسی بات؟... مطمئن ہیں وہ۔''

''دن کا پوچھتا ہوں۔''

ابھی صبح تو اسی بات پر اس سے چخ چخ ہوئی تھی۔ وہ پھر وہی رٹ لگا رہا تھا۔ ''میں نے نہیں معلوم کیا۔'' میں نے صاف کہا، ''وہ کیوں روکیں گے زیادہ، جب سمجھیں گے، خود ہی بتا دیں گے۔''

اس کی پیشانی پر انتشار کے آثار نمودار ہوئے، لیکن وہ چپ رہا۔

''کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔'' موقع دیکھ کے میں نے دھیرے سے کہا۔ قریب موجود سیورین، بہلول سے زیادہ متعجب ہوئی، چونکی سی ہوئی۔

''کون...؟ کون ہے رے؟'' بہلول کا دماغ خوب کام کر رہا تھا۔ میرے لیے یہ طمانیت کی علامت تھی۔ ناک چڑھا کے کہنے لگا، ''آ گئے حرام کے...''

''ہاں، لیکن کوئی اور بھی ہے۔''

''بلیا تو نہیں ہے؟'' وہ بری طرح تلملا گیا۔

میں نے سیورین کو اشارہ کیا کہ وہ باہر کھڑے لوگوں کو اندر لے آئے۔

وہ منظر دیدنی تھا، کاش ڈاکٹر رائے بھی موجود ہوتا اور دیکھتا کہ آدمی سے آدمی کا رشتہ کیسا ہوتا، کیسا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے بہلول کا پلنگ گھیر لیا۔ کوئی اُس کے ہاتھ چومتا، کوئی پیر پکڑ تا، پیروں پر سر رکھتا۔ انھوں نے بہلول کا بستر پھولوں سے بھر دیا۔ میدا کا تو برا حال تھا، جنون سا طاری تھا اُس پر۔ ''کا ہے اُستاد ایسا کا ہے کو ہوا۔ ہمیں پتا نہیں۔ تم کو تو سیدھے ہمرے پاس، اپنے داس کے پاس آنا چاہیے تھا۔'' اُن میں صرف جامو ہی کسی حد تک تھما ہوا تھا۔ بہلول کو سلام کرکے اور اس کے سینے سے لگ کے میرے پاس آ کھڑا ہوا۔ کمرے میں ہر طرف پھولوں کی پتیاں بکھر گئی تھیں۔ بہلول ہر ایک سے حال پوچھتا رہا۔ گلے شکوے، تھپکیاں، تسلیاں، دعائیں، تمنائیں، ہر کوئی حکم سننے کا آرزومند۔ اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بہلول کو اُٹھا کے کھڑا کر دیں، اس کی ساری تکلیف اپنے اندر جذب کرلیں۔ دیر ہو گئی تو میں نے جامو کو ٹوکا کہ اتنا ہی کافی ہے۔ مجھے خدشہ تھا، اپنے تجسس میں ڈاکٹر رائے آ گیا تو کمرے کا حال دیکھ کے بہت ناراض ہوگا۔

جامو نے سب کو وہاں سے ہٹا دیا۔ سیورین بھی پھیلی پھیلی آنکھوں سے اُن کی بے قراریاں دیکھتی رہی تھی۔ میں نے فرش پر پڑی ہوئی پتیاں سمیٹنے کی کوشش کی تو سبھی میرا ہاتھ بٹانے لگے۔ شاخ سے جدا ہو کے پھول کیسا بکھر جاتا ہے، بے وجود سی ہو جاتا ہے، کیوں کہ وجود تو انضباط سے عبارت ہے۔ ہم نے بہ عجلت بہلول کے بستر سے پتیاں چن لی تھیں۔ اُدھر سیورین کمرا صاف کرنے والی ملازمہ لے آئی۔ منٹوں میں اُس نے فرش پہلے جیسا کر دیا۔ اور وہی ہوا، جس کا مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ملازمہ کمرا صاف کرکے گئی تھی کہ کسی نے آ کے ڈاکٹر رائے کے آنے کی اطلاع دی۔ میں نے اُن سے منت کی کہ اب وہ سارے کمرے سے چلے جائیں۔ کوئی بھی جانا نہیں چاہتا تھا۔ بہلول کی مرضی بھی نہیں تھی۔ اِس میں کچھ وقت صرف ہو گیا، اور ڈاکٹر رائے دو مددگار ڈاکٹروں، ایک معمر نرس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ سب نے سٹ پٹاتے ہوئے اُسے سلام کیا، اور ڈاکٹر کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بہلول کے پیر چھو کے وہ بھی

کمرے سے چلے گئے۔ میں بھی اُن کے پیچھے باہر آ گیا۔

ڈاکٹر زیادہ وقت اندر نہیں ٹھہرا۔ وہ سارے کمرے کے باہر سبزہ زار کے فرش پر بیٹھ گئے تھے۔ ڈاکٹر کو دیکھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے، ہاتھ باندھے اور سر جھکائے ہوئے۔ ڈاکٹر اُن کے پاس ہی آ گیا اور لمحوں تک کچھ سوچتا اور جلتی بجھتی نظروں سے انھیں دیکھتا رہا۔ اُس کا چہرہ کبھی تمتما اُٹھتا، کبھی ماند پڑ جاتا۔ وہ مجھ سے مسلسل انگریزی میں بات کرتا تھا لیکن اُس وقت خاصی بے اعتنائی سے ہندوستانی میں مخاطب ہوا، "آج ات ہی .. سمجھے ابھی اسے آرام چاہیے۔"

اس مختصر کلام کے بعد اُسے چلے جانا چاہیے تھا کہ اُس کے ساتھی ڈاکٹر منتظر کھڑے تھے۔ وہ موجود رہا۔ میں نے مناسب جان کے زورا اور جامو کی طرف انگلی اُٹھائی۔ "یہ دونوں کلکتے سے آئے ہیں۔"

وہ ایک بیدار مغز، دقیقہ رس شخص تھا، میرا مدعا بھانپ گیا۔ "رات میں تمھارے ساتھ صرف ایک ہی آدمی یہاں ٹھہر سکتا ہے، رات کو صرف تمھی۔" اس نے جیسے کوئی حکم صادر کیا، اور فوراً ہی وضاحت کی۔

"ملاقات کے اوقات میں کوئی پابندی نہیں، لیکن زیادہ لوگ بالکل نہیں۔" یہ کہتے ہی وہ چل پڑا تھا کہ پھر رُک گیا اور میرے عین مقابل ہو کے سرد لہجے میں بولا، "استاد میدا سے کہو، اُسے وکیل صاحب کے خون کا بڑا ملال ہے، وہ اُس نے اُن کے قاتلوں کو ختم کر کے قرض چکا دیا، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا ہے، مگر ابھی وہ خود تو موجود ہے۔"

"جی، جی ہاں۔" میں نے بوکھلا کے کہا۔ میری نگاہیں میدا کی طرف اُٹھ گئیں۔ میدا کا جسم اکڑ گیا۔

"وہ بھی کچھ کم ذمے دار نہیں۔" ڈاکٹر کی گھٹی ہوئی آواز میں بڑی ترشی و تلخی تھی۔ میں کیا جواب دیتا، تکتا کھڑا رہا۔ پھر وہ بھی وہاں نہیں ٹھہرا۔

ڈاکٹر کے جاتے ہی میدا نے پاس آ کے میرا بازو پکڑ لیا اور بے تابی سے پوچھنے لگا، "ڈاکٹر صاحب ہمرے بارے میں کا گٹ پٹ کیو تھے، بھیا؟"

"نہیں نہیں، کچھ نہیں۔" میں نے گڑبڑا کے کہا۔

"ہمرا نام تو لیو تھے بھیا؟"

"بولتے تھے، استاد میدا سے کہو، وہ اسپتال کے باہر لوگ لے کے نہ آیا کرے، اپنے آدمیوں کو باندھ کے رکھے۔" اُسی وقت ہی ایک حیلہ میری سمجھ میں آیا۔ میدا تذبذب سے سر ہلانے لگا۔ میرے جواب سے صاف لگتا تھا، اُس کی تشفی نہیں ہوئی تھی۔

زورا کی خواہش تھی کہ اسپتال میں وہی میرے ساتھ رہے۔ جامو نے اُس کا لحاظ کیا۔ میدا، بدھو دادا، اُن کا تیسرا ساتھی اور جامو واپس چلے گئے۔ کمرے میں ایک نظر جھانک کے ہم دونوں دروازے کے قریب کرسیاں ڈلوا کے بیٹھ گئے۔ زورا کے پاس حالِ دل بیان کرنے کے لیے ایک انبار تھا۔ سلما کو فیض آباد چھوڑ کے اور کچھ عرصے وہاں قیام کر کے وہ اور جمرو کلکتے چلے گئے تھے۔ کہتا تھا، فیض آباد سے نکلنے کو جی نہیں کرتا تھا، مگر جمرو کی وجہ سے اُسے جانا پڑا۔ اُس نے طے کر لیا تھا، بھِکُل سے منت کر کے وہ مستقل طور پر فیض آباد رہنے کی اجازت لے گا اور زندگی حویلی کی نذر کر دے گا۔ کلکتے میں بھی سب اُس کا خیال رکھتے تھے، مگر اُس کا دل فیض آباد میں اٹکا ہوا تھا، جہاں زریں تھی جس کے پاس بہت چھوٹا سا بچہ کہہ رہا تھا کہ بیشتر وہ فیض آباد کے ڈیرے ہی پر رہا تھا۔ ... روز شام کو حویلی جاتا تھا۔ زریں اُسے روک لیتی اور رات کا کھانا کھلائے بغیر جانے نہیں دیتی۔ دوپہر کو بھی وہ اُس کے اور جمرو وغیرہ کے لیے اتنا کھانا اُسے بھیج دیتی کہ کئی لوگ سیر ہو کر کھا لیتے۔ زریں کے پاس جا کے اُسے لگتا تھا جیسے اُس کی کھوئی ہوئی ماں اور بہن مل گئی ہیں۔

پہلی بار زورا نے مجھے اپنے بارے میں بتایا کہ کبھی بڑودا شہر میں اُس کا گھر تھا۔ اُس کی ایک بہن نرمل اُس سے کوئی آٹھ نو برس بڑی تھی۔ پندرہ سال کی ہوئی تو ایک دن اُس کا شرابی جواری باپ بیٹی کو گھر سے لے گیا۔ واپس آیا تو بیٹی ساتھ نہیں تھی۔ ماں نے بہت دُہائیاں دیں، باپ نے کچھ اتا پتا نہیں دیا۔ بیٹی کی تلاش میں ایک روز ماں گھر سے نکل گئی اور کبھی واپس نہیں آئی۔ اُس وقت زورا کی عمر سات آٹھ برس تھی۔ باپ دن بھر شراب میں ڈوبا رہتا۔ پھر زورا بھی گھر سے نکل کھڑا ہوا اور بے ٹکٹ سفر کرنے پر پکڑا گیا۔ حوالات میں سپاہیوں نے اُس سے بڑی زیادتیاں کیں۔ نئے بھرتی ہونے والے کسی نوجوان افسر کو اُس پر ترس آیا

تو کہیں زورا کی جان چھوٹ پائی۔ پھر وہ واپس گھر نہیں گیا، دوبارہ بے ٹکٹ گاڑی میں سوار ہوا، اس بار بچ رہا اور بمبئی پہنچ گیا۔ بمبئی میں ٹھوکریں کھاتا، اذیتیں سہتا رہا۔ بمبئی شہر کسی پناہ گاہ اور کمین گاہ کی طرح ہے۔ ہر ایک کو اپنے دامن میں سمو لیتا ہے۔ زورا نے ماں بہن کی تلاش جاری رکھی اور مختلف شہروں کے بازار، گلی کوچے چھان مارے، نہ اُس کی ماں مل پائی نہ بہن۔ باپ کا معلوم نہیں کیا ہوا۔ اُس نے پلٹ کے باپ کی خبر نہیں لی۔ بمبئی میں اُس نے طرح طرح کے کام کیے، مزدوری کی، چھوٹی موٹی چوریاں، جیب تراشی اور چاقو بازی کرنے لگا۔ آخر بڑے یہ دادا بن گیا۔ کہہ رہا تھا، اُس کی ماں یا بہن ہوتی تو زریں ہی کی طرح پیش آتی۔ زریں تو بہت سی ماؤں کی ایک ماں اور بہت سی بہنوں کی ایک بہن ہے۔

زورا کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال کے بے کار کی تسلی دینی چاہی۔ ہر آدمی ہی شاید بہت بہروپ ... ہوتا ہے۔ دیکھو تو زورا کی طرح ہٹا کٹا، چلتا پرزہ، ... ہوتا، اندر سے کیسا ٹوٹا پھوٹا، کتنا چھلنی ہے۔

... دوپہر ہو چکی تھی۔ زورا کی باتوں میں کچھ احساس ہی نہیں ... نرس سیورین کے باہر آنے جانے کا۔ بعد کو اُس نے بتایا کہ وہ کئی بار باہر آئی تھی اور اُس نے ہمیں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا کہ جانے کب کے بچھڑے ہوئے ہیں۔ پھر اُس کے اندر بلانے پر ہمیں اُٹھنا پڑا اور یہ دیکھ کے حیرت ہوئی کہ ... کے آگے رکھی ہوئی لمبی میز پر کھانا سجا ہوا ہے۔ سیورین میں بھی زریں کی بڑی خوبی تھی۔ اُسے خیال تھا کہ ہم نے دوپہر کا کھانا کہاں کھایا ہوگا۔ پوچھے بغیر اُس نے یہ اہتمام کیا تھا۔ ہم نے اُسے بھی ساتھ بٹھا لیا۔ زورا کی وجہ سے وہ جھجک رہی تھی، میرے اصرار پر ساتھ بیٹھ گئی۔ ایسا پُرتکلف کھانا نہیں تھا، اسپتال کا سیدھا سادہ، ہلکا پھلکا، وہ تین شریک ہوں تو آدمی کچھ کھا پی ہی لیتا ہے۔ ہم نے ہر ممکن احتیاط کی کہ ذرا سا شور نہ ہو اور بھِکُل کے آرام میں خلل نہ پڑے۔ وہ دوپہر کے کھانے اور تھوڑا کچھ لینے کے بعد وہ نیند میں ڈوب چکا تھا۔

ڈاکٹر رائے نے مجھ پر پابندی عائد کر دی تھی۔ زورا موجود تھا، لیکن شہر کے دگرگوں حالات میں اُس اجنبی کا تنہا باہر نکلنا اچھا نہیں تھا۔ میرے کپڑے میلے اور شکستہ ہو گئے تھے، مجھے

انداز طعام

ایک اعرابی (دیہاتی) کسی خلیفہ کے دسترخوان پر آیا۔ اُس کے سامنے بکری کا بھنا ہوا گوشت رکھا گیا۔ اعرابی نے کھانے میں بڑی تیزی دکھائی۔ خلیفہ نے اعرابی سے کہا، "میں دیکھ رہا ہوں، تم ایسے غصّے سے کھا رہے ہو جیسے بکرے کی ماں نے تمھیں سینگ مارا ہو۔"

اعرابی بولا، "میں آپ کو دیکھ رہا ہوں، آپ ایسے پیار سے کھا رہے ہیں جیسے اس کی ماں نے آپ کو دودھ پلایا ہو۔"

"ادب العجمین" ... مفتی محمد ...

بڑی اُلجھن ہو رہی تھی۔

پھر ایک تدبیر ذہن میں آ گئی۔ زورا کو وہاں چھوڑ کے میں مرکزی عمارت تک چلا گیا اور چھ گلا کو اپنی مشکل بتائی۔ وہ ایک چست و چابک دست آدمی تھا۔ کچھ وہ ڈاکٹر رائے سے میرے خصوصی مراسم کا گواہ بھی تھا۔ میری خوش نودی بالواسطہ ڈاکٹر کی خوش نودی تھی۔ اُس نے میری گزارش توجہ سے سنی اور ہوٹل کے منیجر کے نام مجھ سے ایک رقعہ لکھوایا۔ رقعے میں درخواست کی گئی تھی کہ بھائی کی بیماری کی وجہ سے میرا ہوٹل آنا ممکن نہیں ہو رہا۔ منیجر میرے لیے محفوظ کمرے میں رکھا کپڑوں کا بکسا حاملِ رقعہ کے سپرد کر دے تو بڑی عنایت ہو۔ ہوٹل میں بطور امانت خاصی بڑی رقم میں نے محفوظ کرائی تھی، سو ہوٹل کے منیجر کو کوئی اعتراض یا شبہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے لکھا تھا کہ منیجر چاہے تو تصدیق کے لیے ہوٹل کے کسی کارندے کو میرے فرستادے کے ساتھ بھیج دے کہ رقعہ میرا ہی نوشتہ ہے اور بکسا میرے ہی حوالے کیا گیا ہے۔ چھ گلا نے اپنا کوئی ماتحت ہوٹل بھیج دیا اور وہ ہوٹل کے کارندے کے ساتھ ہی واپس آیا۔ کارندے نے مجھ سے بکسے کی رسید لینا بھی لازم جانی۔

کئی دن بعد لباس تبدیل کرنے کی صورت پیدا ہوئی۔ نہا دھو کے اور لباس بدل کے آدمی کیسا تیا نیا ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد جیسے ہی شام چار بجے مریضوں سے ملاقات کا وقت شروع ہوا، جامو اور میدا آ گئے۔ اب کی اُن کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا۔ بھِکُل غفلت میں تھا۔ وہ باہر بیٹھے، منتظر رہے۔ ملاقات کا وقت ختم ہوا چاہتا تھا کہ سیورین نے انھیں اندر بلا لیا۔

بخشل جاگ چکا تھا۔ سیورین نے اُسے جگا دیا تھا۔ جامو اور حمیدا اُس کے گرد بیٹھے محبتیں نچھاور کرتے رہے۔ ٹھیک پانچ بجے ملاقات کا وقت ختم ہو جانے کا اطلاعی گھنٹہ بج جانے پر سیورین نے انھیں اُٹھا دیا۔ چند منٹ ہی انھیں بخشل کے پاس بیٹھنے اور اپنے گرامی قدر کی دل جوئیاں کرنے کا موقع مل سکا۔ زورا کو بھی وہ ساتھ لے گئے۔ ڈاکٹر رائے کے حکم کے مطابق زورا رات تک میرے ساتھ رہ سکتا تھا، لیکن شہر کی سڑکوں پر پولیس دندنا رہی تھی۔ رات کو زورا کا اکیلے اڈے تک جانا کسی پیچیدگی کا سبب بن سکتا تھا۔

بخشل کو پھر نیند نہیں آئی اور اُس کی فرمائش سیورین سے رد نہیں کی گئی۔ بستر سے اُٹھ کے بخشل نے چند پھیرے کمرے کے اندر لگائے، پھر باہر نکل گیا۔ ابتدا میں وہ دائیں بائیں ہم دونوں کے کندھوں پر ہاتھ جمائے چلتا رہا اور چند قدم بعد ہمارے سہارے سے دست کش ہو گیا۔ میں اور سیورین ساتھ ساتھ رہے۔ خود اُسے احتیاط کا احساس تھا کہ سیورین کو عاجزی نہیں کرنی پڑی۔ صبح کی طرح وہ دروازے کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دن اپنا سفر تمام کر رہا تھا۔ دھوپ سورج کے پاس لوٹ رہی تھی۔ اب سائے ہی رہ گئے تھے۔ سورج کے سائے بھی کیسے روشن ہوتے ہیں۔ مغرب تک بخشل باہر بیٹھا آتی جاتی شام کا نظارہ کرتا رہا، اور خود ہی اُٹھ گیا۔ آدمی بھی کیا تماشا ہے۔ آرام کا مشتاق ہوتا ہے اور آرام سے تنگ بھی آ جاتا ہے۔

اندھیرا ابھی دُور تھا کہ یمی آ گئی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سیورین کچھ بدلی بدلی سی ہے، کھوئی کھوئی نظر آ رہی ہے۔ دن میں بارہا اُس کا سامنا ہوا، لیکن آج اطمینان سے بیٹھنے کا کوئی وقت ہی نہیں ملا۔ یمی کے آ جانے پر اُس نے لباس تبدیل کر لیا تھا، لیکن وہیں موجود رہی اور اُس سے کوئی بات نہ ہو پائی۔ اِس خیال سے کہ اُس کی ژولیدہ ذہنی کا سبب کچھ تو معلوم ہو، وہ جانے لگی تو میں اُس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا اور اُسے روک کے پوچھا کہ اُس کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ وہ کچھ بدحواس ہو گئی، جھکی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ کے ذرا گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی، ”کیوں، مجھے کیا ہوا؟“

”چہرے پر وہ روشنی نہیں ہے۔“

”کیسی روشنی؟“ وہ پھٹی پھٹی آواز میں بولی۔

”جو تم سے مخصوص ہے، روشنی، تازگی، شگفتگی۔“

اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی، آزردہ مسکراہٹ۔ مصنوعی مسکراہٹ بڑی زہر لگتی ہے۔

”تھکی تھکی سی لگتی ہو۔“ میں نے نرمی سے پوچھا۔

”شاید۔“ وہ ڈوبی ڈوبی آواز میں بولی۔

”یہ کوئی اور بات ہے؟“

”کوئی بات نہیں، کیا بات ہوتی۔“

”بہرحال... اب گھر جا کے ساری رات آرام کرنا، اور سنو! صبح ناشتے وغیرہ کی زحمت نہ کرنا۔“

”کیوں، پسند نہیں آتا کیا؟“ اُس کا لہجہ سراسیمہ تھا۔

”نہیں، یہ بات نہیں، مگر تم اہتمام زیادہ ہی کرتی ہو۔“

”کچھ بھی تو نہیں، مجھے تو اچھا لگتا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ مجھے بہرطور اُس کی خاطر عزیز تھی۔ وہ ہر اعتبار سے ایک نفیس لڑکی تھی، شائستہ، نازک طبع، سادہ و معصوم اور دل کش بھی بے پناہ۔ دوشیزگی کی عمر میں جو کچا پن ہوتا ہے، اور حیرانی سی، اور شرمندگی سی اُس کے سراپا کا خاصہ تھی۔ اتنے دنوں کے ساتھ میں آدمی ایسا ڈھکا چھپا نہیں رہتا، پھر اُس نے بخشل کا بہت خیال رکھا۔ دن بھر کام کرنے کے بعد وہ ضرور تھک جاتی ہوگی، کام بھی کیسا! بخشل جیسے مریض کی نگرانی، ہر وقت نگاہ رکھنے کا۔ فرض شناسی، دیانت ہے، اور یہ دیانت کاری بہت تھکاتی ہے۔ گھر پہنچنے کے بعد وہ ناشتے کے لیے فکرمند ہو جاتی ہوگی۔ یہ سوچ کے میں نے حجت سے اجتناب کیا کہ بہت سی فکروں سے دل کی طمانیت کا پہلو بھی نکلتا ہے۔

جاتے وقت اُس کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔ میں اُسے راہ داری کے سرے ہی پر رخصت کر سکتا تھا۔ آگے اُس کی ہمرہی بے وجہ و مناسب نہیں تھی۔ وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی دائیں جانب مڑ گئی اور نظروں سے دُور ہو گئی۔ کسی کے اوجھل ہو جانے پر اُس کی کمی کے احساس سے مراد ہے کہ وہ شخص نقش گری و اثر پذیری کی نادر صفات سے آراستہ ہے۔ ورنہ کتنے بے شمار روز اوجھل ہوتے اور سامنے آتے رہتے ہیں، جیسے کوئی وجود ہی نہ ہو اُن کا۔

اُس رات ڈاکٹر رائے کے نہ آنے پر مجھے تعجب ہوا۔ اُس کے بجائے اُس کے مددگار دو اور ڈاکٹر رات کے دورے پر آئے۔ میں نے اُن سے ڈاکٹر کے نہ آنے کی وجہ جاننی چاہی تھی، اُنھوں نے خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ میں نے یمی سے پوچھا تو اُس نے بھی خاص توجہ نہیں دی، بے نیازی سے بولی کہ کہیں اور مصروف ہو سکتے ہیں، وہ اپنا کام سمجھتے ہیں کہ کب کہاں اُن کی کس قدر ضرورت ہے۔

مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ جیسا کہ دوپہر میں نے ڈاکٹر رائے سے شبہ ظاہر کیا تھا کہ کہیں اُس نے میرے بارے میں نظرِ ثانی تو نہیں کی ہے، گو اُس نے تردید میں ذرا سا بخل نہیں کیا تھا، مگر اُس وقت اُس کے نہ آنے سے پھر وہی وہم کھٹکنے لگا تھا۔ میں نے اُس سے یہ بھی تو کہا تھا کہ جو بھی ہے، یہی کچھ ہے میرے پاس۔ میں نے اُس سے کیا چھپایا ہے۔ کوئی بے کلی سی رہی اور اُس کی تشریح و تصریح سے میں قاصر رہا۔

یمی کے التفات کی فراوانی وہی تھی۔ بخشل کے معمولات کی ادائی کے بعد مجھ سے پوچھے بغیر اُس نے کھانا منگوا لیا اور میرے ساتھ ہی بیٹھی رہی۔ میں نے دوبارہ ڈاکٹر کے بارے میں اپنی تشویش ظاہر کی تو اُس نے مجھے ٹال دیا۔ وہ ایسی ہی تھی ... عمر رسیدگی کا خوب فائدہ اُٹھاتی تھی۔ ڈانٹ ڈپٹ کرنی ... تو اُس کے ہاں ریشم بھی بہت تھا۔ اُس کی تلخی میں بڑی ... کہنے لگی کہ کسی بات پر واقعی ڈاکٹر تم سے کشیدہ ہے تو ... مطلب نہیں کہ وہ تمھارے بھائی کی طرف سے غافل ... یا اُس کے کارِ مسیحائی میں بل آ سکتا ہے۔ میں نے یمی سے نہیں کہا کہ اِس حقیقت کا مجھے علم ہے، لیکن یہ تو میرا اپنا معاملہ ہے۔ مجھے تو ہلکا سا بھی ایک امکان ویران کیے ہوئے ہے کہ میں نے کب اور کہاں تجاوز کیا ہے، مجھ سے کون سی لغزش سرزد ہو گئی ہے۔ یمی کی ہدایت پر میں بستر پر آ کے دراز ہو گیا۔ میری آنکھیں کھلی دیکھ کے وہ کل کا وظیفہ دُہرانے لگی۔ میں نے اُسے بہت منع کیا، نہیں مانی۔ میرے سرہانے بیٹھ کے سر دبانے لگی۔ اُس کی انگلیوں سے شفقت ٹپک رہی تھی۔ پھر میں نے بھی وہی کیا، آنکھیں بند کر لیں۔ تب کہیں وہ بستر سے اُٹھی، پھر جانے کس وقت میرے منتشر حواس پر رات غالب آ گئی۔

اور صبح جلد ہی آنکھ کھل گئی۔ یمی نے چائے پلائے بغیر مجھے باہر نکلنے نہیں دیا۔ دیر تک میں ننگے پاؤں سبزہ زار پر ٹہلتا رہا۔ سبزے میں شبنم گھلی ہوئی تھی اور اُس کا گداز دوچند ہو گیا تھا۔ سورج رفتہ رفتہ زمین پر اُترتا رہا۔ سورج کو زمین کی توفیق کا اندازہ ہے، سو وہ ایک حد پر آ کے رُک جاتا ہے۔ کسی دن اُس نے اپنا معمول بدل دیا تو زمین کا کیا بنے گا۔ نام و نشان ہی شاید باقی نہ رہے، اور کسی دن سورج نے زمین سے منہ پھیر لیا تو بھی زمین پر اندھیرے کے سوا کیا رہے گا۔ یوں زمین کا اپنا کیا ہے، اُس کی زندگی تو سورج کی مرہونِ منت ہے۔ میٹھے پانی اور نرم و لطیف ہوا کی کتنی ہی افراط ہو، سورج کی اعانت کے بغیر سب اکارت ہے۔ جب بھی تنہا چہل قدمی کرو، خوابیدگی کے مانند آدمی کو خیال و خواب پر قابو نہیں رہتا، خیال و خواب اُمڈے چلے آتے ہیں۔

صبح کے کاموں پر اسپتال کے کارندوں کی آمد و رفت جاری رہی، اور دن کھلتا گیا۔ پھر بائیں جانب، راہ داری سے سیورین طلوع ہوتی دکھائی دی۔ شہابی رنگت کی ساڑھی میں سجی ہوئی، کھلی کھلی، نئی نئی سی۔ اُس کے نمودار ہو جانے کی فرحت، رات اُس کے رخصت ہو جانے کی خلش سے کہیں بیش تھی۔ سیورین آج اِس لیے جلدی آ گئی تھی کہ ڈاکٹروں کی آمد سے پہلے ہم فراغت سے ناشتا کر سکیں۔ میں نے اُسے مشورہ دیا کہ کسی وقت ڈاکٹر کے وارد ہو جانے کا دھڑکا تو برقرار رہے گا، اور ایک ہیجز دھیڑ رہے گی، ڈاکٹر کو کمرے میں بسی ناشتے کی مہک پر مُنھ بنانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ سیورین کو اُتنی ہی بے چینی ہوگی جتنی کسی تخلیق کار کو اپنی تازہ تخلیق کے اظہار کی، مگر وہ راضی ہو گئی، میں اصل بات اُسے کیا بتاتا کہ مجھے تو ڈاکٹر رائے کی آمد کا انتظار ہے، دیکھتے ہیں، وہ اِس وقت بھی آتا ہے کہ نہیں۔ اِس کش مکش میں بے لطفی کیا، ڈھنگ سے سیورین کے لطف و کرم سے انصاف نہ کیا جا سکے گا۔

نو بجے، پھر ساڑھے نو۔ بخشل بستر پر بیٹھا ہوا تھا اور میری نگاہیں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ دس بجنے میں ابھی دیر تھی کہ باہر سے مانوس چاپوں کی گونج سنائی دی۔ میں نے شکر کی سانس لی۔ وہ ڈاکٹر رائے ہی تھا جو اپنے ساتھی ڈاکٹروں اور نرسوں کے ایک دستے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور ہم تینوں کے سلام کا سرسری جواب دیتا سیدھا بخشل کے پاس چلا گیا۔ نیم دراز

بختل کی بحالی پر اُس نے مسرت خوشی سے داد دی اور بختل سے طرح طرح کے سوالات کرتا رہا۔ اُس کے ساتھی نوجوان اور اُدھیڑ ڈاکٹر بھی۔ پھر ڈاکٹر رائے بیش تر اُنھی سے مخاطب رہا۔ وہ طبّی اصطلاحی زبان میں بختل کے مرض کی نوعیت اور علاج کی نزاکت کے رموز و نکات اُنھیں تعلیم کرتا رہا تھا۔ اِس دوران سیورین نے میرے قریب آ کے سرگوشی کی کہ باہر ملاقاتی موجود ہیں اور اُنھیں روک دیا گیا ہے۔ میری نظر گھڑی پر گئی۔ دس سے چند منٹ اوپر ہو رہے تھے۔ باہر جا کے میں اُن سے ملنے کا ارادہ کرتا ہی رہ گیا۔ ڈاکٹر نے بختل کو بستر سے اُٹھا دیا تھا۔ بختل اِس فیاضی کا منتظر تھا۔ تقریباً اُچھل کے ایک دم فرش پر آ گیا۔ "میں اب ٹھیک ہوں ڈاکٹر صاحب۔" اُس نے بلند آواز میں کہا۔

ڈاکٹر رائے نے مسکرا کے سر ہلایا اور ہندستانی میں بولا، "وہ تو میں بھی دیکھتا ہوں، لیکن ابھی تم کو استاد از یادہ نہیں، سمجھے!"

اُستاد کے لقب سے بختل کے چہرے پر حیرانی ہویدا ہوئی۔ دوسرے لمحے ڈاکٹر کو بھی شاید اپنی بے محل بے ساختگی کا احساس ہوا اور وہ خفیف سا نظر آیا۔ یا شاید مجھے محسوس ہوا کیوں کہ اُس نے کوئی وضاحت ضروری نہیں سمجھی اور بختل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے دروازے کی طرف لوٹ پڑا۔ اُس سے بات کرنے کا مجھے موقع ہی نہیں مل سکا۔ کچھ اُس نے بھی کمرے میں میری موجودگی کا خیال نہیں کیا۔ دانستہ، یا نادانستہ میں بھی پھر اُس کے تعاقب میں کمرے سے نکل گیا۔ باہر کھڑے جامو، زورا، میدا اور برجو ڈاکٹر کی تعظیم میں ایک طرف سمٹ گئے تھے۔ اُنھیں دیکھ کے ڈاکٹر ٹھٹکا تھا، مگر فوراً ہی آگے چل دیا۔ اُس نے اُن کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ جیسے اُس نے اُنھیں دیکھا ہی نہ ہو۔ میں نے تیز قدموں سے اُسے جا لیا اور اُسے رُکنا پڑا۔

"ہاں۔" کسی بات کے، جو تک یاد آ جانے پر جو عالم ہوتا ہے، اُس نے چونک کر پوچھا۔ "کیسے ہو؟"

"آپ کیسے ہیں؟" میں نے کٹی کٹی آواز میں کہا۔

"مجھے ایک مریض کو دیکھنے کی عجلت ہے۔" اُس کے ماتھے پر شکنیں اُبھر آئیں۔ اُس کے لہجے سے بھی فکر مندی عیاں تھی۔

میں خاموش رہا۔

"تم آ ؤ گے اُس طرف؟" اُس نے رکی انداز میں پوچھا۔

"کہاں؟"

"میری طرف، اُدھر دفتر میں۔"

"کب آنا ہے؟"

"جب، جب تم چاہو۔"

"ابھی آ جاتا ہوں، یا آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔"

"ابھی نہیں... تھوڑی دیر بعد... میں نے بتایا نا۔ ایک مریض کو دیکھنا ہے، اُس کی حالت نازک ہے۔" اُس کی آواز میں تشویش تھی، لمحے بھر کے توقف کے بعد کہنے لگا، "ارادہ تھا، فارغ ہوتے ہی تمھیں بلا لوں گا۔"

مجھے ہمت ہوئی، ورنہ میں نے پیچھی، بل کہ شکایتی آواز میں کہا، "رات بھی آپ کا انتظار..."

وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا اور بولا، "وہیں بات ہو گی۔"

وہ چلا گیا۔ میں اُس کے چہرے اور لہجہ و آواز سے کچھ اخذ کرنے کی اُدھیڑبن میں وہیں کھڑا رہا۔

بختل اُن چاروں کے درمیان باہر ہی موجود تھا۔ دھوپ سے ابھی سبزہ زار کا بڑا حصّہ محفوظ تھا۔ سیورین نے وہیں کرسیاں لگوا دی تھیں۔ میں اُن کے پاس پہنچا تو سارے میری جانب متوجہ ہو گئے۔ میرا دماغ بھٹکا ہوا تھا۔ اُن کے سوالوں کے جواب میں ہوں، ہاں ہی کرتا رہا۔ پھر کسی نے باہر آ کے کوئی لحاظ کیے بغیر اعلان کیا کہ ناشتا لگا دیا گیا ہے۔ میں نے ازراہِ وضع اُن سے بھی پوچھا۔ سب نے انکار کر دیا تو میں نے زور بھی نہیں دیا۔ سیورین میرے انتظار میں کمرے میں ٹہل رہی تھی، آج بھی وہ باز نہیں آئی۔ وہی اہتمام تھا۔ ابھی کو بھی اُس نے روکا ہوا تھا۔ اُدھر جلد سے جلد ڈاکٹر رائے کی طرف جانے کی فکر، اِدھر سیورین کی دل شکستگی کا خدشہ۔ وہ دونوں، توشے میرے آگے رکھتی رہیں اور میں نے اُنھیں مایوس نہیں کیا۔ داد و تحسین مردنا ہو تو بہت گراں ہوتا ہے۔ سیورین نے لطیف اور خوش ذائقہ چیزیں بنائی تھیں۔ نفاستِ طبعی اور جسم و جاں میں رچی ہوئی ہو تو آدمی کے ہر طور، ہر کام، ہر بات میں نظر آتی ہے۔ میری مدح سرائی سے سیورین گلنار ہوتی رہی۔ خوشی میں دل کش آدمی کی دل کشی و دل آویزی سوا ہو جاتی ہے۔

کچھ وقت ناشتے میں گزر گیا۔ گیارہ بجے عیادت کاروں کا وقت تمام ہو جاتا تھا۔ بہ ہر حال کچھ وقت جامو، میدا وغیرہ کے پاس بیٹھنا لازم تھا۔ میدا مچل رہا تھا کہ اسپتال سے فارغ ہو جانے کے بعد بختل چند دن اڈّے پر قیام کرے۔ "ہاں رے، دیکھیں گے۔ ابھی اِدھری سے چھٹی تو کھلے۔" بختل اُکتائی آواز میں بولا۔

"ناہیں استاد۔" میدا بچّوں کی طرح ضد کرنے لگا۔ "اُدھر تو جانو، اب کھلے ہی کھلے، پر ہمرے سے ابھی سے پکّا کرو۔"

"بولا نا، آئیں گے رے اُدھری۔" بختل نے معاملہ بھی اختیار کی۔ "اپنا ٹھکانا ہے وہ بھی۔"

"ای ہوئی نا بات اُستاد!" میدا ہاتھ نچا کے بولا۔

گیارہ بجے سے پانچ منٹ پہلے گھجر بج اُٹھا۔ آخری گھجر پہ اُنھیں اُٹھ ہی جانا تھا۔ میں اُن کے جانے ہی کا منتظر تھا۔ بختل ابھی باہر بیٹھے رہنا چاہتا تھا۔ زورا اُس کی خدمت میں حاضر ہی تھا۔ ڈاکٹر رائے کی طلبی پر اُس کے پاس جانے کا عذر کر کے میں نے مرکزی عمارت کا رُخ کیا۔ مجھے کچھ دیر اُس کے پاس بیٹھنا پڑا، لیکن کچھ ہی دیر بعد مجھے ڈاکٹر کے کمرے میں طلب کر لیا گیا۔ اُس کے چہرے سے ملال مترشح تھا۔

"سب ٹھیک تو ہے ڈاکٹر صاحب؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"وہ بے چارہ بے کار کی جنگ کر رہا تھا، آخر ہار گیا۔" ڈاکٹر اُسی سے بولا۔

"ہار تو آدمی کا مقدر ہے، آخر ہار ہی جاتا ہے۔"

"مگر اُسے اور وقت مل سکتا تھا، اگر وقت پر یہاں آ جاتا۔"

میں نے رسمی افسوس کا اظہار کیا۔

"خیر تم بتاؤ، یہاں تو روز ہی یہ تماشا ہوتا ہے۔"

"آپ رات نہیں آئے۔" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"یہ اسپتال ایک بڑا ادارہ ہے۔ یہاں بہت لائق اور تجربے کار ڈاکٹر ہیں۔" اُس کا لہجہ جھنجلایا ہوا تھا۔ "میں نہ ہوں گا، تب بھی یہ چلتا رہے گا۔"

"مگر کوئی بات تو ہے جو لوگ آپ کے پاس کھنچے چلے آتے ہیں۔ لوگ آپ سے ہی اُمیدیں کیوں رکھتے ہیں؟ اِس لیے کہ یہ اُمیدیں آپ ہی کی دی ہوئی ہیں۔" میں طے کر کے آیا تھا، اِس بار کھل کے بات کروں گا۔ میں نے کہا، "میری خوش گمانی ہے، آپ نے مجھے بڑی عزت دی ہے۔ دوسروں سے کچھ زیادہ ہی۔ سو آپ سے کچھ سوا کی توقع بے جا نہیں ہے۔"

اُس نے سکون سے میری بات سنی، چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، اور نرم روی سے بولا، "رات کو ذرا مصروفیت رہی۔ آئی جی ملنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا، یہاں کیا بات ہو پائے گی، گھر پر بلا لیا۔ رات کا کھانا پھر ہم لوگوں نے ساتھ ہی کھایا۔"

میں نے تجسّس ظاہر نہیں کیا حالاں کہ یہ سن کے میری رگیں کھنچنے لگی تھیں۔ اُس نے خود ہی بتایا، بل کہ تکرار کی کہ آئی جی اپنے افسرانِ بالا کے رویّوں سے بہت آزردہ ہے۔ اِدھر اکبر علی خاں کے بھائی سکندر علی خاں کی شہر میں موجودگی سر پر لٹکی ہوئی تلوار کے مانند ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومت کے حکام اپنے عالی شان بورڈوں میں بیٹھے حکم پر حکم صادر کر رہے ہیں۔ اُن کی تسلی کے لیے پولیس کی روایتی کارروائیاں جاری ہیں۔ پولیس نے کئی ایسے جرائم پیشہ پکڑ لیے ہیں، بہ ظاہر اِن واقعات سے جن کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ شہر کے اڈّے کے بھی بہت سے لوگ گرفتار کر لیے گئے ہیں، لیکن کہیں سے سراغ نہیں مل رہا۔ کسی جانب کوئی شبہ گزرتا ہے تو ثبوت نہیں ہے۔ ڈاکٹر رائے کہہ رہا تھا کہ آئی جی سے اُس کی ایسی کوئی شناسائی نہیں تھی۔ دوستیاں کرنے کا اُسے وقت ہی کہاں ملتا ہے۔ پہلی مرتبہ جب آئی جی مجھ سے ملاقات کرنے اور ساتھ لے جانے کے ارادے سے اسپتال آیا تھا تو ڈاکٹر سے خاصا متاثر ہو کے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے انکسار کیا، اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن میں تو گواہ تھا۔ اُس کی صاف بیانی، زیرکی، استدلال اور منطقی توجیہات سے کوئی بھی اُس کا اسیر ہو جاتا۔ چناں چہ اِس پیچیدہ اور سنگین صورتِ حال میں آئی جی کو ڈاکٹر رائے کا خیال آنا چاہیے تھا۔ جزرسی اور نکتہ طرازی اپنی جگہ، ڈاکٹر کی طبعی سنجیدگی، متانت، انسانوں سے ہم دردی، چیزوں کی درستی اور تعمیر و اصلاح کی خوبیاں مستزاد ہیں۔ اُس کے بے زبان پر

آ سکے اپنے ان احساسات کا اظہار کہیں بے موقع نہ ہو، کسی حتمی تاثر کے اندیشے میں، میں نے زبان بند ہی رکھی۔

کہنے لگا۔ ''میں نے آئی جی سے کہا، میں تو ایک ڈاکٹر ہوں، لیکن ایک بات بڑی صاف ہے۔ خون ریز وارداتیں ہو چکی ہیں تو ثبوت بھی کہیں موجود ہونا چاہیے۔ ثبوت نہ خانوں میں چھپا ہوا ہے، یا چھپا دیا گیا ہے۔ پولیس کو حوصلہ رکھنا چاہیے کہ ثبوت اتنی آسانی سے مرتا نہیں۔ وہ مرتا نہیں تو دست رس سے کچھ فاصلے ہی پر ہے، کہیں آس پاس، دور و نزدیک۔ پولیس کو واضح طور پر شبہے کے بجائے معین کرنے چاہییں، اور ایک ایک کر کے ان پر تجربہ۔ مفروضے قائم کیے بغیر نتائج کیسے اخذ کیے جا سکتے ہیں، وہ مفروضے قائم کرنے کے بعد ہر قسم کی جراتوں کے لیے آمادگی، کسی رُو رعایت کے بغیر، پولیس کے فرسودہ انداز سے الگ۔''

میرے جسم میں سردی کی ایک لہر آ کے گزر گئی۔

''میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟'' مجھے خاموش دیکھ کے ڈاکٹر نے ڈنک مارتی آواز میں سوال کیا۔

میں نے سٹ پٹاتے ہوئے ہم نوائی کی۔ ''اور کیا کہہ سکتے ہیں آپ۔''

''تمھارے دماغ میں کوئی بات ہو تو بتاؤ۔''

''آپ اور میں بہت کچھ جانتے ہیں، یقیناً پولیس بھی کسی حد تک جانتی ہوگی، لیکن مکمل شواہد کے بغیر کوئی قدم دیواروں سے سر پھوڑنے کے مترادف ہوگا۔''

''اور یہ کیسا لیسا ہے۔'' وہ سلگتی آواز میں بولا۔ ''ہم بہت کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتے۔''

''اوپر رکھی چیز کا حصول دست رس ہی سے ممکن ہے، قامت کی بلندی کے لیے کوئی چیز چاہیے جو ادھر اُدھر موجود نہیں ہے۔ یہی صورت کچھ پولیس کے بھی پیش نظر ہوگی۔''

اُس نے آہ بھری۔ ''رات میں نے سوچا تھا، تمھیں بھی بلا لوں، بیٹا کی بھی یہی خواہش تھی، لیکن شبہ تھا، تمھاری موجودگی آئی جی کو پسند نہ ہو۔''

اُس کے لہجے کی یگانگت اور قربت سے مجھے اپنا غبار چھٹتا محسوس ہوا، کوئی بوجھ سر سے اُتر گیا ہو جیسے۔ ''بیٹا کیسی ہیں؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ٹھیک ہے، اپنے حال میں گم، آئی جی کے جانے کے بعد تمھارا بہت ذکر رہا۔ اِدھر اُدھر کی تصویریں جمع کر رہی ہے تمھیں دکھانے کے لیے۔''

''مجھے بھی انھیں دیکھنے کا تجسس ہے، حالاں کہ یقین ہے بڑی نادر چیزیں ہی ہوں گی۔ قلم، مُو قلم پر اُن کی گرفت کیا خوب ہے۔ روانی، بے ساختگی، پھر خیال اور فکر، اور ان کی نظر، چیزوں کو اپنے زاویے سے دیکھنے اور محسوس کرنے والی نظر۔ ان کی چند تصویریں ہی دیکھ پایا تھا، لیکن اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا مشاہدہ کتنا تیز ہے، مشاہدے کے ساتھ مطالعہ ہو تو دوآتشہ ہے۔ اُن کے ہاں کیسی مشاقی ہے، رنگ برتنے کا ایک سلیقہ اور... اور...''

اُس نے ہاتھ اُٹھا کے مجھے روک دیا۔ ''یہ سارا بچوں کے سامنے کہنا۔ آج تمھیں بلانے کو کہہ رہی تھی۔ لیکن دیکھو، آج نہیں تو کل... وقت تمھارے پاس بھی اب کم ہے۔ تمھارے بھائی کو جلد چھٹی مل جائے گی، اور ظاہر ہے، تم فوراً اُسے گھر سے جانا چاہو گے۔''

اُس کی زبان سے یہ مژدہ سننے کا میں کب سے آرزو مند تھا، بتاتے ہوئے ڈاکٹر کی آواز سست ہو گئی تھی، گویا بیٹی کی پڑی ہو... میں نے اپنی مسرت بہ مشکل خود تک محدود رکھنے کی کوشش کی اور سر جھکا لیا۔

دیر تک اُس پر سکوت طاری رہا۔ جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا، پھر افسردگی سے کہنے لگا۔ ''آج شام اکبر علی خاں کے گھر... انتقال کے بعد ہونے والا روایتی اجتماع ہے، تیجا وغیرہ... کیا کہتے ہیں اُسے؟''

''مجھے جانے کی اجازت مل سکتی ہے؟'' میں نے زیر لبی سے پوچھا۔

''ہاں!'' وہ جھنجھلا کے بولا۔ ''تم پاگل ہو گئے ہو؟''

''مجھے بہت بار محسوس ہوتا ہے۔''

''میں نے تمھیں بتایا تھا، آئی جی نے تمھارے بارے میں سکندر علی خاں کو خاصا مطمئن کر دیا ہے۔''

''سکندر علی خاں کا نہیں، یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔''

''تم وہاں جا کے کیا کرو گے؟ انھیں اور دُکھ دو گے، اُن کے زخم کریدو گے؟ کیا فضول بات کرتے ہو۔'' وہ ناراضی سے بولا۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، وہاں جا کے میں اِس کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

''معلوم ہوا ہے، اکبر علی خاں کی بیوی ٹھیک نہیں ہے۔ بار بار اُس پر غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔''

''یہ تو ہوگا ہی۔ اکبر علی خاں نے بتایا تھا، دونوں بڑی آزمائشوں کے بعد ایک ہو سکے تھے۔ بیگم کا ذکر وہ بڑی چاہت سے کیا کرتے تھے، دونوں ہم مزاج تھے۔ ایک ہی جھلک دیکھی تھی میں نے اُن کے گھر کی، دونوں جیسے ایک دوسرے کے لیے...'' میری آواز بھرا گئی اور آگے کچھ نہ کہا گیا۔

ڈاکٹر کرسی سے اُٹھ کے میرے پاس آ گیا اور میری کمر تھپکنے لگا۔ ''یہی ہوتا ہے۔ آدمی، آدمی سے ملتا ہے، آدمی، آدمی سے بچھڑ جاتا ہے۔ کسی ایک کو تو پہلے جدا ہونا پڑتا ہے، اُسے خبر نہیں ہوتی، دوسرا کتنا ویران ہو جائے گا۔ یہاں تو بات ہی دوسری ہے۔ ایک کو دوسرے سے چھین لیا گیا ہے، کسی خطا اور گناہ کے بغیر چھین لیا گیا ہے۔ سکندر علی خاں نے درست فیصلہ کیا ہے، بھائی کے بیوی بچوں کو ساتھ لے جائے، یہ گھر اور در و دیوار تو انھیں بہت ستائیں گے۔''

ڈاکٹر نے چائے منگوائی تھی اور ابھی کہیں جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ ... جانگلا گھبرایا گھبرایا کمرے میں داخل ہوا اور سرگوشیانہ انداز میں ڈاکٹر کو کچھ بتایا۔ پوری بات تو میری سمجھ میں نہ آ سکی، کسی مریض کا ذکر تھا۔ ڈاکٹر چائے ادھوری چھوڑ کے مجھ سے ... کرتا ہوا اُسی وقت کمرے سے چلا گیا۔ مریض ڈاکٹر کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں تو ڈاکٹر بھی کچھ کم اُن کے تابع نہیں ہوتا۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے موسم جیسے بدلتے رہے، کبھی گرمی، کبھی سردی کا احساس۔ سارے راستے ڈاکٹر مجھ پر مسلط رہا۔ اُس نے جھٹل کے بارے میں تو یہ سنائی تھی تو گزشتہ رات آئی جی سے ملاقات کا احوال بھی بتایا تھا۔ اُس نے واضح طور پر کچھ نہیں کہا تھا۔ میں جانتا تھا، بہت کچھ وہ مجھے نہیں بتا سکا ہے۔ شاید میں اُسے سننا بھی نہیں چاہتا تھا، اُس کا چہرہ تو میرے سامنے ہی تھا۔ اکبر علی خاں کا نام آنے پر اُس نرم خُو، اُس دَور کے آدمی کی آنکھوں میں وحشت اُتر آئی تھی۔ اُس کا چہرہ ہی کچھ اور ہو جاتا تھا۔ کچھ وقت ہی جاتا ہے، میرا دل دھڑک رہا تھا، جانے کیا دیکھنے اور سننے کو ملے۔

ٹھیک پانچ بجے جامو اسپتال آ گیا۔ یہی بات مجھے کھٹک رہی تھی۔ وہ تنہا ہی تھا۔ میدا، مرجو اور دادا میں سے کوئی اُس کے ساتھ نہیں تھا۔ جھٹل کو تعجب ہوا۔ ''کدھر گیا رے وہ بہاری جھنگرا؟'' اُس نے ناگواری سے پوچھا۔

''نہیں آیا اُستاد۔'' جامو نے ہلکی آواز میں کہا۔ ''اور دیکھو، ابھی کب آئے۔''

''کیا ہوا احرام کے جنے کو؟''

جامو نے خفی زبان میں بتایا کہ اڈے پر کسی نوشتے سے چاقو بازی کے دوران معمولی زخمی ہو گیا ہے۔

''وہ کدھو ابھی ساتھ اُٹھا ہو گیا کیا؟''

''دادا کو میدا کے واسطے پھر ٹھہرنا ہی تھا۔'' جامو جھنجھلایا ہوا لگتا تھا۔ ''میں تو اِدھر ہوں اُستاد۔''

''بیوا نے کچھ نہیں بولا تجھ کو؟''

''بولتا تھا، اُستاد کے آگے ہاتھ جوڑ دینا۔''

جھٹل نے سر جھٹک کے بے دلی کا اظہار کیا۔

جاموکو فوراً ہی خیال آیا کہ جھٹل کا مطلب کچھ اور ہے،

در میدا اُس سے کوئی وعدہ کر کے گیا ہے۔ اُس نے تنہا ہو کے کہا۔ "ڈاکٹر سے پوچھ لیا ہے؟"

"ڈاکٹر وغیرہ ایک ہی گھاٹ کے ہوتے ہیں۔"

"ابھی تھوڑا اپنے گورو کو اُستاد، نکل کے بیڑیاں ہی بیڑیاں پینا، اور کھانا بھی، کون پکڑے گا تمھارا ہاتھ۔"

"تو بیٹے کو ٹھیک نہیں لگتا رے آج۔" مچھل نے اُس کے چہرے پر نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

"مجھ کو کیا ہوتا۔" جاموبھن بھنا کے بولا، "تمھارے سامنے بیٹھا ہوں، ٹیڑھا میڑھا دکھائی پڑتا ہوں تم کو...؟"

مچھل نے زورا کو مخاطب کیا۔ "بیٹا! اُستاد کو پانی دکھا ذرا۔" اتنا ہو، جامو کو خود دھیت آ گیا کہ وہ کس کے سامنے بیٹھا ہے۔ "کیا ہے اُستاد!" وہ چڑتے ہوئے بولا، "کیسی بات کر رہے ہو۔"

"لگتا ہے، اِس کھونٹے کا گھاس پانی راس نہیں آیا تجھ کو۔" مچھل نے اپنی آواز ویسی رکھی۔ "بول رے، کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں اُستاد، کیا ہوتا۔" جامو شکست لہجے میں بولا۔

"تو پکّی تول کا ہے۔ پورا سیدھا بول رے۔"

"کیا بولوں، چاچا نہیں، تم کیا سمجھ رہے ہو۔"

"تو اب اُدھر ہی لوٹ جا، بنگلہ پڑے ہیں۔"

"اِدھر میں تم کو بُرا لگ رہا ہوں۔ تم کو ساتھ لے کے جاؤں گا۔ اپنے کو کیوں بتاتا ہے پھریاں۔ اب بولو گے تم تے کب بدلا ہے۔"

"ہاں۔" بات بدلنے کے لیے میں نے مداخلت کی۔ "بلایا تو میں نے ہے جامو بھائی کو۔" میں نے مچھل سے کہا، "اُس وقت تمھاری حالت ہی ایسی تھی۔ اب تو شکر ہے، سب ٹھیک ہے۔ جامو بھائی آ گئے، بڑی بات ہے اور وہ چاہیں تو جا بھی سکتے ہیں اب۔"

"اُستاد بولیں گے تو چلا جاؤں گا ابھی۔" جامو تیوری چڑھا کے بولا۔ "بولو اُستاد!"

"تجھ کو بھگا کے لگاؤں کیا۔"

"لگاؤ، ایمان سے، ویسا بھی بہت ہو گئے۔"

"جا رے۔" مچھل نے منہ پھیر لیا۔ "اپنے سے مستی کرتا ہے۔"

جامو کچھ بولنا چاہتا تھا کہ میں نے اُسے چپ ہو جانے کا اشارہ کیا۔ مچھل نے بھی دیکھ لیا تھا۔ شاید اُس نے بھی باور کیا

کہ کسی وجہ سے جامو اصل بات بتانے سے اجتناب کر رہا ہو گا۔ وہ بھی کچھ سرد پڑ گیا۔ میں نے سیورین سے کہہ کے چائے وغیرہ کا بندوبست کروایا، اور اِس دوران کوشش کی کہ کلکتے، فیض آباد کا ذکر ہوتا رہے۔

پانچ بجے جامو اور زورا مچھل کے پاؤں چھو کے اُٹھ گئے۔ ہم باہر آ گئے اور کمرے سے چند قدم دُور جا کے میں نے جامو سے پوچھا، "میدا کب پکڑا گیا جامو بھائی؟" وہ چلتے چلتے رُک گیا اور میری صورت دیکھنے لگا۔ "تجھ کو پتا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ "بس اندازہ..."

"سچ سچ بول۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ لے گئے ہیں، تُو کیا بولتا ہے؟"

"مچھل بھائی کے سامنے تمھارے اُلجھنے اور میدا، بیرو وغیرہ کے ساتھ نہ آنے سے یہی کچھ سمجھ میں آتا ہے۔"

جامو نے پھر سارا واقعہ بتایا کہ تین ساڑھے تین بجے پولیس کی بھاری نفری نے آناً فاناً اڈّے کا علاقہ گھیرے میں لے لیا۔ وہ دندناتے، بندوقیں تانے اندر گھستے ہی چلے آئے۔ اُن کے تیور بہت جارحانہ تھے۔ اُنھوں نے جامو اور زورا کو بھی پکڑ لیا تھا، لیکن بعد کو کسی پولیس افسر کی دخل اندازی پر چھوڑ دیا گیا۔ پولیس افسر یقیناً جامو اور زورا سے پہلے نمٹ چکا تھا۔ سب اُنھیں پٹنا شہر میں داخل ہوتے ہی گرفت میں لے لیا گیا تھا، اور رات بھر اُن سے بازپرس، بل کہ زیادتی کی جاتی رہی تھی۔ پولیس نے اڈّے پر پکڑ دھکڑ کی کارروائی اتنی تیزی سے کی کہ کسی کو کچھ سوچنے، سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ میدا سے بھی جامو اور زورا کی کوئی بات نہ ہو سکی۔ اتفاق سے اڈّے پر اُس وقت سارے لوگ نہیں تھے، لیکن جتنے بھی تھے، سبھی کو جانوروں کی طرح گاڑیوں میں دھکیل دیا گیا، گردن پکڑ پکڑ کے، بندوق کی بٹوں کی ضربوں سے۔ جامو کہہ رہا تھا کہ اُس نے اڈّے کے آدمیوں سے ایسا معاندانہ سلوک کبھی نہیں دیکھا۔ باہر کے پولیس والے بھی پٹنا پولیس کے ساتھ ہوں گے۔ شہر کی پولیس سے اڈّے کے آدمیوں کی تھوڑی بہت صاحب سلامت ہوتی ہی ہے۔ کچھ تو یہ مروّت کام آئی۔ باہر کی پولیس کے دباؤ میں شہر کی پولیس بھی چوکنی رہی۔ پھر جامو اور زورا ہی اڈّے پر باقی رہ گئے۔ بعد کو چھاپے کے وقت اڈّے سے باہر رہ جانے والے لوگ اچھی خاصی

تعداد میں اڈّے پر آ گئے، اور اُن میں سے کچھ تو فرار ہو گئے، کچھ نے ہر حالت میں اڈّے پر موجود رہنے کو ترجیح دی۔

"اب تم نے کیا سوچا ہے جامو بھائی؟" ساری رُوداد سن کے میں نے جامو سے پوچھا۔

"اپنے کو کیا سوچنا لڈّے۔" جامو بیزاری سے بولا۔

میں نے اُسے مشورہ دیا کہ بہتر ہے، وہ دونوں میدا کے اڈّے واپس نہ جائیں اور کلکتے جانے والی پہلی گاڑی میں سوار ہو جائیں، یا پھر جس ہوٹل میں میرا کمرا ہے، وہیں رہیں۔ آگے جا کے اُن کے لیے مشکلیں ہو سکتی ہیں۔

دونوں نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ ایسے وقت اڈّے واپس نہ جانے سے وہاں بچ جانے والوں کی نظروں میں اُن کی کیا وقعت رہ جائے گی۔ کلکتے کے اڈّے کا ایک بھرم ہے دُور دُور تک، اور وہ تو مچھل کے لیے آئے ہیں۔ اب اُسے ساتھ لے کے ہی جائیں گے۔ اُنھوں نے اِس شہر میں کون سا جرم کیا ہے جو پولیس اُن کے پیچھے پڑی رہے گی۔ اُن کا یہاں سے اِس طرح روانہ ہو جانا فرار کے زمرے میں آ سکتا ہے، اور پولیس [illegible] ور شک میں مبتلا کر سکتا ہے، اور میدا ابھی کیا سوچے گا۔ جامو [illegible] توقع تھی کہ میدا جلد واپس آ جائے گا۔ پولیس یہ کارروائیاں [illegible] ہی ہے۔ عرصے سے میدا یہاں راج کر رہا ہے۔ اُس کے [illegible] لمبے ہونے چاہئیں، اُس کی جڑیں ایسی کم زور نہیں ہوں گی۔

"میدا اب شاید جلد نہ لوٹ پائے جامو بھائی۔" میں یہ کہنا نہیں چاہتا تھا، زبان سے نکل گیا۔

"کیوں؟" جامو حیرانی سے بولا۔ "ایسا کیوں بولتا ہے۔"

"کسی بنیاد ہی پر اُس پر ہاتھ ڈالا گیا ہو گا۔ پولیس اُسے پہلے کیوں نہیں لے گئی۔ اب کیوں؟ میدا سے ضرور کوئی چوک ہوئی ہو گی۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

"کیسی چوک؟ کیا مطلب ہے تیرا؟"

جامو کو شاید تفصیل سے واقعات معلوم نہیں تھے۔ معلوم بھی ہوئے ہوں گے تو اُس طرح، میدا نے جس طور سے تلقین کیے ہوں گے۔ جامو کے پٹنا آنے کے بعد میری اُس سے کوئی بات ہی کہاں ہو پائی تھی۔ میں نے ترتیب سے ٹھہر ٹھہر کے اُسے ساری رُوداد سنانی چاہی۔ دھنوا سے نبرد آزمائی، میرے خاتمے کے لیے اسپتال میں گھس آنے والے حملہ آور اور نوجوان انتھونی کی موت،

پھر اکبر علی خاں کے خون تک۔ میں نے اُسے بتایا کہ مبیّنہ طور پر وہ تین آدمی تھے، اور ایک دن بعد ہی اُن تینوں کا کام تمام کر کے اُن کی لاشیں اُسی جگہ پھنکوا دی گئیں جہاں اکبر علی خاں کا خون کیا گیا تھا، اور یوں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ اکبر علی خاں کے خونِ ناحق کی تلافی کر دی گئی ہے، اور یہ تین آدمی میدا کے ہاتھوں، یا اُس کے اشارے پر اپنے انجام سے دوچار ہوئے۔

"میدا کے ہاتھوں۔" جامو پھیلی آنکھوں سے بولا۔

"پر اُس نے بہت بات کی، اپنے کو ایسا کچھ نہیں بولا۔"

"یہ بات مچھل کے کہنے کی تھوڑی ہوتی ہے جامو بھائی! آدمی اپنے آپ سے نہیں بولتا۔ میدا کے بقول، اُسے سب خطا، بے گناہ اکبر علی خاں کے اِس طرح ختم ہو جانے کا بہت دُکھ تھا، اور وہ اکبر علی خاں کو واپس تو نہیں لا سکتا تھا۔ یہی کچھ اُس کے بس میں تھا۔ لگتا ہے، میدا سے کہیں چوک ہوئی۔ ظاہر ہے، انتھونی، پھر اکبر علی خاں، پھر اُن تین آدمیوں کے قتل کے بعد پولیس تماشائی تو نہیں بنی رہتی۔"

"میدا نے اِس بارے میں تجھ کو خود بتایا؟ میرا مطلب ہے، اُن تین آدمیوں کا صفایا کرنے کا۔" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں، اُس نے میرے سامنے اقرار کیا ہے۔"

جامو کے چہرے کا گوشت اُبھر آیا، کہنے لگا۔ "پر اُس نے ٹھیک ہی کیا، ڈلے!"

"مگر پولیس کی نظر میں تو خون، خون ہے۔ میدا، اکبر علی خاں کے قاتلوں کو پولیس کے آگے ڈال دیتا تو اور بات ہوتی۔ وہ تو عدالت بن بیٹھا۔"

"یہ تو ہوتا ہے، پولیس، عدالت کی گھما پھیری کا تجھ کو پتا ہے۔ برس لگ جاتے ہیں، اُدھر میدا کو تیرا بھی دھیان ہوگا، تو در سپتال سے چھوٹے گا تو آندھی بن کے اُن پر ٹوٹے گا۔"

"تو اُس کے خیال میں اُس نے حساب صاف کر دیا؟ جامو بھائی! میں تمھیں کیا بتاؤں، اکبر علی خاں صاحب کیسے آدمی تھے۔ وہ تین آدمی نہیں، وہ تو بہت سوں سے اُوپر تھے۔ وہ تو بڑے فرشتہ آدمی تھے۔ میں انھیں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کہتا۔ تم نے انھیں دیکھا جو نہیں۔"

"سمجھتا ہوں، ڈلے۔" جامو نے مجھے گلے سے پکڑ لیا۔

"ایک بات بول لے راجا بھائی!" زور دار زہریلی آواز میں بولا۔ "اپن ایدر میدا دادا کا مہمان ہے۔ اپن نے تمھارا پورا بات سن لیا ہے۔ ٹھیک ہے، جو تم بولتا ہے، پر اپن کو یہ میدا دادا ساں، ہاں قسم اڈے کا دادا دکھائی نہیں پڑتا۔"

"تیرا کون سا گلا گھونٹ لیا ہے اُس نے۔" جامو نے اُسے ڈپٹ دیا۔

"نہیں جامو بھائی، تم کچھ بولو، اپن بھی تم لوگ بیچ اُٹھتا بیٹھتا ہے شروع سے۔ یہ آدمی ٹھیک نہیں ہے ایک دم۔"

شام کو اسپتال آنے والے ملاقاتیوں کا وقت کب کا ختم ہو چکا تھا، اس لیے ہم صدر دروازے سے باہر آ گئے اور تادیر چار دیواری کے جنگلے کے پاس کھڑے رہے۔ دربان اور تعینات سپاہی مجھے پہچان گئے تھے۔ اُنھوں نے ہمارے بیٹھ جانے کے لیے پٹی کرسیاں اور بنچیں خالی کر دیں۔ ہم نے منع کیا، لیکن وہ نہیں مانے، اور ہمیں بیٹھنا پڑا۔ جامو گم سم سا ہو گیا تھا، پھر یکایک اُس کے جسم میں ہمک اُٹھی، مچل کے بولا۔ "میدا سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے، ڈلے۔ کام بھی اُس نے خود نہیں کیا ہوگا۔ وہ کوئی نیا آدمی نہیں ہے جو اوچھا ہاتھ ڈالے گا۔ اپنے کو لگتا ہے، پولیس دکھاوے کے لیے اُس کو لے گئی ہے۔"

"کام جس نے کیا، یا اُس کے اشارے پر کسی اور نے، غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ نہیں بھی ہوئی تو اندر یا باہر کا کوئی آدمی انگلی بھی تو اُٹھا سکتا ہے، میدا کا کوئی دل میں لیے، یا اُس سے ناراض آدمی۔ پولیس کو شک تو میدا پر پہلے بھی ہوگا، اور شک ور گہرا ہو جائے تو پولیس بال کی کھال نکال لیتی ہے۔ سنتے ہیں، پولیس بڑی کٹکھنی ہو رہی ہے۔ کچھ اس کی ساکھ کی بھی تو بات ہے۔"

"تو کیسی باتیں کر رہا ہے لاڈلے؟" جامو کڑکی آواز میں بولا۔

مجھے احساس ہوا کہ اتنا کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔

"تو تیرا خیال ہے، میدا جلدی نہیں آ پائے گا۔"

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا، "ایک اندازہ ہے جامو بھائی۔"

"تو کچی بات نہیں بولتا۔" جامو عجیب لہجے میں بولا۔

"میں تو دوسری بات سوچتا ہوں، پھر اڈے کا کیا بنے گا۔ وہاں تو اوپر کا کوئی آدمی نہیں بچا۔"

"کسی کو بھی چوکی پر بٹھا دو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"اڈا تو اپنا ہے۔"

"اپنا کیا، کون سا وہاں بیٹھنا ہے، مجھے، یا تمھیں۔"

"پھر بھی ایسے چھوڑا تو نہیں جا سکتا، بہت بڑا اڈا ہے، شہر میں ایک ہی۔"

"وہاں جو رہ گئے ہیں، آپ طے کر لیں گے۔"

"وہ سوا ہے کوئی بھی پورا دکھائی نہیں پڑتا۔"

"انھی میں سے کسی کو آگے بڑھا دو، جامو بھائی! جان چھڑاؤ۔ ہمیں تو پیچھے جانا ہے۔ کتنا ہی بڑا اور پرانا ہو، ایسے اڈے کی کیا فکر کرنی، جس سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھنا۔ ہمارے، یہاں آنے کا مقصد تو مخمل بھائی کی صحت یابی ہے۔ اگر تم نے خود ہی کہا تھا، آپ ہی وہاں لوگ چھینا جھپٹی، مار کُٹائی کر کے طے کر لیں گے۔ ہم سامنے نہ ہوتے تو بھی ایسی صورت میں انھیں بچنے کے لیے کوئی راستہ نکالنا ہی پڑتا۔"

جامو کوئی جواب نہ دے سکا۔ اُجڑ ڈوبتا جا رہا تھا۔ انھیں جانا تھا، اور وہ دونوں مجھ سے گلے مل کے چلے گئے۔

مخمل سبزہ زار میں بیٹھا ہوا تھا اور سیورین سے باتوں میں مصروف تھا۔ نرسیں عام طور سے مریضوں کے ساتھ کسی بے تکلفی سے اجتناب کرتی تھیں، مگر سیورین مخمل کا ٹھکانا بھی نہیں سکتی تھی۔ دوسرے یہ اسپتال کے خاص الخاص مریضوں کا

حصہ تھا۔ یہاں اسپتال کے عام قواعد کا اطلاق نہیں ہو پاتا ہوگا۔ مخمل کے سامنے میز رکھی تھی، میز پر شربت بھرا جگ، گلاس، پھلوں کی تشتری وغیرہ۔ وہ خاصا تن آسان لگ رہا تھا، حویلی کے باغیچے، یا اڈے کی چوکی پر گاؤ تکیے سے کمر ٹکائے بیٹھا ہو جیسے، بس حقہ ہی وہاں نہیں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سیورین اُٹھ گئی۔

"کیوں ری، کدھری کو چلی؟" مخمل نے اُسے ٹوکا۔

سیورین نے سعادت مندانہ انداز میں، مدد کے کام نمٹانے کا عذر کیا اور چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ بھی تو آ گئے ہیں۔"

اُن کے درمیان یہ موانست میرے لیے تعجب انگیز تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میری عدم موجودگی میں وہ ایک دوسرے کو بہت جان چکے ہیں۔

میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ مجھے فطرتاً مخمل مجھ سے میدا کے بارے میں نہ پوچھ گچھ کرے کہ جامو اُس سے کیا چھپا رہا تھا، مجھے [illegible] ناکافی کرنی پڑے۔ اس ایک بیچ پر کہ میدا پولیس کے [illegible]ن ہے، اُسے قرار نہیں آتا، مگر وہ کسی اور دھن میں تھا، [illegible] میدا کے زخمی ہو جانے کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ [illegible] تم ہمانے لگی تھی۔ تھوڑی دیر میں سیورین نے واپس [illegible] میں وہیں کے بغیر مخمل کے مزہ کو ٹھوکا دیا۔ مخمل نے ذرا چوں و چرا نہیں کی اور اُٹھ گیا۔ اُجالے کی اب رمق ہی باقی رہ گئی تھی کہ ایلی آ گئی۔ سیورین کو اب گھر جانا تھا، بس تبدیل کر کے وہ کمرے میں چلی آئی، وہ مخمل کے بستر کے کنارے بیٹھ گئی۔ "تجھ کو یہی روپ جچتا ہے، اسی کو پہنا کر۔" مخمل نے کہا۔

سیورین کا سراپا دوہرا ہو گیا۔ ساڑھی میں وہ بالکل بدل جاتی تھی۔ لہر کی طرح اُس کے سیدھے ترچھے بدن پر ساڑھی خوب کھلتی تھی۔ مخمل نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے پیشانی کو بوسہ دیا تو اُس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ چھلک پڑتی، فوراً ہی باہر نکل گئی۔ ان لڑکیوں کے پاس آنسوؤں کا ایک دریا چھپا ہوتا ہے۔ مجھے خیال تھا، آج بس تاشتے ہی پر اُس سے کوئی بات ہو پائی تھی، سو میں بھی باہر نکل آیا۔ وہ میری منتظر ہی تھی۔ "جا رہی ہو۔" میں نے بوجھل آواز میں کہا، "آج وقت ہی نہیں مل پایا۔"

"میں دیکھ رہی تھی۔" اُس کے لہجے میں اُداسی تھی۔

"وہ اُدھر ڈاکٹر صاحب نے بلا لیا۔ اڈے کے آدمی، زردوار، درجامو وغیرہ آ گئے۔ اور مخمل بھائی... وہ بھی اب موجود ہیں نا... میدا آدمی موجود ہی ہوتا ہے، وہ اب تمھارے جانے کا وقت ہو گیا۔"
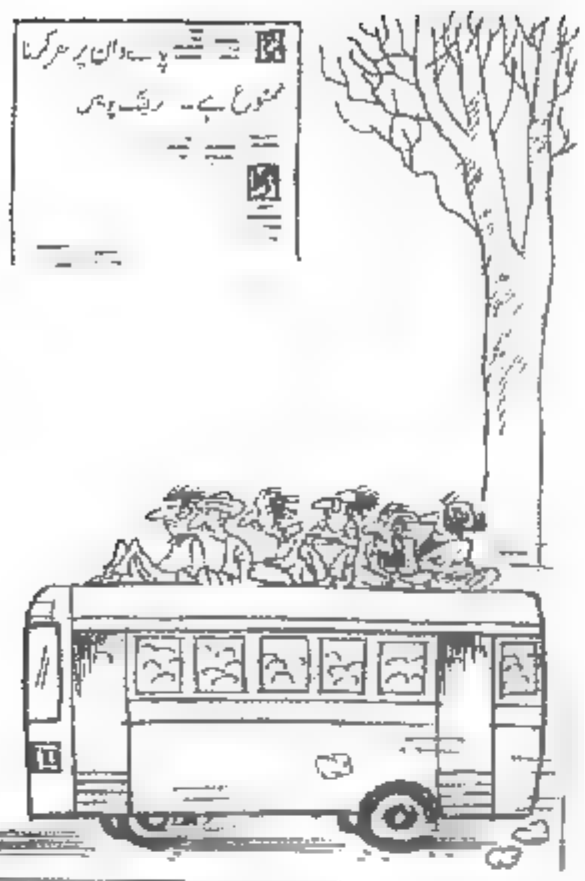
"کہو تو میں واپس آ جاؤں۔" وہ چہکے سے بولی، یہ بات وہ پہلے بھی کئی بار کر چکی تھی۔

"نہیں نہیں۔ تم اب گھر جا کے آرام کرو۔ گھر جا کے تمھیں کل کے ناشتے کی بھی تو تیاری کرنی ہے۔"

وہ کھل کھلا پڑی، موتی سے بکھر گئے۔

"بس صبح بہترین ناشتا لے کے آنا۔ تم بھولو گی تو نہیں نا۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "اور ہاں، ایک آدمی بڑھ گیا ہے۔ مخمل بھائی کا بھی دھیان رکھنا ہے۔ اسپتال کا کھانا کھاتے کھاتے وہ عاجز آ چکے ہوں گے۔ ویسے بھی تمھاری اُن سے اچھی دوستی ہو گئی ہے۔"

"وہ بہت اچھے ہیں۔" سیورین وارفتگی سے بولی۔ "میرے بابا تو بچپن ہی میں دُور ہو گئے تھے، بعد کو ماں بھی نہیں رہی۔ بابا سے باتیں کر کے ایسا لگا جیسے مجھے میرے بابا مل گئے ہیں۔ ہم دونوں میں بہت باتیں ہوئیں۔ وہ میرے بارے میں پوچھتے رہے، پھر اپنے گھر کی جنت کا حال بتاتے رہے، اپنی بیٹی زری کا... اور کہنے لگے کہ کبھی وہاں آنا اور دیکھنا کہ وہاں کیسے لوگ بستے ہیں، اور یہ سب تیرے جیسے ہیں۔ اُنھوں نے

بڑا مان دیا ہے مجھے۔" وہ بڑبڑا بولتی رہی۔
کل کی طرح راہ داری کے موڑ پر میں نے اُسے رخصت کیا، اور کوشش کی کہ وہ کوئی بار لیے گھر نہ جائے۔

مجھے شبہ تھا، آج رات ڈاکٹر راسے کے گھر جلدی نہ ہو جائے۔ دوپہر اُس نے ایسا کچھ امکان ظاہر کیا تھا مگر 9 بج گئے۔ نہ ڈاکٹر آیا، نہ معمول کے مطابق رات کے دورے پر اُس کے بجائے کوئی دوسرا ڈاکٹر، نہ کوئی قاصد۔ اس وقت تک کسی کو آ جانا چاہیے تھا۔ یہی بھی پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ ڈاکٹر کے دورے کے بعد وہ جیسے کسی اہم کام سے نچنت ہو جاتی تھی۔ بہرحال، میں اپنی جانب سے تیار بیٹھا تھا۔ ضرور اسپتال میں کوئی مریض نازک حالت میں آیا ہوگا۔ دلی تسلی کے لیے آدمی طرح طرح کے عذر، قیاس کر لیتا اور امکانات تراش لیتا ہے۔ دیر ہو جائے تو یہی قیاس وسوسوں، واہموں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، اور اُن کی کثرت پریشان بھی بہت کرتی ہے۔ خلاق آدمی تو یوں بھی ان ہونیاں تخلیق کرتا رہتا ہے۔

کوئی ساڑھے نو بجے اسپتال کے ایک ملازم نے آ کے ڈاکٹر راسے کی آمد کی اطلاع دی۔ میں راہ داری میں جا کے کھڑا ہو گیا، اور چند ہی منٹ بعد ڈاکٹر راسے، ایک اور ڈاکٹر اور نرس کے ساتھ پچکتے جھجکتے قدموں سے کمرے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کے اُس نے ہاتھ پھیلا دیا، اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کے بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ "تم انتظار کر رہے ہو گے۔"

"جی ہاں۔" میں نے بے تابی سے کہا۔

"پہلے بھائی کو ایک نظر دیکھ لوں، پھر تم سے بات ہوتی ہے۔"

"خیریت تو ہے ڈاکٹر صاحب؟"

"کچھ تو معلوم ہو گیا ہو گا تمھیں۔"

"ہاں، میدا کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ آج شام جب کلکتے سے آنے والے وہ دونوں، چاسو اور زور، میدا کے بغیر مغل بھائی کو دیکھنے آئے تھے۔" میں نے اضطراری سادگی سے کہا۔

بس اتنے میں ہم کمرے تک پہنچ گئے تھے۔ ڈاکٹر مغل کے پاس چلا گیا۔ اُس کا روزنامچہ دیکھا۔ مغل غنودگی میں تھا، آہٹوں سے جاگ گیا اور اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے جگہ جگہ سے اُس کا سر دبا کے دیکھا اور اطمینان کا اظہار کرتا رہا۔ یہی کو

اُس نے دواؤں اور غذاؤں کی تبدیلی کے بارے میں ہدایت دی۔ [illegible] ایک تیزی سے کاغذ پر مندرج کرتی رہی۔ ڈاکٹر نے صبح و شام اسپتال کی حدود میں چلنے پھرنے کی بھی مغل کو اجازت دے دی۔ وہ سات آٹھ منٹ سے زیادہ نہیں ٹھیرا۔ میں اُس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر آ گیا۔ سبزہ زار میں کرسیاں ابھی تک پڑی ہوئی تھیں۔ وہ اُن کی طرف بڑھا تھا کہ ٹھیر گیا اور اُس نے اپنے ساتھی ڈاکٹر اور نرس کو واپس جانے کا اشارہ کیا اور سبزہ زار میں آ گیا۔ کرسیاں نم ہو چکی تھیں مگر ایسی زیادہ نہیں کہ بیٹھا نہ جا سکے۔ کرسی سنبھالتے ہی ڈاکٹر راسے سر جھکا کے بولا۔ "ایک افسوس ناک خبر ہے۔"

"کیا ڈاکٹر صاحب؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"دوپہر میں نے تمھیں بتایا تھا، آج شام اکبر علی خاں کے ہاں روایتی قسم کا اجتماع ہے۔ سنا ہے، ایک خلقت جمع تھی، مرد، عورتیں..."

اور ڈاکٹر نے وہی بتایا جس کی تمہید سے میرے دل میں ہُوک اُٹھی تھی اور میری سانسیں سینے میں رُک گئی تھیں۔

"اکبر علی خاں کی بیوی بھی اُسی کے پاس چلی گئی۔" ڈاکٹر نے کرب سے کہا۔

میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔

"ابھی ساڑھے آٹھ بجے ایک پولیس افسر میرے پاس آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ گھر میں عورتوں کا اژدحام تھا، قرآن خوانی کے بعد وہ بین کر رہی تھیں کہ پہلے سے نیم جاں اکبر علی خاں کی بیوہ اس آہ و بکا کی تاب نہ لا سکی۔ وہ چلی گئی۔"

میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے اپنے ہاتھوں میں میرے ہاتھ جکڑ لیے۔ "تم ٹھیک کہتے تھے، وہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے تھے... تمھیں یہ اطلاع دیتے ہوئے مجھے بہت دکھ ہے۔" میں گُنگ بیٹھا رہا۔

"ایک آدمی چلا گیا تھا، دوسرا اُس سے اس قدر وابستہ تھا کہ زندہ رہنا اُس کے اختیار میں نہیں رہا۔ کوئی کیا کر سکتا ہے۔ اُسے اپنے بچوں سے زیادہ شوہر عزیز تھا۔" ڈاکٹر نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ "سوچتا رہا، کس طرح یہ دل دوز خبر تم تک پہنچاؤں۔ اسی کشمکش و پیچ میں دیر ہو گئی۔ تم میرا انتظار کر رہے ہو گے۔ جبھی سے میں نے کہا تھا کہ آج شام تم گھر آ سکتے ہو۔

وہ پولیس افسر آ گیا اور اُس کی زبانی یہ سن کے مجھ پہ [illegible] ایک عالم رہا۔ میں تو ان سانحوں کا عادی ہوں۔ روز یہاں [illegible] ہوتا رہتا ہے۔ لوگ دم توڑ دیتے ہیں اور آہ و زاری کرتے ہوئے اُن کے عزیز اُن کی میتیں لے جاتے ہیں، لیکن اس حادثے نے مجھے نڈھال کر دیا۔ ایک ذرا سی بات پر کتنے سانحے ممکن ہو سکتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا، تم سے کیا کہوں، سوائے اس کے کہ تم ایک حوصلہ مند آدمی ہو، اپنے آپ کو سنبھالے رکھو، اور ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ اس میں تمھاری کوئی غلطی، کوئی قصور نہیں، یہ تو عزیزِ من، ہتانے ہانے کی بات ہے۔"

مجھ سے کچھ بھی نہ کہا جا سکا۔

"میں زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔ گھر میں بیمار راہ تک رہی ہوگی۔ تم سے ایک اور بات کہنی ہے۔ یہ وقت تو نہیں ہے، لیکن ضروری بات ہے۔ اچھا ہے، تم باخبر رہو۔"

"جی، ڈاکٹر صاحب۔" میں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"[illegible] استاد کو گرفتار کر کے شہر کی پولیس کے بجائے بیرونی [illegible] کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ بیرونی پولیس اپنے انداز سے [illegible] کے مجرموں سے نمٹ رہی ہے۔ تمھیں یہ جان کے حیرت ہوگی، حیرت بھی اور عبرت بھی کہ میدا نے کسی بھی جرم [illegible] سے صاف انکار کر دیا ہے۔ یہی شخص کل ہمارے [illegible] اعتراف کر رہا تھا۔ تم شاید مجھ سے متفق نہ ہو، مگر مجھے شبہ ہے، یہی آدمی سارے المیوں کی بنیاد ہے۔ مجھے تو وہ کاذب اور پہلے درجے کا کمینہ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً اُسی نے تمھیں ختم کرنے کے لیے اسپتال میں مسلح آدمی بھیجے تھے جن کی زد پر اتفوئی غریب آ گیا۔ اپنے اس اقدام میں ناکامی کے بعد تمھیں منتشر و متزلزل کرنے کے لیے اُس نے اکبر علی خاں کو مار دیا۔ یوں اُس کا ایک مقصد بھی حاصل ہوتا تھا۔ اکبر علی خاں اور تمھاری قرابت کی وجہ سے لازماً پولیس سب سے پہلے تمھاری جانب ہی رُخ کرے گی اور حوالات، یا جیل میں آسانی سے تم اُس کا نشانہ بن سکتے ہو، یا پھر ایک لمبی مدت تک پولیس، عدالت کے شکنجے میں جکڑے رہو گے۔ وہ تمھارے خلاف اپنے نمک خوار پولیس والوں کی ڈوریاں ہلاتا رہے گا۔ اُسے توقع نہیں ہوگی کہ پولیس تم پر ہاتھ ڈالنے کے بجائے تمھیں آزاد کیے رکھے گی۔ دوسری بار ناکامی کے بعد پھر یہی ایک صورت، چارو ناچار رہ جاتی

تھی کہ وہ دوسرے طریقے سے تم پر اثر انداز ہو۔ اُس نے اپنے تین آدمیوں کی قربانی دے کے اُن کی لاشیں اکبر علی خاں کے خون کی جگہ پھنکوا دیں اور تمھیں یہ تاثر دینے کی کوشش کہ میدا اُستاد پیچھے کے اڈّے کا ایک بااصول، سچا اور کھرا آدمی ہے۔ وہ اپنے علاقے میں ایسی دھاندلی اور ظلم و ستم برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اکبر علی خاں کے واقعے پر اُس کا سر جھک گیا ہے اور ندامت کا یہ عالم ہے کہ تمھارے قدموں پر اپنا چاقو ڈالنے، اور اڈّے سے دست برداری کا اعلان کرنے آ گیا ہے۔ اُسے اندازہ تھا، اس عجز و انکسار، شکستگی اور پشیمانی کے اس اظہار پر اڈّا تم اُسی کے حوالے کر دو گے، نہ بھی کر پاؤ تو اُسے تمھارے ممکنہ قہر و غضب سے تو امان مل جائے گی، اور تم نے وہی کیا جو ایک عالی حوصلہ اور کشادہ دل شخص کو کرنا چاہیے تھا۔

"وہ شروع سے تمھارے تعاقب میں تھا اور اچھی طرح جان چکا تھا کہ تم اُس کے اڈّے پر اپنا چاقو واپس لینے ضرور آؤ گے اور اس شہر میں اُسے رُسوائی کا سامنا کرنا پڑے گا، جہاں ایک عرصے سے بلاشرکتِ غیرے وہ حکم رانی کر رہا ہے۔ وہ تو کلکتے سے تمھارے دو ساتھیوں کی آمد کے بعد اُس کی آنکھیں کھلیں کہ تم تو اُستاد مغل کے آدمی ہو، وہ کس شخص کی جان کے درپے تھا۔ یہ تو بھڑوں کے چھتّے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ اُستاد مغل کے عتاب کے خیال ہی سے اُسے ہَول آنا چاہیے۔ اُسے تو پھر یہ خوف بھی دامن گیر ہوا ہوگا کہ صحت یابی کے بعد اُستاد مغل اپنے طور سے حقائق کی تفتیش کر سکتا ہے، اور اُس سے کچھ چھپانا آسان نہ ہوگا۔ اکبر علی خاں کے خون کی حقیقت آشنائی

کے بعد اُس کا غصہ و غم کیسا قیامت خیز ہو سکتا ہے۔ سو آپ استاد شخص کے سامنے میدا بندگی ہی پیش کر سکتا تھا، اور وہ بھی کر رہا تھا۔ بہر حال، مآل کار وہ گرفت میں آ چکا ہے۔ یہ سارے جرم اُس نے اپنے معتبر، تھیوں کی مدد کے بغیر نہیں کیے ہوں گے۔ دیکھتے ہیں، کب تک وہ رفاقت کا حق نبھاتے ہیں۔ اپنے سرغنہ کی پردہ پوشی کی کتنی ہمت ہے اُن میں۔ پولیس کو اصل صورتِ حال تک پہنچنے میں دیر لگ سکتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، پولیس بھی عزم کیے ہوئے ہے۔ مجرموں کو اپنے انجام تک پہنچنا ہی چاہیے۔"

ڈاکٹر کی آواز جل سی رہی تھی۔ میں نے کوئی دخل نہیں دیا۔ یک محاتی تامّل کے بعد اُس نے پوچھا، "تم کوئی تردید... کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

میں تو ششدر رہ گیا تھا۔ کچھ کہنے کا یارا ہی نہ تھا مجھے۔

"ہو سکتا ہے، میرا تجزیہ ایک فسانہ لگتا ہو، لیکن یہی کچھ نظر آتا ہے، اور میں سمجھتا ہوں، اتنا بے جو نہیں ہے۔"

"جی، جی ڈاکٹر صاحب۔" میری آواز بیٹھ گئی۔

"سوچنا تم... میں اب چلتا ہوں۔ میری کمر پر دھپ مارتے ہوئے وہ اُٹھ گیا۔ "یہ دنیا بہت عجیب ہے، جتنی دل کش اور روشن ہے، اُتنی ہی مکروہ اور اندھیری... کل ملیں گے، اور ہاں، سنو! کل صبح میرے سامنے وہی چہرہ ہو، جو تمھارا ہے۔"

میں سبزہ زار ہی میں بیٹھا رہا۔ مجھ سے اُٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ جسم میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی۔ پھر یمی آ گئی اور کھانے کے لیے پوچھنے لگی۔ منع کرنے پر ضد کرنے لگی۔ جی میں آیا، اسے جھڑک دوں، لیکن یہ بھی نہ ہو سکا۔ میرا ہاتھ پکڑ کے وہ مجھے کمرے میں لے گئی اور صوفے پر میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ "کیا بات ہے میرے بچے!" اُس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دل گیر لہجے میں پوچھا۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میری سسکیاں نکل گئیں۔ اُسے ہو جانا چاہیے تھا۔ اُس نے بے قراری سے میرا سر آغوش میں لے لیا۔ "نہیں، نہیں۔ یہ کیا۔" وہ مجھے پچکارنے لگی۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ شغل بھی جاگ سکتا ہے۔ مجھ سے تو کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا، اُمڈ اُمڈ کے آنسو آ رہے تھے۔ اُس نے مجھے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ "میری جان! مجھے بتاؤ، ڈاکٹر کیا کہہ گئے ہیں۔"

میں نے بہ مشکل اُسے اکبر علی خاں کی بیوی کے متعلق بتایا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ "یہ کیا ہوا۔ نہیں نہیں۔" بہت وہ مجھے دلاسے دے رہی تھی، خود اس پر قابو نہیں رہا۔

"یہ کیسے ہو گیا بچے؟" وہ پھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "بس اُن کے بغیر وہ نہیں رہ سکتی تھیں۔ سارا گھر ہی برباد ہو گیا، اور کس وجہ سے، کس کی وجہ سے۔" میں نے بلکتے ہوئے کہا۔

"نا نا، تمھاری وجہ سے کیوں، ایسا مت سوچو۔" وہ اُکھڑی ہوئی سانسوں سے بولی، "تم ایسا چاہتے تھے کیا..." وہ مجھے سمجھاتی اور روتی رہی۔ کہنے لگی، "آدمی کسی کی موت سے زیادہ اپنی بے بسی اور مجبوری پر روتا ہے کہ نہ کسی کو جانے سے روک سکتا ہے، نہ کسی جانے والے کو واپس لا سکتا ہے۔" پچکی سی تلقین دیتا کیوں دل [illegible] ہوگئی، بولی "رو لو میرے بچے! جتنا رو سکتے ہو۔ [illegible] آنسوؤں کے سوا کیا ہے۔ یہ آنسو بڑا سہارا ہیں۔ یہ نہ ہوں تو آدمی کیا کرے، اُس کا دماغ پھٹ جائے، وہ تو پاگل ہو جائے۔"

بار بار وہ گھر میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا، جہاں میں چاقو نکالے داخل ہوا تھا، اور سارے گھر والوں کو دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اکبر علی خاں، اُن کی بیگم نزہت، اُن کے بچے۔ کیسا بھرا پُرا گھر تھا۔ اکبر علی خاں کس والہانہ انداز میں مجھ سے اپنی بیگم کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ اُن کی باتیں کانٹوں کی طرح میرے سینے میں چبھ رہی تھیں۔

ایڈی بھی میرے ساتھ جاگتی رہی۔ رات گئے اُس نے جھجکتے ہوئے مجھ سے کھانے کے لیے پوچھا تو اُس کے بھوکے رہ جانے کی وجہ سے میں بھی رسماً اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ نہ وہ کچھ کھا پی سکی، نہ مجھ سے کچھ زہر مار کیا جا سکا۔ میں نے اُسے میدا کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ ڈاکٹر رائے کیا قیاس آرائی کر کے گیا ہے۔ ڈاکٹر کا اندازہ درست ہے تو اکبر علی خاں کی بیگم کا قاتل بھی تو وہی میدا ہے۔ ایسے شخص کے لیے سزائے موت تو بڑی حقیر سزا ہے۔

سیورین آج اور سویرے ہی آ گئی تھی، لہلہاتی اور چہچہاتی ہوئی۔ شغل نے اُس کے داخل ہوتے ہی اُس کی شگفتگی چھین لی۔ ادھیڑ عمری میں بڑی سرد و گرم چشیدہ تھی۔ سیورین کو زندگی کے اُتنے عجوبوں سے کتنا واسطہ پڑا ہوگا۔ وہ تو کھِلاڑی تھی۔ دنیا دیدہ بزرگوں کی فعالیت اور ہوش مندی کے اطوار کبھی کبھی بے محل، سنگ دلانہ لگتے ہیں۔ ایڈی نے کسی سے پوچھے بغیر ناشتا میز پر لگا دیا، جو ناشتا کم، کھانے کی باقاعدہ دعوت کا اہتمام زیادہ لگتا تھا۔ شغل پوری طرح بیدار تھا۔ ایڈی نے از راہِ وضع اُس سے ساتھ دینے کی درخواست کی۔ سیورین نے آج بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، لیکن ہم تینوں بس ٹونگتے رہے۔ شغل کو دنوں بعد یہ موقع ملا تھا۔ سیورین کے ہاں روغن اور مسالوں کی آمیزش برائے نام ہی ہوتی تھی۔ شغل نے لطف لیتے ہوئے کھایا، اور پھیکی پھیکی مسکراہٹ سے سیورین اُس کی داد و ستائش کا شکریہ ادا کرتی رہی۔ ساری خوش رنگی و خوش ذائقگی، خوش آوازی و خوش شائستگی، خوش دلی کی پابند ہوتی ہے۔ شغل [illegible] کے لیے بڑی آسودگی تھی۔

[illegible] برتن بھی جلد سمیٹ دیے، اور ڈاکٹر رائے کے [illegible] میز صاف کر دی۔ دس بج رہے تھے، اور چندری [illegible] تھے کہ جامو اور زورا نے جھجکتے ہوئے کمرے میں [illegible] بجے سے اسپتال کے باہر ملاقاتیوں کا وقت شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ میری طرح اُن دونوں کو بھی حیرت ہوئی ہوگی کہ شغل نے اُن سے میدا کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اُنھوں نے بھی اپنی جانب سے کچھ بتانے سے گریز کیا۔ کسی وقت بھی ڈاکٹر کے آ جانے کے خیال سے شغل کمرے ہی میں موجود اور ناشتے کے بعد صوفے پر بیٹھا رہا۔ اُس کی معتدل حالت، خوش باشی ہی کا اثر ہوگا کہ جامو اور زورا کے چہروں پر چھایا تکدر بڑی حد تک چھٹ گیا تھا۔

وہ دونوں شغل میں مصروف تھے کہ اُنھیں وہیں چھوڑ کے میں باہر نکل آیا۔ مراد یہی تھی کہ اُن میں سے کوئی جلد، یا بدیر باہر آ جائے گا، اور اُسے مجھ سے بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔ جتنا میں مضطرب تھا، اُتنے ہی وہ دونوں بھی ہونے چاہیے تھے۔ یہی ہوا، چند منٹ بعد جامو باہر آ گیا۔ اُسے اکبر علی خاں کی بیگم کے سانحے کا علم نہیں تھا۔ وہ تو اڈے کی ویرانی کا حال بتا رہا تھا۔

جنبشِ کلام

معن بن زائدہ منصور کے دربار میں آئے۔ آتے ہوئے وہ درمیانے قدموں سے ذرا تیز چلتے ہوئے آئے تھے۔ منصور نے اُن سے کہا، "اے معن! آپ کی عمر دراز ہو گئی ہے۔"

معن نے جواب دیا، "آپ کی اطاعت و فرماں برداری میں اے امیر المومنین!"

منصور نے کہا، "اس کے باوجود آپ کا جسم مضبوط اور طاقت ور ہے۔"

معن نے کہا، "آپ کے دشمنوں کے لیے اے امیر المومنین!"

منصور بولے، "آپ میں ایک خوبی ہے۔"

معن نے کہا، "وہ آپ کو نصیب ہوا ہے امیر المومنین!"

المستطرف، التنوخی ☆ عادل دہلی احمد الحق

کل شام اُن کے اڈے پر واپس پہنچنے کے بعد پولیس دوبارہ عمارت میں گھس آئی، اور بچے کھچے لڑکوں کو پکڑ کے لے گئی۔ کل شام ہی سے پولیس نے اڈے کا علاقہ حصار میں لے رکھا تھا۔ اڈے کی اتنی بڑی عمارت میں صرف جامو اور زورا ہی رہ گئے۔ اڈے سے متعلق کسی بھولے بھٹکے نے آنا چاہا ہوگا تو پولیس کی فصیل عبور کر کے اڈے تک اُس کا پہنچنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ نظر پڑتے ہی پولیس نے اُسے دھر لیا ہوگا، یا پولیس کو دیکھ کے وہ بھاگ نکلا ہوگا۔ جامو اور زورا نے رات بڑے کرب میں گزاری، صبح سویرے ہی اڈے سے نکل پڑے۔ تھوڑی دور جا کے ہی اُنھیں اندازہ ہو گیا کہ گلیوں اور سڑکوں پر گشت خطرناک ہے۔ اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں کہیں اُنھیں عافیت ملی۔ اُنھوں نے وہیں ناشتا کیا اور خاصا وقت گزار دیا۔ لیکن اُن کی منزل اسپتال تھی، اور جگہ جگہ پولیس موجود تھی۔ کئی مقامات پر اُنھیں روک لیا گیا اور پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ کسی جگہ سپاہیوں کو اُن کے بیان پر یقین نہیں آیا۔ وہ اُنھیں ساتھ لے جانے لگے تھے کہ پہلے کی طرح، گشت کرتے ہوئے پولیس کے دستے میں کسی نے پہچان کے رہائی دلوا دی۔ اسپتال ابھی دور تھا۔ وہ تانگے میں بیٹھ گئے۔ باقی راستے میں بھی کئی رکاوٹیں پیش آ سکتی تھیں۔ آگے پولیس کا ایک جھنڈ نظر آنے پر وہ تانگے سے اُتر گئے، اور خود پولیس کے سامنے جا پہنچے۔ اُنھوں نے

اپنی مشکل بیان کی۔ یوں ایک مددگار سپاہی کے ہم راہ کہیں وہ اسپتال پہنچ پائے۔

جامو اپنی بے زری اور وحشت کا ذکر کر رہا تھا کہ راہ داری کے موڑ پر ڈاکٹر راے آتا دکھائی دیا۔ آج اُس کے ساتھ کوئی ڈاکٹر نہیں تھا، نہ ہی کوئی نرس تھی۔ پیچھے البتہ کچھ دوری پر ایک خدمت گار ساتھ چل رہا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میں اُس کی جانب لپک پڑا، میری تقلید میں جامو بھی۔ درمیان میں آمنا سامنا ہو جانے پر ڈاکٹر رک گیا، ہم بھی ٹھہر گئے۔ ڈاکٹر کا چہرہ گہری سنجیدگی کی غمازی کر رہا تھا۔ ہمارے سلام پر وہ لمحوں تک خاموش رہا، پھر میرے بجائے اُس نے ٹوٹی پھوٹی ہندستانی میں جامو کو مخاطب کیا۔

"تم بھی کلکتے سے آئے ہو؟" اُس کی آواز دھیمی رہی تھی۔

جامو نے اضطراری انداز میں سر ہلا دیا۔

"دوسرا کدھر ہے؟"

جامو کی گردن کمرے کی طرف مڑ گئی۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" ڈاکٹر نے پوچھا

جامو کے بجائے میں نے جواب دیا، "[illegible] اندر کمرے میں زورا ہے۔"

"کدھر ٹھہرے ہو تم لوگ؟"

جامو نے میری طرف دیکھا اور ہکلاتے [illegible] "ادھر میدا استاد کے ٹھکانے پر۔"

"وہ جگہ چھوڑ دو،" ڈاکٹر نے تنبیہ کے لہجے میں کہا، "یا تو کلکتے لوٹ جاؤ، یا اپنا کوئی اور ٹھکانا کر لو۔ جس کے لیے تم ادھر آئے ہو، وہ سب ٹھیک ہے۔ تین چار دن میں تم تک پہنچ جائے گا۔"

جامو نے کچھ کہنا چاہا اور خاموش رہا۔

ڈاکٹر نے اُس سے زیادہ بات نہیں کی، اور [illegible] فاصلہ طے کر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بخل کو [illegible] دیکھ کے اُس کے جسم میں لہری اٹھی، آنکھوں کی چمک [illegible] بے اختیار اُس نے انگریزی میں کہا، "یہ تم ہو استاد!"

بخل فوراً کھڑا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کی آواز کی لہک سے [illegible] اُس کا مفہوم سمجھ گیا۔ "سر، آپ کا ہے ڈاکٹر صاحب۔" اُس نے ممنونیت سے کہا۔

ڈاکٹر نے اُسے بٹھا دیا اور خود اُس کے برابر بیٹھ گیا [illegible] اُس نے صبح و شام بخل کے جتنی احوال پر مشتمل کاغذات ڈاکٹر کے سامنے دھر دیے۔ وہ بہ غور اُن کا جائزہ لیتا رہا اور بخل سے کہا، "دو، یا تین دن بعد جا سکتے ہو۔"

"اب بھی جا سکتا ہوں۔" بخل آہستگی سے بڑبڑاتے ہوئے بولا، اور اپنی بے چینی چھپانے میں ناکام رہا۔

"جا سکتے ہو استاد، پر ہم جانے دیں تب..." یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر صوفے سے اٹھ گیا۔ قریب ہی جامو ہاتھ باندھے ہوئے کھڑا تھا۔ ڈاکٹر نے اُس کے پاس رک کے کہا، "تم اپنے [illegible] کے ساتھ شام تک ادھر ٹھہر سکتے ہو۔"

جامو کا چہرہ کھل اٹھا۔ اُس نے ڈاکٹر کے پیر چھونے چاہے تو وہ پیچھے ہٹ گیا اور دروازے کی طرف جاتے جاتے اُس نے ہاتھ ہلا کے مجھے اشارہ کیا، "میرے ساتھ آؤ۔"

پھر چند قدم آگے جا کے کہنے لگا، "میدا استاد حوالات میں مردہ پایا گیا۔ پولیس نے ابھی تک چھپایا ہوا ہے۔"

میرا جسم ڈگمگا گیا اور مجھ سے ڈاکٹر راے کا ساتھ نہ دیا جا سکا۔
وہ بھی ٹھہر گیا اور میری صورت دیکھنے لگا۔ میرا منہ کھلا ہوا تھا، آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ میرا بازو تھام کے اُس نے گہری سانس بھری۔ "مجھے ابھی کچھ دیر پہلے معلوم ہوا ہے۔" وہ آہستگی سے بولا، "چلو، اُدھر چل کے بات کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔"
مجھے نہیں معلوم، اُس کے ساتھ چلتا ہوا میں کس طرح اُس کے دفتر تک پہنچ سکا۔ دفتر آ کے اُس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بے حواسی سے تعمیل کی۔
وہ میرے برابر بیٹھ گیا اور ملازم طلب کر کے مشروبات وغیرہ لانے کا حکم دیا۔ ملازم کے چلے جانے کے بعد وہ بوجھل آواز میں بولا۔ "مجھے بھی یقین آنے میں دیر لگی۔ اُسے، تا غیرت مند شخص ہونا چاہیے تھا، مگر شاید یہ غیرت کی بات نہیں۔"
میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

"ارے تم... تمھیں کیا ہوا؟" میری خاموشی پر اُس نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔
"کچھ نہیں۔" میں نے ہڑبڑا کے کہا۔ "یہ کیا... کیسے ڈاکٹر صاحب؟ آپ کیا..."
"ہاں، یہی کچھ معلوم ہوا ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو ختم کر لیا ہے۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔
"اُس نے خود کو ختم کر لیا؟" میں نے بے ربطی سے کہا۔
"تمھیں دُکھ ہو رہا ہے؟"
اُس کی آواز سینے میں ترازو ہوئی تھی، لیکن اُس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔
"مجھے بھی اسی کا دکھ ہے۔" وہ تلخی سے بولا۔ "مرا بھی اُس درندے نے خود منتخب کی۔"
میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور بہ مشکل زبان کھولی۔

"آپ کو کیا معلوم ہوا ہے؟"
"کچھ زیادہ نہیں۔" وہ بگڑ کے بولا۔ "صبح سویرے اُس کا بے حرکت جسم دیکھ کے اُس کی کوٹھری پر تعینات پہرے دار نے چاہا کہ وہ سو رہا ہے، لیکن پھر پہرے دار کو شبہہ ہوا۔ اُس نے آوازیں دیں اور دوسرے سپاہی بلا لیے اور لمحوں میں اُن پر حقیقت کھل گئی۔ اُس نے شیشہ چبا لیا تھا، یا اُس کے پاس زہر تھا۔ گلے میں پڑی مالا کے ٹوٹے چھوٹے دانے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ خون کی لکیر ہونٹوں پر جمی ہوئی تھی۔ یہ تو زہر خوری کی علامت لگتی ہے۔ اصل بات تو، بہرحال، تفتیش کے بعد معلوم ہو ہی جائے گی۔ کیا اڈے کے لوگ زہر بھی اپنے پاس چھپا کے رکھتے ہیں؟" اُس نے جھنجھلائی ہوئی آواز میں پوچھا، "میرا مطلب ہے، حفظِ ماتقدم کے طور پر۔"
"مجھے نہیں معلوم، میرا خیال ہے، نہیں۔ میں نے کبھی نہیں [illegible]... اڈے کے لوگ اتنے بودے نہیں ہوتے۔"
"وہ اڈے سے اوپر کا آدمی تھا۔"
"[illegible] لوگ تو آخر تک اپنی جنگ لڑتے ہیں۔"
"[illegible] ہجرت کرتے ہیں، مگر کسی میدان پر... جب [illegible] ہو گیا ہو"
ڈاکٹر ترش آواز میں بولا، "میں نے تمھیں بتایا تھا۔ یہ شہر کی پولیس نہیں تھی۔ تمھارے بہ قول، شہر کی پولیس سے اڈے کے لوگوں کی ایک رسم و راہ ہوتی ہے۔ یہ دوسرے شہر کے سپاہیوں اور افسروں پر مشتمل پولیس تھی، بالکل اجنبی۔ اُس نے میدا کے بجائے اُس کے قریب ترین ساتھیوں سے بازپرس کا آغاز کیا۔ اُنھیں ایک دوسرے سے الگ رکھا گیا تھا۔ تمھیں حیرت ہو گی، مجھے بتایا گیا ہے کہ میدا کا خاص مربی، مشیرِ اوّل اور دستِ راست مجو دادا ہی سب سے ناتواں ثابت ہوا۔ ذرا سی ذہنی تنبیہ سنا ہے، پولیس کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ کچھ پولیس کے حصار، اُس کے تیور دیکھ کے مجو دادا کا حوصلہ پست ہوا۔ پھر پولیس نے وعدہ معاف گواہ کی صورت میں زندگی کی اُمید جگائی تو اُس عمر رسیدہ سے کچھ نہاں نہ رکھا گیا۔ میدا کے دوسرے معتمدین کے آگے جب مجو دادا کے اعترافات کا گوشوارہ پیش کیا گیا تو تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں مار کے اُنھوں نے بھی سپر ڈال دی۔ پولیس نے پہلے میدا کے وفاداروں، جاں نثاروں سے حاصل کی ہوئی شہادتوں کی راتوں رات تصدیق کی، پھر اُس کی کوٹھری کا رُخ کیا اور ساری رُوداد سامنے رکھ دی۔ بڑے پولیس افسر وہاں موجود تھے۔ حتیٰ کہ کوئی عدالتی کارندہ بھی طلب کر لیا گیا تھا۔ میدا پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اُس نے کوئی بحث نہیں کی۔ دستخط کرنے اُسے آتے تھے، انگوٹھا بھی اقرار نامے پر ثبت کرا لیا گیا۔ یاد ہے، میں نے کیا کہا تھا؟"
"جی... جی ہاں۔" میں نے بوکھلا کے کہا۔
کل ہی ڈاکٹر راے نے اُستاد میدا کے بارے میں راے زنی کی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ کوئی دور نہیں، شہر کے اڈے کی چوکی کا نگراں، وہی ایک آدمی سارے المیوں کی بنیاد لگتا ہے۔ مجھے ختم کرنے کے لیے اُسی نے اسپتال میں مسلح آدمی بھیجے تھے جن کی زد پر اسپتال کا نوجوان ملازم انتولی آ گیا۔ میدا کو باور ہو گیا تھا کہ بھائی کی صحت یابی کے بعد میں اپنا حق واپس لینے اڈے ضرور آؤں گا، اور اُس کی ہزیمت کا نتیجہ رسوائی کے علاوہ اڈے پر برسوں کی عمل داری کا خاتمہ بھی ہے۔ اپنے پہلے اقدام کی ناکامی پر مجھے منتشر کرنے کے لیے اُس نے اکبر علی خاں کو ختم کر دیا کہ اکبر علی خاں اور میری قرابت کی وجہ سے سب سے پہلے پولیس میری ہی جانب قدم بڑھائے گی۔ کسی طور پر پولیس کے نرغے میں آ جاتا ہوں تو کسی بھی وقت آسانی سے اُس کا نشانہ بن سکتا ہوں، یا پھر ایک لمبی مدت تک پولیس اور عدالت کے شکنجے میں تو جکڑا رہوں گا، اور وہ میرے خلاف اپنے نمک خوار پولیس والوں کی ڈوریں ہلاتا رہے گا۔ میدا کو توقع نہیں تھی کہ پولیس مجھے آزاد کیے رکھے گی۔ دوسری بار ناکامی کے بعد پھر بھی ایک صورت رہ جاتی تھی کہ وہ کسی اور طرح مجھ پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرے۔ اُس نے اپنے تین آدمیوں کی قربانی دے کے اُن کی لاشیں اُسی جگہ پھنکوا دیں جہاں اکبر علی خاں کا خون ہوا تھا اور یوں یہ تاثر دینا چاہا کہ میدا اُستاد پنا شہر کے اڈے کا ایک سچا اور کھرا آدمی ہے۔ اپنے علاقے میں وہ ایسی ہٹ دھرمی، دھاندلی برداشت نہیں کر سکتا۔ اکبر علی خاں کے معاملے پر اُس کا سر جھک گیا ہے، اور ندامت کا یہ عالم ہے کہ اب وہ میرا چاقو واپس کر کے اور

اڈّے سے دست برداری کا اعلان کرنے آ گیا ہے۔ اُسے احساس ہے، یہ کوئی تلافی تو نہیں، لیکن وہ یہی کر سکتا تھا کہ اکبر علی خاں کے قاتلوں کو جتنی جلد ممکن ہو، انجام سے دوچار کر دے۔ میدا کو اندازہ ہو گیا کہ اڈّے کی چوکی مجھے مطلوب نہیں ہے۔ اُس کی پسپائی اور پشیمانی کے اِس بے پناہ اظہار پر مجھے پگھلنا چاہیے اور اعلیٰ ظرفی یہی ہے کہ پھر اڈّا بھی اُسی کے حوالے کر دیا جائے۔ میں نے یہی کیا۔ میں ایسا نہ کرتا تو بھی اسپتال سے فارغ ہو جانے کے بعد میرے ممکنہ قہر و غضب سے میدا کسی امان کی توقع تو کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر راے کی ایک ایک بات مجھے یاد تھی۔ اُس کی دیدہ وری میں کیا کلام تھا۔ گو اُس نے اپنا تجزیہ فسانہ طرازی پر محمول کیا تھا، لیکن جہاں دیدگاں کا یہی شیوہ ہوتا ہے کہ اپنے قیاس اور مفروضوں میں وہ شک کی ایک گنجائش ضرور رکھتے ہیں، اپنے تجزیوں پر اصرار نہیں کرتے اور حتمی، یا آمرانہ انداز سے اجتناب کرتے ہیں۔ کچھ بھی بے تسلسل، بے ربط اور بے جواز نہیں لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی زبانی یہ فسانوی خاکہ سن کے میری رگیں کھنچنے اکڑنے لگی تھیں۔ اُسی وقت سے مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ آنے والے روز و شب میں تصور سے بعید کچھ بھی سننے اور دیکھنے سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔

"میدا نے اعتراف کر لیا ہے کہ اُسی نے اکبر علی خاں کو...؟" میں نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے پوچھا۔

"اور تم نے کیا سنا؟" وہ برہمی سے بولا، "اُس نے... اُس نے تسلیم کر لیا ہے سبھی کچھ، یہ میں کہہ رہا ہوں۔ اور اب بھی کوئی شبہ ہے تمھیں؟"

"مگر کیوں؟ کیوں ڈاکٹر صاحب؟ اکبر علی خاں بیچ میں کہاں آتے تھے۔" میری آواز ڈوب رہی تھی۔

"یہ تو اُسی سے پوچھیے۔" ڈاکٹر شکستگی سے بولا۔ "آدمیوں میں بھی آدمی کہاں اور کتنے ہوتے ہیں۔ وہ آدمی ہی کتنا تھا۔ کچھ لوگ نام کے آدمی ہوتے ہیں، بہ ظاہر آدمی، بہ باطن جان ور، بھیڑیے، گدھ... اُس جنگلی نے ایک بالکل غیر متعلق آدمی کو مار دیا۔ کچھ بھی نہیں سوچا، ذرا سا بھی خیال نہیں آیا اُسے کہ کس کا نشانہ لے رہا ہے... کون ہے، وہ شخص... اُس کا ایک گھر ہے۔ بیوی بچے ہیں۔ کیسا شخص اُٹھا لیا ہے وہ..." ڈاکٹر راے آہیں بھرنے لگا اور بولا، "مجھے اکبر علی خاں سے ملاقات کا بہت کم موقع ملا، لیکن انھیں دیکھ کے احساس ہوا تھا، اِس شہر میں رہتے ہوئے کیسے عمدہ شخص سے محروم رہا ہوں۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ اب ملاقاتیں رہیں گی۔ اور یہ کوئی رسمی بات نہیں تھی۔ وہ اُن لوگوں میں تھے جن سے دوبارہ ملنے کی خواہش ہوتی ہے... اور وہ اپنا انتونی۔ وہ بھی بہت یاد آتا ہے۔ بڑا پیارا اور جوشیلا لڑکا تھا۔ اُس نادان نے فرار ہوتے ہوئے لوگوں کے آڑے آنے کی حماقت کی تھی مگر اکبر علی خاں کس کے راستے کی رکاوٹ بنے تھے... دو خاندان اُجڑ گئے اُس کمینے کی وجہ سے... اور وہ آسانی سے مر گیا۔"

ڈاکٹر کی دل دوز باتوں سے میرا سینہ کٹ سا رہا تھا۔ دیر تک ہم دونوں سر جھکائے چپ بیٹھے رہے۔ خدمت گار کی آمد پر ڈاکٹر سیدھا ہو گیا۔ خدمت گار نے چاے بنانی چاہی تھی کہ ڈاکٹر نے اُسے واپس کر دیا اور خود چاے بنانے لگا۔ مجھے اُس کا ہاتھ روک کے یہ خدمت انجام دینی چاہیے تھی، لیکن میرے ہاتھ پیر ہی اینٹھے ہوئے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" اُس نے بہ شگفتگی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے ناتوانی سے کہا۔

"ہاں، اب کہنے کو رہ بھی کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو چلے گئے اُس جان ور کے اُٹھ جانے کے بعد واپس تو نہیں آ سکتے۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔

"آج کسی وقت اکبر علی خاں کی بیگم کی تدفین ہو جائے گی۔" ڈاکٹر یاسیت سے بولا، "اُدھر ڈاکٹری سند اور دیگر تحقیقات مکمل ہونے تک پولیس رازداری برت رہی ہے۔ ظاہر ہے، پولیس کو خدشہ ہو گا کہ اُس پر زیادتی اور ظلم کا کوئی الزام نہ آ جائے حالاں کہ میدا اور اُس کے ساتھیوں کے اعتراف کے وقت اُس نے اپنے طور پر ساری احتیاطیں کر لی تھیں، لیکن میدا کے واقعے سے معاملہ پیچیدگی اختیار کر گیا ہے۔ غفلت اور تشدد کے الزامات پولیس پر عائد کیے جا سکتے ہیں، اور زیادہ دیر تک میدا کی خبر روکے بھی نہیں رکھی جائے گی۔ اکبر علی خاں کی بیگم کالج میں پڑھاتی تھیں اور فلاحی کاموں میں بھی حصہ لیتی تھیں۔ پولیس کے خیال میں ایک بڑا ہجوم جنازے کے ساتھ ہو گا۔ طلبہ ویسے ہی مشتعل ہیں۔ اکبر علی خاں کے قاتلوں کی گرفتاری تک۔ اُنھوں نے کلاسوں میں جانے سے پہلے ہی انکار کیا ہوا ہے۔ کاروبار کئی دن سے ٹھپ پڑا ہے۔ بیگم کی ناگہانی مستزاد ہوئی، شہر میں سلگتی آگ اور بھڑک سکتی ہے۔ اسے فرو کرنے، لوگوں کا غم و غصہ اور خوف کم کرنے کے لیے پولیس کو میدا کے اعتراف اور اُس کے انجام کی خبر تدفین سے پہلے عام کرنی ہو گی۔"

ڈاکٹر خود کلامی کے انداز میں جانے کیا کیا قیاس آرائیاں کرتا رہا۔ میں نے کچھ سنا، کچھ نہیں۔ میرے سامنے چاے کی پیالی رکھی تھی۔ "تم نے چاے نہیں لی؟" اُس نے میری کمر تھپکتے ہوئے کہا، "ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

میں نے بہ عجلت پیالی اُٹھا کے منہ سے لگا لی۔ ابھی کچھ گرم تھی۔ حلق چیرتے ہوئے دو چار گھونٹوں میں پیالی خالی ہو گئی۔

"ابھی شہر کے معتدل ہونے میں وقت لگنا چاہیے اور میدا کی بات پہ یقین آنے میں... افواہوں کا ایک بازار گرم ہو گا۔ ایک عرصے سے یہاں اُس کا راج تھا۔ شہر میں ایک دوسری حکومت کے مانند۔ کتنے لوگ اِس راج پاٹ سے بالواسطہ طور پہ بھی وابستہ ہوں گے، [illegible] کا کیا بنے گا۔ گرفتار کچھ لوگ تو جلد ہی چھوڑ دیے جائیں گے... دیکھو، آگے کیا ہوتا ہے۔ پہلے جیسی اڈّے کی سلطنت قائم ہونے میں ایک وقت لگ جائے گا اور شاید کبھی نہ ہو پائے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟"

"جی، جی ہاں۔" میں نے کھوئی ہوئی آواز میں کہا۔

"تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

"میں، میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر صاحب!" میں نے خود کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ سارا کچھ بہت..."

"ہاں، بہت عجیب ہے۔" وہ میری بات کاٹ کے بولا، "عجیب اور حیران کن، المناک بھی۔ اِتنی تیزی سے صورتِ حال یہ شکل اختیار کر لے گی، اِس کی توقع نہیں تھی۔"

میں نے کہنا چاہا، "اِتنی تیزی سے تو یہ سارا کچھ اُسی کی وجہ سے ممکن ہوا ہے،" لیکن میں نے زبان بند رکھی۔

"مگر ایسا غلط بھی کیا ہے۔" وہ کسمسا کے بولا، "مآلِ کار تو یہی ہونا چاہیے تھا۔"

"ہونا تو کچھ نہیں چاہیے تھا۔" میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔

"بے شک، مگر بدقسمتی سے جو ہو چکا تھا، اور جن لوگوں کی وجہ سے ہوا تھا، انھیں باقی رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ بہ ہر حال، اب تمھیں... تمھیں پُرسکون ہونا چاہیے۔"

"جی ہاں۔"

ڈاکٹر ایک حساس آدمی تھا۔ میرے لہجے کی تلخی اُسے محسوس ہوئی ہوگی۔ کہنے لگا، "میری مراد ہے، اب پولیس وغیرہ کی اُلجھنوں سے تم آزاد ہو۔ گو آزادی کا یہ احساس بہت سے
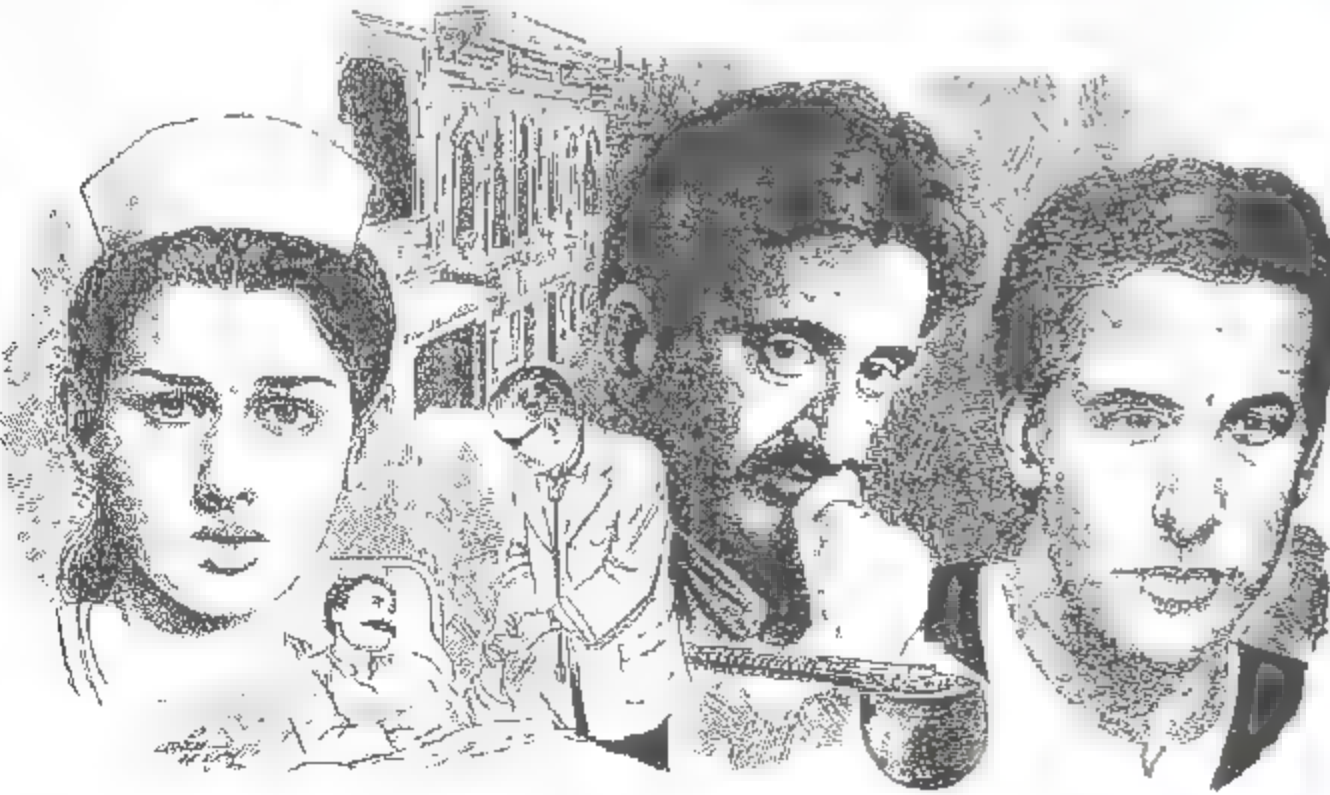
دُکھوں سے آلودہ ہے، مگر تمھاری کوئی لغزش یا نادانی مجھے نظر نہیں آتی۔ تمھیں بھائی کے پاس پہنچنے کی بے چینی تھی، اور راستے بند کر دیے گئے تھے۔ پناہ کے لیے تم کسی گھر میں داخل ہو گئے، بے سوچے سمجھے۔ اتفاق سے وہ گھر اکبر علی خاں کا تھا۔ پھر کوئی چارہ نہ دیکھ کے تم نے انتہا پسندانہ فیصلہ کیا کہ تمھیں خود میدا کے پاس جا کے اُس سے نبرد آزما ہو جانا چاہیے۔ کسی نادانی میں تم نے یہ قدم اٹھانے کا ارادہ کیا ہوگا۔ تمھارے نہ چاہتے ہوئے اکبر علی خاں تمھارے ساتھ ہو گئے۔ اُن کی بھی کوئی غلطی نہیں تھی۔ وہ ایک باوضع اور دردمند شخص تھے۔ کاش وہ تمھارے ساتھ نہ جاتے، میدا کے ٹھکانے پر تمھارے ساتھ جو کچھ ہوتا، اُسے تم ہی بھگت لیتے، تم تو اکیلے ہی جانا چاہتے تھے، اور اکبر علی خاں تمھارے وکیل اور طرف دار کی حیثیت سے اُس بدباطن کے سامنے نہ آتے تو اُن کا وقت بھی نہ آ پاتا۔ یہ سارا اتفاقات کا سلسلہ ہے عزیز من! اِس میں تم سے کہاں کوتاہی ہوئی۔"

"کوتاہی تو میری ذات کی ہے ڈاکٹر صاحب! میں کبھی ایسا نہیں چاہتا، مگر جانے کیا ہو جاتا ہے۔" میری آواز بھرا گئی۔ "لوگ مر جاتے ہیں، گھر برباد ہو جاتے ہیں، ایک جگہ نہیں، کتنی جگہ یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ آپ نے اکبر علی خاں کا گھر نہیں دیکھا، میں نے دیکھا ہے۔ کوئی مثالی گھر ہی ایسا ہو سکتا ہے، کیسے خوش و خرم زندگی کی اُمنگیں لیے ہوئے لوگ، شائستہ، علم دوست، ایک دوسرے پر مرمٹنے والے، لوگوں کے کام آنے والے، اور پر وہ گھر سامنے آ جاتا ہے۔ اور میری آنکھیں بہت جلتی ہیں، کہتے ہیں، بعض لوگوں کے قدم ہی نحس ہوتے ہیں۔ میں اُنھی لوگوں میں ہوں۔"

"ہا، کیا فضول بات کرتے ہو۔" اُس نے مجھے جھڑک دیا، پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ "یہ لغو گوئی تم سے مطابقت نہیں رکھتی۔ تم ایک سچے اور بہادر نوجوان ہو، تم نے کب کسی کا برا چاہا تھا۔ وہ تو کڑی سے کڑی ملتی گئی اور جس کی وجہ لازماً تم نہیں تھے۔ تمھارا مقابل تو ایک دوسرا آدمی تھا، وحشی، جنونی۔ یہی افسوس ہے کہ ایسے پیچ کو تو کتوں کے آگے ڈال دینا چاہیے۔ میں سوچتا ہوں تو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ وہ کتنا بڑا بہروپیا تھا، صرف اپنے آپ سے واسطہ رکھتا تھا، کسی طور سے سہی، اُسے اپنی دل دہی سے غرض تھی۔" میری تائید و تردید سے کیا فرق پڑتا۔ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

"مجھے جانا چاہیے۔" یکایک اُسے بے کلی سی ہوئی۔ اُس نے دستی گھڑی دیکھی اور بولا۔ "چند مریض دیکھنے ہیں، انتظار کر رہے ہوں گے۔ تم یہاں بیٹھنا چاہو تو بیٹھو۔ مجھے واپس آنے میں ایک ڈیڑھ گھنٹا لگ سکتا ہے۔ صبح آنے والے پولیس افسر سے میں نے کہا تھا کہ وہ تفصیلات سے آگاہ کرنے کے لیے ایک بار پھر زحمت کرے۔ آئی جی کی ہدایت پر صبح وہ بہت کم وقت کے لیے آیا تھا، کسی بھی وقت وہ دوبارہ آ سکتا ہے لیکن اب کیا، جزئیات سے کیا دلچسپی۔ مجھے تو تمھارا خیال تھا، شکر ہے، سچ شرمندہ نہیں ہوا۔" وہ صوفے سے اُٹھ گیا تھا۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ "تم جا رہے ہو؟" اُس نے بے ریگانہ تیور سے پوچھا۔

"جی ڈاکٹر صاحب!" میں نے مؤدب لہجے میں کہا۔

"ہاں، یہی ٹھیک ہے۔ اُدھر بھائی کے پاس جاؤ، اور دیکھو اُسے ابھی کچھ نہ بتانا، اُس کے پاس موجود اپنے ساتھیوں کو بھی تاکید کر دینا۔ میں دوپہر آنے کی کوشش کروں گا، یوں اب ایسی ضرورت بھی نہیں۔ وہ تیزی سے صحت کی طرف ما[illegible] تم بھی اب اپنا بار کم کرو، یہ شانے سیدھے کرو۔" دروازے سے نکلتے ہوئے وہ بولا۔ "تمھارے دوسرے ساتھی کو بھی رات تک کمرے میں ٹھیرنے کی اجازت دی گئی تھی، لیکن میں سمجھتا ہوں، اب اُن کا میدا کے ٹھکانے پر واپس جانا مناسب نہیں، کمرے میں رات کو صرف ایک تیماردار، مریض کے ساتھ رہ سکتا ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں، وہ کسی سرائے، ہوٹل میں ٹھیر جائیں گے۔ ایک دو روز کی بات ہے۔"

وہ سوچنے لگا، پھر بولا۔ "اُن دونوں کے لیے اسپتال ہی میں کوئی انتظام کرنا چاہیے۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اُن کا؟"

"جامو اور زورا۔" میں نے نیچی آواز سے کہا۔

"اڈے ہی کے لوگوں کے نام معلوم ہوتے ہیں۔" وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ "میرا خیال ہے، وہ اب اُس طرف کا سوچیں ہی نہیں۔ اُن کا جو سامان اسباب وہاں رکھا ہے، اُس پر خاک ڈالیں۔ میدا کے علاقے میں بڑی کشیدگی ہوگی۔ پولیس سارے شہر میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہاں تو چپے چپے پر ہوگی، اور اب یہی کہا، وہ آج باہر بھی نہ نکلیں، بیگم اکبر علی خاں کے جنازے پر جانے کیسے حالات ہوں۔ حالاں کہ اُس سے بدتر کیا ہوگا جو گزشتہ دنوں ہو چکا ہے۔"

اسپتال کی مرکزی عمارت کے استقبالی وسیع و عریض ہال میں مجھے چھوڑ کے وہ ہاتھ ہلاتا ہوا ایک جانب چلا گیا۔ کچھ دیر میں وہیں کھڑا رہا۔ اب گنتی کے چند سپاہی وہاں نظر آتے تھے۔ اسپتال کے اندرونی حصوں میں بھی اُن کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔

سورج آسمان کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔

جامو، زورا اور مُغل کمرے کے باہر راہ داری کے سائے میں کرسیوں پر یوں بیٹھے ہوئے تھے، جیسے اپنے گھر کے کسی گوشے میں۔ کرسیوں کے سامنے رکھی بیضوی میز بسکٹوں، پھلوں کی تشتریوں اور چائے کی پیالیوں سے بھری تھی۔ [illegible] مخصوص نئے دُھلے ہوئے لباس میں مغل خاصا [illegible] نظر آ رہا تھا۔ پہلے زورا نے مجھے دیکھا اور بے قرار ہو گیا۔ "[illegible] بھائی۔" وہ نعرہ لگاتے ہوئے اُٹھا اور آدھے راستے میں مجھے جا لیا، اور بے تحاشا گلے سے لپٹ گیا۔ "ابھی [illegible] اتنی دیر ہو گئی؟"

"ڈاکٹر صاحب نے روک لیا تھا۔" میں نے اُس کے جوش و خروش کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔ "مغل بھائی بھی تو بہت ٹھیک لگتے ہیں۔"

"ایک دم فٹ فاٹ، چیچک ما لک۔ لگتا ہی نہیں۔ اِتنے دن بستر سے چپکا پڑا تھا۔ دیکھ! نہیں رہے؟" وہ چہک کے بولا۔ چند قدم بعد ہم اُن تک پہنچ گئے۔ زورا سبزہ زار سے میرے لیے کرسی اُٹھا لایا۔ پہلے مجھے بٹھایا، پھر خود بیٹھا۔

ڈاکٹر رائے کے پاس سے میرے آنے کے بعد مغل کو ایک سوال کی تکرار کا عارضہ ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر نے اُس کے بارے میں کچھ نیا تو نہیں کہا ہے۔ میں نے حسبِ معمول اُسے مطمئن کرنا چاہا کہ ڈاکٹر نے اطمینان ظاہر کیا ہے اور ایک دو دن بعد چھٹی کر دی جائے گی۔

"ایک دو دن کیوں؟" وہ خشونت سے بولا۔

میرے بجائے جامو نے رسانی سے کہا۔ "ٹھیک ہے اُستاد! ایک کون سی گاڑی چھوٹ رہی ہے سائیں۔ کچھ سوچ سمجھ کے ہی ڈاکٹر بولتا ہوگا۔ اُس کو مریض پاس اٹکائے رکھنے کا شوق تو نہیں ہوگا۔"

مغل کی پیشانی سکڑ گئی، اور وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"تیرا منہ کیوں پھولا ہوا ہے رے؟"

میرا جسم اکڑ گیا۔ "مجھے کیا ہوا ہے؟"

"ہاں راجا بھائی!" زورا نے بے ساختہ مغل کی ہم نوائی کی۔ "ماں قسم، ہم کو بھی تھوڑا اُکھڑا ہوا، بندھا ہوا لگتا ہے۔ بولو، کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے چڑ کے کہا۔ "کیا بات ہوتی؟"

اُنھیں مجھ پر یقین نہیں آیا۔ تینوں کی نظریں مجھ پر منڈلانے لگی تھیں اور مجھے خود کو چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔

"ڈاکٹر نے کچھ بولا؟ ٹھیک ٹھیک بول۔" مغل نے دھمکی اور شبہ بھری آواز میں پوچھا۔ "اپنے کو فرق نہیں پڑتا۔"

"نہیں پڑتا تو کرید کیوں کر رہے ہو؟" میں نے ناراضی سے کہا۔ "کیا سمجھ رہے ہو تم، میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ شام کو وہ آئے تو خود پوچھ لینا اور کاغذ پر دستخط کروا لینا۔"

آدمی کا اپنے ہاتھ پر، اپنی زبان اور حرکات و سکنات پر قابو ہو سکتا ہے، لیکن چہرے کے آتے جاتے رنگوں پر اختیار کے لیے بہت مہارت اور قدرت چاہیے۔ ہر دانا اور ذہین آدمی میں شک کی ایک خوبی یا خامی بدرجۂ اتم ہوتی ہے۔ میں ڈاکٹر کے پاس سے آ رہا تھا۔ میرے غبار آلودہ چہرے سے مغل کے سر میں وہم و گمان کا بلا لے جا رہے تھے۔ میرا دماغ بھٹکا ہوا تھا اور مغل کی دل جوئی کے لیے کوئی شافی عذر نہیں سوجھ رہا تھا، مگر جامو یا کا معاملہ فہم تھا۔ بات بدلنے کے لیے اُس نے مجھے چائے کی پیش کش کی۔ مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں تھی۔ میرا تو دل ہی ٹوٹ رہا تھا، لیکن میں نے منع نہیں کیا اور مجھے یاد آیا، ابھی صبح کے دورے پر ڈاکٹر نے از خود مغل کو دو تین دن بعد رخصت مل جانے کا مژدہ سنایا تھا۔ مغل سے بے خبر ہو جانے کے بعد اب دوبارہ کچھ یاد دلانا یا یہ ذکر چھیڑنا بے محل تھا۔ ویسے بھی سنگین بیماری سے اُٹھنے اور معمول کے خلاف اتنے دن کاٹنے کے بعد تنگ مزاجی اور زود رنجی کی ایک رعایت ز[illegible]

صحت شخص کا حق ہوتی ہے، سو میں نے حجت نہیں کی۔ ٹکوزی سے ڈھکی کیتلی سے جامو نے میرے لیے اہتمام سے چائے بنائی، ورزور نے بسکٹ کی تشتری آگے رکھ دی۔ بتھل کا تکدر دور کرنے کے لیے مجھے کچھ اسی قسم کے مثبت رویے کا تاثر دیتے رہنا چاہیے تھا۔ میرے آنے سے پہلے جامو کلکتے کی رُوداد سنا رہا تھا۔ زورا کے اشتیاق پر اُسے بات جاری رکھنے کا بہانہ مل گیا۔ زورا کے اشتیاق کا اظہار بھی دانستہ ہوگا۔ دونوں کا مقصد بتھل کی توجہ مبذول کیے رکھنا تھا۔ ہرچند انھیں میدا کی خبر سنانے کے لیے میں بری طرح مضطرب تھا لیکن سر دست یہ ممکن نہیں تھا۔

میں چوں کہ ان کے درمیان موجود نہیں تھا، اس لیے جامو نے مختصر طور پر پس منظر سے مجھے آگاہ کیا۔ اُس نے بتایا، کلکتے میں بنگھا نامی نوجوان ایک روز اڈّے پر وارد ہوا اور اڈّے سے وابستگی کی درخواست کی۔ جے پور کا وطنی تھا، صاف ستھرا شکل وصورت میں اچھا بھلا، قد میں اُٹھا، جسم کا گٹھا ہوا، ہاتھ پیر کا مضبوط، تیوروں میں بانکا، کم گفتار اور کچھ لُٹ الگ، کھویا کھویا نظر آتا تھا۔ جامو نے قبولیت میں عجلت نہیں کی۔ کئی دن تک اچھی طرح دیکھا بھالا، پرکھا اور چاقو پر گرفت اور تل کی آزمائش کے بعد ہی بھرتی۔

عشرے کے قریب گزرا ہوگا کہ ایک رات سونا گاچھی کے بازار کے چودھری کا قاصد ہانپتا کانپتا اڈّے آیا اور دہائیاں دیں کہ کانتا بائی کے بالا خانے میں بنگھا نے اُدھم مچایا ہوا ہے۔ معلوم ہوا، جب محفل گرم تھی اور حسن و جمال میں بے مثال، دور دور تک مشہور مینا رقص کر رہی تھی کہ بنگھا نے بالا خانے میں داخل ہو کے مینا کو آغوش میں بھر لیا اور بوسوکی کی۔ اُسے روکنے کی کوشش کی گئی تو اس نے چاقو نکال لیا اور محفل میں موجود شائقین کو دھمکی دی کہ وہ سارے وہاں سے چلے جائیں، مینا صرف اُس کی ہے، اور آج کے بعد کسی کے سامنے گائے گی، نہ ناچے گی۔ عام لوگ کانتا بائی کے بالا خانے کا رُخ کم ہی کیا کرتے تھے کہ صاحبِ ثروت ہی مینا کی دل رُبائی اور عشوہ طرازی کے متحمل ہو سکتے تھے۔ محفل میں اُس وقت شہر کے بااثر لوگ موجود تھے۔ بنگھا کی چاقو نمائی پر وہ آگے پیچھے فرار ہو گئے اور اُن میں سے کسی نے بالا خانے سے اُترتے ہی پولیس کو مطلع کر دیا۔ بازار کے چودھری نے پولیس کے علاوہ اڈّے کی طرف قاصد بھیجا تھا کہ بہ قول کے اڈّے کا معاملہ تھا اور بنگھا کا تعلق اڈّے سے مسلّم ہو چکا تھا۔ اُدھر بنگھا کی دیوانگی بڑھتی گئی۔ وہ مینا کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اُس کی دست درازی سے نازک اندام مینا ایسی دہشت زدہ ہوئی کر بے ہوش ہو گئی۔ اڈّے کے آدمی پہنچنے سے پہلے پولیس بالا خانے پہنچ گئی، بڑی مشکل سے بنگھا کو قابو میں کیا اور ساتھ لے گئی۔

تین چار دن بعد جامو کی سفارش پر بنگھا کو چھوڑ دیا گیا۔ جامو اُسے اڈّے لے آیا اور سورج غروب ہونے سے پہلے شہر سے نکل جانے اور دوبارہ اپنی صورت نہ دکھانے کا حکم دیا۔ جواب میں بنگھا نے چاقو کھول لیا۔ جامو کے کہنے کے مطابق اُس نے حکمِ عدولی کی اور کہا کہ اڈّے پر اور بھی چاقو باز ہیں، پہلے وہ اُن سے پنجہ آزمائی کر کے حوصلہ نکال لے۔ ضرورت پڑی تو جامو بھی سامنے آ جائے گا۔ جامو نے جمرو کو اُس کے آگے کھڑا کر دیا تھا، لیکن بنگھا نے جامو کی پیش کش کم زوری پر محمول کی اور کہنے لگا کہ وہ تو اب اڈّے کی چودھری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جامو نے بہت اُس کی ہرزہ سرائی برداشت کی۔ بنگھا نہیں مانا، للکارتا رہا تو جامو کو اُٹھنا پڑا اور نتیجہ وہی ہوا، جو ہونا چاہیے تھا۔ زیادہ وقت صرف نہیں ہوا۔ جامو نے تین چار پھیروں میں بنگھا کو تہی دست کر دیا، اور فرش سے اُس کا چاقو اُٹھا کر اور اُس کی طرف اُچھال کے ایک اور موقع دینا چاہا، لیکن بنگھا نے چاقو گرفت میں نہیں لیا، بل کہ ٹھوکر مار کر جامو ہی کی طرف لوٹا دیا اور سر جھکائے اڈّے سے نکل گیا۔ جامو کے اشارے پر جمرو نے اُس کے پیچھے جا کے کچھ رُپے اُس کی جیب میں ڈال دیے تھے کہ واپسی کے سفر کے لیے اُس کے پاس زادِ راہ ہو، نہ ہو۔ بنگھا نے ایک نظر جمرو کو دیکھا اور جیب سے رُپے نکال کے سڑک پر پھینک دیے اور آہستہ قدموں سے دور ہوتا رہا۔ جمرو نے پھر اُس کا تعاقب نہیں کیا۔

اڈّے کے آدمیوں نے سمجھ لیا تھا کہ بنگھا کا قصہ تمام ہو گیا ہے۔ رات کی ابھی ابتدا تھی، اڈّے پر کسی نے آ کے اطلاع دی کہ کانتا بائی کے بالا خانے پر خون ہو گیا ہے۔ جامو نے صورت حال جاننے کے لیے فوراً آدمی دوڑائے۔ ایک ہجوم وہاں موجود تھا اور شور مچا ہوا تھا۔ پولیس نے علاقے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ اڈّے کے آدمیوں کو اندر جانے سے روک دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ایک نہیں، تین خون ہوئے ہیں۔ بعد کو بعض شاہدوں نے بتایا کہ سورج غروب ہو چکا تھا اور بالا خانے میں موجود ہر کوئی رات کی بزم آرائی کے اہتمام میں مصروف تھا۔ سازندے آ چکے تھے، شمعیں روشن کی جا رہی تھیں اور لڑکیاں سج بن رہی تھیں۔ مینا بھی تیار ہو رہی تھی۔ اچانک بنگھا بالا خانے میں نمودار ہوا۔ سازندوں نے مزاحمت کی۔ بنگھا انھیں دھکیلتا ہوا اندر بڑھتا گیا۔ پہلے کانتا بائی سے اُس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ کانتا نے شور مچانا شروع کیا تھا کہ بنگھا کی ضرب سے دور جا پڑی۔ بنگھا مینا کے پاس پہنچ گیا اور ساتھ چلنے کی عاجزی کی۔ پھر چاقو نکال کے کہا کہ مینا نہیں مانی تو وہ اُسے ختم کر دے گا۔ مینا نے اِدھر اُدھر چھپنے کے جتن کیے، دوسری لڑکیوں کے پاس پناہ حاصل کرنی چاہی، لیکن سبھی کا بُرا حال تھا۔ بالا خانے کے باہر لے جانے کے لیے بنگھا پلٹ گیا تھا کہ [illegible] مزاحم ہوئی۔ بنگھا نے چاقو چلا کے اُسے دور کیا اور قریب [illegible] سے چادر اُٹھا کے مینا کا جسم ڈھانپنے کی کوشش کی اور [illegible] پھڑ پھڑاتی مینا اُس کے قبضے سے نکلنے میں [illegible]۔ وہ سیدھی دوسرے کمرے کی طرف بھاگی اور دروازہ بند کیا چاہتی تھی کہ بنگھا وہاں پہنچ گیا اور اندر کمرے میں جا کے اُس نے دروازہ بند کر لیا۔

کچھ دیر مینا کی سسکیاں سنائی دیتی رہیں، پھر خاموشی چھا گئی۔ خاصی دیر بعد پولیس دروازہ توڑ کے کمرے میں داخل ہوئی تو دونوں خون میں لت پت پڑے تھے، دونوں ختم ہو چکے تھے۔

اُس رات جامو اور اڈّے کے کئی لوگوں کو تھانے طلب کر لیا گیا۔ رات بھر تفتیش ہوتی رہی، مگر یہ محض خانہ پُری تھی۔ جامو کے پاس بنگھا کے بارے میں پولیس کو مطمئن رکھنے کے لیے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ صبح کاذب کے وقت اُنھیں اڈّے واپس جانے کی اجازت مل پائی۔

بنگھا کا لاشہ مُردہ خانے میں رکھ دیا گیا۔ کلکتے میں کوئی اُس کا پُرسانِ حال نہیں تھا۔ پہلے جے پور، پھر پٹیالا پولیس سے کلکتا پولیس کے رابطے کے نتیجے میں بنگھا کے کوائف معلوم ہو سکے کہ اُس کے محترم و معزز باپ کا تعلق جے پور ہی سے ہے، لیکن ایک عرصے سے وہ پٹیالا کے مہاراجا کے دربار میں اہم منصب پر فائز ہے۔ بنگھا اُس کا اکلوتا بیٹا تھا، بڑے ناز و نعم میں اُس کی تربیت ہوئی تھی۔ جیسی کس بل اور حربی فنون کے ساتھ اُسے اعلا تعلیم بھی دی گئی تھی۔ ایک روز مہاراجا کے دربار میں رقص و سرود کی محفل برپا کرنے کے لیے کلکتے سے مدعو کی جانے والی مینا کی ایک جھلک دیکھ کے بنگھا ہوش و حواس سے بیگانہ ہوا۔ اُس نے دوبارہ مینا کے دیدار کرنے کی بڑی تگ و دو کی، لیکن کانتا بائی کا طائفہ مہاراجا کا خاص مہمان تھا، رسائی مشکل تھی۔ پٹیالے میں طائفے کا قیام چند روزہ تھا۔ صرف ایک ہی رات مہاراجا کی عشرت گاہ میں مینا کو اپنی آواز اور رقص کے کمالات پیش کرنے کا شرف حاصل ہو سکا۔

پٹیالے سے کلکتا پولیس کو اطلاعات ملیں کہ مینا کے واپس جانے کے بعد بنگھا اپنے متعلقین کے لیے اجنبی اجنبی سا ہو گیا تھا، اور ایک دن کسی کو کچھ بتائے بغیر وہ گھر سے نکل گیا۔ باپ اور اُس کے زیرِ اثر کارندے قرب و جوار میں، جگہ جگہ اُسے ڈھونڈتے رہے۔ ماں اُس کے غم میں پلنگ سے لگ گئی۔

ارشادات

❁ خاموشی بہت بڑی حکمت ہے۔
(حضرت محمد ﷺ)

❁ انصاف کی ایک گھڑی برسوں کی عبادت سے بہتر ہے۔
(حضرت محمد ﷺ)

❁ عاجز ترین شخص وہ ہے جس کا کوئی دوست نہ ہو۔
(حضرت ابوبکر صدیقؓ)

❁ جو شخص اپنا راز چھپاتا ہے، وہ اپنا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے۔
(حضرت عمر فاروقؓ)

❁ خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔
(حضرت عثمان غنیؓ)

❁ انسان کی قابلیت اُس کی زبان کے نیچے پوشیدہ ہے۔
(حضرت علی المرتضیٰؓ)

جانے کتنی رقم بنگش کے پاس تھی؟ قیاس ہے، کچھ زیادہ نہیں۔ کلکتے آ کے اُس نے سونا گاچھی کا رُخ کیا اور کئی راتیں تو اُدھر سے کاتنا بائی کے بالاخانے جاتا رہا، اور اُس کے پلّے سے پیسے ختم ہوتے گئے۔ ایک رات وہ پیسے کی طرح نذر نہیں گزار پایا تو سبھی کا رویّہ تبدیل ہو گیا۔ اس نے کاتنا بائی سے ملنا کی بات کی تو اُسے دُھتکار دیا گیا، اور بالاخانے پر اُس کا داخلہ ہی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اس کے بعد ہی بنگش نے اڈّے کا رُخ کیا تھا۔

جامو دل گیر آواز میں بنگش کی رُوداد سنا گیا۔ سبھی چپ ہو گئے۔ دیر بعد زورا تلملاتی آواز میں بولا، "یہ کیا ہے دادا؟"

جھَل گہری سانس کھینچ کے رہ گیا۔

"یہ آدمی یک دم ایسا اُتّم کیوں ہو جاتا ہے؟"

"ہو جاتا ہے رے۔" جھَل منمناتے ہوئے بولا۔

"وہی پن بولتا ہے، ایسے کیسے؟"

"تجھ کو کوئی ملتا تو یہ نہیں بولتا۔" جامو نے جھینپتی آواز میں کہا، "تُو کیا جانے گا۔"

"پن کے مستک میں نہیں آتا قسم سے۔" زورا مچل کے بولا، "ابھی ماں باپ اور سارا گھر چھوڑ کے... اُس کا تو گھر بھی بڑا تھا، پڑھا لکھا بھی تھا، کس بات کا گھاٹا تھا اُس کو... ابھی ایک سا ایک..."

"ایک بات کی کمی تھی اُس کو، پڑھائی لکھائی، بڑا گھر، دھن دولت، سارا دھر رہ جاتا ہے۔" جامو نے تمتماتی آواز میں کہا، "کبھی ایک آدمی جب سامنے کو آ جاتا ہے، جان پڑتا ہے، وہی ہے، بس وہی۔ اُسی کی کمی تھی، تو سمجھو، وہی دُنیا ہوتا ہے۔ پھر کچھ اور دکھائی نہیں دیتا، وہی دُنیا، وہی جان مال۔ اپنا آپ بھی دکھائی نہیں دیتا پھر تو..."

"بیما!" زورا معصومانہ تعجب سے بولا، اور سر پر اُنگلی گھساتے ہوئے کہنے لگا، "یہ تو تھوڑا، پھر پڑا ہونے والا بات لگتا ہے پن کو۔"

جامو نے میری، پھر جھَل کی طرف کتراتی نظروں سے دیکھا، اور جھلا کے بولا، "تُو بیبا ہی بولے گا۔ تجھ کو کیا پتا سالے! اپنے کام سے کام رکھ، ورنہ یہ دھنیز چھیڑا نہ کر۔"

جامو کے جھنجھلائے لہجے سے زورا کی سمجھ میں جلد ہی آ گیا کہ سامنے میں بیٹھا ہوں، اور میری موجودگی میں بیاں کر بلاغت سے تجاوز کر رہا ہے۔ وہ پشیمان سا ہو گیا، لیکن میں اُس سادہ دل کا ہدف نہیں تھا، میں خود جو ہدف پر موجود تھا، اور بارہا میں نے خود کو بھی یہی کچھ باور کرانے کی کوشش کی تھی۔

سیوورین اتنی دیر سے کہاں غائب تھی۔ اچھا ہوا کہ اُس نے آ کے سبھی کو منتشر کر دیا۔ اُس وقت اُس کی آمد سے مجھ سمیت اُن تینوں کی بھی گلو خلاصی ہوئی تھی۔ سیوورین اپنی رَو میں بہکی ہوئی آئی تھی۔ مجھے دیکھ کے ٹھٹک سی گئی اور پلکیں جھپکانے لگی۔

"تم کب آئے؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے ہی۔" میں نے مسکرانا چاہا۔

"سب ٹھیک تو ہے؟" اُس نے تذبذب سے پوچھا۔

ڈاکٹر رائے کے پاس سے میں کسی تازہ اُفتاد کا بار لیے ہی واپس آ تا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں میچ کے اُسے تسلی دی تو اُس کے چہرے پر روشنی سی بکھر گئی۔

اُس نے جھَل سے کمرے میں چلنے کی استدعا کی۔ جھَل کے پیش و پس پر اُس نے کوئی لحاظ نہیں کیا۔ "چلیں، اب اُٹھ جائیں۔" اُس کے لہجے سے نازبرداری عیاں تھی۔ ... نے ... پرا کتفا نہیں کی، جھَل کا ہاتھ تھام کے ... ۔

"سورت اُس کی نہیں ہے بَس۔" جھَل کو زرّیں کی یاد آ رہی تھی۔ اُس کے تیور بھی یہی کچھ تھے۔ "چل ری۔" وہ سپر ڈالتے ہوئے بولا اور کسی معمول کی طرح سیوورین کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔

جامو اور زورا بھی اُس کے پیچھے اندر جانا چاہتے تھے۔ میں نے اُنھیں روک لیا۔ کچھ وقت بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ سیوورین نے جھَل کو بستر پر دراز کرا دیا ہو گا، میں نے اُن سے بیٹھ جانے کو کہا، اور دھیمے لہجے میں بتایا کہ ڈاکٹر رائے کی زبانی میدا کے بارے میں مجھے کیا معلوم ہوا ہے۔

اُن پر حیرت کا ایک عالم طاری ہوا۔ دونوں کسمسا کے سیدھے بیٹھے نہ رہ سکے۔

"یہ کیا کیا بولتا ہے راجا بھائی؟" زورا سنسناتی آواز میں بولا، "نہیں، نہیں۔"

"مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا، لیکن کسی اور نے نہیں، ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے۔ میدا اب نہیں ہے۔"

"یہ کیسے؟" جامو کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ "یہ تُو کیا بول رہا ہے لاڈلے؟"

صبح اسپتال آنے والے پولیس افسر سے ڈاکٹر کو جو کچھ معلوم ہوا تھا، میں نے سیدھے سچے لفظوں میں دُہرا دیا۔

"اپن تو پہلے ہی بولا تھا۔" زورا نے بھڑک کے کہا۔ "بولا تھا نا راجا بھائی! اپن کو میدا ٹھیک آدمی نہیں لگتا۔"

بے شک، زورا نے میدا کے بارے میں کچھ یہی رائے زنی کی تھی، اور جامو نے اُسے تاڑ دیا تھا۔

میرے بیان سے اُن کی تشفّی ہو گئی اور وہ پے در پے سوال کرنے لگے۔ میں آموختہ ہی دُہرا اور تکرار ہی کر سکتا تھا کہ اس سے زیادہ میرے علم میں کچھ تھا بھی نہیں۔ ادھوری آگہی وہم و قیاس کا موجب ہوتی ہے۔ وہ اپنے طور پر تبصرے کرنے اور ... تخلیق کرنے لگے تھے اور مجھ سے تائید و تردید کے خواہاں تھے۔ میری محتاط روی اُنھیں زچ بھی کر رہی تھی، ... بھی۔ جامو کو تسلیم نہیں تھا کہ بہ جُز دادا ہی نے سب سے پہلے میدا کے ... انجام پر تصدیق کی مہر ثبت کی ہو۔ اُس کا کہنا تھا کہ ... اڈّے کا ایک کہنہ مشق آدمی تھا، سرد و گرم چشیدہ، پولیس سے بارہا سامنا ہوا ہو گا، اور وہ میدا کا خاص مربّی، اُس کے لیے کسی سائے کے مانند تھا، اور اُس کے پاس زندگی ہی کتنی رہ گئی ہے کہ اُس نے وعدہ معاف گواہ بننا گوارا کر لیا۔ اڈّے کے لوگ اِتنے کچے نہیں ہوتے کہ ہلکی بھاری الاتوں اور عواقب کے خوف سے زبان کھول دیں، اور نہ اِتنے ناعاقبت اندیش کہ دُور و نزدیک دیکھ بھال کیے بغیر ایسی واردات کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ کل سہ پہر میدا کو پولیس ساتھ لے گئی تھی، رات تک اِس واردات کی تہ تک کس طرح پہنچ گئی؟

"اب کچھ بھی ہو جامو بھائی!" میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا، "کیا کہا جا سکتا ہے۔ تفصیلات تو ڈاکٹر صاحب کو بھی زیادہ معلوم نہیں تھیں۔ میں نے تمھیں بتایا کہ شہری پولیس نہیں تھی۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" جامو منتشر لہجے میں بولا۔

"تھوڑا بہت تو ہونا چاہیے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"نہیں لاڈلے! کوئی اور بات ہے، کدھر کوئی کالا ضرور ہے۔" جامو انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا، "ضرور پولیس کے کان بھرے گئے تھے، مخبری جس کو بولتے ہیں۔"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے بحث مناسب نہیں سمجھی۔ جامو کا تجربہ کم نہیں تھا۔ جو بات میرے دل میں کھٹک رہی تھی، اُس زیرک کے ذہن میں رسا ہو چکی تھی۔ مجھے خاموش ہی رہنا تھا۔ میں نے صراحت نہیں کی کہ اِسے 'مخبری' نہیں کہنا چاہیے، مگر ایک شخص پولیس کے اِس یقین اور اعتماد کا سبب ضرور بنا ہو گا کہ کم از کم تین آدمیوں کو ختم کر دینے کی واردات کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔ اُس دن جب میدا میرا چاقو لوٹانے اور اڈّے سے دست کشی کی پیش کش کرنے اسپتال آیا تھا تو ڈاکٹر رائے ہمارے درمیان موجود تھا۔ میدا اُسے وہاں سے ہٹا نہیں سکتا تھا اور اپنی بے بسی اور ندامت کے اظہار کا بھی وہی ایک موقع تھا۔ ڈاکٹر کی وجہ سے اُس نے مبہم انداز میں اُن تین آدمیوں کو انجام سے دوچار کر دینے کا اقرار کیا تھا، جنھوں نے، اُس کے بہ قول، اکبر علی خان کا خون کر دیا تھا، اور شہر کے اڈّے کی چوکی پر اُس کے ہوتے ہوئے اِس دیدہ دلیری اور ہٹ دھرمی نے اُسے سب کی اور خود اُس کی اپنی نظروں میں رُسوا کر دیا تھا۔ میدا کے اعتراف میں ایسا ابہام بھی نہیں تھا کہ ڈاکٹر جیسا صاحب نظر تعبیر نہ کر پاتا، اور ڈاکٹر جیسا انسان دوست آسانی سے درگزر کر دیتا۔ ڈاکٹر کے تکدّر اور رنج کا میں گواہ تھا۔ میدا، ڈاکٹر کو

محض ایک معمہ ہی سمجھتا ہوگا۔ اُسے کیا اندازہ ہوگا کہ ڈاکٹر کیسا ہمہ داں شخص ہے، اُس کی کتنی آنکھیں ہیں۔ میدا کو اس زعم اور اعتماد سے بھی آسودہ ہونا چاہیے تھا کہ ثبوت تو سات تہ خانوں میں دفن ہیں، ڈاکٹر، میں یا کوئی اور میدا کے موہوم یا علانیہ اعتراف کے باوجود ثبوت و شواہد کے بغیر کیا ضرر رساں ہو سکتا ہے۔ بے دلیل الزام بڑا بے وقعت ہوتا ہے، اڈے کے زورآوروں پر انگلی اُٹھانے کے لیے ایک مردانہ جرأت چاہیے۔

کل صبح ہی ڈاکٹر نے گزشتہ رات آئی جی سے اپنی گفت گو کے بارے میں مجھے بتایا تھا۔ اُس نے آئی جی سے کہا تھا کہ تسلسل سے خوں ریز وارداتیں ہو چکی ہیں تو ثبوت بھی کہیں موجود ہونا چاہیے۔ پولیس کو حوصلہ رکھنا چاہیے کہ ثبوت مرتا نہیں، ور مرتا نہیں تو دست رس سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔ پولیس کو واضح طور پر شبہے کے اہداف معین کر کے بیکے بعد دیگرے اُن پر تجربے کرنے چاہییں۔ مفروضات [illegible] نتائج کیسے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ میں نے جھجکتے ہوئے [illegible] مکمل شواہد کے بغیر پولیس کا کوئی اقدام [illegible] چھوڑنے کے مترادف ہوگا۔ ڈاکٹر اس ستم پر دل گرفتہ تھا کہ بہت کچھ جانتے ہوئے بھی ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اور [illegible] اوپر رکھی چیز کا حصول دست رس ہی سے ممکن ہے۔ قامت کی بلندی کے لیے بھی کوئی چیز چاہیے جو ارد گرد موجود نہیں۔ یہی صورت پولیس کے بھی پیشِ نظر ہوگی۔

اور پولیس کو مفروضے تراشنے کی کیا ضرورت تھی۔ ڈاکٹر نے اختیار رکھا یا تھا۔ اُس کا فرسودہ سند تھا۔ اُس کے شمارے پر پولیس نے ایک ہی سمت کا رُخ کیا ہوگا جہاں تشبیب تھا۔ شک، تذبذب ہے۔ ڈاکٹر کے عطا کیے ہوئے یقین سے پولیس کے آگے راہیں کھلتی گئی ہوں گی۔ شہر کی پولیس بھی باہر کی پولیس سے بدل دی گئی تھی۔ شہر کی مروّت، آشنائی کے لحاظ کی کوئی بندش ہی نہیں رہی تھی۔

میں نے جا مو اور زورا کو ڈاکٹر کے تدبر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا، خاموش ہی رہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے اُلجھتے رہے اور آخر اسی نتیجے پہ پہنچے کہ جزئیات سے کیا سروکار ہے۔ [illegible] تی دیر بعد جا مو کو اکبر علی خاں کا خیال آیا جاں سوز لہجے میں بولا، "اور وکیل صاحب کو بھی اسی نے [illegible] مطلب، انھوں ہی نے"

"ہاں جا مو بھائی! انھوں ہی نے۔" میں نے کپکپی آواز میں کہا۔ "کوئی اور نہیں۔"

"مگر کیوں؟" جا مو کرب سے بولا۔

"یہ تو وہی ٹھیک بتا سکتا تھا جا مو بھائی!"

"اپنے پلّے کچھ نہیں پڑ رہا ہے ایمان سے۔"

"اپن کو لگتا ہے، کتیا کا جنا تھا میدا حرام کا۔" زورا مغلظات بکنے لگا۔

دھوپ ابھی زرد نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کرسی سے اُٹھ کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے۔ اپنا ہی جسم بوجھ بنا ہوا تھا۔ وہ بھی اُٹھ گئے۔ بہت دیر سے نہ سیورین باہر آئی تھی، نہ ہم اندر جا سکے تھے۔ جا مو اور زورا کے کندھے بھی ڈھلک سے گئے تھے۔ آدمی کا [illegible] بیمار درختوں کے مانند ہوتا ہے۔ کڑی دھوپ ہو یا تند ہوا [illegible] خمیدہ ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے کمرے میں جانے کی [illegible] کی کہ شخص کے سامنے انھیں اپنے دست و بازو اور [illegible] کوئی منفی تاثر نہیں دینا چاہیے تھا۔ مریض کے ارد گرد کا [illegible] حول بھی اکسیر کا کام کرتا ہے۔ زورا کو اڈے واپس جانے کی فکر لاحق ہوئی۔ "اپن سوچتا ہے، ابھی اُدھر جانا ٹھیک نہیں دادا۔" اُس نے اکھڑی ہوئی آواز میں جا مو کو متنبہ کیا۔

میں نے انھیں بتایا کہ ڈاکٹر رائے نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔ کمرے میں مریض کے ساتھ صرف ایک آدمی کے ٹھیرنے کی اجازت ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ یہیں، اسپتال میں ہم میں سے دو کا انتظام کر دیں گے۔

زورا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ جا مو بھی اس مہربانی سے تن آساں نظر آنے لگا۔

"پر اُدھر ای اپن کا تھوڑا بہت سامان بھی رکھا ہے۔" زورا ترود سے بولا۔

میں نے اُن سے کہا کہ ڈاکٹر نے سامان پر خاک ڈالنے کو کہا تھا۔ اُدھر نہ معلوم کیا حال ہو، پورا علاقہ پولیس کے حصار میں ہے۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اب وہاں کا رُخ کرنا مناسب

نہیں، بل کہ اُس نے جامو اور زورا کے اسپتال سے باہر نکلنے پر بھی پابندی عائد کر دی ہے۔ آج اکبر علی خاں کی بیگم کی تدفین کے وقت شہر کے حالات اور بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ پولیس نے تدفین سے پہلے میدا کی خبر عام کر دینے کا ارادہ کیا ہے۔ لوگوں کو اتنی جلد یقین نہیں آئے گا کہ انھیں میدا کے زور و اثر کی عادت ہو گئی تھی۔ جس طرح محکوم کسی ایک حاکم کی حاکمیت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ کوئی دن میدا کا آخری دن بھی ہو سکتا ہے، یہ حقیقت تسلیم کرنے میں ایک وقت چاہیے۔ گواہی کے لیے پولیس میدا کے لاشے کی سرِعام نمائش نہیں کر سکتی، لیکن کئی دن سے شہر پر چھائی دہشت دُور کرنے اور میدا کے طویل غلبہ و تسلط سے نجات اور امان کے احساس کے لیے ہر حربہ آزمائے گی۔

"آپ اُدھر کے اڈّے کا کیا بنے گا لاڈلے؟" جامو نے مضطرب لہجے میں پوچھا۔

"اپن کو کیا دادا، جو بھی ہو سو۔" زورا چِنچ کے بولا، "اپن کا ٹھیکا نہیں۔"

"ہاں جامو بھائی!" میں نے زورا کی تائید کی۔ "ہمارا کیا واسطہ، جو بچ جائیں گے، وہی لڑ جھگڑ کے چوکی کا فیصلہ کر لیں گے، ہمیں تو جتنی جلدی ہو، یہاں سے چلے جانا ہے۔ اب اس شہر میں ایک پل کے لیے جی نہیں لگتا۔"

"ہاں لاڈلے! وہ تو ہے، اپنے کو تیرا دھیان آتا ہے۔ تو نے بُرا وقت بِتایا۔" جامو میری گردن دبوچتے ہوئے بولا، "استاد کو تو اپنا ہوش ہی نہیں تھا۔ بہت اکیلا تھا تُو۔"

"اتنا اکیلا بھی نہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔ "پہلے اکبر علی خاں صاحب تھے، پھر اپنے ڈاکٹر صاحب۔ اکیلے ہونے کی بات نہیں جامو بھائی! یہ سارا کچھ "میرا گلا رُندھ گیا۔

"وہی تو... وہی تو ہم بولتے ہیں لاڈلے! بس جتنا تھا، سسرا وقت کٹ گیا۔ اب کوئی دیر نہیں۔ اُستاد کو دیکھا نہیں، بالکل پہلے جیسا ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے۔"

ہم ابھی باہر ہی کھڑے تھے اور کمرے میں جانا چاہتے تھے کہ سیورین نے دبے پاؤں آ کے ہمیں چونکا دیا۔ اُسے سامنے دیکھ کے جامو اور زورا کے جسم بل کھا گئے۔ کسی کو خیال نہیں تھا کہ دوپہر گزر چکی ہے۔ یہ یاد دہانی سیورین کی خدمت گزاری کا حصہ نہیں تھی، مگر وہ کچھ اور ہی لڑکی تھی۔ گھر کی لڑکیاں جیسی کہ ہوتی ہیں، سمجھدار، خوش شعار۔ جامو اور زورا نے مجھے دیکھا، اُن کی وجہ سے میں نے منع نہیں کیا، اور سیورین تو بس اشارے کی منتظر تھی۔ مُغل کے آرام کی خاطر اُس نے ہمیں باہر ہی بیٹھے رہنے کی ہدایت کی، اور آدھ گھنٹے میں اسپتال کے طعام خانے سے خدمت گار کھانا لے آئے، ہلکا پھلکا، لیکن بے ذائقہ نہیں۔ زورا اور جامو بھی شاید میری وجہ سے خاموش تھے، وہ بھی بس لقمے توڑتے رہے۔ کھانے کے دوران سیورین مسلسل ہمارے ارد گرد منڈلاتی رہی۔

دوپہر کو کوئی ڈاکٹر مُغل کو دیکھنے نہیں آیا۔ اب اُن کی یہ بے توجہی اطمینان کی علامت تھی۔

خدمت گار کھانے کے برتن میز سمیت لے کے واپس جا چکے تھے کہ سیورین گھبرائی ہوئی ہمارے پاس آئی اور کچھ کہنا چاہتی تھی کہ رُک گئی، پھر ہچکچاتے ہوئے انگریزی میں بولی کہ اُسے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ جامو اور زورا سمجھ نہ سکے، لیکن سیورین کی سیمابی حالت سے فکر مند ہوئے۔ مجھے اُٹھنا پڑا۔ زورا اور جامو سے کچھ دُور جا کے سراسیمہ لہجے میں اُس نے میدا کے بارے میں بتایا۔

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے آنکھیں بند کر لیں اور شکر کا سانس لیا کہ سنانے کو اُس کے پاس کوئی ایسی ویسی بات نہیں تھی۔

"تمھیں معلوم ہے؟" وہ حیرانی سے بولی۔ "مجھے تو ابھی طعام خانے سے آنے والے خدمت گاروں نے بتایا۔ کہہ رہے تھے، سارے شہر میں ہلچل مچ چکی ہے۔"

"اور کچھ تو نہیں بتایا اُنھوں نے؟" میں نے تحمّل سے پوچھا۔

"کچھ اور بھی ہے؟" اُس نے ہراساں آواز میں کہا، "جو تمھیں معلوم ہے۔"

"نہیں، اس سے زیادہ نہیں۔"

"تم نے مجھے نہیں بتایا۔"

"تم سے بات کرنے کا موقع کہاں ملا، اور تم کیا کرتیں جان کر، اور پریشان ہو جاتیں۔"

"یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں، سنا ہے، شہر میں بہت خوف و ہراس ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ پولیس کہتی ہے، اُس نے خود کو ختم کر لیا۔"

"کچھ بھی ہو، اب وہ نہیں ہے۔" میدا کے لیے میری زبان پر بہت آگ اُمڈی، مگر سامنے سیورین تھی۔ چیزیں ہی نہیں، آدمی بھی کانچ کے بنے ہوتے ہیں۔

"اب کچھ اور..." وہ بدحواسی سے بولی، "اب کیا ہوگا... میدا کے بعد...؟"

"کوئی اور آ جائے گا، لیکن وہ میدا نہیں ہوگا۔" میری رسیلی آواز بھی اُس نازک اندام پر گراں ہوگی۔

اُس کے چہرے پر چھائی کشمکش دیکھ کے میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "تم کیوں پریشان ہو رہی ہو؟"

"تمھیں تو کچھ..."

"مجھے کیا ہوتا!" اُس کی خاطر جمعی کے لیے میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میرا کیا تعلق؟"

"سلسلہ تو تمھیں سے شروع ہوا تھا۔"

"اور سمجھو، اُس پر ختم ہو گیا۔"

"مگر کیا واقعی اُس نے خود کو...؟"

"ڈاکٹر صاحب کو یہی بتایا گیا ہے۔"

اُس کی بے چینی دُور نہ ہو سکی اور وہ کسی قدر ہیبت زدہ لہجے میں بولی، "لیکن اُس کے لوگ، وہ سب تو بہت خطرناک ہیں۔ ایک ہی آدمی تو گیا ہے۔"

"ہاں، وہ تو ہے۔ اُن میں سے کچھ تو جیل چلے جائیں گے، کچھ چھوٹ جائیں گے۔ کچھ دل برداشتہ ہو کے شاید یہ شہر ہی چھوڑ دیں گے، یا داداگیری کا کام۔"

"میدا اُن کی پشت و پناہ تھا، اُن کا ولی نعمت۔ وہ اُن سے جدا ہو گیا ہے۔"

"میری وجہ سے کیا؟" میں نے تندی سے کہا۔

"لیکن وہ خطرناک ہی نہیں، پاگل بھی تو ہیں۔"

"تو! تو کیا کیا جائے؟"

وہ جانچتی نظروں سے مجھے دیکھا کی، اور کچھ تامّل کے بعد شکایتی انداز میں بولی، "تم سے تو اب بات کرنی بھی مشکل ہو گئی ہے۔" اُس کی شکایت میں گہری اُداسی تھی۔

"میں تو یہیں ہوں، تم سارا کچھ دیکھ ہی رہی ہو۔"

"میں کچھ کہوں؟" وہ فرش پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے چونک کے پوچھا۔

"تم یہیں ہو، اور تم سے بات نہیں ہو پا رہی... تو لگتا ہے، تم بہت دُور ہو، سامنے ہو کے بھی بہت دُور۔"

"تم بھی عجیب ہو۔" بے ارادہ میں نے اُس کے بازو پر ہلکی سی دھپ لگائی۔ اُس کی آنکھوں میں چنگاریاں سی چمکیں، پھر آنسو چھلک آئے۔ ان لڑکیوں کے پاس آنسوؤں کی بڑی افراط ہوتی ہے۔ قریب ہی زورا اور جامو بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ اُسے آواز دینے اور اُس کے پیچھے جانے کو میرے قدم بڑھے تھے، لیکن میں نے خود کو تھام لیا۔

سہ پہر بعد مُغل سبزہ زار میں آ کے بیٹھ گیا۔ سیورین نے شام کی چائے کا وہیں انتظام کروا دیا تھا۔ سہ پہر کے بعد شام تھکی تھکی نظر آتی ہے۔ دھوپ ہے بھی، نہیں بھی، یا دھوپ جیسے بوڑھی ہو گئی ہو۔ پھر جب سورج ساری دھوپ سمیٹ لیتا ہے

اور اُجالا بھی نہیں جاتا جب شام نکھرتی ہے، اور کتنی دیر کے لیے، اِدھر آئی، اُدھر گئی۔

سورج واپس جا چکا تھا۔ بتھل سبزہ زار ہی میں دھرنا دیے رہتا کہ سیورین نے آکے اُسے اٹھا دیا۔ اسپتال کے کسی ملازم نے اُسے ڈاکٹر رائے کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ ایلی بھی آ چکی تھی۔ کمرا صاف تھا، مگر دونوں نے ایک بار پھر جلدی جلدی چیزیں درست کر دیں۔ ایلی کے اصرار کے باوجود بستر کے بجائے بتھل صوفے ہی پر جم گیا۔ اس میں کچھ رعزڈ کٹر کو اپنی مکمل بحالی کا تاثر دینے کی بھی ہوگی۔ بستر بڑی راحت ہے، لیکن خواہش اور ضرورت ہو، تبھی۔ راحت کے لیے ایک استطاعت چاہیے۔ ہر وقت کی راحت سے جی پھرنے لگتا ہے، اور جبری راحت تو آدمی کو گوارا ہی نہیں۔ آدمی کی مرضی شاید سب سے بڑی راحت و دروست ہے، اور یہ بات تو کسی خواب کی طرح ہے۔ آدمی کب اور کہاں اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔ بس اتنا ہے کہ کسے کتنا اپنی مرضی کا اختیار ہے۔

سب منتظر تھے۔ سورج کا بچا کھچا اُجالا بھی ماند پڑ چکا تھا۔ کمرے کی روشنیاں تو دیر سے جلی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر رائے کی آمد کی خبر سن کے سیورین نے ابھی تک اسپتال کا لباس تبدیل نہیں کیا تھا۔ ایلی نے اُسے گھر چلے جانے کی ہدایت کی تھی، لیکن وہ ٹھیری رہی۔ اندھیرا پوری طرح حاوی ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر رائے، مددگار نوجوان ڈاکٹر اور اَدھیڑ نرس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ ایلی، سیورین، زورا، جاموا اور میں تو مستعد ہی تھے، بتھل بھی کھڑا ہو گیا۔ ڈاکٹر پہلے تو کچھ جھجکا، پھر تپاک سے ہاتھ بڑھا دیا۔ بتھل نے دونوں ہاتھوں میں اُس کا ہاتھ جکڑ کے سینے سے لگا لیا۔

"کیا استقبال کیا لگ رہا ہے؟" ڈاکٹر نے مسکرا کے پوچھا۔

بتھل نے ممنونیت کی نظروں سے اُسے دیکھا اور زبان سے کچھ نہیں کہا۔

"لگتا ہے، جانے کی بڑی جلدی ہے۔"

بتھل نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ٹھیک ہے، دیکھتے ہیں، کتنا جلدی جا سکنے کا ہے۔" ڈاکٹر نے اُسے بستر پر لیٹ جانے کا اشارہ کیا۔ بتھل نے بہ اکراہ تعمیل کی۔ میں، زورا اور جاموا باہر چلے آئے۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہی رہا۔ دس بارہ منٹ سے اوپر نہیں ہوئے ہوں گے کہ ڈاکٹر باہر آ گیا۔ دروازے کے پاس ہم تینوں کھڑے ہوئے تھے۔ زورا اور جاموا نے اُسے سلام کیا اور دوبارہ ہاتھ باندھ لیے۔

"پرسوں وہ جا سکتا ہے۔" ڈاکٹر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے انگریزی میں کہا اور مجھے ساتھ آنے کا حکم دیا۔ مجھے یقین تھا، یہی کچھ ہوگا۔

اپنے ساتھی ڈاکٹر اور نرس کو ہاتھ ہلا کر رخصت کرنے کے بعد وہ سبزہ زار میں رکھی ہوئی کرسیوں تک آ گیا۔ جاموا اور زورا نے مناسب سمجھا کہ کمرے میں چلے جائیں اور ہمارے سامنے نہ رہیں۔

"جیسا کہ اندازہ تھا۔" اُس نے کسی تمہید کے بغیر کہا، "لوگوں کو یقین نہیں آ رہا کہ میدا نے خود کو ختم کیا ہے، یا وہ پولیس کے جبر و تشدد کا نشانہ بنا ہے۔"

مجھے تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

"بہ ہر حال، پولیس نے یہ اطلاع لوگوں تک پہنچانے سے پہلے احتیاطاً سپاہیوں کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا، اور انھیں تلقین کی تھی کہ خود کسی قسم کی قیاس آرائی نہ کریں۔ شہر کی جانب بھیجے جانے والے تازہ پولیس دستوں کو میدا کی لاش بھی دکھا دی گئی تھی کہ وہ شہادتوں کے امین رہیں، اچھی طرح جان لیں کہ میدا کے جسم پر تشدد کے نشانات نہیں ہیں، اعترافی کاغذات بھی انھیں دکھائے گئے تھے جن پر میدا کے دستخط اور انگوٹھے کے نشان ثبت تھے۔

"صبح صبح آئی جی نے اکبر علی خاں کے گھر حاضری دے کے اُس کے بڑے بھائی سکندر علی خاں کو تمام حقائق سے باخبر کر دیا تھا۔ تمام شہادتیں اور دستاویزات وہ ساتھ لے گیا تھا۔ سکندر علی خاں اپنی بھاوج کی ناگہانی کے صدمے سے نڈھال تھا۔ سوگ واروں میں گھرا ہوا تھا، تدفین کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ وہ آئی جی سے کیا جرح کرتا اور جرح کرنے کے لیے رہ بھی کیا گیا تھا۔ چور سے لوٹا ہوا مال برآمد ہو سکتا ہے، قاتل سے کیا برآمد ہو۔ آج جمعہ تھا، جمعے کی فضیلت کے خیال سے بیگم کا جنازہ اُٹھانے میں تاخیر کر دی گئی تھی، تاکہ نماز کا مجمع بھی شامل

ہو جائے۔ سنا ہے، ہر قسم کے لوگ جنازے میں شریک تھے۔ بہت بڑا ہجوم تھا۔ بیگم کے شاگرد طلبہ آہ و زاری کر رہے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آس پاس کے دیہات میں کسانوں کے بچوں کی تعلیم کے لیے بیگم نے کچی پکی درس گاہیں کھولی تھیں، سو دیہات سے آنے والوں کی بھی ایک بڑی تعداد جنازے کے ساتھ تھی۔ سہ پہر تین بجے کے قریب اپنے شوہر کے پہلو میں بیگم کو آبائی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

"جنازے میں شریک لوگوں میں ہر ایک کو یہی جستجو تھی کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ پہلے یہ بات چند لوگوں تک محدود تھی۔ اب قریباً سبھی پر منکشف ہے کہ ایک روز کوئی اجنبی نوجوان چاقو کھولے وکیل صاحب کے گھر میں دندناتا ہوا داخل ہو گیا تھا اور ردِعمل میں اکبر علی خاں اُس کے اِتنے قریب آ گئے تھے کہ میدا کے ٹھکانے پر اُس کے ساتھ چلے گئے۔ وہ نوجوان کس زعم میں میدا جیسے سرکش استاد سے چاقو آزمائی کرنے اور اُسے چوکی سے بےدخل کر دینے کے ارادے سے گیا تھا۔ میدا کی نظر میں اکبر علی خاں اِتنے اہم ہو گئے تھے کہ تمھیں متزلزل کرنے کے لیے وہ اکبر علی خاں کا خون کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اکبر علی خاں کی کوئی مجبوری انھیں میدا کے ٹھکانے پر تمھارے ساتھ لے گئی تھی۔ وہ تمھ...ے کسی ...شام سے قریب ہوئے کہ تم ایک بڑے چاقو باز ہو اور ...وس سے تمھارا بھی تعلق ہے۔ میدا جیسا اُستاد چیتوں میں تمھارے قدموں پر چاقو ڈالنے اور اڈا چھوڑ دینے پر کیوں مجبور ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے، چیونٹیاں تو رینگتی جا رہی ہیں سروں میں۔ لوگ کہانیاں سنا رہے، سن رہے اور کہانیاں بنا رہے ہیں۔ وہ تمھیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے، تم اسپتال میں ہو، اور پولیس کی ہدایت پر تمھیں پہلے اکبر علی خاں، اور اب اُس کی بیگم کی تدفین میں شرکت سے روک دیا گیا ہے۔ پولیس تمھاری حفاظت یا تم پہ نگاہ رکھنے کی خاطر اسپتال میں تعینات کی گئی تھی۔ پولیس افسر بتا رہا تھا، قسم قسم کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، اور تمھیں بتاؤں، پولیس نے اب دوبارہ اسپتال میں ایک دستہ تعینات کر دیا ہے، اس کمرے کے اطراف میں۔"

"آپ کیوں ڈاکٹر صاحب؟" بہت دیر بعد میں نے زبان کھولی۔

اہتمام

اُردو کے مشہور ادیب کنھیا لال کپور خاصے طویل القامت تھے۔ دُبلے پتلے ہونے کی وجہ سے اُن کا قد کچھ اور بھی لمبا لگتا تھا۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے میں داخلہ لینے کے لیے آئے۔ انٹرویو بورڈ کے سربراہ پطرس بخاری تھے۔ انھوں نے ایک نظر کپور کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر بےاختیار بولے، "مسٹر کپور، آپ سچ مچ اتنے لمبے ہیں یا آج انٹرویو کے لیے خاص اہتمام کر کے آئے ہیں؟"

تحسین عباس جعفری کا تعاون

"تم اِسے دُور دراز احتیاط ہی کہہ سکتے ہو۔"

"میرے لیے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"یہی کہا جا سکتا ہے، میرے لیے تو نہیں۔"

"لیکن اڈے کے سارے لوگ تو بند کر دیے گئے ہیں۔"

"ممکن ہے، کچھ باقی رہ گئے ہوں، یہاں کے، یا باہر کے۔ یاد پڑتا ہے، تمھی نے ایسا کچھ بتایا تھا، میدا نے باہر کے چند لوگوں سے بھی تو مدد مانگی ہوگی۔ پولیس نے اُن میں سے دو ایک کو پکڑ لیا ہے، ابھی دو ایک باقی ہیں... اور اکبر علی خاں یا بیگم کا کوئی شیدائی بھی تو پاگل ہو سکتا ہے۔ پولیس نے بہت کچھ صاف کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن پولیس پر یہاں کے لوگوں کا اعتبار نہیں۔ خیر چھوڑو۔" وہ کسی قدر اُکتائے ہوئے لہجے میں بولا، "میں بھی نہیں سمجھتا کہ اب پولیس کے یہاں رہنے کا کوئی جواز رہتا ہے۔ تم بتاؤ، رات گھر آ رہے ہو۔ تمھارے پاس دو ہی راتیں ہیں، آج کی اور کل کی، یہ دو راتیں ہمارے ساتھ گزارو۔ بینا تمھیں پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہا، آج رات شاید تم آ سکو۔"

"کیسی ہیں وہ؟" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، اپنے آپ میں مست، تمھارا ذکر مسلسل کرتی رہتی ہے۔"

"میں نے بھی کئی بار سوچا، آپ کی طرف جاؤں۔ اُن سے وعدہ بھی کر کے آیا تھا۔ اُن کی تصویریں، جل کر نواور دیکھنے کا اشتیاق ہے، اور انھیں دیکھنے کا بھی۔ وہ خود بہت نیک تا اور قابلِ دید لڑکی ہیں۔" میری زبان بس میں نہیں رہی اور

میں نے بہ عجلت کہا، ”ایک غیر معمولی، عمدہ اور دل کش خاتون۔“
ڈاکٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلک پڑی۔ ”اور یہی کچھ وہ تمھارے بارے میں کہتی ہے۔“

”میں کہاں اور کہاں ڈاکٹر صاحب۔“ میں نے کھسیانی آواز میں کہا، ”میں اتنی عزت اور مسرت کا سزاوار کہاں۔ مجھے اُن کے پاس جانا تھا، لیکن آپ تو دیکھ ہی رہے ہیں۔“

”ہاں۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اُسے سارا کچھ بتا دیا۔ تو آج تو آرہی ہے، وہ آج رات، بل کہ کچھ دیر بعد؟“
میں نے جھجکتے ہوئے کہا، ”آج رہنے دیں ڈاکٹر صاحب؟“

”کوئی مصروفیت؟“

”بس ڈاکٹر صاحب!“

”طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”جی بالکل۔“ میرا جسم اکڑ گیا۔

”ان سب بے واقعات سے متاثر ہونا چاہیے۔ میں تمھیں نہیں بتانا چاہتا تھا، لیکن خیال آیا، عملی تمھیں اور بوجھل رکھے گی۔“ وہ ملائمت سے بولا، ”آج کو تو اچھا ہے، کچھ وقت گزر جائے گا، ماحول کی تبدیلی بھی ایک علاج ہے۔“

میں چپ رہا۔

اور میرے چہرے پر چھائی کشیدگی اُس صاحب نظر سے چھپی نہ رہ سکی، اُس نے بُردباری سے کہا۔ ”بہ ہر حال، جیسا تم کہتے ہو کل آجانا۔ میں اُس سے کہہ دوں گا، آج انتظار نہ کرے۔“
میں نے شکریہ ادا کرنا چاہا، اور جانے کیوں یہ ایک لفظ میری زبان پر اٹک کے رہ گیا۔ کچھ مجھے اس لفظ کی فرسودگی کا گمان ہوا۔
وہ کرسی سے اٹھ گیا۔ اسپتال کی طرف جانے کے بجائے اُس کا رُخ گھر کی جانب تھا۔ میں نے اُس کا ساتھ دیا، پھر چلتے چلتے وہ ٹھہر گیا اور بھولا ہوا کچھ یاد آجانے کی اُلجھن چہرے پر ہویدا ہوئی۔ اُس نے جامو اور زورا کی شب بسری کے انتظام کے بارے میں بتایا اور کہنے لگا کہ کل صبح اُس کے شخصی معاملات کے معاون چھ تگ کے ذریعے گرانڈ ہوٹل سے کسی آدمی کو بلا کے وہاں رکھا باقی سامان منگوا لیا جائے اور پہلے ہوٹل کے واجبات کی ادائی کر دی جائے۔ ہمارے لیے اسپتال سے براہِ راست اسٹیشن روانگی مناسب رہے گی۔

اسپتال کی چار دیواری تک اُسے رخصت کرنے کے ارادے سے میں اُس کے ساتھ چل پڑا تھا لیکن اُس نے مجھے لوٹا دیا۔
مجھے احساس تھا، وہ کوئی غبار لے کے نہ گیا ہو، مگر میری معذرت اپنے عزم کا حاصل تھی جو میں نے گزشتہ مرتبہ اُس کے گھر سے آنے کے بعد ساری رات ایک ہیجان و اضطراب کے بعد کیا تھا اور مجھے ایک گونہ سکون ہوا تھا، آج نہیں تو کل یہ صورت تو پیش آتی تھی۔

میں اُس کے ساتھ زیادہ دُور نہ جا سکا تھا، اس لیے جلدی واپس آگیا۔ کمرے میں سیورین کے موجود ہونے پر مجھے حیرت ہوئی۔ اُس نے بنا گھریلو لباس تبدیل کر لیا تھا اور مغل کے پاس بیٹھی مشتاقانہ، نیاز مندانہ انداز میں باتیں کر رہی تھی، جامو اور زورا بھی قریب ہی موجود تھے۔ لگتا تھا، برسوں سے سیورین سے شناسائی ہے۔ ایک بھی وہیں تھی۔ کسی ڈاکٹر کی آمد کا اب امکان نہیں تھا۔ میری آمد دخل اندازی کا باعث ہوئی، جیسے کوئی اجنبی اُن کے درمیان آگیا ہو۔ مجھے دیکھتے ہی مغل کو شب بہ خیر کہتے ہوئے سیورین اُٹھ گئی۔
”تم ابھی تک یہیں ہو؟“ میں نے عمداً انگریزی میں پوچھا۔
”تمھارا انتظار کر رہی تھی۔“ وہ دبی زبان سے بولی۔
”مگر بہت وقت ہو گیا ہے۔“ میں نے فکرمندی سے کہا۔
”کبھی کبھی ہو جاتا ہے اتنا وقت بھی۔“ بابا سے دل چسپ باتیں ہو رہی تھیں۔ وقت کا اندازہ بھی نہیں ہوا۔
”تمھیں اب جانا چاہیے۔“
”سچ کہوں، دل ہی نہیں چاہتا۔“
میں پھر کیا کہتا۔ اُسے دیکھتا رہ گیا۔
”یہ تو بہت انوکھے لوگ ہیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میرے لیے کیا کریں۔ بار بار زری کا ذکر کرتے رہے۔ کیا میں واقعی کچھ اُس جیسی ہوں؟“ اُس نے معصومیت سے پوچھا۔
”ہاں، کچھ کچھ، بل کہ بہت کچھ۔“ میں نے بھی سچ کہا۔
”اُس کا نام اتنی بار سنا ہے کہ اُسے دیکھنے، اُس سے ملنے کے لیے دل مچلتا ہے۔“
”آئینہ تو گھر میں ہے تمھارے، گھر جا کے سامنے کھڑی ہو جانا۔“

میری سخن طرازی لمحوں بعد اُس کی سمجھ میں آئی اور اُس کے رخساروں سے کرنیں سی پھوٹنے لگیں۔ ”شکر ہے، اس وقت تم کسی کشاکش سے دوچار نہیں ہو، ورنہ تو...“
کمرے میں صرف ایک ہی میری اُس کی زبان سمجھ رہی تھی اور زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ تا دیر اُن لوگوں کی موجودی میں کسی ایسی زبان میں بات کرنا جس سے وہ ناواقف ہوں، آداب کے منافی تھا۔ میں نے ہندوستانی میں سیورین سے بات شروع کی تو اُسے بھی ناروائی کا احساس ہوا۔ میں نے اُسے تاکید کی تھی کہ کل صبح وہ ناشتے وغیرہ کی زحمت نہ کرے۔
”کیوں نہیں۔“ وہ چہک کے بولی، ”آج تو زورا اور جامو بھائی بھی ہیں۔“
”اسی لیے کہہ رہا ہوں۔ اتنی دیر سے گھر جا رہی ہو۔ تم اہتمام سے باز نہیں آؤ گی۔ جاتے ہی صبح کی تیاری میں لگ جاؤ گی۔“ میں نے منع کرنے کے انداز میں کہا، ”یہاں اسپتال میں معقول انتظام ہے، خصوصاً ان کمروں کے لیے۔“
”کچھ نہیں، میری فکر نہ کرو۔ مجھے کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ مجھے خوشی ملتی ہے۔“
”ہاں مسٹر! ابھی راجا بھائی ایک دم ٹھیک بولتا ہے۔ ناشتا کا کوئی جھگڑا مت ڈالو۔ گھر جا کے ابھی اکتفارات سونے کا ہے بس!“ زورا نے مشفقانہ تیور سے کہا۔
سیورین نے سنی اَن سنی کر دی۔ سب کو ’خدا حافظ‘ کہتی، ہاتھ ہلاتی ہوئی تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ اُسے راہ داری کے سرے تک رخصت کرنا میرا معمول ہو گیا تھا۔ زورا اور جامو بھی اُٹھ گئے تھے۔ میں نے اُنھیں روک دیا۔ کمرے سے چند قدم دُور جا کے سیورین ٹھہر گئی اور مضطربانہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔
میں نے جانا، کوئی چیز بھول گئی ہے، میں نے وجہ پوچھی۔
”کچھ کہنا ہے تم سے۔“ اُس کی آواز اُمڈ رہی تھی۔
میری سوالی نظریں اُس پر مرکوز ہو گئیں۔ ”کیا بات ہے؟“
”میں واقعی کیسی لڑکی ہوں؟“
”یہ کیا... کیا مطلب، تمھیں کسی سند کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟ تم اچھی ہو۔“
”میری کوئی بات تمھیں ناگوار تو نہیں گزری؟“

”پھر تمھیں کیوں آیا، مسئلہ کیا ہے؟“
”تم چاہو تو مسئلہ کوئی بھی نہیں۔“
”میں چاہوں...؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟“ میں نے ناگواری سے پوچھا، ”کیا ہے؟“
”میں بھی تم لوگوں کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔“ اُس نے رُکی رُکی آواز میں کہا۔ میں گنگ رہ گیا۔
”بہت پہلی کر لی تھی تم سے۔“ اُس کے ہونٹ دھڑک رہے تھے۔
”تم اپنے ہوش و حواس میں تو ہو۔“ میں نے اضطراری لہجے میں کہا، ”کہاں، کہاں جانا چاہتی ہو؟“
”تمھارے ساتھ، جہاں تم جاؤ، جہاں بھی۔“
”تمھیں معلوم ہے، تم کیا کہہ رہی ہو؟“
”میرا یہاں کوئی نہیں۔ جو ہیں، دُور دُور کے ہیں۔ بس مجھے ساتھ لے چلو، کسی بھی حیثیت سے، اور کسی حیثیت کے بغیر بھی۔ میں تم پر، یا کسی پر کوئی بوجھ نہیں ہوں گی۔ میرا وعدہ ہے تم سے، میں تمھاری، بابا کی اور اُس کی... زری کی خدمت کرتی رہوں گی۔“
وہ ڈوبتی ڈولتی آواز میں بولی۔
لمحوں تک مجھ سے کچھ کہا نہ جا سکا، پھر میں نے بہ مشکل، اپنی آواز، اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے نرم روی اختیار کی۔
”تم ہمارے بارے میں کتنا جانتی ہو؟“
”جتنا جان چکی ہوں، اُتنا بہت ہے۔“
”تم بچوں کی سی باتیں نہیں کر رہیں؟“ میں نے بھیگی آواز میں کہا، ”اتنا بڑا فیصلہ تم نے اتنی آسانی سے کیسے کر لیا؟“
”سوچ سمجھ کر کیا ہے۔“ اُس کے لہجے میں یقین تھا۔
”اور میں نے بابا سے بھی بات کی ہے۔“
”تم نے مغل بھائی سے بھی کہا ہے یہی کچھ؟“ میں نے بدحواسی سے پوچھا، ”پھر... پھر اُنھوں نے، اُنھوں نے کیا جواب دیا؟“
”اُنھوں نے تمھارے بارے میں کہا ہے۔ کہہ رہے تھے، تمھیں اگر کوئی اعتراض نہ ہو۔“
”یہ کہا اُنھوں نے؟“ مجھے حیرانی ہوئی اور میں نے کسی دلیل سے اجتناب کیا۔ ”پھر میرا کیا ہے۔“ میں نے کہا، ”وہ

آ، وہ ہیں تو میرے اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔ اصل میں تو وہ مُتحمل بھائی ور اُن کی بیٹی ہی کا گھر ہے۔"

"تمھارا کچھ نہیں ہے؟" وہ شکیلی آواز میں بولی۔

"میں کیا! سارا کچھ تو مُتحمل بھائی کا ہے۔"

"تم نہیں چاہتے، میں بھی وہاں رہوں، اُن لوگوں کے ساتھ۔ کیا میں دوسروں کی طرح اُس گھر کی ایک فرد نہیں بن سکتی؟"

"کیوں نہیں بن سکتیں، مگر کیوں؟ تمھیں اُس گھر میں بسنے والوں کے واقعات معلوم ہیں؟"

"بابا نے کچھ کچھ اشارتاً بتایا ہے، وہاں کون کون ہے، اور وہ سارے کس طرح ایک دوسرے کے لیے ایثار پر آمادہ رہتے ہیں۔"

"اُنھوں نے نہیں بتایا کہ وہ سارے کن حالات میں وہاں آئے ہیں، کس بے چارگی کے عالم میں؟"

"میں بھی کسی بے چارگی میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔"

"تم... تم کس مصیبت سے دوچار ہو۔"

"میں بہت اکیلی ہوں۔ میں تمھیں کیا بتاؤں۔" وہ روہانسی ہوگئی۔ "میرا کوئی نہیں ہے۔"

"لیکن ہمارے یہاں آنے سے پہلے بھی تو تم۔"

"وہ اور بات تھی۔ جب تم یہاں نہیں آئے تھے۔ [illegible] زورا ور جا سو بھی ئی۔"

میں نے اُس سے کہا کہ ہمیں یہاں آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ بیش تر مُتحمل حواس سے بیگانہ رہا، اور درمیان میں اَن ہونے سانحے پیش آتے رہے۔ اِن دنوں میں جو کچھ اُسے دیکھنا، سننا اور سہنا پڑا ہے، اُس نے کبھی تصور نہ کیا ہوگا، اڈّے، چاقو، پولیس، خون... اور میں نے کہا، اُسے کیا معلوم ہے، خانم، نیساں اور سلما حیدرآباد سے، منیر علی کا خاندان جیسلمیر سے، فروزاں اور یاسمن آسن سول سے، اور خود زریں کس عذاب سے گزر کے اُس پناہ گاہ تک پہنچ پائی ہے۔ اُن سب کا وہاں اکٹھے ہو جانا ایک اتفاق ہے، یا مجبوری ہے۔ سیورین کی کیا مجبوری ہے؟ وہ ایک منظم زندگی گزار رہی ہے، نہایت محترم اور مقدس پیشے سے وابستہ ہے، یہاں اُس کا گھر ہے، یہ گلیاں، مجمعے، یہاں کے موسموں کی وہ عادی ہے۔ میں گواہ ہوں، اُس سے ڈاکٹر راے کا سلوک کس قدر مربیانہ ہے۔ سبھی اُس کی عزت کرتے ہیں، اور وہ کوئی عام نرس نہیں۔ اِن خاص کمروں میں اُس کی تعیناتی ہے، اپنے کام میں مہارت اور مستعدی ہی کے سبب سے۔ نئی جگہ تو نئی ہوتی ہے۔ زریں کی حویلی تو ایک چاردیواری ہے۔ اُس چاردیواری میں بے شک اُن ستم رسیدگاں نے عزت اور عافیت کی ایک دُنیا آباد کرلی ہے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہاں سب ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں، اور احسان و ایثار کے لیے آمادہ رہتے ہیں، لیکن وہ اور دُنیا ہے۔ یہاں سے کوئی مطابقت نہیں ہے۔

میں نے اُس سے اور بھی بہت کچھ کہا، مگر اُس نے عزم کر رکھا تھا۔ کہنے لگی کہ اُس نے پہلی مرتبہ ایسے لوگ دیکھے ہیں جو دوسروں سے بہت مختلف ہیں۔ دریا دلی، اِرادوں کے پختہ، تحفظ، توانائی اور سلامتی کی علامت۔ اِن کے پاس بڑی چھاؤں ہے۔ انھیں دیکھ کے احساس ہوا کہ وہ تو بڑی گھٹی ہوئی زندگی بسر کرتی رہی ہے۔ وہ تو بہت حریص، بدنگاہ اور سوداگر لوگوں میں گھری [illegible] ہے، وقت پر کنارے ہو جانے، آنکھیں چُرا جانے والے [illegible] اسپتال میں طرح طرح کے مریضوں سے اُس کا واسطہ [illegible] اُن میں سے بیش تر اُسے ساتھ لے جانے کی [illegible] ہے، کسی نے اُس کے دام پوچھے، کسی نے اُس کی قیمت لگائی، کسی نے اپنے راج محل کی زینت بنانا چاہا، کسی نے دُنیا بھر کی آسائش فراہم کرنے کے دعوے کیے۔ عورت شاید مرد سے زیادہ حساس اور نگاہ شناس ہوتی ہے۔ وہ کیا بتائے، کس طرح اُس نے اپنا دامن بچائے رکھا ہے۔ سیورین نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا کہ اُس کی ماں ہے نہ باپ، رشتے کی ایک مہربان چچی اپنا گھر چھوڑ کے اُس کے گھر آ بسی ہے، اُسی کی دُمساتھ کے لیے۔ کہنے لگی کہ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی، اور یقیناً بن جاتی، لیکن کوئی بھی ساتھ نہ رہا تو اُس نے اپنا ساتھ بھی چھوڑ دیا، اُس نے خود کو ترک کر دیا۔ پر یہ زندگی ہے، کتنی ہی بیگانہ ہو، آدمی کھینچے، دھکیلے جاتا ہے۔ وہ تنہا رہی تھی، اُس نے تکرار کی کہ ہمارے یہاں آنے کے بعد اُسے کسی دریچے کے کھل جانے کا گمان ہوا۔ کوئی دریچہ کھل گیا ہو جیسے اور تازہ ہوا وہ روشنی در آئی ہو۔ اُس کے ویراں کدے میں کونپلیں سی پھوٹنے لگیں اور بچھڑے ہوئے خواب اُس کے پاس لوٹ آئے۔

میں نے بہت کچھ کہنا چاہا، لیکن میرے اِدّعا میں کوئی توانائی تھی، یا اُس کا ارادہ میری دلیلوں سے زیادہ توانا تھا۔ کہنے لگی کہ کیا اُس نے واقعی کوئی بڑی ناروا بات کہی ہے، جو امکان سے باہر ہے۔ کیا میرے تقدّر کا سبب یہ ہے کہ دوسروں کی طرح اُسے کوئی حادثہ یا سانحہ پیش نہیں آسکا ہے، وہ بے بسی اور محرومی کے اُس پیمانے پر پوری نہیں اُترتی جو ہم نے زرّیں کی حویلی میں داخلے اور سکونت کے لیے مقرّر کیا ہے، یا وہ اُن کی طرح نہیں ہے جو وہاں موجود ہیں، وہ کوئی غیر لڑکی ہے، کوئی اَچھوت، میرے کہنے کے مطابق، وہ ایک چار دیواری ہے، لیکن زنداں تو نہیں ہے۔ اُس کے وہاں چلے جانے سے کچھ منتشر ہوجانے کا اندیشہ ہے، اور کیا اُس زنداں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ کہنے لگی، کیا آدمی کبھی کچھ وہی ہوتا ہے جو نظر آتا ہے۔ اُس کا دمکتا رنگ، چمکتی آنکھیں، خوش رفتاری، خوش گفتاری، یہ نظم وضبط، سلیقہ شعاری کسی سرایت کیے ہوئے خوف کا مآل بھی تو ہوسکتی ہے۔ آدمی کو کبھی غصہ بھی تو آنا چاہیے، وہ اونچی آواز میں بات کرنے کو ترس گئی ہے۔ پیشہ [illegible] کوئی جبر ہے، یا بے حسی۔ آدمی کا سب سے [illegible] کے باوجود خوابوں سے محرومی ہے۔

میں نے ہاتھ اُٹھا کے اُسے روک دیا۔ "خدا کے لیے اتنا مت کہو۔" میں نے التجا کی۔ "میں شاید وضاحت نہیں کر پایا، نہیں کر پا رہا ہوں۔ مجھے بتاؤ، تم نے میری یا مخمل بھائی کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا ہے؟ تم چھاؤں کی بات کرتی ہو، تو ہم وہاں کب اور کتنا رہ پاتے ہیں۔ ہم تو مستقل سفر میں رہتے ہیں، اور سفر میں کیوں رہتے ہیں، یہ تمھیں کیا معلوم ہے۔"

"کچھ کچھ بابا نے مجھے بتایا ہے۔" وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

"تمھیں کچھ بتایا ہے اُنھوں نے؟" میں نے حیرت سے پوچھا، "کیا... کیا بتایا ہے؟"

"یہی کہ تمھیں کسی کھوئے ہوئے کی تلاش ہے۔" وہ اُداسی سے بولی۔ "تمھارا کام بس یہی رہ گیا ہے۔ میری دُعا ہے، کاش، وہ تمھیں جلد مل جائے، لیکن اس کا یہ مطلب کہاں ہوتا ہے، تمھاری مراد بر آنے کے بعد تم وہ نہیں رہو گے جو تم ہو۔ تمھارے سائے اور روشنی میں کمی ہوجائے گی۔ تمھارا دل تنگ ہوجائے گا۔ تم تو اور سایہ دار اور توانا ہوجاؤ گے۔"

میں نے اُسے غور سے دیکھا، وہ ایک خوش اندام لڑکی، شاخِ نازک کی طرح جس کا سراپا، رنگ شفق گوں، نقش ونگار تراشیدہ۔ وہ کیسی باتیں کر رہی ہے، کسی نے سچ کہا ہے، آدمی تو اپنے دَردوں سے تشکیل وتکمیل ہوتا ہے۔ سامنے کے، یا نظر آنے والے مظاہر کی دل فریبی کو باطنی اوصاف دو آتشہ کر دیتے ہیں۔ جو آئینے کا شیوہ ہے، وہی آنکھ کا۔ آئینے کو کتنا نظر آتا ہے، اور آنکھ کی رسائی کس قدر ہے۔ اصل تو جوہرِ نادیدہ ہے، تراشیدہ فکر، شبابی، چمکتی خیال، جذبہ واحساس کی خوش قامتی، نرمی ونازکی اور فراوانی، اور گونا گونی، سراپا تو تبھی مکمل سمجھنا چاہیے۔

بے اختیار میرا جی اُسے سینے سے لگا لینے کو اُمڈا، لیکن پھر میں ٹھٹک کے رہ گیا۔ ہم کمرے کے باہر کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ اسپتال کے اِس حصے میں بہت سکون ہوتا تھا، اور اُس وقت تو [illegible] نہ ہونے کے برابر تھی۔ سوئی سوئی سی روشنی ہر طرف [illegible] ہوئی تھی۔ رات کی خاموشی میں ہر پل کو بھی جیسے گویائی [illegible] ہے۔ لگتا تھا، سرگوشیاں کر رہی ہو۔ میں نے کچھ کہنا چاہا، اور [illegible] خاموش کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ لمحے گزر گئے، پھر میں نے [illegible] آواز میں اُسے ٹوکا، "گھر جاؤ آپ، دیر بہت ہوگئی ہے۔"

اُس نے بھی پھر زبان نہیں کھولی، راہ داری کے موڑ پر وہ جدا ہو جاتی تھی۔ وقت گزر جانے کی وجہ سے مجھے دُور تک اُس کے ساتھ جانا چاہیے تھا، لیکن اُس نے مجھے روک دیا، اور جاتے وقت اُس کی گراں خاطری کا مجھے شدت سے احساس ہوا، سو اُس کی دل دہی کے لیے میں نے فرمائش کی۔ "سنو! وقت ملے تو صبح ناشتے میں ذرا سے میٹھے چاول لیتی آنا... زیادہ بالکل نہیں۔" میرے لہجے میں یقیناً کسی استحقاق کی آمیزش تھی۔

وہ پھر رُک گئی اور اُس کی پلکیں جھپکنے لگیں اور اُس کی آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے۔ "تمھیں پسند ہیں؟"

"بس ایسے ہی۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "اچھے لگتے ہیں، اب تو دن ہو گئے۔"

میری تدبیر کارگر ہوئی۔ اُس کی رفتار ہی بدل گئی، جیسے تیرنے لگی ہو، یا اُڑنے۔

کمرے میں وہ تینوں میرے منتظر تھے۔ مجھے دیکھ کے بے چین سے ہوئے، لیکن کوئی سوال نہیں کیا۔ جھل بستر پر نیم دراز تھا، جامو، ورزورا، اس کی پٹی بیٹھے ہوئے تھے۔ زورا اُس کے پیر دبا رہا تھا۔

سوفے پر میرے بیٹھ جانے کے بعد جھل نے اکلسائی آواز میں پوچھا، ”کچھ بولی رے تجھ سے؟“

”ہاں۔“ میں نے سر جھٹک کے کہا۔

”لنی کھپڑیا کی ہے۔ تو نے کیا بولا؟“

”تمھارے بعد میں کیا کہہ سکتا تھا؟“ میں نے ترشی سے کہا۔

”شمیں ماتی، اس واسطے تجھ پر ڈال دیا تھا۔ تو ہی اُس کی بدلی میں سمجھائے گا۔ وہ تو بڑا مان کرتی ہے۔“

”ٹھیک ہے، اُستادا“ زورا مچل کے بولا، ”ابھی ایک کے بڑھنے پہ کیا ایدر سے اُودر ہو جانے کا ہے۔“

”بہت پیاری ہے، اُستاد!“ جامو نے وارفتگی سے تائید کی، ”اُدھر اُن بھی جیسی لگتی ہے، قسم سے۔ اُن سے بچھڑی ہو جیسے۔

وہ جو بولتے نا، ایک کو ٹھی دو، دوسرے کو ٹھو دو۔“

جھل کی پیشانی تنگ ہو گئی۔ اُس نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے بھی خاموشی ہی بہتر لگی۔

ایمی نے کسی خدمت گار کے ذریعے اسپتال کے طعام خانے سے رات کے کھانے کا انتظام کر دیا تھا۔ جھل بھی شریک ہو گیا، مناسب ہی کھانا تھا۔ کھانے کے بعد تازہ ہوا کے لیے وہ باہر آ کے بیٹھ گئے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی کی وجہ سے مینڈک اور جھینگر غل مچانے لگے تھے۔ بارش کا پانی سبزے کی سب سے مرغوب غذا ہے۔ ہر سُو تیز مہک اُٹھنے لگی ہے۔ خوش بُو کے بھی شاید رنگ ہوتے ہیں۔ سبزے سے اُٹھتی مہک سے ہرے رنگ کا گمان ہوتا ہے، گلاب کی خوش بُو سے گلابی، شہابی، چمپا سے سنہری اور موتیا سے نقرئی رنگت کا۔ جتنے رنگ کے پھول، اُتنے خوش بُو کے رنگ۔ کئی رنگ کے پھول خوش بُوؤں کا آمیزہ ہوتے ہیں؛ عطرِ مجموعہ۔ ہم سائبان میں بیٹھے تھے، سائبان میں بارش کا لطف ہی کچھ اَور ہوتا ہے۔ راہ داری کی چوڑائی اچھی خاصی اور چھت بھی خاصی اونچی تھی۔ پانی ہم سے دُور تھا، لیکن محسوس ہو رہا تھا، ہم بھی بھیگ رہے ہیں۔ بارش سے عجب خوش گوار منظر ہو گیا تھا۔

اچانک جھل کے جسم میں پھڑک اُٹھی۔ جامو اور زورا دن بھر اسپتال میں رہے تھے، اور اَب رات کو بھی موجود تھے۔ جامو کے بہ قول، میدا اُستاد زخمی ہو جانے کی وجہ سے نہ آ سکا تھا، لیکن اڈّے کے دوسرے لوگوں کے نہ آنے پر جھل کو کھٹکنا چاہیے تھا۔ کل اوّل پہر اور اُس سے پچھلے دن جھل کے پاس آ کے میدا کی شیدائیت کا حال ہم نے دیکھا تھا، کیسا بچھا بچھا جاتا تھا، جھل سے اپنی پرانی نیاز مندی کا ذکر بار بار کرتا تھا، کچھ یہی کیفیت برجو دادا کی تھی۔ میدا زخمی تھا تو اڈّے کے دوسرے آدمی اُس کی نیابت، میدا کی جانب سے معذرت کرنے اور جھل سے اپنی لگاوٹ کا اظہار کرنے آ سکتے تھے۔ اِدھر اسپتال میں دن بھر ٹکے رہنے کا جواز تو جامو اور زورا کے پاس موجود تھا کہ ڈاکٹر رائے کی نوازش خسروانہ ہے، لیکن اَب رات کو اسپتال کے تحت قواعد کے خلاف وہ ٹھیرے ہوئے تھے اور کمرے میں مزید صرف ایک بستر کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ اتنا وقت گزر جانے کے بعد اَب کہیں اُن کے جانے کے آثار بھی

پیچھے بیٹھنے والوں کے لیے بھی ہیلمٹ لازمی

نظر نہیں آتے تھے۔ جھل نے میدا کے نہ آنے کی وجہ جاننے کے بجائے حتمی انداز میں کہا، ”اُلٹا ہو گیا رے حرام کا جنا۔“

جامو اور زورا چونک پڑے۔ وہ کیا جواب دیتے۔ ”ہاں اُستاد! لگتا ہے، تھوڑا سا اُلٹا سیدھا ہو گیا۔ میدا اُستاد تو خیر آج نہیں آ سکتا تھا، لیکن دوسرے لوگ، برجو دادا...“ جامو نے اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”سیدھا بول رے۔“ جھل بگڑ کے بولا۔

”ہم لوگ تو تم کو پتا ہے، سویرے سویرے واں سے نکلے تھے۔ پیچھے اُدھر کوئی چکر ہوا، تو کیا بول سکتے ہیں۔“ جامو نے بہ ظاہر سادگی سے کہا۔

جھل کے چہرے سے ظاہر تھا، اُسے یقین نہیں آ رہا ہے۔ اُس کی نظر زورا پر گئی، اور زورا کی بے نیازی سے اُسے اندازہ ہو گیا کہ زورا بھی جاسوسی کی زبان بولنے لگا۔

میرے جی میں آیا، آج نہیں تو کل اُسے سارا کچھ معلوم ہو جانا ہے۔ کل صبح بھی میدا یا اڈّے کا کوئی اَور آدمی اُس کی خبر کو نہیں آئے گا، اور اسپتال سے چھٹی ملنے تک زورا اور جامو بھی کب تک ٹال سکیں گے، لیکن میں کہاں سے شروع کرتا۔ اِتنا بتانے سے کہ میدا اَب اِس دُنیا میں نہیں ہے، کل تک وہ بے شک ہر طرح جو کسی یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ پر اَب وہ کبھی نہ آ پائے گا، وہ اَور فی الحال اُس کے قریب ترین ساتھیوں میں سے کوئی بھی۔ جھل کو میں کیا کیا اور کس حد تک بتا پاتا۔ میں نے خود کو تھام لیا۔ خدا خدا کر کے تو اُس کی بحالی کی صورت پیدا ہوئی ہے۔ ہر بات اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے۔ بے محل حقیقت بیانی یاوہ گوئی ہو جاتی ہے۔

جھل نے بھی چپ سادھ لی۔ اُسے احساس ہونا چاہیے تھا کہ اُس کے معتقدوں کی پہلو تہی اور لب بستگی بے سبب نہیں ہو گی۔ جنھیں کسی طرح کی مرتبت نصیب ہے، اُن پر اپنے حلقہ بگوشوں کا لحاظ بھی واجب ہے۔ ارادت مندوں سے اُن کی توفیق اور مقدرت سے سوا کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ اسپتال میں زیرِ علاج کسی عام مریض سے اُس کے پرسانِ حال باہر کے بکھیڑوں کے ذکر کی احتیاط کرتے ہیں۔

دیر تک وہ راہ داری میں بیٹھے بجلی کی چمک اور بارش کی آنکھ مچولی کا نظارہ کرتے رہے۔ بارش کبھی تیز ہو جاتی، کبھی دھیمی پڑ جاتی۔ بادل مسلسل گرج رہے، یا تڑپ رہے تھے، جیسے آسمان پھٹ پڑے گا اور دُنیا آج ہی تمام ہو جائے گی۔ یوں دُنیا تو روز ہی تمام ہوتی ہے۔ آدمی کے لیے تو اُسی دن ختم ہو جاتی ہے جب وہ دُنیا سے چلا جاتا ہے۔

رات گئے جامو اور زورا کو نرس ایمی اِنھی خاص کمروں کے حصے میں واقع ایک خالی کمرے میں لے گئی، بالکل اُسی طرز کا کمرا جہاں جھل کو رکھا گیا تھا، کشادہ، روشن اور ساز و سامان سے آراستہ۔ معلوم ہوا، جاتے وقت ڈاکٹر رائے، ایمی کو ہدایت کر گیا تھا۔ یہ کیسی اعلا ظرفی، کس درجے کی خوش خلقی تھی کہ اُسے دُور افتادگان جامو اور زورا کی شب بسری کا خیال رہا، اور اُس نے کسی ایسی ویسی جگہ کے بجائے یہ خاص کمرا تفویض کیا۔ ایمی کے فراہم کیے ہوئے مریضوں کے مخصوص کپڑے پہن کے جامو اور زورا بھی مریض نظر آنے لگے تھے۔ ایمی شوخی سے کہنے لگی کہ اَب بس انجکشن کے لیے تیار ہو جاؤ۔

کچھ وقت اُن کے پاس بیٹھ کے میں ایمی کے ساتھ اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ دواؤں کا اثر ہو گا کہ جلد ہی جھل کی

آنکھ لگ گئی تھی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی، آج کا تو کام ہی شب بیداری کا تھا۔ اپنے چھوٹے موٹے کاموں سے نمٹ کے میرے پاس صوفے پر آ کے بیٹھ گئی، دیر تک چپ رہی، پھر سرگوشی میں بولی۔ "جا رہے ہو میری جان!"

میں نے کہا، "جانا تو تھا ہی۔"

حسرت سے بھیگے لہجے میں کہنے لگی، "کچھ دن اور رُک جاتے۔"

میں نے کہا، "یہ بھی بہت دن ہو گئے۔ اب اور رُکنے کو مت کہو، جتنے دن ہم یہاں رہیں گے، کچھ نہ کچھ ہوتا رہے گا۔ بہتر ہے، جلد سے جلد ہم یہاں سے چلے جائیں۔"

بھرائی ہوئی آواز میں بولی، "بہت یاد آ ؤ گے، خداوند جانتا ہے، تمھیں دیکھ کے لگتا ہے، کوئی کھویا ہوا مل گیا ہے۔ سے دن یہاں طرح طرح کے لوگ آتے ہیں، آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اُن کی صورتیں بھی یاد نہیں رہتیں، لیکن تم جیسے لوگوں کے ساتھ وقت گزارنے کا یہ پہلا تجربہ ہے۔ تم تو نقش چھوڑ کے جا رہے ہو۔" پھر بچوں کے سے لہجے میں پوچھنے لگی کہ کیا کبھی وہ بھی مجھے یاد آئے گی۔ میں کیا جواب دیتا، میں نے کہا۔ "بالکل نہیں۔" وہ کھلکھلا پڑی، مجھے بازو میں سمیٹ لیا، اور میرا ہاتھ آنکھوں سے مَس کرنے لگی، پھر کیا ہوا کہ رونے لگی۔ دُنیا میں لوگ بہت برے ہوتے ہیں تو اچھے بھی بہت ہوتے ہیں۔

رات کے آخری پہر نیند نے آ لیا تھا، لیکن مُنہ اندھیرے آنکھ کھل گئی، بہقل ابھی غافل تھا۔ مُنہ ہاتھ دھو کے میں راہداری میں آ کے بیٹھ گیا۔ صبح منظر ہی مختلف ہو گیا تھا، آسمان صاف، بادلوں کا نام نشان نہیں۔ بارش کے بعد آسمان بھی دُھل جاتا ہے، اور سبزہ، لگتا ہے، سبزے کے رنگ میں سونا آمیز ہو گیا ہو، اور اس آمیزش، اس بہروپ سے سبزہ چمکنے لگا ہو۔ آٹھ بج کر چند منٹ ہی اوپر ہوئے ہوں گے کہ لدے پھندے ایک خدمت گار کے ساتھ سیورین راہداری میں طلوع ہوئی، جیسی اُجلی اُجلی، اُجلی۔ بارش نے جیسے اُسے بھی کچھ اور نکھار دیا ہو۔ مجھے دیکھ کے رفتار تیز ہو گئی۔ اُس کے ہاتھوں میں بھی سامان تھا۔ میں نے لپک کے اُسے جا لیا اور بہ عجلت سامان اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نیلی ساڑی میں ملبوس تھی۔ ساڑی اُس پر خوب پھبتی، جچتی تھی۔ اُس کا دھان پان سراپا اور

کشیدہ، اور کمان ہو جاتا تھا۔ "جامو اور زورا بھائی کہاں ہیں؟" کمرے میں آ کے اُس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

میں نے اُسے بتایا کہ ابھی آتے ہوں گے، رات خاصی دیر سے سوئے تھے، اور کیا معلوم، سوئے بھی یا نہیں۔

"انھیں بلا لیں، سارا گرم گرم ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے آنے میں بہت دیر ہے۔ اچھا ہے، اُن کے آنے سے پہلے ہم نمٹ جائیں۔ بعد کو یہ کھانوں کی خوشبو بھی کمرے سے دُور کرنی ہے، دیکھا نہیں اُس دن۔ اُن کی ناک کتنی تیز ہے۔" وہ تیز تیز آواز میں بولی۔

اُس کی آواز پر بہقل بھی بستر سے اُٹھ گیا۔ سیورین اُمڈتی ہوئی اُس کے سینے میں جا چھپی۔ بہقل نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پیشانی کا بوسہ لیا۔

"بس بابا، آج آپ ہاتھ مت روکیں۔" اُس نے نازبردارانہ لہجے میں کہا، "آپ کا سارا کچھ دھیان میں رکھ کے لائی ہوں۔"

"تاری اب کیا رکھا ہے۔" بہقل پھیکی ہنسی ہنسا ... "بالکل ٹھیک ہوں میں۔ دیکھو، کیسا ہاتھ چلتا ہے۔" ... جانے کیوں اُس کی نظر مجھ پر، پھر اِدھر اُدھر پڑ گئی اور اُس ... تبسم پھیل گیا۔

کسی خدمت گار نے جامو اور زورا کے کمرے میں جا کے انھیں مطلع کر دیا تھا۔ جتنی دیر میں وہ آئے، ایمی اور سیورین نے میز پر تشتریاں سجا دیں، شکر ہے، جامو اور زورا نے رات والا مریضوں کا لباس تبدیل کر لیا تھا اور اپنے اصل حلیے میں آ گئے تھے۔ ناشتے کے اہتمام میں سیورین شاید رات بھر جاگتی رہی ہو، مگر چہرے پر رتجگے کے آثار مطلق نہیں تھے۔ خوشی میں آدمی پر تھکن ایسی طاری نہیں ہوتی۔ خوشی بھی تو نیند کے، نشے کے مانند ہے۔ میٹھے چاولوں کا ڈونگا اُس نے چپکے سے میری طرف کھسکا دیا۔ خاصی توجہ سے چاول پکائے گئے تھے، دانہ دانہ الگ تھا، جیسے دانہ دانہ الگ پکایا گیا ہو۔ میٹھا بھی بس میٹھے کی حد تک تھا، چاولوں پر غالب نہیں آیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ بالائی سے لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ بالائی بھی وافر تھی۔ عورتیں چاہے کتنی ہی زندگی کے دیگر معاملات میں فعال اور سرگرم ہوں، گھر اور گھریلو امور سے اُن کی نسبت طبعی ہوتی ہے۔

چھوٹی چھوٹی پوریاں، ترکاری، انڈے کا حلوہ، توسٹ مکھن، شہد، میدے کی نمکین اور میٹھی ٹکیاں وغیرہ۔ جانے کیا کیا، البتہ گوشت کی کوئی چیز نہیں تھی۔ جامو اور زورا بار بار ستائشی نظروں سے سیورین کو دیکھتے تھے اور اُس کے رخساروں پر لالی بکھر جاتی تھی۔

ٹھیک دس بجے ڈاکٹر کی آمد ممکن ہوئی۔ کمرا بالکل صاف تھا۔ ایمی اور سیورین نے تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں اور تیز پنکھا چلا دیا تھا کہ کسی قسم کی مہک باقی نہ رہے۔ ڈاکٹر راے کے ساتھ دو نوجوان ڈاکٹروں کے علاوہ گورا ڈاکٹر بھی تھا۔ وہ پہلے بھی یہاں آ چکا تھا۔ ڈاکٹر کو اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں، جامو اور زورا اُسے دیکھتے ہی کمرے سے نکل گئے اور راہداری میں کرسیوں پر بیٹھنے کے بجائے کھڑے رہے۔ دس پندرہ منٹ بعد، ڈاکٹر راے اپنے ساتھیوں سمیت باہر آ گیا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے وہ گفتگو میں ایسا محو تھا کہ ہم پر نظر نہ پڑ سکی۔ گورے ڈاکٹر نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے رسمی دوائی انداز میں ہاتھ ہلایا تو ڈاکٹر راے کو سامنے میری موجودگی کا احساس ہوا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے ساتھی ڈاکٹروں سے معذرت کرتا ہوا وہ سیدھا میری طرف بڑھا۔ "گیارہ بجے آئی جی یہاں آئے گا۔" دستی گھڑی پر طائرانہ نظر ڈال کے اُس نے ... لہجے میں کہا، "وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

"مجھ سے!" میں نے چونک کے کہا۔ "اب کیوں؟"

"یہ اُسی سے پوچھنا۔" وہ بے اعتنائی سے بولا۔

"اب کیا ... کیا ڈاکٹر صاحب؟"

"تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" اُس نے سرسری طور پر کہا، "وقت پر اُس طرف آ جانا۔" یہ حکم دیتے ہی وہ فوراً چل پڑا۔

میں نے پوچھنا چاہا کہ کس طرف، لیکن وہ مڑ چکا تھا۔ ظاہر ہے، اُس کی مراد اُس کا دفتر ہی ہو گی۔ اُسے بہت جلدی تھی، یا گورے ڈاکٹر کی ہمراہی کی وجہ سے وہ زیادہ بات نہیں کر سکتا تھا، اور مجھ میں اُسے روک کے وضاحت طلب کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا، آئی جی کا مجھ سے ملاقات کا کیا مقصد ہو سکتا ہے، اب کیا پھر کوئی اور ...

دس بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ گیارہ بجنے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔ یہ مختصر وقت کاٹنا مشکل ہو گیا۔ ڈاکٹر حسبِ عادت

بھارت سے شائع ہونے والا پنجابی سماچار اخبار دُنیا کے کئی ملکوں میں جاتا ہے جس میں افریقہ بھی شامل ہے ایک مرتبہ اِس اخبار کے مالک اور ایڈیٹر شری گل اخبار کی سرکولیشن میں اضافے کے لیے دورہ کرتے ہوئے افریقہ بھی گئے اور اپنے ایک عزیز کی معرفت سالانہ خریدار بناتے رہے۔ ایک روز ایک ہندوستانی سکھ ٹھیکے دار سے سالانہ ڈھائی سو روپے چندہ وصول کر کے اُسے سالانہ خریدار بنایا اور ساتھ ہی یہ گزارش کی کہ اپنے کسی اور واقف کار، دوست، عزیز، یا رشتے دار کو بھی سالانہ خریدار بننے پر آمادہ کر کے اُسے خریدار بنوا دیں، چنانچہ وہ انھیں ساتھ لے کر ایک اور سکھ دوست کے گھر چلا گیا۔ وہاں جا کر اُس نے دروازے پر لگی گھنٹی بجائی اور ساتھ ہی زور سے آواز دے کر پکارا، "اوئے نہال سنگھا! اوئے نہال سنگھا!" گھنٹی اور پکار کی آواز سن کر نہال سنگھ فوراً اوپر کی کھڑکی میں آن کھڑا ہوا اور پوچھا، "خیریت تو ہے؟ بہت جلدی میں لگتے ہو۔" شری گل کے ساتھی سردار نے گل صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، "دیکھو، گل جی آئے ہیں۔ پنجابی سماچار اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ فوراً ڈھائی سو روپے لے کر نیچے آؤ اور اخبار کے سالانہ خریدار بن جاؤ۔"

نہال سنگھ نے وہیں کھڑے کھڑے اوپر ہی سے جواب دیا، "مگر مجھے تو پنجابی پڑھنی نہیں آتی، میں پنجابی اخبار کا سالانہ خریدار بن کر کیا کروں گا؟"

"اس کی تم فکر نہ کرو میرے یار! جہاں سے میں اپنا اخبار پڑھواتا ہوں، وہاں سے تمھارا اخبار بھی پڑھوا دیا کروں گا۔ بس تم جلدی سے ڈھائی سو روپے لے کر نیچے آ جاؤ، باقی فکر میری ہے، تمھاری نہیں۔" گل جی کے سفارشی نے کھٹاک سے جواب دیا۔

"باتیں سکھ متروں کی" از افتخار مجاز ☆ مطالعہ فرحت سینہ

تعاون

مجھ سے انگریزی میں مخاطب ہوا تھا۔ آئی جی کا ذکر ایک ہی بار آیا تھا، لیکن زورا اور جامو کے کان بھی اُن کے دیدوں جیسے تھے۔ میری وحشت دیکھ کے کرید کرنے لگے۔ میں نے اُنھیں بتایا تو

وہ بھی مکدر ہوتے، حیران اور پریشان بھی۔

گیارہ بجنے میں آدھ گھنٹا باقی تھا۔ میں نے کمرے میں جا کے حلیہ درست کیا۔ مُغل بھی میرے ساتھ باہر آ گیا۔ زورا اور جاموکو تو معلوم تھا، مُغل سے کچھ کہے بغیر میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا رہداری سے دُور ہو گیا۔ پولیس کی نفری موجود تھی، لیکن صرف اِن خاص کمروں کے حصّے کے اطراف۔ چند منٹ بعد مرکزی عمارت آ گئی، اور سب سے پہلے چھاگلا سے مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ میرے انتظار میں باہر ٹہل رہا تھا۔ اُسی نے مجھے ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچایا اور بتایا کہ چند مریضوں سے نمٹ کے کسی بھی لمحے ڈاکٹر پہنچا چاہتا ہے۔ جی میں آیا، چھاگلا ہی سے کچھ معلوم کروں، لیکن اچھا نہیں لگا۔ مجھے صوفے پر بٹھا کے اور رسمی خیر خیریت پوچھ کے چھاگلا چلا گیا۔ میں گُنگ بیٹھا دیواری گھڑی دیکھتا رہا۔ وقت بھی کبھی کیسا بے حس ہو جاتا ہے۔

گھڑی نے گیارہ بجائے تھے، اور ابھی تین ہی منٹ اوپر ہوئے تھے کہ کمرے کے باہر وزنی جوتوں کی آہٹیں گونجیں۔ میں بے ارادہ اُٹھ گیا اور ارادتاً بیٹھ گیا، اور مجھے پھر کھڑا ہونا پڑا۔ پولیس کی یہ پابندیٔ وقت تعجب خیز تھی۔ وہ آئی جی ہی تھا۔ چھاگلا کی معیت میں تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کے ساتھ وہی دو افسر تھے جو پہلے بھی اُس کے ہم راہ آئے تھے۔ تینوں کا رُخ میری طرف ہو گیا۔ آئی جی میرے مقابل آ کے ٹھیر گیا اور اُس کی تیز چمکیلی نظریں میرے چہرے پر جم گئیں۔ پھر اُس نے فوجیانہ انداز میں ہاتھ بڑھایا۔ اُس کا مدعا سمجھنے میں مجھے دیر لگی، لیکن یہ بس چند لمحوں کا تردد تھا۔ میں نے بھی بدحواسی سے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اُس نے میرا ہاتھ زور سے جکڑ لیا اور جکڑے رہا۔ اُس دم مجھے یہ لگا جیسے میرے جسم سے بندھی رسیاں کھل گئی ہوں۔ اُس نے میرا حال پوچھا اور مُغل کا۔ میں نے ہکلاتی زبان میں اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہا، اور مجھے نہیں معلوم، میں کچھ کہہ سکا بھی یا نہیں۔

"معذرت۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ کل تم جا رہے ہو۔ تم سے ملاقات نہ ہوتی تو ایک خلش رہ جاتی۔" مجھے یقین نہیں آ رہا تھا، یہ کسی پولیس والے کا لہجہ ہے، مگر آئی جی ہی مجھ سے مخاطب تھا۔ کہنے لگا، "افسوس ہے، زیادہ دیر نہیں ٹھیر سکتا۔ ابھی شہر کے حالات معمول پر نہیں آ سکے ہیں اور ہر طرف نگاہ رکھنی پڑ رہی ہے۔ ہم نے تمھارے بارے میں کلکتا پولیس سے معلومات حاصل کی ہیں، یہ ضروری تھا، ہماری اپنی تسلّی اور یہاں کے پولیس ریکارڈ کی تکمیل کے لیے۔ تم سے لڑکپن کی عمر میں دو قتل ہوئے تھے؟" میں نے حیرانی سے اُسے دیکھا تو وہ ہاتھ اُٹھا کے جلدی سے بولا، "اور وجہ بھی معلوم ہوئی۔ کسی لڑکی کو وحشیوں سے بچانے کے لیے تم نے دو آدمیوں کو چاقو گھونپ دیے تھے۔ سات سال کی سزا کے دوران تم نے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور ایم اے کی سند حاصل کی۔ تم جیل میں نہایت اچھے قیدی ثابت ہوئے... یہی کچھ نا... تم ظہیر خاں، بابر زماں خاں اور لاڈلے! ہم کیسے حیران کُن نوجوان ہو۔ تم بتاؤ، تمھیں کس نام سے پکارا جائے۔"

"جو آپ کو بہتر لگے۔ میرے لیے بھی ایک جیسے ہیں۔" اس اثنا میں مجھے اپنی سانسیں ہموار کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے ٹھیری ہوئی آواز میں کہا، "آپ تو سب کچھ جان ہی گئے ہیں، جیل میں نام بدلنا مجبوری تھی۔ میرا خیال ہے، ناموں سے کچھ ایسا فرق نہیں پڑتا۔"

"بے شک، تم ٹھیک کہتے ہو۔" وہ جوشیلے لہجے میں بولا، "لیکن ہم یہ نہیں جان سکے کہ وہ لڑکی کون تھی؟ تم کہاں سے آئے تھے؟ اور یہ تم بتاؤ گے بھی نہیں۔"

میں خاموش رہا۔

"معلوم ہوا ہے کہ تم اڈّا گیری کے لیے ہر اعتبار سے مکمّل ہو، چاقو، بلم، لاٹھی، زور، ہر طرح سے لیس۔ تمھارے ہاتھ میں پھرتی ہے، نگاہ تیز ہے، ہوش مندی سے کسی کے سامنے آتے ہو، لیکن اڈّوں سے تمھاری وابستگی واجبی ہے۔ اڈّا گیری سے تمھیں کوئی دل چسپی نہیں۔ عرصے سے تم اپنے مربی اُستاد مُغل کے ساتھ مسلسل سفر میں رہتے ہو، کسی کی تلاش میں۔ ہو سکتا ہے، اُسی لڑکی کی تلاش میں... یا کسی اور کی۔ اطمینان رکھو، ہم تم سے پوچھیں گے نہیں۔ کلکتے میں مقدمۂ قتل کے دوران بھی تم نے اُس لڑکی کا ذکر کرنا اور نام لینا گوارا نہیں کیا اور اپنا مقدمہ کم زور کر لیا۔"

میں ایک مضطرب نگاہ سے اُسے دیکھ کے رہ گیا۔

"بہرحال، اِس وقت ہمارے یہاں آنے کا مقصد تمھیں اپنی معلومات سے متاثر کرنا نہیں، تمھارا اور ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنا تھا۔" وہ سنجیدگی سے بولا، "تمھاری وجہ سے ہم سُرخ رُو ہو سکے۔"

"میں کیا..." میرا جسم سکڑ گیا۔ "میں کہاں... شکریہ ضروری ہے تو اس کے سزاوار ڈاکٹر صاحب ہیں۔"

"تم نے سچ بولا، ڈاکٹر صاحب نے اور ہم نے... بدترین حالات میں سچ بولا... کوئی افترا، مبالغہ نہیں... اور ڈاکٹر صاحب نے ہماری رہنمائی کی۔"

"مجھے نہیں معلوم، ڈاکٹر صاحب نے آپ کی کیا رہنمائی کی، لیکن میں سمجھتا ہوں، میں نے تو کچھ نہیں کیا۔ آپ سچ کی بات کر رہے ہیں۔ میرے پاس چارہ بھی پھر کیا تھا۔"

"ڈاکٹر صاحب تو ہمارے لیے ایک دریافت ہیں، وہ انسان دوست، حق گو، جہاں دیدہ اور بے باک شخص... اُن کی بصیرت اور حکمت کے تو ہم معترف ہیں۔ انھوں نے ہمارا اعتماد بحال کیا۔ یہ انھی کی دلیلوں کا کرشمہ تھا کہ ہم سے، جُرم کہو یا گناہ، سرزد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ ہم تو تمھیں ساتھ لے جانے کے ارادے ہی سے آئے تھے، معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب سے تمھارا کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن وہ تمھارے لیے دیوار بن گئے، اور اُن کی توانائی کا سبب تم تھے، تمھارا سچ۔ انھوں نے ہمیں قائل کیا، ہم پر زور دیا کہ پولیس کے روایتی طریقوں سے ہٹ کے کوئی اقدام کرنے کی جراًت کریں۔ انھوں نے ہمارے لیے ایک سمت مقرر کی، ورنہ ہم تو بھٹکتے رہتے۔ اپنی روش کے خلاف ہم نے اُن کی ہدایات آزمائیں، اور کسی قدر اپنی حدود سے بھی تجاوز کیا۔ میدا کو چھیڑنے کے بجائے ہم نے اُس کے چھوٹے بڑے ساتھیوں سے باز پرس کی ابتدا کی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں شہر کی پولیس بدل دینے کا مشورہ دیا تھا۔ ہمارے عزم کی پختگی کی وجہ ڈاکٹر صاحب ہی تھے۔"

ڈاکٹر رائے کی آمد سے آئی جی منتشر سا ہو گیا۔ میرے سامنے سے ہٹ کے اُس نے ڈاکٹر سے ہاتھ ملایا۔

"معافی چاہتا ہوں، کچھ دیر ہو گئی۔" ڈاکٹر نے متانت سے کہا، "ایک مریض کی حالت بہتر نہیں تھی... اور یہ کیا؟ آپ لوگ ابھی تک کھڑے ہیں۔"

"کریڈٹ کارڈ کے بڑھتے ہوئے استعمال نے مجھے فکرمند کر دیا ہے۔"

"آنے زیادہ وقت نہیں ہوا ڈاکٹر صاحب، اور کھڑے کھڑے ہی آنا تھا۔" آئی جی نے تمام تر ادب سے کہا، "آپ اندازہ کر سکتے ہیں، سرِ دست مصروفیت کا کیا عالم ہو گا۔ بس آپ دونوں کا شکریہ ادا کرنا تھا، آپ نے ہمارے لیے..."

ڈاکٹر نے اُسے روک دیا۔ "چائے کا وقت تو دیجیے۔"

آئی جی نے معذرت کر لی۔ "آپ سے تو ملاقاتیں رہیں گی ڈاکٹر صاحب... اگر آپ نے وقت دیا؟" وہ بے جست سے بولا، "ہم نے تو آپ کا گھر دیکھ لیا ہے، اور مسائل تو پیش آتے رہیں گے۔" پھر وہ میری طرف منہ کر کے بولا، "اصل میں اس نوجوان کے پاس آنا ضروری تھا کہ اسے کل چلے جانا ہے، اور اِس سے تو بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"یہ ایسا ہی ہے۔" ڈاکٹر نے شگفتگی سے کہا، "کتنی ہی بار ملاقات ہو، تشنگی کا احساس رہتا ہے۔"

میں نے سر جھکا لیا۔ میرے لیے یہ ایک حادثہ ہی تھا کہ جھکتے ہوئے انداز میں آئی جی مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ "ہمیں اب اجازت دو۔" اُس کی آواز پر کوئی بار سا تھا۔

اُس کے ساتھی افسروں نے بھی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ میری تو کچھ عقل میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کہنا اور کس طرح انھیں رخصت کرنا چاہیے۔ انھیں واقعی جلدی تھی۔ کمرے سے نکل جانے میں انھوں نے کوئی لمحہ نہیں گنوایا۔ اُن کے پیچھے ڈاکٹر، پھر میں بھی باہر آ گیا۔

مرکزی عمارت کے پورچ میں موٹر کھڑی تھی۔ اُن کی رفتار تیز تھی، بالکل سپاہیانہ۔ اُن کا ساتھ دینے کے لیے

ڈاکٹر رائے دور مجھے لپکنا پڑا۔ آئی جی موٹر میں بیٹھ گیا تھا کہ مجھے خیال آیا، میں نے ہاتھ اُٹھا کے اُس سے کچھ کہنا چاہا۔

اُس نے ڈرائیور کو موٹر بند کرنے کا حکم دیا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ جھٹ موٹر سے اُتر آیا، اُس کے ساتھ دونوں افسر بھی۔ مذبذب لہجے میں اُس نے مجھ سے پوچھا: "کوئی مسئلہ؟"

"ایک گزارش ہے۔" میرا لہجہ عاجزانہ تھا۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ مجھے اکبر علی خاں صاحب کے گھر جانے کی اجازت مل جائے؟"

وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکا، ماتحتوں پر نظر کی، پھر ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

"نہیں، ممکن نہیں۔" ڈاکٹر نے قطعی آواز میں دخل دیا۔

"ہاں، ڈاکٹر صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ وہاں تو ہر وقت سوگ واروں کا ہجوم ہے، اور اُن میں طرح طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ بیگم کے چلے جانے پر تو وہ گھر بالکل اُجڑ گیا ہے۔" آئی جی تأسف سے بولا، "ہم نے تمہاری طرف سے سکندر علی خاں کو مطمئن کر دیا ہے کہ ہمی نے تمہارا راستہ روک رکھا ہے۔ اُس کی حالت بھی ٹھیک نہیں، تین چار روز اور یہاں رہے گا، پھر بچی کو ساتھ لے کے دکن چلا جائے گا۔"

میں چپ ہو گیا۔

"ہم تمہارا دُکھ، تمہاری خلش محسوس کر سکتے ہیں، اور ہم نے ہر زاویے سے غور کیا، کسی جگہ بھی ہمیں تمہارا دوش نظر نہیں آیا۔ تم سے ایک چوک ضرور ہوئی، اسے چوک کہنا بھی چاہیے یا نہیں۔ ڈاک خانے میں میدا کا جیب کترا ساتھی تمہارا بٹوا لے کے بھاگ کھڑا ہوا تھا تو تم اُس پر خاک ڈال دیتے۔ پھر کچھ بھی نہ ہوتا۔ ہمیں یہ حقیقت بھی تسلیم ہے کہ تم جیسے نوجوان... اور شاید کسی کے لیے بھی خود کو قابو میں رکھنا مشکل تھا، تمہیں فطری طور پر اُس کا تعاقب کرنا چاہیے تھا... اور ہاں، ایک دوسری چوک، وہ بھی نادانستہ تھی کہ میدا کے ٹھکانے پر جا کے اُستاد جھلّل کا نام تمہاری زبان پر نہ آ سکا۔ آ جاتا تو صورت بالکل مختلف ہوتی۔ میدا نہایت سفّاک اور چالاک آدمی تھا، وہ جان گیا تھا کہ تم یوں ہی سینہ تان کے اُس کے سامنے نہیں آئے ہو گے۔ کاش، وہ تمہارے مقابل آ جاتا۔ ہمیں یقین ہے، پھر اُس کا کیا حشر ہوتا لیکن بنیادی طور پر وہ ڈاکے کا آدمی نہیں تھا، بڑا کمینہ صفت، درندہ خصلت تھا وہ۔ ہمیں صدمہ ہے تو اکبر علی خاں کا۔ اُن کے گھر جا کے دل ڈوبنے لگتا ہے۔ بچے دیکھ کے، سکندر علی خاں سے مل کے۔ بچے تو ٹوٹ پھوٹ سے گئے ہیں، یہی حال اُن کے تایا کا ہے۔" آئی جی کی آواز بھاری ہو گئی۔

ڈاکٹر نے اُس کی کمر پر ہاتھ رکھ کے موٹر کی طرف اشارہ کیا، اور موٹر جلد ہی دُور چلی گئی۔

میں نے اجازت چاہی تھی، لیکن ڈاکٹر رائے مجھے ساتھ لے آیا اور کمرے میں آ کے دیر تک گم سم بیٹھا رہا۔ میرا کچھ پوچھنا یا ٹوکنا سُوءِ ادب ہوتا۔ لگتا تھا، مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے اور زبان کھولنے سے پہلے اپنے مدعا کی پیمائش کر رہا ہے۔ قدر و قیمت، اثری و بے اثری کا تخمینہ۔ یوں خالی الذہنی میں بھی کچھ یہی کیفیت ہوتی ہے، مگر ڈاکٹر جیسے ایک پُر مایہ شخص کے ذہن میں ہر وقت خیالوں کی یورش ہوتی چاہیے۔ آتے وقت وہ خدمت گار سے چائے کے لیے کہہ آیا تھا۔ چند منٹ بعد چائے آ گئی اور ڈاکٹر میز والی کرسی سے اُٹھ کے صوفے پر میرے پاس آ بیٹھا۔ خدمت گار چائے بنا کے چلا گیا تو چند گھونٹ لے کے اُس نے بتایا کہ اُس کا معاون چھاگلا ہمارے جانے تک مسلسل ہمارے رابطے میں رہے گا۔ چھاگلا نے گرانڈ ہوٹل سے ہمارا بچا یا سامان لینے اور ہوٹل کا حساب چکتا کرنے کے لیے اپنا ایک خاص کارندہ بھیج دیا ہے۔ توقع ہے کہ ہوٹل کا منیجر ہوٹل میں رکھی ہوئی میری نقد رقم حوالے کرنے اور رسید لینے خود آئے گا۔ قبل از وقت ہمارے لیے ریل کے ٹکٹوں اور ڈبے میں جگہ کی فراہمی کے لیے بھی چھاگلا ہی سے کہا جائے۔

اُس نے میرے آگے نمکین بسکٹوں کی طشتری رکھ دی اور ستائے انداز میں بولا، "تم لوگ کلکتے جا رہے ہو یا فیض آباد؟"

"میری خواہش تو فیض آباد جانے کی ہے، وہاں گھر ہے۔ جھلّل بھائی کو کچھ دن آرام کرنا چاہیے۔"

"وہ اب بالکل ٹھیک ہے، دماغ پر سوجن نہیں۔ اُس کی اتنی فکر مت کرو۔"

"لیکن ابھی آرام تو بہ تر ہی رہے گا۔"

اُس نے ہنکاری بھری اور کچھ توقف کے بعد آزردگی سے بولا، "رات کو آ رہے ہو؟ بینا کہہ رہی تھی، کچھ پہلے آ جانا۔"

"جی..." میری آواز ڈگمگا گئی۔

"اور کہہ رہی تھی، کچھ خاص پسند ہو تو پوچھ لوں۔"

"کیا ڈاکٹر صاحب!" میں نے کھسیائی آواز میں کہا، "آپ کے ہاں تو سبھی کچھ کسی نعمت کے مانند ہے۔ لیکن..."

وہ صوفے پر سیدھا ہو گیا۔ "لیکن کیا؟"

میں نے بہ مشکل کہا، "مجھے معاف کیجیے۔ مت بلائیے مجھے۔"

"کیا... کیا بات ہے؟"

"شاید میرا گھر نہ آنا ہی بہتر رہے گا۔"

اُس کے ہونٹ کھل گئے، آنکھیں بھنچ گئیں۔

"آپ نے غور نہیں کیا ڈاکٹر صاحب!" میں نے بساط بھر انکسار سے کہا، "اجازت ہو تو جسارت کروں؟"

"ہاں ہاں، کہو، کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"آپ نے اُس رات مجھے گھر سے رخصت کرتے ہوئے ایک بات کہی تھی۔ ہو سکتا ہے، آپ نے یوں ہی اپنا ایک خیال ظاہر کر دیا ہو، لیکن مجھے اپنی سماعت پر شبہ ہوتا رہا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا وہ رات کیسی بے چینی سے گزری۔ آپ نے مجھے کیسے مرتبے سے نوازنے کی دریا دلی کی تھی۔ ایک ایسے شخص کے لیے، جس سے آپ کا واسطہ چند روزہ تھا، یہ کیسی وسیع القلبی اور روشن خیالی ہے۔ میں اِس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس وقت میں آپ سے کچھ نہ کہہ پایا کہ جو میں نے سنا ہے، واقعی آپ نے کہا ہے، مجھے تو کسی خواب کا گمان ہوتا تھا، اور میں آپ سے کہہ بھی کیا پاتا۔ شاید آپ کو یاد ہو، میں نے آپ کو پہلے ہی بتایا تھا کہ کوئی مجھ سے بچھڑ گیا ہے۔ روز لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں، مگر کوئی رگِ جاں ہوتا ہے، حرزِ جاں۔ اُس کے بغیر آدمی ادھورا رہ جاتا ہے۔ مجھے، میری منزل مجھ سے کھو گئی ہے۔ عرصہ ہو گیا، میرا کام شہر شہر، گلی کوچے اُسے ڈھونڈنا رہ گیا ہے۔ میری وجہ سے میرا آباد گھر ویران ہو گیا، ماں بیٹے کی جدائی میں سو گئی، بہن بھی کوٹھے پہ چلی گئی، اور وہ بھی مر گئی۔ پر اب پھر سے ایک گھر بن گیا ہے، باپ ہے، بہنیں اور بھائی ہیں... اور ایک گھر نہیں... دو دو گھر... لیکن میرا تو کوئی بھی گھر نہیں ہے۔ گھر تو گھر میں رہنے سے ہوتا ہے، مجھے اپنے گھر میں رہنے کی سعادت اور مسرت عرصے سے نصیب نہیں ہے کہ میرا کہیں جی نہیں لگتا۔ میں تو کب سے در بہ در ہوں۔"

ڈاکٹر بے حس و حرکت آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔

میں نے اُس سے کہا کہ اُس کی بیٹی بینا تو قدرت کے کسی شاہ کار کے مانند ہے، ایک بے پناہ لڑکی۔ جس پہلو سے دیکھیے، حُسن و جمال میں یکتا، باطنی صفات میں بہ درجۂ کمال۔ علم، ہنر، سلیقہ، فکر اور رفتار گفتار میں ایک مثال۔ کسی میں اتنی خوبیاں شاذ و نادر ہی یک جا ہو پاتی ہیں۔ اِس پر مستزاد، وہ کس صاحبِ کمال کی بیٹی ہے، ایک مسیحا نفس، فرشتہ خصلت باپ کی۔ کون ناہنجار اُس سے نسبت کا خواہاں نہ ہو گا۔ وہ تو کوئی بدبخت ہی ہو گا۔

"بس کرو۔" میرے ہاتھ پر زور ڈال کے ڈاکٹر کسی قدر ناراضی سے بولا، "اِتنا مت کہو۔"

"مجھے کہنے دیجیے۔" میری آواز کی سوزش اختیاری نہیں تھی۔ میں نے کہا، "مجھے اندازہ ہے، آپ نے بیٹی کا عندیہ جانے، یا محسوس کیے بغیر اتنی بڑی، اتنی اہم بات منہ سے نہ نکالی ہو گی۔ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں۔ کوئی دوسرا تو کوئی نامراد ہی دے سکتا ہے۔"

میں نے کہا، "رات بھر کے کرب و انتشار کے بعد میں پُرسکون ہو گیا۔ یوں کہیے کہ میں جو آپ کی داد و دہش کے سحر میں اپنا ارادہ کھو بیٹھا تھا، مجھے باز یاب ہو گیا۔ میں نے طے کیا کہ ڈاکٹر رائے جیسے زندگی شناس اور وضع آشنا سے بات کرنا

چند پتے سودمند

- انسان جتنی محنت خامی چھپانے میں صرف کرتا ہے، اُتنی محنت میں وہ خامی دُور کی جا سکتی ہے۔
- اپنی اولاد کو ہم بہت کچھ سمجھانا چاہتے ہیں، لیکن وہ نہیں سمجھتی۔ ہماری اولاد بھی ہمیں بہت کچھ سمجھانا چاہتی ہے، لیکن ہم نہیں سمجھتے۔
- کچھ لوگ زندگی میں مردہ ہوتے ہیں اور کچھ لوگ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔

فرمودات: واصف علی واصف ☆ تعاون: رانا محمد حمید خاں

ایسا مشکل نہیں۔ میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ آپ کے سامنے سارا احوال آئینہ کردوں گا، لیکن آپ کا سامنا ہوتے ہی ہمت جواب دے جاتی تھی۔ ایک نہایت نازک خیال آدمی کے شیشۂ احساس پر ٹھیس لگ جانے کا اندیشہ گھیر لیتا تھا۔"

وہ مسکرانے لگا اور میرے ہاتھ پر تھپکا مارتے ہوئے بولا، "وحشت! کیسی باتیں کرتے ہو۔ مجھے تو تمھارا جواب اُسی وقت مل گیا تھا جب تم کوئی جواب نہ دے پائے تھے۔ میں نے ایک خواہش ظاہر کی تھی۔ اِس کا مطلب حکم نہیں تھا۔ بینا کے علاوہ کچھ تمھارا خیال بھی تھا کہ تم اپنے دیگر پس منظر کے باوجود، ایک لائق، تعلیم یافتہ، سلیم الطبع، پُرجوش اور جرأت مند نوجوان ہو۔ تم میں ہر قوی شخصے، سایہ اور ستون بننے کی صلاحیت ہے۔ تمھیں تو کہیں اور ہونا چاہیے۔ خیال تھا، عرصے سے تم کسی سراب کے تعاقب میں ہو تو کچھ زندگی کی طرف بھی دیکھو، زندگی کو زندگی کی طرح برتو۔ یہ اتنی محدود نہیں ہے، اور تم سے تم تک اور تمھاری کسی معیّن منزل تک نہیں ہے۔ بے شک میری تجویز میں بینا کی پسندیدگی شامل تھی، لیکن کیا ضروری ہے کہ تم، بہ ہر حال، مجھ سے متفق ہو، اور کیا ضروری ہے کہ کسی ربط و ارتباط کے لیے کوئی ایک مخصوص رشتہ ہی بنیاد بنے۔ تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ تمھارے پاس مثبت جواب نہیں ہے تو تم کسی احسان فراموشی، محسن کُشی کے مرتکب ہو جاؤ گے۔ میرا تم پر کوئی حق نہیں ہے، اور نہ ہی بینا پر۔ تم بھی ایک اکائی ہو، بینا بھی۔ تمھاری طرح بینا کی بھی ایک ذات ہے۔ اُسے یا تمھیں مشورہ تو دیا جا سکتا ہے، لیکن اپنی خواہش مسلط کرنا مناسب نہیں۔ رشتوں میں حق کی بات شدّ و مد سے کی جاتی ہے۔ یہ حق بڑا مبہم لفظ ہے۔ اس کی پیمائش کسی کو نہیں معلوم۔ حق سے مراد کوئی ضابطہ، قاعدہ، قانون اور روایت ہے، لیکن رشتے تو تعلق خاطر سے استوار ہوتے ہیں۔ کون کس سے کتنا مانوس ہے، کسے کون کتنا مرغوب ہے شیدائیت حق پر نہیں، خود رَو ہونی چاہیے، از خود رفتہ۔ بینا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے، انگلستان سے اس لیے آ گئی کہ اُس کا باپ اکیلا ہے اور اُسے اپنے باپ کی خدمت کرنی چاہیے۔ نہیں، قطعاً نہیں۔ وہ اِس لیے یہاں نہیں آئی کہ میں اُس کا باپ ہوں۔ وہ اِس لیے آئی کہ وہ ایک شخص سے محبت کرتی ہے جو اتفاق سے اُس کا باپ بھی ہے۔ اُس نے میری اپنی چاہتوں میں ایک وقت گزارا ہے۔ میرے بیٹے نہیں آئے، اور مجھے اُن سے کوئی شکایت نہیں۔ بینا نہیں آتی تو مجھے اُس سے بھی کوئی شکوہ نہ ہوتا۔ ذمّے داری، یا ایک روایتی لفظ، فرض کی ادائی سے حق کا جواز نہیں بنتا۔ میں نے، ہرچند، ایک باپ کی حیثیت سے اپنی ذمّے داری پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرض کی ادائی اور ذمّے داری کی تکمیل کسی مبادلے، معاوضے، یا حق سے مشروط نہیں کرنی چاہیے۔ سمجھے!" یکایک اُس نے سر جھٹکا اور خود کو سرزنش کرنے لگا۔ "میں تو بھٹک گیا۔ یہ میں کہاں سے کہاں چلا گیا... میں تم سے کیا کہنا چاہتا تھا۔" وہ اُلجھ کے بولا۔

"آپ بالکل نہیں بھٹکے اور بہکے۔" میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔ "آپ کیسی زندگی آموز باتیں کر رہے ہیں۔"

"میں تمھاری وضاحتوں پر ٹوک رہا تھا اور خود... میں واقعی بوڑھا ہو گیا ہوں۔" اُس نے چند لمحے تامّل کیا۔ حلق میں باقی چائے انڈیل کے وہ نسبتاً پُرسکون آواز میں بولا، "بینا ایک معاملہ فہم اور ہوش مند لڑکی ہے۔ وہ ایسی جذباتی نہیں۔ عمر چاہے کیسی ہی جذباتی ہو۔ پڑھا لکھا آدمی دلیلیں بنا لیتا ہے یا یوں کہو، دلیلوں میں اُسے پناہ مل جاتی ہے۔

مجھے احساس ہے، میری ایک دُور دراز خواہش کا اظہار تمھارے لیے بہت غیر متوقع ہوگا، اور یقیناً تم نے ایک مشکل وقت گزارا ہوگا۔ خصوصاً اِس صورتِ حال میں کہ تم اپنے ماضی کی کسی گرہ میں بندھے ہوئے ہو، مگر میرے خیال میں یہ کچھ ایسی ناروائی بھی نہیں تھی۔ جب تم گھر آئے تو دونوں ہی میرے سامنے تھے، تمھیں دیکھ کے، تم سے مل کے جانے کتنے زمانوں بعد بینا اپنے اصل روپ میں نظر آئی۔ میری نگاہ سے اگر کوئی لغزش نہیں ہوئی تو تم بھی مجھے خاصے مختلف دکھائی دیے، جیسے نیا ماحول اور نیا منظر تمھارے لیے دل کشی، راحت و سکون کا باعث بنا ہے۔ تم نے بڑی فکر آفریں اور دل نشیں باتیں کیں، اُس رات کچھ دیر کے لیے سہی، مگر تم دونوں کے چہروں پر چمکتی چاندنی کا میں نے نظارہ کیا تھا اور محظوظ ہوا تھا۔ میں تمھیں بتاؤں، میں جانتا ہوں اچھی طرح، میرے سامنے آ کے وہ شعبدے باز بڑی وارفتگی اور سرخوشی کا تماشا کرتی ہے، مگر اُس رات واقعی اُن کی

آنکھوں کی تابانی دیدنی تھی، ارادی نہیں، بے ساختہ۔ کتنے آئے اور چلے گئے۔ اُس نے سنگ دلی سے اُنھیں نظر انداز کر دیا۔ وہ ایک عجوبہ لڑکی ہے، کج فہم، کم ارادہ اور کم حوصلہ نہیں۔ وہ خاصی متحمل مزاج ہے، موسموں کے سرد و گرم سے آشنا۔ میں سمجھتا ہوں، تمھارے گھر آنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ خوش ہوگی، اور میں تو بس اُسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اُس کی عمر تو زندگی بسر کرنے کی ہے، اور میں تو بہت کچھ اُسی کے لیے قائم ہوں۔"

"میں آ جاؤں گا، آپ کے حکم سے سرتابی کی مجال مجھ میں نہیں ہے۔" میں نے تمام تر ادب اور احترام سے کہا، "جو میں کہنا چاہتا تھا، شاید اُس کے بیان پر قادر نہیں، لیکن آپ نے خود ہی میرے گریز اور امتناع کے اسباب کی نشان دہی کر دی ہے۔ بے شک اُس رات میرے گھر آنے پہ آپ کا مشاہدہ مبنی واقعہ ہے۔ وہاں جا کے مجھے ایسا لگا جیسے میں تو کسی طلسم کدے میں آ گیا ہوں، کسی چمن زار میں، نہیں تو روشنیوں میں آ گیا ہوں، مجھ پر تو ساتواں در وا ہو گیا ہے، اور چراغ میری دسترس میں ہے۔ بس ذرا ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے۔ میں تو وہاں... خود کو بھول گیا تھا، اور میں تو کوئی اور آدمی ہو گیا تھا، ... آپ نے یہ کہا کہ یہ سارا آئینہ خانہ، یہ رنگ اور روشنیاں، اور یہ گلستان تمھارا ہو سکتا ہے تو میری حالت اُس بس ماندہ، درماندہ، اُس قسمت گزیدہ کی سی ہوئی جس پر قدرت اچانک مہربان ہو جائے۔ لیکن جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، رات بھر کے گرداب اور ہیجان کے بعد میں، بہ ہر حال، اپنے پاس واپس آ گیا تھا۔ آپ نے بینا کے تحمّل کی بات کی ہے، اور حوصلہ مندی کی، مگر آپ نے میرے لیے نہیں سوچا۔ وہ کتنی ہی مضبوط اعصاب کی ہو، لیکن میرا بھی تو کچھ خیال کیجیے۔ میں تو اپنا بات کر رہا ہوں۔ میں جو اپنے آپ سے ہراساں ہوں۔ نقش بننے کے لیے وقت کی کوئی شرط نہیں ہوتی۔ ایک لحہ بھی نقش ہو جاتا ہے اور جزوِ جاں بن جاتا ہے۔ وہ دریچے ہی کیوں کھولے جائیں، جن کے پار کسی مطلوب کے گزرنے کا امکان ہو اور مطلوب کو بھی تو کسی گرہ سے رہا ہونا چاہیے، اور مطلوب کو بھی تو کوئی مطلوب ہو سکتا ہے۔ آپ نے ایک زندگی کے تجربے کیے ہیں، ایک منطق ماورائے عقل کی بھی ہوتی ہے،

شوق کی، خود فراموشی کی، خود شکنی کی، ہر عمر اور ہر فرد میں، جس کا درجہ اور پیمانہ مختلف ہوتا ہے۔ آدمی صرف سر ہی نہیں ہوتا، سر کے نیچے بھی بہت کچھ ہوتا ہے، بہت سمندر، آگ، اور شور اُٹھائے اور چھپائے ہوئے۔ دو اور دو پانچ کے آپ بھی قائل نظر آتے ہیں، لیکن کبھی حاصل جمع چھ، سات، دس اور بے شمار بھی ہوتا ہے۔ باہم آمادگیاں ہوں تو کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں، دیے خود بہ خود روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ نازک اندام، کانچ کا جس کا سراپا ہے، دل بھی اُس کا کانچ کا ہونا چاہیے۔ وہ تو ویسے بھی آبگینہ ہے، خوابوں اور خیالوں میں بسنے، رنگوں اور سازوں سے کھیلنے والی لڑکی۔ اُسے کیوں کسی آزمائش سے دوچار کیا جائے اور میں بھی وہ آدمی نہیں ہوں ڈاکٹر صاحب! اپنی منزل سے بچھڑ گیا تو میں خود سے نہ بچھڑ جاؤں اور پشیمانی اور پسپائی کے کسی احساس میں تا دیر شاید باقی نہ رہوں۔ مجھے تو آخر دم تک اُسے ڈھونڈنا ہے۔ میرا دل کہتا ہے، وہ میری منتظر ہے، وہ بھی کسی آسرے، کسی یقین میں زندہ ہے۔"

ڈاکٹر رائے صوفے سے اُٹھ گیا۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ اُس نے غور سے میری طرف دیکھا، اور دیکھتا رہا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکنے لگی۔ اُس کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں۔ اُس نے بازو پھیلا دیے، میں بھی اُس کے سینے سے جا لگا۔

❄ میرے پیچھے بشنوں نے سارا کچھ طے کر لیا تھا۔ یہ ڈاکٹر رائے کا دیا ہوا اعتماد ہی ہوگا کہ بشنو نے فیض آباد جانے سے انکار کر دیا تھا۔ کمرے میں میرے پہنچنے کے چند منٹ بعد وہ ذرا اشارے سے مجھے باہر لے آیا، اور اُس نے ایگی، سیوارین، جامو، بشنو، اور اپنے درمیان ہونے والے فیصلے سے آگاہ کیا۔

اُس کے کہنے کے مطابق، سیورین ہمارے ساتھ نہیں جا رہی تھی۔ وہ تو ساتھ جانے ہی پر مُصر تھی، لیکن یہ کسی طور مناسب نہیں تھا۔ جُھمل کی تاکید پر مان گئی، اور طے یہ ہوا کہ ہمارے چلے جانے کے بعد وہ لمبی چھٹی کے لیے درخواست دے گی، آبائی گھر ساتھ رہنے والی آنٹی کی تحویل میں دینے کے لیے قانونی دستاویز، مختار نامہ وغیرہ تیار کرائے گی، کلکتے میں زورا اور جامو سے خط اور تار کے ذریعے اُس کا رابطہ مستقل رہے گا، اپنے ضروری کاموں سے نمٹ کے وہ جامو اور زورا کو مطلع کر دے گی۔ دونوں معیّنہ تاریخ اور وقت پر، جس گاڑی سے پٹنا اسٹیشن آئیں گے، سیورین اسٹیشن پر اُن کی منتظر ہو گی اور اُسی گاڑی سے اُن کے ساتھ فیض آباد روانہ ہو جائے گی۔ جامو اور زورا پٹنا شہر میں داخل نہیں ہوں گے۔ دس پندرہ یا بیس منٹ جتنی دیر گاڑی اسٹیشن پر رُکتی ہے، اُتنے ہی وقت کے لیے وہ پرانے نام پٹنے میں رہیں گے۔

میں نے خاموشی سے سن لیا اور کچھ نہیں کہا۔ سیورین سامنے آتی تو رخ روک رہے تھے، بل کہ کرنیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ کچھ شرمائی شرمائی اور ہلکی پھلکی بھی لگ رہی تھی۔ مجھے بھی اپنا چہرہ شکنوں سے عاری رکھنا چاہیے تھا کہ اب میرے انگلی اُٹھانے اور مآل اندیشی میں پڑنے کا وقت گزر چکا تھا۔

کوئی ایک بجے کے قریب چھاگلا، گرانڈ ہوٹل کے مینیجر اور اُس کے دو کارندوں کے ہم راہ راہ داری میں آتا دکھائی دیا۔ ہم سب باہر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ مینیجر حسب کتاب اور ہوٹل میں رکھا ہمارا مختصر سامان بھی ساتھ لایا تھا۔ بیس ہزار روپے کی رقم، جو میں نے اُس کے پاس بہ طور امانت رکھوائی تھی، اُس نے واپس کر دی اور چھاگلا کے دستخطوں کی گواہی کے بعد مجھ سے رسید لکھوائی۔ مینیجر افسوس کر رہا تھا کہ ایک رات بھی ہم ہوٹل میں قیام نہ کر سکے۔ پہلے دن صرف ایک سوا گھنٹے کے لیے غسل اور لباس کی تبدیلی کے لیے میں نے کمرہ استعمال کیا تھا اور ہمیں ایک بڑی رقم ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ میں نے کوئی درخواست نہیں کی تھی، لیکن انتظامیہ نے از خود تھوڑی بہت رعایت کر دی تھی۔

دوپہر کو سیورین نے ہسپتال کے طعام خانے سے کھانے کا انتظام کر دیا تھا۔ بھوک ایسی تھی بھی نہیں، لیکن صبح، دوپہر، رات کھانے کی رسم کی تکمیل بھی تو واجب ہے۔ دوپہر کو ڈاکٹر رائے جُھمل کو دیکھنے نہیں آیا۔ اُس کے بجائے ایک اُدھیڑ ڈاکٹر نے خانہ پُری کے انداز میں دورہ کیا اور چند منٹ کے معائنے کے بعد جُھمل کو سکون و عافیت کی نوید دیتا چلا گیا۔

چھاگلا کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ پولیس نے اڈّے کے بہت سے آدمی رہا کر دیے ہیں اور میدا کی میت اُن کے حوالے کر دی گئی ہے کہ اُنھی کے ہاتھوں اُس کی آخری رسوم انجام پائیں۔ چھاگلا بتا رہا تھا کہ صبح اِکا دُکا دکانیں کھلی تھیں، لیکن اڈّے کے آدمیوں کی رہائی اور اُنھیں میدا کی میت کی تحویل کی خبر سن کے لوگوں نے خود کو گھروں تک محدود کر لیا ہے۔ سارا شہر بند ہے، سڑکوں پر سناٹا ہے اور زیادہ تر پولیس اور افواہیں گشت کر رہی ہیں۔ چھاگلا آج کسی ذاتی ملازم کی طرح ہماری خدمت پر مامور تھا۔ ٹکٹوں کی خریداری کے لیے اُس نے اپنا معاون اسٹیشن بھیج دیا تھا۔ شام تک اسپتال کے واجبات بھی ادا ہو گئے۔

شام کی چائے کا اہتمام چھاگلا کی طرف سے کیا گیا تھا۔ جس کمرے میں جامو اور زورا نے شب بسری کی تھی، وہیں میز لگا دی گئی تھی۔ چاٹ پکوڑے، دہی بڑے، [illegible] کے انگریزی بسکٹ اور چائے کی کیتلی، ڈونگوں اور تشتریوں سے [illegible] سجی ہوئی تھی۔ ہمارے اصرار کے باوجود چھاگلا [illegible] اور ہوٹل کے پیشہ ور خدمت گاروں کی طرح ہمارے آگے چیزیں پیش کرتا رہا۔ سیورین اور اسپتال کے دو ایک کارندے بھی اُس کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ایمی آ گئی تھی۔ ورلباس کی تبدیلی کے باوجود سیورین ٹھیری رہی۔

اندھیرا گہرا ہو گیا تھا اور آہستہ آہستہ رات حاوی آ گئی تھی۔ سبھی ڈاکٹر رائے کے منتظر تھے۔ وہ نہیں آیا۔ جیسے جیسے وقت بڑھتا گیا، مجھے تشویش ہونے لگی۔ ایک ہی پہر کی تو بات تھی، کل صبح ہمیں چلے جانا ہے۔ ڈاکٹر کو آنا چاہیے تھا۔ کہیں گھر جا کے اُس نے میری عرض داشت پر نظرِ ثانی تو نہیں کی۔ گھر جا کے اُس کا سامنا بیٹا سے ہوا ہو گا۔ ڈاکٹر اُس سے کیا کہہ پایا ہو گا۔ وہ کتنا ہی بیٹی سے سچ بولتا ہو، میرے عذر بچوں کے تئیں جُھمل نہ کر سکے گا، پھر بیٹا کیا مطمئن ہو سکے گی۔ دھندلے عذر ذہین آدمی کو اَور مضطرب کر دیتے ہیں۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ جامو اور زورا میرے ساتھ تھے اور ہم راہ داری میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر رائے کی راہ تک رہے تھے۔ ساڑھے نو بجے ہوں گے کہ ایک نوجوان ڈاکٹر کی آمد سے صاف ہو گیا کہ ڈاکٹر رائے اب نہیں آئے گا۔ ڈاکٹر تل پیر پہلے بھی کئی بار آ چکا تھا، کچھ کھلنڈرا اور بے پروا قسم کا نوجوان تھا۔ یہ اُس کی شوخی ہی تھی کہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا، واپس ہوتے وقت اُس نے مطلع کیا کہ ڈاکٹر رائے گھر پر کسی مصروفیت کی وجہ سے اِس وقت نہ آ سکے، اُنھوں نے معذرت کی ہے اور کہا ہے کہ صبح وہ جلد ہی یہاں پہنچیں گے۔ جی میں آیا، ڈاکٹر تل پیر کو اطمینان رسید کر دوں کہ وہ یہ بات پہلے بھی بتا سکتا تھا، لیکن ہاتھ ملتا رہ گیا۔ آخری دن مجھے کوئی غلط تاثر قائم نہیں کرنا چاہیے تھا۔

دس بجے تک سیورین ٹھیری ہوئی تھی۔ بہ مشکل گھر جانے پر آمادہ ہوئی۔ اُس کے جاتے وقت مجھے یاد آیا کہ میں نے اقتونی کے خاندان اور اُس کی بیوی کی اعانت کے لیے سیورین سے کچھ کہا تھا۔ سیورین نے مجھے یاد نہیں دلایا تو اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اِسے کوئی رعایت جانوں۔ ہوٹل سے آئے ہوئے سامان میں چیک بُک بھی موجود تھی۔ صبح وقت [illegible] اِس لیے میں نے سیورین کو روک لیا اور پوچھا کہ اقتونی کے خاندان کے لیے کتنی رقم کا چیک کاٹنا مناسب ہو گا۔ اُس [illegible] شیری عیسائی مشنری اپنے لوگوں کا خیال رکھتی ہے۔ اُس نے شیری کی کفالت کے لیے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا ہے۔ شیری کی حالت بہت خراب ہے۔ اُسے تو اپنا ہی ہوش نہیں۔ خدا ہی اُسے زندگی لوٹا سکتا ہے۔ میں نے لاکھ روپے کا چیک کاٹنے کی بات کی تو سیورین گم سم سی ہو گئی۔ میں نے کچھ اَور سمجھا اور پوچھا کہ کم ہو تو اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ کہنے لگی کہ اس سے نصف بھی بڑی رقم ہو گی، لیکن ابھی تو وہ نہیں ہے، اِسی شہر میں۔ آنے والے دنوں میں صورتِ حال دیکھ کے وہ مجھے مطلع کر دے گی۔ میں نے اُس سے کہا بھی کہ مجھے روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے اور نہ اِس کی ضرورت پڑتی ہے۔ پچاس ہزار کا چیک میں لکھے دیتا تھا۔ اِسے سیورین پاس رکھے۔ چیک میں کوئی نام مندرج نہیں ہو گا۔ سیورین جسے مناسب سمجھے، اُسی کا نام لکھ دے، عیسائی مشنری کا نام بھی لکھا جا سکتا ہے۔ سیورین تیار نہیں ہوئی۔ بحث کا وقت نہیں تھا۔ اُسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ آج کی رات وہ شاید سو بھی نہ پائے، میرے کہنے کا کچھ حاصل بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ اَب مجھی سے اُس کا واسطہ نہیں تھا، جامو بھائی اور زورا بھائی اور جُھمل بابا بھی اُس کے نگہدار تھے۔

رات کو دیر تک ہم باہر ہی بیٹھے رہے۔ آسمان صاف تھا اور گزشتہ رات کی مسلسل بارش سے خنکی ہو گئی تھی۔ نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ دیر رات گئے جُھمل کے کمرے نے پردہ اُٹھے۔ جامو اور زورا اُسی کمرے میں چلے گئے جہاں اُنھوں نے کل رات بسیرا کیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ بستر پر بیٹھتے ہی جُھمل کی آنکھ لگ گئی۔ میں اور ایمی چپکے چپکے باتیں کرتے رہے۔ پھر ایمی کی خواہش پر میں بھی بستر پر آ گیا۔ وہ بہت آزردہ تھی۔ ہلکے ہلکے ہاتھوں سے میرا سر دباتی اور بالوں میں اُنگلیاں پھیرتی رہی۔ اُس کی اُنگلیوں میں ایسی لچک تھی اور اِتنی ہی نرمی۔ جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی یا ایمی نے مجھے سُلا دیا۔

ساڑھے گیارہ بجے دلّی سے آنے والی گاڑی پٹنا اسٹیشن آتی تھی۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ ساڑھے دس سے پہلے اسپتال سے روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ سفر درپیش ہو تو نیند بھی اُچٹتی ہوئی

پشتو کہاوتیں

- غریب کو لحاف نہیں ملتا تھا، جب مل گیا تو وہ پہر تک اُس میں لیٹا رہا۔
- غریب کو کمبل نہیں ملتا تھا، جب مل گیا تو کہنے لگا، یہ بارہ گز کا نہیں ہے۔
- جو سوئیں گے، وہ خواب بھی دیکھیں گے۔
- بادشاہ کی شال، دھوبی کی دھوتی۔
- ننگے کو بھیگنے کا کیا ڈر۔
- بجلی کی چمک میں کس نے سوئی میں دھاگا ڈالا ہے۔
- چمار کا گھر ویسے بھی گندا تھا، اوپر سے مینہ بھی برسا۔
- گدھے کی دُم، جس طرف سے بھی ناپو ایک برابر۔
- پت جھڑ میں پتے بغیر ہوا کے گرتے ہیں۔
- بدنصیبوں کا حصہ بھی تھوڑا ہوتا ہے۔
- جوانی کی بے کاری، بڑھاپے کا روگ۔

انتخاب: رفیق احمد نقش

آتی ہے۔ کسی کو جگانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سبھی صبح سویرے اُٹھ گئے، اور آٹھ بجے سے پہلے سیورین بھی آگئی۔ ناشتے کے سامان کے علاوہ اُس کے پیچھے آنے والے خدمت گار کے ہاتھ میں مطبخی (ٹفن کیریر) بھی تھی۔ یہ مطبخی زریں نے فیض آباد سے چلتے وقت ہمارے سپرد کی تھی اور کل دوپہر ہوٹل میں رکھے سامان میں واپس آئی تھی۔ سیورین تو اسے دیکھ کے نہال ہوگئی، کسی سے پوچھے بغیر ساتھ لے گئی اور اب بھر کے لائی ہوگی، حالاں کہ سفر اتنا طویل نہیں تھا۔ پٹنے سے کلکتے کا فاصلہ تین سو میل کے قریب ہے، زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے کا سفر۔

کسی بھی وقت ڈاکٹر رائے کی آمد کے اندیشے میں سیورین نے اُسی کمرے میں ناشتا لگوادیا جہاں کل چھاگلا نے شام کی چاے پر ہمیں مدعو کیا تھا۔ سبھی کو جلدی تھی، لیکن سیورین اپنی ضد کی پکی تھی۔ رات سبھی نے اُسے منع کیا تھا کہ صبح وہ کچھ بھی نہ لائے۔ اُس نے اپنی آنی کو بھی ساری رات جگایا ہوگا۔ ناشتا اِس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے۔ شاید کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ جانے مطبخی میں کیا کیا بھرا ہوگا۔ کسی نے کہا ہے، علم و ہنر، خوش صورتی، خوش فہمی اعلیٰ درجے کی نسائی خوبیاں ہیں، لیکن سب سے بڑی خوبی ایثار پیشگی اور خدمت گزاری ہے۔ آدمی کو پھر آدمی جکڑ سا لیتا ہے۔

جلدی کرتے کرتے بھی نو بج گئے۔ ایلی بار بار باہر جا کے ڈاکٹر کی آمد کے بارے میں سُن گُن لے آتی تھی۔ جامو اور زورا نے میرے اور بھُتّل کے کپڑے پہن لیے تھے۔ اُن کے ناپ کے تو نہیں تھے۔ مگر کرتے اور پاجامے میں اتنی گنجائش ہوتی ہے۔ واسکٹ میں عیب اور چھپ گئے۔ بھُتّل بھی اپنی جُون میں آچکا تھا۔ اِتنے دنوں بعد اپنے اصل لباس میں وہ عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں نے تو صبح ہی زریں کا سیا ہوا اپنا کرتا اور پاجامہ پہن لیا تھا، اوپر سے خاکی رنگت کی کھدر کی واسکٹ۔ سبھی نئے نئے سے ہوگئے تھے۔

ساڑھے نو بج گئے۔ چھاگلا بھی آگیا۔ ڈاکٹر رائے نہیں آئے۔ سبھی راہداری میں کرسیوں پر بیٹھے اُس کا انتظار کھینچ رہے تھے۔ گاڑی کے روانہ ہونے اور وقت پر ہمارے اسٹیشن پہنچ جانے کا ڈاکٹر کو اندازہ ہوگا۔ اور اگر وہ نہیں آیا؟ اِس وہم نے میرے

سر میں جالا بُننا شروع کردیا تھا۔ تو کیا ہم اُس سے وداع ہوئے بغیر چلے جائیں؟ چھاگلا کو ڈاکٹر کی آمد کا پورا یقین تھا۔ دس بجے والے تھے۔ چھاگلا بھی بے چین نظر آنے لگا۔ راہداری میں ٹہلتے ہوئے وہ گھڑی دیکھتا جاتا۔ میں نے تو اپنے طور پر ارادہ کرلیا تھا، ڈاکٹر کے نہ آنے کی صورت میں ہم سفر ملتوی کردیں گے، اور بھی کئی گاڑیاں پٹنے سے کلکتے جاتی ہیں۔ ڈاکٹر رائے سے ملے بغیر یہاں سے چلے جانا ناز یبا تھا۔

ابھی دس بج کر تین چار ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ بائیں سمت سے ڈاکٹر رائے متوازن قدموں سے راہداری میں آتا دکھائی دیا۔ وہ اکیلا تھا۔ اُسے دیکھ کے چھاگلا تیزی سے اُس کی طرف بڑھا اور سبھی کھڑے ہوگئے۔ کمرے میں جانے کے بجائے ڈاکٹر باہر رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ اُس کے بیٹھنے کے بعد بھُتّل نے بھی کرسی سنبھال لی۔ جامو اور زورا کچھ دور ہٹ گئے۔ ڈاکٹر کی ہدایت پر میں بھی اُس کے پہلو کی کرسی پر دراز ہوگیا۔ کسی تاخیر کے بغیر ایلی نے طبی احوال کے کاغذات باہر ہی ڈاکٹر کے ملاحظے کے لیے پیش کر ... ۔ ڈاکٹر انھیں بہ غور دیکھتا رہا، پھر مسکراتے ہوئے بو ... ... ہسپتال آگئے تھے اُستاد!"

"ہسپتال نہیں، آپ کے پاس۔ ہسپتال تو سارا آپ ہی ہیں۔" بھُتّل نے ممنونیت سے لب ریز آواز میں کہا، "آپ نے اپنے سے بہت کیا، ہم کو بولو، ہم کیا کریں؟"

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ "تم نے ہم کو ایک آدمی دیا ... یہ جوان۔" اُس نے میری جانب انگلی اُٹھائی اور بولا، "آپ اِس کو ہم سے واپس لے جارہے ہو۔"

"اُس میں ہوتا تو آپ ہی کو دے دیتے۔" بھُتّل نے سنجیدہ آواز میں کہا، "پر کیا بولیں، بہت بکٹ ہے، بڑا نٹ کھٹ صاحب!"

"ہی دیکھتے تو اُستاد۔" ڈاکٹر لطف لے کے بولا، "لوگ بولتے ہیں، ہر آدمی کا مول ہوتا ہے۔ اِس کا کوئی مول ہو تو بولو۔"

بھُتّل کے شانے سکڑنے اور پھیل گئے۔ "اِس کا کوئی مول نہیں۔ ہوتا تو پہلی بولی ہمی لگاتے۔"

"تمھارا ہی تو ہے اُستاد، اوپر سے نیچے تک۔ ہم نے دیکھا ہے، تم کو ادھر اپنا پتا نہیں تھا تو یہ کیسا لوٹتا تھا۔ اِس نے

اپنے سے تھوڑی لڑائی بھی کی ہے۔ تم کو کچھ ہو جاتا تو یہ ہم کو نہیں چھوڑتا۔"

"کیا ڈاکٹر صاحب!" میں نے تندی سے دخل دیا۔ "کیسی بات کرتے ہیں آپ۔ میں تو آپ کی منت ہی کرتا رہا ہوں۔ شروع میں ہاں ضرور... کوئی الٹی سیدھی بات مُنہ سے نکل گئی ہو تو ... اَن جانے میں... آپ معاف کردیں۔"

"ہاں صاحب! ایسا ویسا کچھ بولا ہو تو معافی دے دیں۔" بھُتّل سفارشی انداز میں بولا، "کبھی یہ بہت اُلٹ سُلٹ کرتا ہے۔ جلدی گھوم جاتا ہے۔"

"اور اِسی کارن اچھا لگتا ہے۔" ڈاکٹر نے بے تامل کہا۔

"آپ کی بڑائی ہے صاحب!" بھُتّل انکسار سے بولا۔

بھُتّل کا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے ڈاکٹر رائے اُٹھ گیا اور قریب موجود چھاگلا کی طرف متوجہ ہوا۔ اُس نے انگریزی میں چھاگلا سے معلوم کیا کہ کیا طبی احوال نامہ میرے حوالے ... ہے۔ جواب میں چھاگلا نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ... بڑا لفافہ مجھے تھما دیا۔ ڈاکٹر پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ... کہ لفافے میں بھُتّل کی بیماری کی تشخیص اور مرحلے وار علاج کی تفصیل درج ہے۔ کسی جگہ اِس قسم کی شکایت دوبارہ نمودار ہونے کی صورت میں متعلق ڈاکٹر کو لازماً یہ رپورٹ دکھائی جائے۔ یوں شکایت کا اعادہ ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ لفافے میں ایک نسخہ بھی ہے۔ اِس میں لکھی دوائیں ہفتے بھر تک استعمال کرائی جاتی رہیں تو اچھا رہے گا۔ نسخے میں توانائی کی بحالی کی ادویہ بھی ہیں۔

ڈاکٹر کی ابرو کی جنبش پر ہمہ دم مستعد چھاگلا دُور کھڑے خدمت گار کے پاس رکھا ہوا گل دستہ لے آیا۔ ڈاکٹر نے اُسے بھُتّل کے آگے پیش کردیا۔

"یہ کیا ڈاکٹر صاحب۔" بھُتّل نے جلتی بجھتی آواز میں کہا۔

پیشانی کی خندگی کے سوا ڈاکٹر نے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور یکایک ہلچل سی مچ گئی۔ میری آنکھوں کے لیے وہ ایک ناقابلِ اعتبار منظر تھا۔ پیازی رنگت کی ساری میں ملبوس ڈاکٹر رائے کی بیٹی بینا کو سب سے پہلے ایلی نے دیکھا اور وہ خود کو روک نہ سکی۔ دیکھتے ہی اُس کی طرف دوڑ پڑی، اُس کے پیچھے

"اِس سال ہم ہر گاؤں کے لیے ریڈیو سیٹ فراہم کریں گے، اگلے سال بجلی کے تار لگائیں گے، اُس سے اگلے سال بجلی مہیا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

سیورین بھی۔ بینا کے عقب میں کچھ فاصلے پر ایک ملازم کے ہاتھ میں بھی گل دستہ تھا۔ سبھی کی نظریں بینا پر مرکوز ہوگئیں۔ وہ شاہانہ انداز سے نپے تلے قدم اُٹھاتی ہمارے پاس آگئی۔ جیسے مجھی سے آنکھیں چار ہوئیں تو ایک رنگ سا اُس کے چہرے پر آکے گزر گیا۔ میرا تو جسم لمحے بھر کے لیے جیسے سُن ہوگیا۔

"میری بیٹی بینا۔" ڈاکٹر نے بھُتّل سے کہا۔ اُس کے لہجے میں فخر بھی تھا، ناز بھی۔

بینا نے ہاتھ جوڑ کے نمسکار کیا۔ ملازم نے آگے آکے گل دستہ اُسے پیش کیا۔ بینا نے تمکنت سے بھُتّل کے سامنے کردیا۔ بھُتّل کی آنکھوں میں خیرگی سی ہویدا ہوئی۔ وہ جھجکتی آواز میں بولا، "یہ تو کوئی مورتی ہے ڈاکٹر صاحب!"

"تم کو دیکھنا چاہتی تھی، پر تم ہی نہیں ملے۔" ڈاکٹر نے اشتیاق سے کہا۔

"یہ تو خود درشن کے لیے ہے۔" بھُتّل نے بینا کے سر پر ہاتھ رکھا اور تھوڑی اُٹھا کے لحظوں تک تکتا رہا اور اُس نے بے اختیار بینا کو بازوؤں میں دبوچ لیا۔ "یہ تو آپ ہی کی بٹیا ہوسکتی ہے۔"

بینا کا سر پاؤں دُہرا ہوگیا۔

"آپ ابھی بولتے تھے، ہر آدمی کا مول ہوتا ہے۔ اِس کا کوئی مول ہو تو آپ ہی کو بولو۔"

ڈاکٹر ہنس پڑا۔ ”یہ بھی اسی کی طرح ہے۔“ وہ میری جانب نگاہ اُٹھا کے بولا۔ ”تمھارے راڈلے کی طرح۔“

بخشل کچھ فکر مند ہوا۔ پھر شاید اس مذمت سے کہ ڈاکٹر کی زبان سے میرے بیٹے‘ ڈلے کا خطاب روانی میں ادا ہوا ہے، اور کوئی معنی خیزی نہیں، وہ استوار ہو گیا، مگر شاید پھر بعد پھر مضطرب نظر آنے لگا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالا اور نکال لیا۔ صبح جب وہ نیا ساس پہن کے تیار ہو گیا تھا، میں نے ہوٹل میں رکھی نقدی اور اپنے پاس محفوظ ہیروں بھری مخملی تھیلیاں اُسے واپس کر دی تھی کہ پہلے بھی یہ اسی کی تحویل میں تھیں۔ اور معاً اُسے کیا ہوا۔ پاس کھڑی بینا کی کلائی گرفت میں لے کے اُس نے اُٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اپنے ساتھ آؤ بٹیا۔“

بینا حیران ہوئی، پہلے ڈاکٹر کو، پھر مجھے دیکھا۔ بخشل نے تذبذب کی مہلت نہیں دی۔ دو ڈھائی گز کی دوری عبور کر کے وہ اُسے کمرے میں لے گیا۔ ڈاکٹر میرے ساتھ پُرسکون حالت میں کھڑا رہا۔ منٹ ڈیڑھ منٹ کے عرصے میں دونوں باہر آ گئے۔ بینا کا چہرہ دہک رہا تھا۔ بخشل کا بازو اُس کے شانے پر تھا اور وہ اُس کے پہلو میں سمٹی ہوئی کمرے سے واپس آئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں جھلملاتی نمی صاف نظر آ رہی تھی۔

بینا کو یوں اپنے ساتھ کمرے میں لے جانے کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ بینا کو کچھ نذر کرنا چاہتا تھا۔ سب کے سامنے اس کا اظہار، جیب سے کچھ نکالنا معیوب بات تھی۔ بخشل نے کوئی نادر ہیرا ہی اُسے بھینٹ کیا ہوگا۔ نقدی کا تو سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ بینا نے یقیناً منع کیا ہوگا، لیکن بخشل کو منع کرنا آسان نہیں تھا۔ میرا خیال تھا، وہ واپس آ کے اپنے باپ کو کچھ بتائے گی، مگر میں بھول گیا تھا، وہ ایک اور قسم کی لڑکی تھی۔ آداب سے بہ تمام و کمال آراستہ، اور پُراعتماد۔ اُسے خود بھی فیصلے کرنے آتے تھے۔

”کبھی تو ملیں گے ڈاکٹر صاحب پھر۔“ بخشل نے اُمڈتی آواز میں کہا۔

”خوشی ہوگی اُستاد۔“ ڈاکٹر شوخی سے بولا۔ ”مگر پہلے کی طرح نہیں۔“

”نا، نا، صاحب، اُب کے ایسے نہیں۔ اب آپ کو سلام کرنے آئیں گے، آپ کو پوچھنے، اور بٹیا کو دیکھنے۔“

ڈاکٹر کا جواب منہ ہی میں رہ گیا۔ سامنے سے مکمل وردی میں ملبوس ایک نوجوان پولیس افسر چند سپاہیوں کے ساتھ راہداری کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ میں اُسے پہچان گیا۔ وہی افسر جو پہلے بھی دو مرتبہ آئی جی کی معیت میں اسپتال آ چکا تھا۔ ہمارے پاس پہنچ کے اُس نے سلیوٹ کے انداز میں ڈاکٹر پھر مجھے سلام کیا۔ اُس کے پاس بھی گل دستہ تھا۔ ہاتھ اُٹھانے پر ایک سپاہی نے تیز قدموں سے آ کے گل دستہ اُس کے حوالے کیا۔

”یہ آئی جی کی طرف سے ہے۔“ پولیس افسر نے ڈاکٹر رائے سے انگریزی میں کہا۔

ڈاکٹر نے بخشل کی طرف بازو پھیلا دیا۔ پولیس افسر نے دوسرے لمحے مستعدی سے بخشل کو سلام کیا اور گل دستہ اُس کی جانب بڑھا دیا۔

”یہ... یہ کیا ہے ڈاکٹر صاحب؟“ بخشل اُلجھ کے بولا۔

”یہ پھول آئی جی پولیس نے تمھارے واسطے بھیجے ہیں۔“ ڈاکٹر نے زیرِ لب تبسم سے کہا۔

”اپنے واسطے؟“ بخشل کی پیشانی پر جال پڑ گیا۔

”ہاں، تمھارے واسطے، میرے واسطے بالکل نہیں۔“

”پر یہ آئی جی سے اپنا کیا...“

بخشل کی کش مکش دُور کرنے کے لیے ڈاکٹر نے شگفتگی سے کہا۔ ”آئی جی صاحب اپنے دوست ہیں۔“

”صاف صاف بولو صاحب!“ بخشل جز بز ہو کے بولا۔

”گاڑی میں تم کو یہ لوگ سارا بول دیں گے۔“ ڈاکٹر نے ہاتھ ہلا کے اُسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”اب چلنے کی تیاری کرو۔ ٹائم تھوڑا رہ گیا ہے۔ شہر کی کنڈیشن ٹھیک نہیں۔ تم کو پولیس کے ساتھ پولیس کی موٹر میں جانا ہے۔“

”پولیس کے ساتھ؟“ بخشل نے ترشی سے پوچھا۔

”ہاں اُستاد، تمھاری سیفٹی کے لیے۔ ہماری ریکوئسٹ پر آئی جی نے یہ ارینجمنٹ کیا ہے۔“

بخشل کی حیرت دوچند ہوئی۔ ”کیا صاحب...“

ڈاکٹر نے اُس کی کمر پر ہاتھ رکھ کے آگے جانے کا اشارہ کیا۔ بخشل بڑبڑاتا رہ گیا۔ اسپتال کے کارندے سامان کمرے سے باہر لے آئے تھے۔ بخشل آگے نہیں گیا۔ اپنے تردد کے باوجود وہ راہداری میں قدم کے پاس گُپ چپ کھڑی ایمی کے پاس گیا۔ اُس نے ایمی کے ہاتھ تھام کے کچھ کہا، پھر وہ سیورین کی طرف پلٹا۔ اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ سیورین سر جھکائے ہوئے تھی، سسکنے لگی۔ بخشل نے اُسے سینے سے لگا لیا اور پیشانی کو بوسہ دیا۔

پولیس افسر کچھ دُور جا کے ہمارے انتظار میں ٹھہر گیا تھا۔ اس وقت جیسے کسی نے مجھے ٹہوکا دیا۔ بینا کی طرح بخشل کو سیورین اور ایمی کا بھی خیال رکھنا چاہیے تھا۔ اسپتال کے ملازم بھی شب و روز ہماری خدمت میں حاضر رہے تھے، لیکن بخشل کو رُکنے کا وقت گزر چکا تھا، اور خود کو دلاسا دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ بخشل سے ایسی چوک ممکن تو نہیں ہے۔ اُسے تو ناز کی کا بہت خیال رہتا ہے۔

بخشل کے چلنے پر ہم بھی حرکت میں آ گئے۔ بینا نزدیک ہی تھی، مجھے اُس سے کچھ کہنا چاہیے تھا، لیکن کیا کہوں اور کہاں سے شروع کروں۔ کوئی سرا ہی نہیں مل رہا تھا، چند قدم کا فاصلہ طے کر کے میں اُس کے پاس چلا گیا۔ مجھے اتنا قریب دیکھ کے وہ پلکیں جھپکانے لگی۔ میں نے آہستگی سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے، زیادہ آنا نہ ہو سکا۔“

”آپ کا انتظار رہا۔“ اُس کی آواز کی کھنک یاسیت سے آلودہ تھی۔

”بس، کیا بتاؤں۔“ میں نے پژمردگی سے کہا۔ ”ارادہ کیا اور دھرا رہ گیا۔“

”پاپا نے مجھے کچھ بتایا ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”کیا... کیا بتایا اُنھوں نے؟“ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

”زیادہ نہیں، اندازہ ہو چلا تھا کہ پورا سچ بتانا اُنھیں دشوار ہو رہا ہے، سو اصرار نہیں کیا۔ باقی پھر خود ہی اخذ کر لینا بہتر تھا۔“ کسی وضاحت کا وقت اور موقع نہیں تھا، اور وضاحت بھی کیا کرتا، میں چپ رہا۔

”آپ کے لیے دُعا کرتے رہیں گے۔ کاش، اس مرتبہ سفر سے آپ سُرخ رُو واپس ہوں... اور جب ایسا ہو تو ایک بار یہاں ضرور آیئے گا۔“

”ضرور... ضرور۔“ میری آواز دھڑک رہی تھی۔

”بہرحال۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے شائستگی سے بولی۔ ”آپ کی آمد یاد رہے گی۔“

میں نے کہنا چاہا، ’مجھے بھی‘، لیکن میری زبان، کٹ کے رہ گئی۔ میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ سراپا بہار تھی۔ میرا جی چاہا، اُسے گلے سے لگا لوں۔ اُس کی آنکھیں بھی چھلک رہی تھیں۔ میں پھر آگے بڑھ گیا۔

وہ مرکزی عمارت کی طرف نہیں گئے۔ پولیس افسر کی رہنمائی میں ہم چوروں اسپتال کے پچھواڑے آ گئے۔ یہاں تین چار قسم کی موٹریں کھڑی تھیں، کچھ اور مسلح سپاہی بھی موجود تھے۔ پہلے ہی کئی حیرانیاں بخشل کو مکدر اور مضطرب کیے ہوں گی کہ میدا اور اڈے کے کسی آدمی نے اسپتال کا رُخ کیوں نہیں کیا اور اس موقع پر بھی کوئی کیوں موجود نہیں ہے۔ دو دن سے جامو اور زورا بھی اڈے واپس نہیں گئے تھے، نہ سپتال سے باہر نکلے تھے، اسپتال کے ضابطے کے خلاف یہیں ٹھیرے ہوئے تھے، اب پولیس کی نگرانی میں روانگی مزید تشویش اور وحشت کا سبب ہونی چاہیے تھی، لیکن اُس نے کچھ نہیں پوچھا، خاموشی سے موٹر کی اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں زورا، اور جامو شخص کے پچھلی نشست پر

تھم گئے۔ ہمارے آگے پیچھے پولیس کی تین موٹریں تھیں۔

ابر چھایا ہوا تھا اور بادل برس کے جا چکے تھے۔ سڑکوں پر سنّاٹے کی وجہ سے موٹروں کی رفتار تیز تھی۔ بازار بند تھے اور ہر طرف کرفیو جیسی ہیبت طاری تھی۔ راہ گیروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ تھوڑی تھوڑی دور بعد سڑکوں پر تعینات سپاہیوں کی سیٹیاں گونجتی رہیں اور جلد ہی موٹروں نے ہمیں اسٹیشن پہنچا دیا۔

یہاں بھی اسٹیشن کی عام گزرگاہ کے سامنے موٹریں نہیں رُکیں۔ وہ ہمیں اسٹیشن سے ملحق مال گودام کے راستے سے اندر لے گئے۔ پلیٹ فارم پر بھی بھیڑ بھاڑ خاصی کم تھی۔ ہم وقت سے کچھ پہلے پہنچ گئے تھے، اور معلوم ہوا، گاڑی مقررہ وقت پر نہیں آ رہی، پندرہ منٹ کی تاخیر کا اعلان کیا جا چکا ہے۔ اُنھوں نے ہمیں اوّل درجے کی وسیع اور روشن انتظار گاہ میں پہنچا دیا، جہاں عورتوں مردوں اور بچوں پر مشتمل ایک ہی کنبے کے آٹھ دس افراد خوش گپیوں میں مصروف تھے، اور ایک شور مچا ہوا تھا۔ ہمیں اور ہمارے ساتھ پولیس دیکھ کے سبھی چپ ہو گئے اور جب اُنھوں نے اچھی طرح جان لیا کہ سپاہی باہر چلے گئے ہیں، صرف پولیس افسر رہ گیا ہے اور ہم سے اُس کے تیور جی صمانہ نہیں، تبھی اُنھیں قرار آیا۔ پولیس افسر نے چائے وغیرہ کا تکلف کرنا چاہا، سبھی نے منع کر دیا، پھر چند منٹ بعد واپس آنے کا کہہ کے وہ بھی باہر چلا گیا۔ ہم چاروں عملاً ایک دوسرے سے بے حد قریب اور اصلاً ایک دوسرے سے بہت دور، بیگانہ بیگانہ سے بیٹھے رہے۔ مجھے، زورا اور جامو کو جھنّل کی کبیدگی کا شدت سے احساس تھا۔ جھنّل اپنی لاعلمی سے بے چین تھا اور ہمیں، اپنی دانستہ زباں بندی سے عجب خجالت اور بے بسی محسوس ہو رہی تھی۔

بیس پچیس منٹ کا وقت کسی طور گزر گیا کہ وقت کا کام گزرنا ہے، اور کبھی یہ بہت غنیمت لگتا ہے کہ وقت ٹھیرتا نہیں، گزر جاتا ہے۔ کاش، وقت آدمی کا تابع ہوا کرتا، گھوڑے کی طرح اور موٹر کی طرح جب چاہا، گھوڑے کو لگام دے دی، جب چاہا، موٹر تیز دوڑا دی۔ دیکھا جائے تو یہی کچھ ہوتا رہا ہے، آدمی ابتدا سے وقت پر غلبہ و تسلط کی کوشش کر رہا ہے، اور اس کوشش میں بہت کچھ حاصل کر لیا ہے، موٹر، ریل گاڑی، ہوائی جہاز، لیکن جو وقت آدمی کے دل پر گزرتا ہے وہ اُسے ٹھیرانے اور جلد سے جلد گزار دینے کی کوئی تدبیر نہ کر پایا۔

گاڑی کی آمد کا گجر بجنے لگا تو پولیس افسر واپس آ گیا، اور جب تک اُس نے ہمیں ڈبے میں پہنچا اور نشستوں پر بٹھا نہیں دیا اور گاڑی نے حرکت نہیں کی، وہ مستقل ہمارے پاس رہا، اِدھر باوردی اور سادہ پوش سپاہی ڈبے کے اردگرد منڈلاتے رہے۔

اوّل درجے کے اِس ڈبے میں ہمارے سوا کوئی اور مسافر نہیں تھا۔ گاڑی کے رفتار پکڑنے اور شہر سے دُور ہونے پر میری طرح اُنھوں نے بھی سکون کی سانس لی ہوگی۔ میں تو اُوپر کی برتھ پر آ کے دراز ہو گیا۔ مجھ میں جھنّل کی بے خبری اور بیماری کے دوران ہونے والے سانحوں کی رُوداد دُہرانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ سارا کچھ بہت کرب ناک تھا۔ گیارہ بارہ دن پہلے ہم فیض آباد سے چلے تھے۔ اور ایک دن، ایک رات بعد عشرے بھر پہلے پٹنا پہنچے تھے۔ ایک عشرے میں شہر کیسا بدل گیا تھا۔

برتھ پر آ کے میرا تو جسم ہی بکھرنے لگا۔ لگتا تھا، ایک زمانے سے نہیں سو سکا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم، زورا اور جامو نے وہ ساری اذیتیں کس طرح جھنّل کو منتقل کیں جن سے میرا واسطہ پڑا تھا، اور جن سے بہ وجوہ جھنّل کو لاعلم رکھا گیا تھا۔ مجھے تو گہری نیند نے آ لیا۔ کتنے اسٹیشن آئے۔ گاڑی کہاں کہاں اور کتنی دیر ٹھیری، مجھے کچھ خبر نہ ہو سکی۔

بازو پر ہلکی دستکیں دے کے زورا نے مجھے جگا دیا، گاڑی کسی اسٹیشن پر رُکی ہوئی تھی۔ برتھ سے اُتر کے اور منہ ہاتھ دھو کے پھر میں بھی اُن کے درمیان آ بیٹھا، اور آنکھیں کچھ کھلیں تو نظر سیدھی جھنّل پر گئی۔ سامنے کی برتھ پر وہ نشست سے کمر لگائے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے دیکھا، اُٹھ کے میرے پاس آنا چاہتا تھا کہ میں خود ہی اُس کے پاس چلا گیا۔ ہاتھ پھیلا کے اُس نے میرے شانے پر رکھا اور خود سے قریب کر لیا، اور لپٹا ہوا جو کچھ نہیں کہا۔ میرا بازو دبوچ کے رہ گیا۔ میری آنکھیں سلگنے لگی تھیں، لیکن میں نے آنکھوں ہی میں آنسو گھونٹ لیے۔

زورا نے مطبخی کھول دی تھی۔ سیورین نے التزام رکھا تھا کہ جلد خراب ہو جانے والی کوئی چیز نہ ہو، زیادہ تیل کی پکی ہوئی سبزی تھی، چنے کی دال کا حلوا تھا اور پوریوں کے علاوہ میدے کی میٹھی ٹکیاں، سفید کپڑے سے بندھی مطبخی میں الگ سے شیشے کا ڈونگا بھی رکھا ہوا تھا۔ اُس میں سادہ میٹھے چاول تھے۔ پلیٹیں، گلاس اور چمچے بھی ساتھ رکھنا وہ نہیں بھولی تھی۔ تیز بارش ہو رہی تھی۔ زورا نے مجھے بتایا کہ سارے راستے یہی حال رہا ہے۔ اسی وجہ سے گاڑی کی رفتار متاثر ہوتی رہی ہے، پٹڑیوں اور پلیوں پر تو رینگتی ہوئی گزری ہے اور انجن تو مسلسل گرجتا رہا ہے۔ اس وقت نو بج رہے تھے، یعنی ہمیں پٹنے سے چلے ہوئے تو گھنٹے کے لگ بھگ ہو رہے تھے۔ آگے غالباً مزید بارش کی اطلاع پر گاڑی اِس اسٹیشن پر ٹھیر گئی تھی۔ بہت کم چہل پہل تھی۔ صرف خوانچے والوں کا شور گونج رہا تھا اور اُن کی صدائیں بھی جیسے بھیگ گئی تھیں۔ زورا نے کسی خوانچے والے کے ذریعے پانی اور چائے کا انتظام کر لیا۔ کھانا دیکھ کے بھوک بیدار ہو گئی۔ بارش میں بھوک کچھ بڑھ جاتی ہے۔ چاروں نے مطبخی تر... خالی کر دی اور سیورین کی باتیں کرتے رہے، اُس کی خوش... خوش شعاری، سلیقے اور نفاست کی باتیں۔

...آدھ گھنٹے بعد بارش ہلکی ہو جانے پر گاڑی نے کھسکنا شروع کیا، اور آگے جا کے رفتار پکڑ لی، ابھی کلکتّا دور تھا کہ بارش پھر شروع ہو گئی۔ شروع ہو گئی، یا پہلے سے جاری تھی۔

دو بجنے میں چند منٹ باقی تھے کہ ہاوڑا اسٹیشن پر گاڑی نے کہیں اپنا سفر تمام کیا۔ بارش اور دو پہر رات کی وجہ سے سڑکیں سُونی پڑی تھیں۔ پھر بھی اڈّے تک پہنچتے پہنچتے ڈھائی بج گئے۔ ساری عمارت سکوت میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھ کے کہرام سا مچ گیا۔ جامو، جمرو اور زورا کو اُنھیں پرسکون رکھنے میں خاصی دشواری ہوئی۔ وہ کسی کو جھنّل کی بیماری کے متعلق بتانا نہیں چاہتے تھے اور جھنّل کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کے لیے بھی فکرمند تھے۔

اڈّے پر موجود سبھی کو تاکید کر دی گئی کہ وہ جھنّل کی کلکتّے آمد کی خبر عام نہ کریں، مگر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں خبر پھیل چکی تھی۔ گیارہ بجے تک اڈّے کی عمارت کے اندر اور باہر ایک خلقت جمع ہو گئی۔ جھنّل نے عرصے بعد کلکتّے کا رُخ کیا تھا۔ اڈّے کے آس پاس کے مکین، پرانے واقف کار، دُکان دار، ٹیکسیوں والے، بوڑھوں اور جوانوں کی ایک کثیر تعداد اڈّے کی طرف اُمڈتی رہی، اُن میں کچھ عورتیں بھی شامل تھیں۔ عمارت میں شور بہت بڑھ گیا تو جھنّل کو کمرے سے باہر آنا اور چوکی پر بیٹھنا پڑا۔ لوگ حسبِ استطاعت مٹھائی کے دونوں، پھلوں اور پھولوں کے ٹوکروں سے لدے پھندے آتے رہے۔ سوناگاچی سے بھی کئی پیغام آئے تھے، جمرو کی زبانی معلوم ہوا کہ اِن دنوں بازار کے علاقے میں گلاب بانو شاہ جہاں پوروالی کے بالاخانے کی بڑی دھوم ہے۔ اُس کے پاس اپنے فن میں ماہر، ایک سے ایک حسین لڑکیوں کا طائفہ ہے۔ جھنّل کے لیے گلاب بانو کا ہرکارہ نذرانہ اور پیغام لے کے آیا تھا کہ مناسب ہو تو آج رات اُس کی تربیت یافتہ شاہدوا کلی بار جھنّل کے سامنے محفل آرا ہو، اور جھنّل کو بالاخانے آنے میں کوئی عذر ہو تو اڈّے پر بھی محفل برپا کی جا سکتی ہے۔ جھنّل کے بجائے جامو نے اُسی تکلف سے جواب دیا، جس تکلف سے پیغام آیا تھا۔ اُس نے گلاب بانو کی نذرانہ اور دعوتِ رقص و سرود پر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ چند دنوں کے لیے محفل ملتوی کر دی جائے تو مناسب ہو۔ جھنّل کے پرانے شناسا لالا شانتی پرشاد نے دیگیں چڑھوا دی تھیں اور دوپہر کو لنگر کا سا سماں ہو گیا تھا۔ جھنّل کے لیے چوکی سے اُٹھنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ ایک جاتا نہیں کہ دوسرا آ جاتا تھا۔ مجھے بھی اُن سبھوں نے مستقل گھیرے میں لے رکھا تھا، مجھ سے لپٹ لپٹ جاتے تھے۔ کوئی میرے ہاتھ چومتا، کوئی چھو چھو کے دیکھتا۔

شام کو اچانک جھنّل نے کلکتّے سے روانگی کا اعلان کر دیا۔ سبھی نے بڑی منّت کی۔ اِس ہجوم سے میرا بھی جی گھبرانے لگا تھا، مگر احتیاطاً ابھی چند دن جھنّل کا کلکتّے ہی میں رہنا بہتر تھا۔

سفر میں تو دیا وہ بہت ہوتا ہے۔ جتھل نے طے کر لیا تھا، بہرحال، وہ مزید ایک رات قیام کے لیے راضی ہو گیا۔ رات کو پھر تذروں نے اُچھل کود شروع کر دی تھی، مشکل سے نٹے۔ میں نے جتھل کو مشورہ دیا تھا کہ ابھی کسی طرف نکلنے کے بجائے کچھ روز کے لیے فیض آباد چلے جائیں۔ جمرو ورزور بھی ہمارے ساتھ جانے کو بہ ضد تھے، جتھل نہیں مانا۔ دوسرے دن صبح نسبتاً سکون تھا، پھر بھی نکلتے وقت بہت سے لوگ اڈّے پر جمع ہو گئے اور کبھی ہمارے ساتھ اسٹیشن تک آئے۔ ہم نے مرشد آباد کے دم لیا، دو دن وہاں سرائے میں قیام کر کے وہ کرشنا نگر آ گیا، پھر دُرگاپور، بوگرا، کشتیا، پبنا، نصیر آباد، نواکھالی، رنگ پور، کھلنا، باری سال، جیسور، بہادر آباد، راج شاہی، چاٹگام، ڈھاکا، فرید پور، فینی، چاند، کاکسس بازار اور میلا گھر سے ہوتے ہوئے ہم سلہٹ آ گئے۔ گوہاٹی، تن سکھیا، ڈبروگڑھ، بسل گری، لمڈنگ، بھی پور دوار، جھوبھ، تیشور، کوراپیٹ، نارتھ لکھیم پور، شیلانگ، دارجلنگ، جگ دل پور، پھلل بانی، سمبل پور وغیرہ بستیوں میں مولوی محمد شفیق کے اسم کا ورد کرتے ہوئے ہم واپس ڈھاکا پہنچ گئے۔

صبح کہیں، شام کہیں، ایک دن یہاں، دوسرا دن وہاں۔ کسی شہر میں دو دن، کبھی تین دن، جس وقت جہاں کی گاڑی مل جائے۔ درمیان میں کئی مرتبہ خراب موسموں نے ہمیں روکے رکھا اور آندھیوں، موسلا دھار بارشوں نے راستے بند کر دیے۔ جہاں گاڑی نہیں جاتی تھی، وہاں کشتیوں کے ذریعے، کبھی لاری میں اور کبھی گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کے۔ ہاتھ گاڑی بھی ان علاقوں میں بہت سی جگہوں پر مل جاتی ہے۔ جہاں سواری نہ ہوتی، جتھل پیدل ہی نکل کھڑا ہوتا۔ یہ بستیاں ہمارے لیے اتنی نئی نہیں تھیں۔ ابا جان کی تلاش میں کئی جگہوں پر ہم پہلے بھی آ چکے تھے۔

میں نے ابتدا ہی میں جتھل کو منع کیا تھا کہ بنگال، آسام اور بہار، خصوصاً شہر گیا کے اردگرد مولوی صاحب مستقل، یا عارضی سکونت سے گریز کریں گے۔ یہاں تبت کے بدھ راہبوں کی کثرت سے آمد و رفت رہتی ہے، اس لیے کہ صوبۂ بہار میں واقع بدھ گیا، بدھ عبادت گزاروں اور زائروں کا مرکز ہے۔ جتھل نے میری بات نہیں مانی۔ اُس کے ذہن میں ہو گا کہ مولوی صاحب نے کورا کو برقع پہنا دیا ہے۔ کسی کو بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اُن جیسی وضع قطع کے کسی شخص کے ہم راہ تبت کے جانگ قبیلے کی ایک نہایت مطلوب شہزادی بھی برقع میں رُوپوش ہو سکتی ہے، اور اَب وقت بھی بہت گزر گیا ہے۔ جانگ قبیلے کے لوگوں نے شہزادی کی بازیابی کی اُمید ترک کر دی ہوگی، اور اگر اُن کے نجومیوں نے اُن کی آس ابھی تک بندھائے رکھی ہے تو وہ بیش تر دُور دراز کے علاقوں میں کورا کو تلاش کر رہے ہوں گے۔ کورا تبت سے اِس قدر قریب کے علاقوں میں ہو سکتی ہے، یہ خوش گمانی اُنھیں کم سے کم ہونی چاہیے۔ ایک اَور وجہ سے بھی جتھل نے بہار، بنگال اور آسام کے سرحدی علاقے کھنگالنے کا عزم کیا تھا۔ یہاں مسلمانوں کی بڑی بڑی بستیاں ہیں۔ مسجدوں اور دینی تعلیم کے مدرسوں کی بہتات ہے۔ جامعۂ قاسمیہ مراد آباد اور دارالعلوم دیوبند میں دینی تعلیم کے لیے طالبانِ علم کی ایک کثیر تعداد اِن علاقوں سے جاتی ہے۔ ممکن ہے، کسی عزیز شاگرد یا مراد آباد میں مولوی صاحب کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف کسی دیرینہ رفیق کی موجودگی اُنھیں اِن دُور افتادہ علاقوں کی کسی محفوظ اور پُرسکون جگہ کھینچ لائی ہو۔ ایسی کسی جگہ اُن کی پذیرائی خوب ہو سکتی ہے۔ بے شک جامعۂ قاسمیہ اور دارالعلوم کے فارغ التحصیل متعدد لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی۔ خاصے لوگ مولوی صاحب کو پہچانتے بھی، لیکن مولوی صاحب نے ابھی تک اِس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا۔ تبلیغی جماعتوں سے وابستہ لوگوں کو تو بہرحال اِن علاقوں میں مولوی صاحب کی آمد کا علم ہونا چاہیے تھا۔

میں نے بعد میں جتھل سے کچھ کہنا سننا ہی بند کر دیا تھا۔ میں تو بس کسی ہم زاد کے مانند، کسی سائے کی طرح اُس کے ہم رکاب رہا۔ ہم زاد کی بھی کوئی مرضی ہوتی ہے اور سایہ بھی اندھیرے میں بچھڑ جاتا ہے، مگر مجھے بھی اِس دشت نوردی کی عادت سی ہو گئی تھی۔ صبح اُٹھ کے کام پر نکل جانا، گلیوں، کوچوں، مسجدوں، مدرسوں میں مولوی صاحب، مولوی صاحب کی صدائیں لگانا اور رات کو اپنی قیام گاہ واپس آ جانا۔ کسی جگہ مولوی صاحب کے مل جانے کا ایک امکان تو ہر وقت موجود تھا۔

شاید یہی آسرا مجھے جتھل کی اطاعت گزاری کے لیے مہمیز کرتا تھا۔ ظاہر ہے، مولوی صاحب ہندستان سے باہر تو نہیں چلے گئے ہوں گے۔ نواب ثروت یار کے سانحے کی خبر سن کے وہ جس طرح حیدر آباد سے روانہ ہوئے تھے، اُنھیں بہت دُور کی کسی جگہ ہی چھپنا چاہیے تھا۔

کھلنا شہر میں بھی اڈّے سے متعلق ایک شخص نے جتھل کو پہچان لیا تھا۔ وہ راشو کے نام سے کلکتے میں مشہور تھا۔ کسی جرم میں پولیس کو مطلوب تھا، اِس لیے کلکتے سے فرار ہو کے کھلنا آ گیا اور اڈّا جما کے اُس نے اپنے اطراف بہت سے لوگ جمع کر لیے۔ جتھل کو کھلنا میں دیکھ کے وہ توریشۂ خطمی ہو گیا۔ بہت مشکل سے جتھل نے اُس سے جان چھڑائی۔ ڈھاکے میں بھی یہی ہوا۔ شابے اُستاد کی جتھل پر نظر پڑ گئی۔ شابے کا کلکتے آنا جانا رہتا تھا اور جتھل سے اُس کی پرانی واقفیت تھی۔ تھوڑا بہت مجھے بھی جانتا تھا۔ شابے کا اصل نام شہاب الدین تھا۔ پہلی بار تو کسی کو علم نہیں ہو سکا، لیکن دوسری بار ڈھاکے آئے ہوئے تیسرا دن تھا کہ صدر گھاٹ کے بازار میں شابے اچانک سامنے آ گیا۔ ڈھاکے کے اڈّے پر اُس کا بہت اثر و رسوخ تھا اور ایک طرح سے وہ نائب کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ جتھل کے پاس اڈّے کے نگراں ملہاری کو لے آیا۔ ملہاری نے جتھل کے بہت تذکرے سنے تھے۔ وہ تو بڑی طرح مُصر ہو گیا اور اڈّے لے جائے بغیر باز نہ آیا۔ ملہاری جیسور کے ایک گانے والے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور راگ ملہار پر اُسے ملکہ حاصل تھا۔

جیسور کے کسی جاگیردار نواب نے اُس کی نوجوان بڑی بہن امینہ کو گاتے ہوئے کہیں سن لیا تھا۔ کہتے ہیں، اپنے چچازاد سے امینہ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ریاضت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک روز وہ اپنے گوشہ نشیں، سُر سنگیت میں ید طولیٰ رکھنے والے اُستاد کے ہاں راگ الاپ رہی تھی کہ جاگیردار بھی کسی غرض سے وہاں پہنچ گیا۔ امینہ پردے میں تھی، جاگیردار اُسے دیکھ نہیں سکا، مگر آواز سن کے اُس پر جی جان سے فریفتہ ہو گیا اور اُس نے اپنی حویلی میں امینہ کو مغنیہ کے طور پر ملازمت پیش کرنی چاہی، امینہ کے گھر والوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ اُن کی عورتیں محض خاندانی ورثے کی حفاظت کے لیے سنگیت سیکھتی ہیں، اصلاً خانہ داری اُن کا شعار ہے۔ چند ہی دن میں امینہ کے نوجوان شوہر کا، اچانک انتقال ہو گیا۔ موت کا سبب زہر خوری تھی۔ جاگیردار نے کچھ عرصے بعد پھر سلسلہ جنبانی کی اور اَب کے شادی کا پیغام بھجوایا۔ دونوں میں کوئی نسبت نہیں تھی۔ جاگیردار کی پہلے سے کئی بیویاں تھیں۔ ہر طرف اُس کے رنگ محل کی داستانیں عام تھیں۔ امینہ کے والدین کو یقین تھا کہ جاگیردار ہی کی وجہ سے اُن کی بیٹی کو بیوگی کا صدمہ سہنا پڑا ہے، تاہم اُن کے پاس کوئی شہادت نہیں تھی۔ افلاس سب سے بڑی بدنصیبی ہے۔ شہادت ہوتی بھی تو اُن کی آواز کتنی دُور تک جاتی۔ کسی نے کہا ہے، مفلس آدمی، آدھا آدمی ہوتا ہے۔ اُنھوں نے بہ صد ادب جاگیردار سے معذرت کر لی اور اپنی قدیم بستی سے ہجرت کا فیصلہ کر لیا، لیکن ہجرت سے پہلے ہی ایک رات امینہ بستی سے غائب ہو گئی۔ والدین اپنے رشتے داروں کے ہم راہ جاگیردار کی بارگاہ میں دہائی دینے پہنچے تو وہ صاف مُکر گیا اور اُلٹا اُن پر برافروختہ ہوا۔ اُس نے اُن ستم رسیدگاں پر زندگی کا میدان تنگ کر دیا۔ امینہ کے والدین نے بہت دوڑ دھوپ کی۔ بڑے بڑے لوگوں کے پاس جا کے فریادیں کیں، مگر بے سُود۔ پھر ایک رات ہندو مسلم فساد کے بہانے اُن کی بستی میں آگ لگا دی گئی۔ ملہاری کا سارا خاندان آگ کی نذر ہو گیا۔ اتفاق سے ملہاری اُن دنوں موسیقی کی تربیت کے لیے کسی اُستاد کے پاس نواکھالی گیا ہوا تھا۔ وہ واپس

آیا تو کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

وہ دیکھ، بام کے در پر دھوئیں کے مرغولے
جلا تو خیر سے کم ہے، بجھا بہت کچھ ہے

ملہاری اُس وقت ایک نوخیز نوجوان تھا۔ اُس نے جاگیردار کے سوا وقفے وقفے سے اُس کے خاندان کا ایک ایک فرد چُن چُن کے ختم کر دیا اور غصہ و غضب کے باوجود اس مشاقی و ہوش مندی سے کہ اُس پر کوئی آنچ نہ آئے۔ پھر بھی اسے جیل ہوگئی۔ کوئی ثبوت نہ ملنے پر وہ جلد ہی چھوٹ گیا۔ شابے کہتا تھا کہ حویلی میں جاگیردار اکیلا رہ گیا تھا۔ سارے خدام خوف سے بھاگ گئے تھے۔ آخر میں جاگیردار پاگل ہوگیا، وہ سڑکوں پر نہایت شکستہ اور ابتر حالت میں پڑا ملتا، پھر ایک دن جانے کہاں چلا گیا اور دوبارہ کسی کو شہر میں دکھائی نہیں دیا۔ ملہاری کو بھی اُس کی بہن امینہ نہیں مل سکی۔

جیل سے واپس آ کے ملہاری مرکھنا بَیل ہوگیا تھا۔ پھر وہ ڈھاکا چلا آیا اور یہاں کے لوگوں نے اُس کے لیے اڈّے کی چوکی خالی کردی۔ وہی پرانی کہانی، لیکن بار بار دُہرائی جاتی ہے۔

ملہاری اب بچپن سے اوپر کا ہو چکا تھا۔ قد اِتنا زیادہ نہیں تھا، کاٹھی کا مضبوط، ارادے کا پکّا۔ جسم میں بلا کی پھرتی۔ ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ چہرے پر دھندلی چھائی رہتی۔ سورج ڈوبتے ہی شراب میں ڈوب جاتا، سورج نکلنے سے پہلے راگوں کی ریاضت شروع کر دیتا۔ دن بھر اڈّے پر بیٹھا اڈّے کے معاملات نمٹاتا رہتا۔ اُس سے وابستہ بہت سی کہانیاں مشہور تھیں، لیکن شابے کے بقول، ملہاری نہ تردید کرتا تھا نہ تائید۔ یوں وہ ایک خوش خلق، نرم آواز اور کم آمیز آدمی تھا۔ بڑی بڑی، بل کہ پھیلی پھیلی آنکھیں ہر وقت چڑھی رہتیں۔ لگتا تھا، کچھ سوچ رہا ہے۔ بہت کم اڈّے سے نکلتا تھا۔ ہمارے پاس خود چل کے آیا تھا۔ مغل سے انکار نہیں کیا گیا۔

آدمی کے پیدا ہوتے ہی اُس کی کہانی، ایک کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ ہر شخص جانے کتنے تہ خانے لیے پھرتا ہے۔ سمندر کی تہ میں اُترنا آسان، آدمی کا اندرون کھوجنا بہت مشکل ہے۔ شابے کہتا تھا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سب کچھ غلط گمانوں کا شاخسانہ ہے۔ جاگیردار یقیناً ایک آوارہ منش آدمی تھا اور رنگ رنگ سے وہ بہانہ شغف رکھتا تھا۔ ایسے آدمی نے مزاحمت پیش کی تھی تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ مگر اِس کا ثبوت نہیں کہ اسی نے امینہ کے شوہر کو راستے سے ہٹایا ہو۔ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ امینہ کے شوہر نے خود کوئی غلط سلط چیز نہ کھالی ہو۔ نوجوانی زندگی کی شرط نہیں ہے۔ موت ترتیب سے کب آتی ہے۔ کسی کے بھی نام قرعہ نکل آتا ہے۔ کوئی بھی نشانے پر آ سکتا ہے۔ جاگیردار کی طرف سے شادی کا پیغام بھجوانا بھی کوئی مذموم و سفاکانہ اقدام نہیں تھا۔ یہ رشتہ تو ایک غربت زدہ خاندان کے لیے عزّت کا موجب ہونا چاہیے تھا، خصوصاً ایک بیوہ لڑکی کے سبب۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ہو سکتا ہے، امینہ اپنی بستی کے یا آس پاس کے کسی شخص سے دل چسپی رکھتی ہو اور اسی شخص نے اُس کے شوہر کا پتّھر اپنے راستے سے ہٹایا ہو اور امینہ کا ایما بھی جرم میں شامل رہا ہو اور ممکن ہے، بعد میں امینہ اسی کے ساتھ فرار ہوگئی ہو۔ اُس کے والدین آہ و بکا کرتے ہوئے جاگیردار کی حویلی پہنچے تھے تو جاگیردار سخت مکدر ہوا تھا۔ جب انھوں نے اسے اِدھر اُدھر رسوا کرنا شروع کیا تو جاگیردار کا ردِّعمل اشتعال آمیز ہی ہونا چاہیے تھا۔ ہندو مسلم فسادات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ کیا معلوم، اُس رات آگ لگنے کا سبب واقعی فساد ہو۔ جاگیردار نے امینہ کے لیے اشتیاق ظاہر کیا تھا اور چوں کہ اُس کے پاس بہت ساز و سامان، لاؤ لشکر، بہت اختیار و اقتدار تھا اور اُس کی سرمستیوں کے فسانے ارزاں تھے، اِس لیے کسی اور طرف دیکھا ہی نہیں گیا۔ نواکھالی سے واپس آکے ملہاری کے سامنے جاگیردار کی حویلی ہی کا ایک راستہ تھا۔ بستی کے بچے کھچے لوگوں نے اُسی جانب اشارہ کیا تھا۔ خون میں حدت بڑھ جائے تو سارے حواس متاثر ہوتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں، بعد میں ملہاری کو اپنی ناپختہ ذہنی کا احساس ہوگیا تھا۔ یہ صورت تو ملہاری کے لیے اور عذاب ناک ہوگی، پھر اسے کسی رات چین سے نہیں سونا چاہیے تھا۔

شابے ایک بسیار گو آدمی تھا۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں گوش گزار کرنے کے بعد کہنے لگا، ’’لوگوں کا کام ہی فسانہ سازی و شوشہ طرازی ہے، مگر خود اُسے یقین ہے کہ ملہاری کا خاندان جاگیرداری کی ہوس ناکی و ستم رانی کا شکار

اور جاگیردار کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ مغل اور میں نے سنا کیے۔ ہم نے کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ لوگوں کا حرج ہے تو یہ کیسا عبرت ساماں سانحہ ہے۔ ناکردہ گناہی کی سزا اسی کو کہتے ہیں۔

ہم سرائے سے اڈّے آگئے تھے۔ ملہاری اور اڈّے کے تمام لوگ ہماری خدمت کے لیے بے چین رہتے، مگر مغل نے وقت ضائع نہیں کیا۔ ڈھاکا ایک گنجان آباد شہر ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ سے جگہ جگہ مسجدیں اور مدرسے قائم ہیں۔ شہر تو ہم نے پہلے ہی چھان لیا تھا۔ اب گرد و نواح کی بستیاں رہ گئی تھیں۔ مغل کو اطمینان نہیں ہوتا تھا۔ شابے کی رہبری میں ایک ایک دن کے لیے ہم ڈھاکے سے دور بھی جاتے رہے۔ یہاں بیش تر افراد ہندوستانی سے ناواقف ہیں۔ بنگال سے باہر تجارت کرنے والے تاجر، نوابین، دوسرے صوبوں کے طلبہ، سرکاری افسر اور علمائے دین وغیرہ ہندوستانی خوب [illegible] ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کے علاوہ لوگوں کو [illegible] اور شرعی مسائل کے سبب سے عربی کی واجبی شد بد ضرور ہوتی ہے۔ مغل کو روانی سے بنگالی آتی تھی۔ میں نے کلکتے میں [illegible] سات سال گزارے تھے۔ مجھے بھی کوئی دقّت نہیں ہوئی تھی۔ بنگالی بہت بے قرار لوگ ہیں۔ شکوہ کرنا شاید ان کی سرشت ہے۔ سارا بنگال دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، جہاں مٹّی، وہاں سبزہ۔ بعض جگہوں پر تو ایسا لگتا تھا جیسے اونچی نیچی زمینوں پر، پہاڑیوں اور ٹیلوں پر سبز قالین بچھا دیا گیا ہو۔ لوگوں کا کہنا ہے، سبزہ بینائی کے لیے بہت اکسیر ہے اور اس سے زندگی کا احساس اجاگر ہوتا ہے، مگر جن کی آنکھیں ہی پراگندہ ہوں؟ ہمیں تو اپنے کام سے غرض تھی، یا یوں کہا جائے کہ فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ بس ایک دن کے لیے مغل نے سندربن کی سیر کی حماقت کی تھی، یا پھر ملک جتنے دن بستر پر پڑا رہا یا کبھی موسم نے پابند کیے رکھا

مہینے میں ایک رات، چودھویں کی رات، اڈّے پر رقص و سرود کی محفل آراستہ ہوتی تھی۔ ہماری خاطر ملہاری ہر روز محفل کا اہتمام کرنا چاہتا تھا، مغل کی خواہش پر اُس نے احتیاط کی۔ ہمیں ڈھاکا آئے ہوئے پورا عشرہ گزر گیا تھا۔

’’اینٹوں کی سپلائی کا ٹھیکا آپ کے بھائی کو، سیمنٹ کا بیٹے کو، سڑک کی تعمیر کا بھتیجے کو دیا گیا ہے۔ ترقیاتی منصوبے کا ہدف حاصل ہو گیا۔‘‘

اطراف میں شاید ہی کوئی بستی رہ گئی ہو، جہاں ہم نہ جا سکے ہوں۔ آخر مغل نے ڈھاکے سے روانگی کا ارادہ کرلیا۔

اُس رات ملہاری اور شابے نے پُرتکلّف دعوت کا انتظام کیا۔ ڈھاکے کے چنیدہ باورچیوں سے کھانا تیار کرایا گیا۔ ملہاری نے سرِ شام ہی شراب نوشی کی ابتدا کردی۔ کھانے کے بعد سازندوں اور ناچنے گانے والیوں کے لیے فرش ہموار کر دیا گیا۔ اگربتیاں سلگ رہی تھیں۔ گلاب پاش سے گلاب کا عرق چھڑکا جاتا رہا۔ شابے کہتا تھا، ملہاری کے سامنے سُر سے اُتری ہوئی گانے والیاں ٹھیر ہی نہیں سکتیں۔ عام ناچنے گانے والیوں کو بلایا ہی نہیں جاتا۔ جنھیں تھوڑا بہت آتا ہے، ملہاری کا نام سن کے وہ مشکل سے تیار ہوتی ہیں اور جنھیں کچھ آتا ہے، دل چسپ بات یہ ہے کہ وہ بلاوے کی منتظر رہتی ہیں۔ وہ ملہاری کی محفل میں شرکت افتخار کا باعث سمجھتی ہیں۔ ملہاری کی تحسین اُن کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ ملہاری کا حکم تھا کہ صورت شکل دیکھنے کے بجائے فن آشنا ہی مدعو کیے جائیں۔ اُس رات بھی جو دو لڑکیاں آئیں، وہ تیکھے نقش و نگار، سانولی رنگت، متناسب بدن اور مجموعی طور پر دل کش، لیکن عمر کی پختہ لڑکیاں تھیں۔ دونوں میں ایک ٹھیراؤ، بُردباری، وقار اور اعتماد تھا۔ دونوں سگی بہنیں معلوم ہوتی تھیں۔ لباس بھی سادہ پہن رکھا تھا اور بناؤ سنگھار بھی زیادہ نہیں تھا۔ شابے کے کہنے کے مطابق پہلے بھی وہ دو بار اڈّے پر

محفل جم چکی تھیں اور مہاری کی اُن پر خاص توجہ تھی۔ وہ بیش تر اُنھی کو بلاتا تھا۔ اُن کا بھی یہ رویہ تھا کہ پہلے سے کہیں بھی کیسی ہی حتمی وعدہ ہو، وہ ملہاری کے ہاں آنے کو ترجیح دیتی تھیں۔ شابے کا کہنا تھا کہ ایک یہی ہیں جنھیں نغمگی کے دوران زیروزبر کے فرق پر مہاری ٹوک دیتا ہے اور یہ نہایت تپاک سے صلاح قبول کرتی ہیں اور حتی الوسع اپنا سقم دُور کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ مہاری بھری محفل سے اچانک اُٹھ گیا، یا اُس نے ہاتھ اُٹھا کے محفل برخاست کرنے کا حکم دے دیا۔ ان دونوں لڑکیوں کو یہ عزت حاصل ہے کہ مہاری ان کی محفل میں آخر تک جم بیٹھا رہتا ہے، لیکن مہاری نے محفل کے سوا انھیں کبھی طلب نہیں کیا ہے، انھیں کیا، کسی کو بھی طلب نہیں کیا۔ اُس نے ڈیڑھ پونے تین سال کا عرصہ یک عزلت نشیں اور مجرد شخص کے طور پر گزارا ہے۔

دونوں لڑکیوں نے پہلے ہاتھ جوڑ کے مہاری کو تعظیم پیش کی۔ اُس کے پیر چھوئے، پھر گانا شروع کیا۔ واقعی اُن کے گلے میں رس تھا، تان خوب اُٹھاتی تھیں۔ راگوں پر ماہرانہ دسترس تھی اور مگن ہو کے گاتی تھیں۔ ایک گاتی تو دوسری ناچتی تھی اور بہت سلیقے سے۔ اڈّے پر بیٹھے ہوئے لوگ جھوم رہے تھے اور پھڑک پھڑک اُٹھتے تھے۔ بھی حسب توفیق پیسے لٹاتے رہے، بجھل بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ مہاری آنکھیں بند کیے، آنکھیں چڑھائے جھومتا رہا اور صرف ایک مرتبہ اُسے مُنہ بنانے اور دخل دینے کی ضرورت پیش آئی۔ اُس وقت وہ کسی ڈیرے کا اُستاد نہیں، موسیقی کا کوئی پنڈت، کوئی گرو دیو لگ رہا تھا۔ اُجلے کپڑے، سر پر صافہ، کندھوں پر سلک کی شال اور گلے میں مالا پڑی تھی۔ میں نے بہت سے اڈّوں اور بالاخانوں پر یہ محفلیں دیکھی ہیں، مگر آج کی بات ہی اور تھی۔ اصل میں یہ مجرے سے کوئی مختلف محفل تھی۔ غالباً کسی کو بھی رقص اور موسیقی کے اس بھونڈے انداز سے گراں باری محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ دونوں لڑکیوں نے جیسے سب کو بے خود کر دیا تھا۔ آدمی بھی کیا صدف در صدف، تہ در تہ ہوتا ہے، ناچنے اور گانے کے دوران اُن کے جوہر کھل رہے تھے۔ اُن کے رقص میں ذرا بھی وحشت نہیں تھی اور اُن کی آواز جی چاہتا تھا کہ وقت

ٹھہر جائے اور جس کے پاس جو کچھ ہو، ان پر نچھاور کر دے۔ مجھے چاندنی بانو یاد آ رہی تھی۔ کیا نہیں جا سکتا کہ مہاری کی نظر میں اُس کا کیا مقام ہوتا! اُسے بھی تانا بیگم نے موسیقی کے بڑے بڑے اُستادوں سے تعلیم دلوائی تھی۔ میرا کوئی واسطہ تو نہیں تھا، لیکن اب تک جو کچھ دیکھا اور جاننے والوں سے جو کچھ سُنا تھا، میرا اندازہ ہے کہ چاندنی بانو کی محفل کے دوران بھی مہاری سے یوں اُٹھا نہ جاتا۔ وہ بھی سرتاپا سُر تھی۔

دو بج رہے تھے، مہاری نے سرگوشی میں بجھل سے پوچھا کہ محفل ختم کر دی جائے؟ بجھل نے درخواست کے لہجے میں فرمائش کی کہ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ آج خود بھی کچھ سنائے۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ مہاری نے اڈّا سنبھالنے کے بعد کسی کے سامنے کچھ نہیں گایا ہے۔ وہ بند کمرے میں یا چھت پر تنہا ریاض کرتا ہے اور دُور ہی دُور سے کسی کو اُس کے ستار بجانے یا راگ الاپنے کی آواز سنائی دے جائے تو دے جائے۔ شروع میں دوستوں نے اُس سے بڑی منت کی تھی، لیکن وہ [illegible] ہوا یوں کہ اُس کی تیوری چڑھ جاتی تھی اور وہ مضطرب ہو جاتا تھا، پھر لوگوں نے کہنا سننا ہی بند کر دیا۔ شہر یا اطراف میں کسی سنگیت سمراٹ کی آمد کی خبر ملتی تو مہاری وہاں ضرور جاتا اور اپ آپ کو ظاہر کیے بغیر کسی گوشے میں بیٹھا خاموشی سے سنتا رہتا۔

بجھل کی فرمائش پر مہاری کی حالت سیمابی ہو گئی، جیسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو، یا بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ وہ عجب بے بسی، بے کسی کی کیفیت سے دوچار ہوا۔ بجھل کے بارے میں شابے نے کچھ کم نہیں بتایا ہوگا۔ یہ مہمان کی خوش نودی بھی ملحوظ ہوگی۔ میرا خیال ہے، بجھل کو اُسے ایسی کسی آزمائش میں ڈالنا نہیں چاہیے تھا، یہ مہمانی کی وضع نہیں۔ بجھل کے منت کش لہجے پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اُس پر مستزاد بجھل کا اصرار تھا۔ مہاری نے ہاتھ جوڑ کے معذرت کرنی چاہی، لیکن بجھل کو جیسے ضد ہو گئی۔ اُس نے مہاری کی معذرت اعتنا کے قابل نہیں سمجھی اور کہنے لگا کہ پھر ہمیں خلش رہے گی کہ ہمارے میزبان نے ہمارا مان نہیں رکھا۔ "نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن" والی مہاری کی حالت تھی۔ ادھر شابے نے اُس کے پیر پکڑ لیے۔ اُدھر دونوں لڑکیاں اور سازندے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے۔

گو اُنھوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن اس خوشی سے بڑی فریاد کیا ہو سکتی تھی۔ ملہاری کے سیاہ چہرے پر خون چھلکنے لگا۔ اس کا رنگ ہی بدل گیا۔ بجھل نے اُس سے کہا کہ فن تو افشا کے لیے ہوتا ہے، اخفا کے لیے نہیں اور یہ تو بخل ہے۔ یہ تو خودغرضی اور خود جبری ہے۔ فن تو دوسروں کے لیے ہوتا ہے، دوسروں کے شوق و اشتیاق سے اسے نمو ملتی ہے۔ یہ دولت لٹانے کے لیے ہوتی ہے اور دونوں ہاتھوں سے لٹانے کے بعد بھی اس میں کمی نہیں ہوتی۔ فن کو دھوپ نہ دکھائی جائے تو یہ گھٹ جاتا ہے۔ بجھل نے بہت سی دل گداز اور دل سوز باتیں کیں۔ کچھ غلط نہیں تھا، مگر خدشہ تھا کہ کہیں ملہاری کو ضبط کا یارا نہ رہے۔ وہ بہ ہر حال اڈّے کا داتا ہے۔ اڈّے کے داتا کے لہجے میں تندی آتے ہوئے دیر کیا لگتی ہے۔ میری توقع کے برعکس ملہاری پر ایک اضطرار اور اضطراب کا عالم طاری رہا۔ وہ کسمساتا اور بل کھاتا رہا اور آخر اُس نے سر جھکا لیا۔ اُس کے سر ڈالتے ہی ہر طرف سے تحسین و آفریں کی صدائیں بلند ہوئیں۔ دونوں لڑکیوں نے مسرت میں گھنگرو چھنکائے، طبلہ نواز نے دیوانہ وار طبلہ بجا کے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ ایک مرتبہ پھر گلاب کا عرق چھڑکا جانے لگا۔ لوگ ایک دوسرے پر گلاب کی پتیاں پھینکنے لگے۔ وہ وادیلا مچ گیا۔ ملہاری بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ پھر اُس کے سر اُٹھانے پر ستار نواز، ہارمونیم بردار اور طبلہ نواز چوکی کے قریب آ گئے۔ ملہاری نے ستار نواز کو کوئی اشارہ کیا۔ اُس نے نہایت ادب سے ملہاری کے پیروں پر ستار رکھ دیا۔ سب کی نظریں ملہاری پر مرکوز ہو گئیں اور ہر جانب سکوت چھا گیا۔ 'تک تک دیدم، دم نہ کشیدم' والا مضمون صادق آتا تھا۔ دونوں لڑکیوں کے چہرے دمک رہے تھے۔ اشتیاق اور تجسس اُن کی آنکھوں سے ہویدا تھا۔

ملہاری نے آہستہ آہستہ ستار کے تار چھیڑے تو ایک جھنکار بلند ہوئی۔ تاروں کو منشا کے مطابق استوار کرنے میں ملہاری کو دیر لگ گئی۔ سبھی آنے والے لمحوں کی صورت گری کے منتظر تھے۔ کسی طرف سے کوئی آہٹ نہیں اُبھری کہ مبادا ملہاری کے ارتکاز میں خلل انداز ہو۔ دھیرے دھیرے ملہاری نے تار جھنجوڑنے شروع کیے اور راگ پھوٹنے لگے۔ تھوڑی

دیر میں ایسا لگا جیسے ترنم کی مخمل پھریاں چھوٹنے لگی ہوں، موسیقی کے آلات میں بھی کیسا رس بھرا ہوتا ہے۔ نچوڑو تو رس ٹپکے، پر کشید کرنے والا بھی تو چاہیے۔ رس کی شیرینی اور نشے میں ہاتھ کی تاثیر کا بہت دخل ہے۔ تار چھیڑنے ہی سے مہاری کی مشاقی کا اندازہ ہو گیا تھا، لیکن ایسی نغمگی، یہ فسوں گری غالباً ہر ایک کے گمان و اعتبار سے ہو تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ سارا کمال ہی نظم و ترتیب، حُسنِ ترتیب میں نہاں ہے اور سارا کمال تناسب و توازن ہی کا ہے۔ کیا شاعری، کیا مصوری اور کیا موسیقی، سب کچھ تو یہ تو ترتیب و ترکیب کا کرشمہ ہے اور بنیادی چیز کسی فن کے مدارج و مراحل سے آگہی اور اُن پر قدرت کا حصول ہے۔ مدعا یہ ہے کہ ہر فن ایک مخصوص ترتیب اور ضوابط کے دائروں میں اسیر ہے۔ یہ دائرے گھٹتے بڑھتے، سکڑتے، پھیلتے رہتے ہیں، ختم نہیں ہوتے۔ ایک ترتیب کے بعد نئی ترتیب، ایک ہنر کے بعد دوسرا ہنر، جدت، اجتہاد، یعنی خلاقی و تخلیق آفرینی کی بات بھی ترتیب و ترکیب کے کسی نئے زاویے اور پہلوداری سے عبارت ہے، اور دائروں سے خارج کچھ نہیں ہے۔ تجرد یا دوسرے لفظوں میں انتہا پسندانہ اجتہاد بھی متعلقہ فن کے کسی روایتی پس منظر ہی میں ممکن ہے۔ خیال کی آمد ہر شخص پر ارزاں ہے، مگر ہر ایک کو ایک نظام، ایک سلیقۂ ہنر لازم ہے۔ موسیقی میں کسی نئے پہلو کی آمد، شاعری میں کسی نئے خیال کا الہام اور مصوری میں کسی نئے زاویے کا ورود متعلقہ فن سے وابستہ شخص ہی کو زیب دیتا ہے، کسی بڑھئی اور لوہار کو نہیں۔ یہی حال بڑھئی اور لوہار کے فنون کا ہے۔ شعرا اور موسیقار اور مصور چوب کاری اور آہن گری میں کسی نئے پن کا تصور کر سکتے ہیں اور بس!

مجھے اچھی طرح یاد تھا، گیا کے کالج میں میرے ایک بزرگ اُستاد کبھی کبھی اپنے موضوع سے ہٹ کے ادھر اُدھر کی باتیں بھی ہمیں تعلیم کیا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ شاعری، مصوری اور موسیقی دو اور دو کا حاصل جمع پانچ کرنے کی کوشش ہے۔ اُس وقت اُن کی بات پلّے نہیں پڑی تھی۔ اب کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا تھا کہ 'دو اور دو کا حاصل جمع پانچ' سے اُن کی کیا مراد تھی۔ جو بہ ظاہر ممکن نہ ہو، اُسے کر گزرنا، کوئی معرکہ سر کرنا، کسی نئی منزل، نئی جہت کا سراغ پانا اور کیمیاگری کرنا،

لکیروں، لفظوں، تاروں اور سُروں کی کسی نئی ترتیب سے کوئی منفرد کرنا، اضافے کا مطلب پانچ نہیں ہوتا کہ حصار سے باہر کچھ نہیں۔ حاصل جمع چار کے خطوط اور زاویے بے شک مختلف ہوتے ہیں اور اسے پانچ کے مترادف کہنا چاہیے۔ یہ حادثہ بھی کبھی کبھی سرزد ہوتا ہے کہ ثمر بار درخت سے گزرتے ہوئے کسی راہ گیر کے دامن میں اچانک کوئی ثمر گر جائے۔ کسی پر اچانک کسی خیال کے ورود، تگ و دو کے بغیر کسی دفینے کے مل جانے کی ناگہانی شاذ و نادر ہی ممکن ہوتی ہے۔ استثنا پر قیصے نہیں بنتے۔ فن میں کمال تو ایک مسلسل کو شش، مستقل کار و ریاضت کا ثمر ہے۔

ملہاری کو ورثے میں موسیقی کی دولت حاصل ہوئی تھی۔ ورثہ دو بیٹے بیٹیوں میں مساوی تقسیم کیا جائے تو حاصل جمع مختلف کیوں ہوتا ہے اور جواب چار کیوں نہیں آتا؟ تین کیوں ہو جاتا ہے اور پانچ کیوں ہو جاتا ہے؟ یہ کیا شعبدہ ہے کہ ایک درجۂ کمال پر پہنچتا ہے، دوسرا صورت دیکھتا اور آئینے پر شک کرتا رہتا ہے۔ ایک ہی مکتب میں درس حاصل کرنے والوں میں کسی ایک کے امتیاز کا سبب ایک کی بے کلی، دوسرے کی بے حسی۔ ایک کی غرض مندی، دوسرے کی قناعت، ایک کا قرار، دوسرے کی بے قراری، ایک کا قیام، دوسرے کا سفر ہے اور وہ بے قراروں میں امتیاز کا پیمانہ بھی یہی ہے۔ کون سرفروشی پر آمادہ رہا، کس نے کتنا خود کو نثار کر دیا۔

ملہاری نے چاقو پر خوب دست رس حاصل کی تھی۔ قریب تیس سال سے وہ اڈے پر قائم تھا، لیکن یہ اُس کا بہروپ تھا۔ لگتا تھا، وہ تو بس ستار بجاتا رہا ہے اور ستار ہی سوچتا رہا ہے۔ جیسے وہ چپکے چپکے اپنا ورثہ بڑھاتا رہا ہے ور اُس نے کوئی دن، کوئی پہر، کوئی لمحہ نہیں گنوایا۔

سبھی گنگ بیٹھے ملہاری کا جمال دیکھ رہے تھے، ملہاری کا اصل رُوپ۔ دونوں لڑکیوں پہ وجد کی کیفیت طاری تھی، آنکھوں میں ڈورے پڑے ہوئے، چہرے تمتماتے ہوئے، بدن میں اُن کے بار بار ہُوک سی اُٹھتی۔ ہر ایک کا یہی عالم تھا۔ ملہاری نے ستار خود سے جدا کیا تو لوگوں کو اس ترنم آفریں سحر سے نکلنے میں لمحے گزر گئے۔ پھر یکایک حرارت میں

کان پڑی آواز سنائی دینا مشکل ہو گیا۔ جھل نے ملہاری کے ہاتھ سینے سے لگا لیے۔ ہر شخص ملہاری کے پیر چھونے، اُسے سلام کرنے کے لیے چوکی کی طرف اُمڈ پڑا۔ انھیں جیسے آج ہی ملہاری کا عرفان ہوا تھا۔ شابے اور اڈے کے دوسرے آدمیوں نے انھیں روکنے کی کوشش کی اور چیخ چیخ کے کہا کہ دوستو! ملہاری نے تو ابھی ستار نوازی کا مظاہرہ کیا ہے، راگ کہاں سنائے ہیں، یہ محفل کا اختتام نہیں ہے، یہ داد و ستائش قبل از وقت ہے۔ ذرا صبر کرو۔ جھل کو بھی اُٹھنا پڑا! اُس نے ہاتھ بلند کر کے لوگوں کو صبر کی تلقین کرنے میں شابے کا ساتھ دیا۔ اُدھر ملہاری اپنے آپ سے بیگانہ سا بیٹھا تھا، کچھ گھبرایا گھبرایا، شرمندہ شرمندہ سا۔ داد سے بڑی لذت کیا ہوتی ہے، خون سنسنانے لگتا ہے۔ اُس کے لیے یہ ایک نشاط انگیز واقعہ ہوگا۔ ستار نواز نے ستار اور طبلہ نواز نے طبلہ سنبھال کے مشق آزمائی شروع کی تو لوگوں کو احساس ہوا کہ ہاں، ملہاری کا اصل جوہر، اصل کرشمہ سازی تو ابھی رہ جاتی ہے۔ ملہاری نے بھی لوگوں کی دہشت خیز محبت دیکھ کے جلدی تان اُٹھائی ور اشاروں اشاروں میں سازندوں کو کچھ ہدایت دی۔

صبح کاذب میں اب وقت کم ہی رہ گیا تھا، ملہاری نے اُسی نسبت سے راگ مالکونس کا آغاز کیا اور قدرے مختصر، ستار پر اُس کی ساحری، مشاقی اور کاری گری کی بات تھی تو آواز صاف خداوندی نعمت، کسی خداداد صلاحیت کا مظہر تھی۔ پہلی شرط تو آواز ہے اور آدمی کا نغمگی سے متصف ہونا ہے۔ شاعری کی اصطلاح میں اسے 'موزوں طبعی' کہتے ہیں۔ دو اور دو کا حاصل جمع پانچ غالباً یہی معجزنمائی ہے۔ آواز بھی نشتر مثال ہوتی ہے، اور بہت کاری نشتر۔ سینے میں ترازو ہو جانے اور رگیں کاٹ دینے کی یہ خوبی تو نشتر میں بھی نہیں ہوتی۔ قدیم روایتی موسیقی کا ایسا نظارہ میں نے پہلے نہیں کیا تھا۔ ملہاری کی آواز میں ایسی کسک، خلش اور فریاد تھی، اتنا کرب تھا کہ آدمی پر گریہ طاری ہو جائے اور وہ گریباں چاک کر دے۔ کہتے ہیں، آواز تو ایک خام چیز ہوتی ہے۔ ہیرے کی طرح اسے تراشنا پڑتا ہے، مگر نہ ہر پتھر ہیرا بن سکتا ہے، نہ ہیرے جیسی آب و تاب کا متحمل ہو سکتا ہے، اور کہتے ہیں، آواز تو آدمی کا سراپا ہوتی ہے،

آدمی کا آئینہ۔ اندر کچھ کھٹکتا ہے تو بے قراری عیاں ہو جاتی ہے۔ اندر کچھ جلتا ہے تو آواز بھی جاں سوز ہو جاتی ہے۔ لوہا جلتا رہے، جلتا رہے، کُٹتا رہے، اِس ضربت و جراحت کے بعد ہی کوئی شمشیرِ بُراں ممکن ہوتی ہے۔

ملہاری کی صحبت میں اڈے کے لوگوں کو بھی قدیم موسیقی کا اچھا ذوق ہو گیا تھا۔ بنگال کے لوگ یوں بھی موسیقی کے رسیا ہوتے ہیں۔ معلومات بھی انھیں خوب ہوتی چاہییں۔ جھل نے تو طرح طرح کا وقت گزارا تھا۔ مجھے بھی راگ راگنیوں سے تھوڑی بہت آشنائی تھی۔ بمبئی میں ایک بار جولین میرے لیے کتابوں کا ڈھیر بازار سے اُٹھا لائی تھی۔ اُس میں ہندستان کی قدیم موسیقی سے متعلق بھی ایک کتاب شامل تھی۔ انگریزی میں تھی اور انگریز محقق ہی کی تالیف تھی۔ مجھے کچھ زیادہ پڑھنے کا موقع تو نہیں ملا، لیکن چند ابتدائی باب نظر سے گزرے تھے۔ کرشنا جی کے پاس بھی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ اُن کی عدم موجودگی میں کبھی کبھی اُن کی کتابیں ٹٹولتا رہتا تھا، ہندستانی موسیقی کسی بڑے خزانے کے مانند ہے۔ ایک در کے بعد دوسرا در، اور ہر در میں ایک خزانہ، دفینے کے راستے، قواعد، ضوابط اور آداب مقرر ہیں۔ پہلے انھیں از بر کیجیے اور در کھولتے، در پار کرتے جائیے اور آنکھیں خیرہ کرتے رہیے۔ ذرا نگاہ چوکی اور آدمی گم ہوا۔ سارے خزانے تک پہنچنے کے لیے ایک عمر چاہیے اور کسی ذی نفس کے پاس اتنی عمر نہیں ہوتی۔ جولین کی عطیہ کتاب سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ راگوں کے باقاعدہ اوقات مقرر ہیں... ویسے تو کوئی بھی راگ کسی بھی وقت گایا جا سکتا ہے، مگر اپنے معین وقت پر گایا جائے تو تاثر ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ملہاری نے وقت دیکھتے ہوئے راگ مالکونس منتخب کیا تھا۔ مالکونس کے لیے رات کے دوسرے پہر کا وقت مقرر ہے۔ یہ بھیرویں ٹھاٹھ کی ایک شاخ ہے۔ منتخب سُروں کے الگ الگ نظام اور ضابطوں کی درجہ بندی کر دی گئی ہے۔ سیدھے سادے لفظوں میں راگ راگنیوں کے مختلف گروہ، یا خاندان وضع کر دیے گئے ہیں، اِن گروہوں اور خاندانوں کو 'ٹھاٹھ' کہا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں راگوں، راگنیوں کے بہت سے نظام، یا ضابطے یا گروہ رائج تھے، بل کہ اُن کا شاخ در شاخ سلسلہ بیٹے

بیٹیوں، داماد وں، بہوؤں، مؤنث، مذکر وغیرہ سے موسوم اور تعبیر کیا جاتا تھا۔ اس موسیقی کے عالموں نے یہ شاخیں دس ٹھاٹھوں، یا دس حصوں میں تقسیم کر دیں۔ ہر ٹھاٹھ کا سُروں کی مختلف ترتیب پر مشتمل اپنا ایک نظام اور تشخص ہے اور ہر ٹھاٹھ کی ذیلی شاخوں کا اپنا ایک نظم، اپنی ایک ترتیب ہے۔ مالکونس کو رات کے راگوں میں بہت فضیلت حاصل ہے۔ پانچ سُروں کا یہ راگ نہایت دل نشیں اور دل نواز راگ ہے۔ راگوں سے متعلق ایک اور دل چسپ بات بھی میں نے پڑھی تھی کہ ہر راگ کی ایک شبیہ قدیم موسیقاروں نے مصوّر کی ہے۔ مالکونس کو انھوں نے سفید رنگ کے ایک جوان رعنا سے تشبیہ دی ہے۔ دلکش آنکھیں، چوڑی پیشانی، دراز قد، وسعت و بازو کا زور آور، شان و شوکت میں یکتائے روزگار، ہاتھ میں زرنگار چھڑی، بدن پہ لاجوردی لباس سجائے اور موتیوں کی مالا زیبِ گلو کیے شہبازوں، شہسواروں کا ہم نشیں ہے۔

مالکونس پر ملہاری کو اتنی قدرت تھی تو راگ ملہار پر اُس کی گرفت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دونوں لڑکیوں کے بدن پارہ پارہ

تھے۔ پھر اُن سے برداشت نہیں ہوا۔ اُنھوں نے اُٹھ کے رقص شروع کر دیا۔ ماحول ہی کچھ اور ہو گیا۔ رقص رنگوں کی مصوری ہے۔ رقص کی آمیزش سے رنگ رنگین ہو جاتے ہیں اور جلد سمجھ میں آتے ہیں۔ ظاہر ہے، ملہاری کے بعد وہی دونوں محفل کے تمام لوگوں سے زیادہ موسیقی کا درک رکھتی تھیں۔ قدرِ جوہر شاہ داند... اُنھی کو ملہاری کے کمال، اُس کے فنی اسرار، سب سے زیادہ منتقل ہونے چاہیے تھے، اور وہی اُس کی صحیح طور پر پذیرائی کر سکتی تھیں۔

سورج طلوع ہونے میں ابھی دیر تھی اور لوگوں کی شمولیت، اُن کے انہماک و استغراق کا یہ حال تھا کہ بس سانس رُک جائے۔ مگر صیاد خود اپنے دام کا اسیر ہونے لگا۔ پہلے تو ملہاری کی آنکھوں میں آگ سی بھڑکی پھر آنسو اُبلنے لگے اور آواز پر رعشہ سا طاری ہو گیا۔ اُس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن جانے کیا ہوا، کچھ بھولا وسرا یاد آ گیا۔ کوئی کانٹا رگِ جاں میں اٹکا ہوا تھا، وہ زیر و زبر کر گیا۔ ملہاری بری طرح رونے لگا۔ سازندوں نے فوراً ساز بند کر دیے۔ اِس سے پہلے کہ ملہاری غش کھا کے گر پڑتا، مخمل نے اُسے بازو میں تھام لیا۔ مخمل نے جیسے خاکستر میں پھونک ماردی تھی، یا تارِ نفس چھیڑ دیے تھے، اُس کے بازوؤں میں نڈھال ہوتے ہی ملہاری پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اُس کی تو ہچکیاں بندھ گئیں۔ دونوں لڑکیوں نے دیوانہ وار چوکی پر آ کے ملہاری کے پیروں پر سر رکھ دیے، پھر ایک لڑکی پلّو سے پنکھا جھلنے لگی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ہر شخص حیران و پریشان ملہاری کو دیکھنے کے لیے چوکی پر چڑھا جا رہا تھا۔ شابے نے بُرا بھلا کہہ کے، گالیاں دے کے اُنھیں روکا اور کچھ دیر کے لیے پُرسکون ہو جانے کی التجائیں کرنے لگا۔ ملہاری کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں۔ آنسوؤں کے ایک سیل کے بعد اُس نے ہاتھ پیر چھوڑ دیے اور خود کو مخمل کی آغوش کے سپرد کر دیا۔ لوگوں کی بے چینی، اُن کی سرگوشیوں اور مشوروں کے شور سے گریز کے لیے یہی مناسب تھا کہ ملہاری کو فوراً کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔ مخمل، میں، شابے اور اڈّے کے چند آدمی جیسے تیسے اُسے چوکی کے عقب میں ایک کمرے میں لے آئے اور چارپائی پر لٹا دیا۔

شابے نے دروازے پر کھڑے ہو کے لوگوں کا داخلہ بند کر دیا۔

دونوں لڑکیوں کو بھی شابے نے روک دیا تھا، لیکن وہ اَڑ گئیں۔ مخمل کے اشارے پر شابے نے بادلِ ناخواستہ اُنھیں بھی اندر آنے کی اجازت دے دی۔ دونوں کی سراسیمگی میں بہت وارفتگی تھی۔ اضطراری انداز میں وہ ملہاری کی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ ہم پیشگی کے استحقاق کا اعتماد تھا، یا فورِ پرستش اور بندگی کا جنون کہ ایک نے سرھانے بیٹھ کے ملہاری کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اُس کے ہاتھ ملنے لگی۔ دوسری، پائنتی بیٹھ کے ملہاری کے پیر مسلنے لگی۔ مخمل نے ملہاری کے مُنہ پر پانی کے چھینٹے ڈالنے شروع کیے۔ اِسی اثنا میں اڈّے کے آدمی کہیں سے کوئی وید پکڑ لائے۔ وید کی دیکھ بھال اور دوا سے ملہاری کے چہرے کا کھنچاؤ کسی قدر کم ہو گیا۔ عرق میں یقیناً نشے کی کوئی دوا شامل تھی، جبھی ملہاری کی آنکھیں مچنے لگیں اور وہ بے ہوش سے بھی بیگانہ ہو گیا۔

وید کی ہدایت پر سب باہر چلے آئے۔ دونوں لڑکیاں چمپا اور چندا وہیں رہنا چاہتی تھیں، لیکن وید نے ایک آدمی کے سوا کسی کو اندر ٹھیرنے کی اجازت نہیں دی۔ سو ملہاری کے ایک سِن رسیدہ معتمد کو نگہداری کی خدمت سونپی گئی اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

تھوڑی دیر میں اندھیرا ٹوٹنے لگا۔ کسی نے بھی وہاں سے جنبش نہیں کی۔ شابے اور مخمل نے بہت کہا تھا، لیکن چمپا اور چندا نے گھر واپس جانے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک کونے میں تھم سے کمر ٹکائے خاموش بیٹھی رہیں۔ اُن کی آنکھیں ڈوبی ہوئی تھیں۔ تھم کے سامنے ہی ملہاری کے کمرے کا دروازہ تھا۔ ملہاری کا حال دیکھنے شابے وقفے وقفے سے اندر جھانک کے واپس آتا تو وہ بے تاب ہو جاتیں۔ شابے اُنھیں مژدہ سناتا کہ ملہاری گہری نیند میں ہے اور گویا سب خیریت ہے، راوی چین لکھتا ہے۔ شابے کی بے نیازی اور اطمینان نے اُنھیں آسودہ نہیں کیا، وہ وہیں بیٹھی رہیں۔

دیکھتے دیکھتے اُجالا ہو گیا۔ کوئی آٹھ بجے اڈّے کے آدمیوں کو ناشتے کا خیال آیا اور بھاگ دوڑ ہونے لگی۔ ہماری وجہ سے وہ کچھ زیادہ فکر مند ہوئے۔ خاصی تعداد میں لوگ دھرنا دیے بیٹھے تھے،

تمام گھنٹے بھر میں اُنھوں نے سب کے لیے ناشتے کا خاطر خواہ انتظام کر دیا۔ پوری ترکاری سارے ہندستان کی مقبول عام غذا ہے۔ ساتھ میں دال اور چاول بھی تھے۔ بنگالیوں کو دال بھات نہ ملے تو بھوکے ہی رہیں۔ نو بجے وید نے دوبارہ حاضری دی۔ وہ اکیلا ہی ملہاری کے کمرے میں گیا اور آ کے بتایا کہ بہ ظاہر فکر کی کوئی بات نہیں، سر دست ملہاری کو دوا سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ لوگوں نے وید کو گھیر لیا اور طرح طرح کے سوالات سے اُس کا ناطقہ بند کر دیا۔ وید کے پاس کوئی شافی جواب نہیں تھا۔ کسی کے پاس بھی نہیں تھا اور شاید سب جانتے تھے، مگر ہر شخص اپنے وہم و قیاس کی تصدیق کے خواہش مند تھے۔

ہمیں بارہ بجے روانہ ہو جانا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب ملہاری کی نگرانی پر متعین آدمی گھبرایا ہوا باہر آیا اور اُس نے بتایا کہ ملہاری کی آنکھ کھل گئی ہے اور وہ شدید قسم کے تشنج اور اختلاجی حالت میں ہے۔ سبھی پریشان ہو گئے۔ اِس سے پہلے کوئی اندر جاتا، چمپا اور چندا دروازے کی طرف لپکیں۔ اُنھوں نے کسی کو مداخلت کا موقع ہی نہیں دیا، سیدھی کمرے میں داخل ہو گئیں۔ اِدھر بھی سب اندر جانے کے لیے کمربستہ ہو گئے تھے، مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ مخمل کے ساتھ میرے اور شابے کے سوا کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔

ملہاری چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے سے دہشت برس رہی تھی۔ بوڑھا خادم اُس کا کندھا پکڑ کے دوائی کا ایک جرعہ لینے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ چمپا اور چندا چارپائی سے کچھ دور ایک جانب ہاتھ باندھے کھڑی کچھ کہہ رہی تھیں۔ ہمیں دیکھ کے وہ چپ ہو گئیں۔ ملہاری بھی حواس باختہ سا ہو گیا اور اُس نے کئی بار سر جھٹکا۔ پہلے ندامت، پھر یاس کا اُس پر غلبہ ہوا۔ مخمل نے اُس کے سرھانے بیٹھ کے اُس کی کمر تھپکتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا، ”کیسے ہو مہاراج؟“

شش و پنج سے دوچار ملہاری بے چارگی کی ایک نظر مخمل پر ڈال کے رہ گیا۔

”وید بولتا ہے، تھوڑے آرام سے سارا ٹھکانے پر آ جائے گا۔“ مخمل نے بدبداتے ہوئے کہا۔

”کہا تھا کہ میرے سلیپر مت پہننا...“

”میں، میں ٹھیک ہوں۔“ ملہاری نے تھکی ہوئی آواز میں باور کرانے کی کوشش کی اور ہڑبڑا کے پوچھا، ”کیا وقت ہوا ہے؟“

شابے نے بہ عجلت اُسے وقت بتایا۔

”اُستاد کو جانا تھا۔“ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

”اپنے کو جلدی نہیں ہے۔“ مخمل نے بے پروائی سے کہا۔

”پر میں، میں...“ وہ اُٹھنے لگا تھا کہ مخمل نے اُسے اُٹھنے نہیں دیا۔ اُس نے مزاحمت جاری رکھی، اپنا سینہ تانتے اور بازو پھیلانے کی مشق کی اور جلد ہی اُسے اندازہ ہو گیا کہ ابھی اُسے اِس مستعدی کی استطاعت نہیں ہے، سو اُس نے زچ ہو کے سر جھکا لیا، لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کے جسم میں تلاطم برپا ہوا۔ اُسے اپنی دائیں جانب ہاتھ باندھے، مجسمے کی طرح ایستادہ چمپا اور چندا کی موجودی نے مشتعل کر دیا۔ ”باہر بھی سبھی اِدھری بیٹھے ہیں، تمھارے درشن کو۔“ مخمل نے زیرِ لبی سے کہا۔

یہ سُن کے ملہاری کے چہرے پر بل پڑ گئے۔ ”میں، میں باہر جاتا ہوں۔“ اُس نے بچوں کی طرح ضد کی اور چارپائی سے اُٹھنے کی کوشش کا اعادہ کیا۔

”نہیں مہاراج! ابھی ٹھیک نہیں ہے۔“ مخمل نے اُس کا زانو دباتے ہوئے کہا، ”گاڑی نہیں چھوٹ رہی کسی کی، رسائی سے جانا۔“

تمیں سال کے معمول میں یہ بے ضابطگی ملہاری کے لیے منافرت اور ناگواری، بے زری اور خِفّت کا باعث ہونی چاہیے تھی اور ہوش و حواس کی بحالی تک اُنھی متضاد کیفیتوں سے نبرد آزمائی لازم تھی۔ فی الحال سکون و سکوت کا جبر ہی اُس کے لیے ایک بہتر نسخہ تھا۔ مخمل نے بھی اشاروں اشاروں میں

اُسے بھی تلقین کی۔ ملہاری نے دوا پینے کے لیے منتظر اپنے بوڑھے نگراں کے ہاتھ سے سفوف کی پڑیا جھپٹ لی اور حلق میں اوٹ کے مُنہ بنایا۔ اُس نے ایک ہی گھونٹ میں سارا پانی اُنڈیل کے کٹورا فرش پر پھینک دیا۔ کچھ دیر خاموشی کا حبس رہا۔ پھر بچھل نے اُس کی تالیفِ قلب کے لیے آہستگی سے کہا،

"رات جو ہم نے چمتکار دیکھا، ویسا کبھی دیکھا سنا نہیں تھا۔"

ملہاری نے ایک گہری سانس لی۔ شانے اُچکائے، اُس کے ہونٹ پھیل گئے۔ جواب میں کچھ کہہ نہ سکا، اِدھر اُدھر دیکھ سے گھمانے لگا اور اُس کی بھٹکتی ہوئی نگاہیں چمپا اور چندا پر آ کے جم گئیں۔ "تم گھر جاؤ، تم کیوں، کیوں..."

"یہ اَب کدھری جائیں گی؟" بچھل نے تیکھے لہجے میں کہا، "کوئی ٹھکانا ہی نہیں چھوڑا مہاراج نے اِن کے لیے۔"

چمپا اور چندا نے بھی سن لیا تھا۔ اُنھیں حوصلہ ہوا اور اُنھوں نے جھٹ ملہاری کے پَیر پکڑ لیے، "ہم کو اپنے چرنوں میں جگہ دو مہاراج!" بڑی لڑکی چندا نے جرأت مندانہ عاجزی سے کہا۔

ملہاری نے پیر سکیڑ لیے اور ہٹ بنا کے بولا، "جاؤ جاؤ، گھر جاؤ، اَب کوئی تماشا نہیں ہے یہاں۔"

"تماشا تو لگتا ہے، اَب شروع ہوگا ملہاری بابو!"

ملہاری کو بچھل کا مفہوم اخذ کرنے کی بے کلی ہونی چاہیے تھی۔ وہ چونک پڑا۔ میں نے بھی سمجھنے کی کوشش کی، لیکن بچھل کا لہجہ رمزیت سے آلودہ تو چہرہ عاری تھا۔ ایسی ناگہاں فقرے بازیاں سینے کی تندی میں اکسیر ہوتی ہیں۔ میں نے اپنی آسانی کے لیے بچھل کے فرمودے کو تلقینِ صبح پر محمول کیا، ملہاری نے بھی۔

"آپ بھی اُستاد، اب جاؤ، ہماری وجہ سے اپنا وقت برباد مت کرو۔" ملہاری نے آزردگی سے کہا، "ہم ٹھیک ہیں بالکل۔"

"ہاں، اب ٹھیک ہی ہونے کا ٹائم آیا ہے، پر بڑا کام ابھی باقی ہے۔ پورا کر کے نہیں جائیں گے تو کاشا پڑا رہے گا۔"

"ابھی رہ گیا ہے کوئی کام!" ملہاری نے مضطربانہ سادگی سے پوچھا۔

اُسے جواب دینے کے بجائے بچھل نے شابے کو ہدایت کی کہ وہ ملہاری کے لیے مُنہ ہاتھ دھونے، لباس کی تبدیلی اور ہلکے قسم کے ناشتے وغیرہ کا بندوبست کرے۔ اُس نے چمپا اور چندا کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا اور خود بھی اُٹھ گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ڈیرے کا نگراں نہ ملہاری ہے اور نہ شابے کو کوئی اختیار حاصل ہے۔ بچھل نے اڈّے کی کمان سنبھال لی ہے۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اُس نے مڑ کے ملہاری کو مخاطب کیا، "پہلے ذرا دھیر میں آؤ مہاراج! پھر تسلی سے بچہ کریں گے۔" چند لمحے ٹھہر کے اُس نے ملہاری کو مشورہ دیا، "باہر آنے کو جی نہ کرے تو ابھی اِدھری آرام کرو۔"

ملہاری ہکّا بکّا اُس کے احکام سنتا رہا۔ بوڑھے نگراں کے سوا سبھی باہر چلے آئے۔ دھوپ تیز ہو گئی تھی۔ فرش پر اَب بھی کہیں کہیں دریاں بچھی ہوئی تھیں اور چارپائیوں پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ چمپا اور چندا اپنی پرانی جگہ پر آ کے جم گئیں۔ کچھ دیر لوگوں کے درمیان بیٹھ کے بچھل نے ملہاری کے بارے میں اُنھیں مطمئن کیا۔ پھر چمپا اور چندا کے پاس جا کے اُنھیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اوپر کی منزل کے جس کمرے میں ہم ٹھیرے ہوئے تھے، بچھل نے اُس طرف کا رُخ کیا تھا۔ اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور ایک کونے میں بیٹھا دری کے دھاگے اُدھیڑتا رہا۔ چمپا اور چندا کے ساتھ وہ جلد ہی نیچے آ گیا۔ مجھے بے چینی ہونے لگی تھی۔ یقیناً بچھل کی پھرتن دہی بے سبب نہیں ہوگی، لیکن مجھے کچھ سجھائی نہیں دیا۔

لوگ تتر بتر ہونے لگے تھے۔ اُن کی تعداد میں بھی کمی ہو گئی تھی کہ ملہاری کی طرف سے اَب اُنھیں ایسی فکر نہیں رہی تھی، دوپہر کے کھانے پر البتہ بہت سے لوگ شریک تھے۔ غالباً اُنھیں ملہاری کی موجودی کی توقع تھی، اِس لیے وہ وقت پر واپس آ گئے۔ ملہاری کو نہ دیکھ کے اُنھیں مایوسی ہوئی۔ معلوم نہیں، وہ اب تک کیوں باہر نہیں نکلا تھا۔ اُسے تو بڑی بے تابی ہو رہی تھی۔ ابھی خیر اِتنا وقت نہیں گزرا تھا، لیکن زیادہ دیر تک اُس کی پردہ پوشی سے لوگوں کو منضبط رکھنے کی دشواری پیش آ سکتی تھی۔ شابے اَب تک اُنھیں جھمکار رہا تھا۔ کھانے کے دوران بھی اُس نے زیرکی سے اُنھیں قابو میں رکھا، کسی قدر رازدارانہ انداز میں اُس نے لوگوں سے کہا کہ ملہاری تو بہت ضد کر رہا تھا، اُسے روک دیا گیا ہے۔ اچھا ہے، کچھ وقت یک سُوئی اور دل جمعی کا اُسے اور مل جائے۔ وہ ہشاش بشاش حالت میں ہم لوگوں کے درمیان آئے۔ وید کی بھی یہی ہدایت ہے، ملہاری نے ویسے بھی کبھی نہ کوئی چھٹی کی ہے، نہ آرام کیا ہے۔ کیا اُسے اِس خلوت کا حق نہیں ہے۔ کیا وہ لوہے کا بنا ہوا ہے؟

عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ دھوپ ابھی باقی تھی کہ مجھے ساتھ لے کے بچھل نے ملہاری کے کمرے کی طرف قدم بڑھائے۔ چمپا اور چندا بھی ہماری پیروی میں اندر جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں، بچھل نے اُنھیں منع کر دیا۔ اُس وقت کمرے میں کوئی اور نہیں تھا۔ نیم دراز ملہاری گاؤ تکیے سے کمر لگائے جانے کہاں کھویا ہوا تھا، ہماری آمد پر سیدھا ہو گیا۔ اُس نے لباس تبدیل کر لیا تھا، بال کڑھے ہوئے تھے۔ خاصا اُجلا ستھرا دکھائی دے رہا تھا۔ بچھل نے دروازے ہی سے صدا لگائی، "کیسے بدلے بدلے لگتے ہو مہاراج!"

ملہاری نے سر جھٹکا، آنکھیں بھینچ لیں اور ہاتھ جوڑ کے [illegible] لہجے میں بولا، "ہم کو مہاراج کیوں بولتے ہو اُستاد؟"

"مجھ لم بولتے ہیں کیا؟"

"جو پہلے بولتے تھے، وہی..." ملہاری نے کھِسیف کے کہا۔

"پٹی بھی تو تم ہی نے کھولی ہے۔"

"اَب جانے دو اُستاد!" وہ اُلجھ کے بولا۔

"کیسے، کیسے جانے دیں۔"

"بھول جاؤ سارا۔"

"تم نے بھلا دیا سارا؟" بچھل نے تنک کے کہا۔

"ہاں۔" ملہاری کی آواز ڈوب گئی۔ "ہم نے تو جتی کی تھی۔ تم ہی نے زور دیا تھا۔ ہم تو... ہم تو..."

"جانتے ہیں، تم نے بڑا مان رکھا اپنا۔ پر آگا پیچھا دیکھ کے ہی ہم نے تکلیف دی تھی۔ تم کو اچھا نہیں لگا تو ہم کو معاف دیو۔"

ملہاری چپ بیٹھا اپنے ہاتھ مسلتا رہا۔

"برا نہ مانو تو تھوڑی زبان کھولیں۔" کچھ توقف کے بعد بچھل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

ملہاری نے سَر گھما کے اُسے متجسس نظروں سے دیکھا۔

"اَب باہر کیسے جاؤ گے؟"

ملہاری کی پیشانی تنگ ہوگئی، گردن بھی اکڑ گئی۔

"اڈّے کا دادا، ٹھمر کی آنکھیں رکھتا ہے۔" بچھل نے نکیلی آواز میں کہا، "ہم بولتے ہیں، اَب تمھیں چلا پاؤ گے تم۔ بہت

مشغول کر یہ تم نے اپنے آپ سے اور ان حرام خوروں سے۔"

"کیا، کیا بولتے ہو تم۔" ملہاری کھڑا ہو گیا۔

"اب اپنے کو مکتی دیو بھیّا، بہت کاٹ لیا بن باس، یہ تو ڈگنے سے اوپر ہو گیا۔"

ملہاری کا ہیجان نمایاں تھا۔ اُس کی بھویں پھڑک رہی تھیں۔

"پڑی جگہ پر جاؤ مہاراج" بھٹل نے تندی سے کہا، "اپنا بھی گھاٹا کیا تم نے، دوسروں کا بھی۔"

ملہاری کو مشتعل ہونا چاہیے تھا۔ یہ سب کچھ میری توقع سے بھی بعید تھا۔ اُس کا چہرہ تمتمانے لگا، نتھنے پھول گئے، لیکن وہ خاموش رہا۔ بھٹل کا مدعا، اُس کی غرض سمجھے بغیر اس کارروائی پر برہمی مناسب نہیں تھی۔ مناسب نامناسب کا شعور ہوش مندی کی دلیل ہے۔ اس سے مراد ہے کہ آدمی بالکل پتھر نہیں بن گیا ہے۔

"یہ تو نہیں چاہیے تھا، جو سینت کے رکھا تم نے، وہ تو تمھارے تک رہا۔ ایسا نہیں ہوتا ملہاری بابو! اب کب تک اپنے آپ کو شانت رکھو؟ سینے پر ہاتھ رکھ کے ..." بھٹل نے اُس سے پوچھا۔

ملہاری سے کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ اس کے ہونٹ دھڑک رہے تھے۔

بھٹل نے اُس سے کہا کہ اگر اُس نے سماعت کا سلسلہ بند نہیں کر دیا ہے اور حوصلہ دراز کرنے پر قادر ہے تو کچھ کہا جائے۔ کب تک وہ کھنڈروں پر کھڑے گزرے ہوئے کا توحہ پڑھتا رہے گا؟ بیتا ہوا لوٹتا نہیں ہے۔ کھنڈر تو کھنڈر ہی رہتے ہیں، اور کھنڈر، اور کھنڈر... بے بسی، بے چارگی، خس و خاشاک، گرد و غبار، گریہ اور سکوت۔ کھنڈروں کے پاس اس کے سوا دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ سب ہٹائے بغیر زندگی نمو نہیں پاتی اور زندگی کی طلب نہیں ہے تو آدمی خود کو کھنڈروں کا جزو کیوں نہیں بنا دیتا۔ یہ جاں گزاری تو ہمہ وقت اُس کے اختیار میں ہے۔ یہ دوئی تو خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے کہ ایک طرف آدمی کھنڈروں کا تمنائی ہے، یا کھنڈروں سے آس لگائے ہوئے ہے، دوسری طرف زندگی کا خوگر ہے۔ بے شک جانے والوں کے نقش کبھی رگِ جاں میں پیوست ہو جاتے ہیں، مگر زندگی تو ٹھیرتی نہیں۔ کسی نے کسی کو وقت سے پہلے ختم کر دیا تو اُس قاتل، اُس جفا پیشہ نے کیا ختم کیے جانے والے شخص کی زندگی غصب کر لی، چھین لی؟

ملہاری کے ساتھ بہت ستم ہوا اور ہر چند اس میں ملہاری کا کوئی قصور، اُس کی کوئی کوتاہی نہیں تھی، لیکن کیا موقع پر ملہاری کی موجودی اُس کے متعلقین کے لیے بقائے دوام کی ضامن ہوتی؟ راستی کا یہی طور ہے کہ اُسے نوشتے کا المیہ جان کے بکھرا ہوا سمیٹنا چاہیے تھا۔ یہی آدمی کا امکان ہے، ہر آدمی کا ایک ظرف، ایک پیمانہ ہوتا ہے۔ اُس کا سینہ چھلنی ہوتا ہے۔ اُس کی آنکھیں جلتی ہیں، زخم رستے ہیں، دل روتا ہے، جسم میں آگ لگتی ہے اور روح مجروح ہوتی ہے۔ پھر اس کا مداوا کیا ہو کہ وہ اپنے آپ کو نوچنا کھسوٹنا شروع کر دے۔ جو بھی سامنے آئے، اُسے اپنی آگ میں لپیٹ لے، ساری دنیا کو آگ دکھا دے، یا وہ مرہم کی جستجو کرے۔ پانی کی، پھولوں کی جستجو بھی ... جواب میں ملہاری نے بھی بہت آگ لگائی تھی۔ بعد کو وقت نے اُس کا مذاق اُڑایا کہ اُس کا ہدف ہی ٹھیک نہیں تھا ... پہلے سے بڑا آزار، پہلے سے بڑا ستم تھا۔ پھر اُسے ... چاہیے تھا، یا کوئی خنجر سینے کے پار کر لینا چاہیے تھا۔ ... نہ ہو سکی تو اُس آسمان گزیدہ کو چپ لی بڑھانے کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ اُس نے کس جرم کی پاداش میں خود کو اس زندان کے سپرد کر دیا۔ اُس کی اگر کوئی خطا تھی تو اُس کے پاس اس سے آسان سزائیں بھی تھیں، اور وہ کب تک یہ زندان بھگتتا رہے گا۔ کیا اس طرح اُس کی سیری ہو گئی ہے، یا تلافی ہو گئی ہے اور اب اُس کا کوئی ادعا نہیں رہا ہے۔ اس زندان کا کوئی راستہ، کوئی اختتام بھی ہے؟

بھٹل بنگالی میں اُس سے مخاطب تھا۔ ملہاری بت بنا سنتا رہا۔ کئی بار مجھے ایسا لگا، جیسے بھٹل ملہاری سے نہیں، مجھ سے ہم کلام ہے، مگر میری بدظنی کا یہ کوئی محل نہیں تھا۔ یہ میرا اپنا نشیب تھا۔ بھٹل کا مخاطب تو وہ شخص بھی تھا جو وہاں موجود نہیں تھا اور وہ سبھی جو ڈونگے پر موجود تھے اور جو نہیں تھے۔

اُس نے نرم لہجے میں ملہاری سے کہا کہ ہم آج ہی اپنا سفر جاری رکھ سکتے تھے۔ ملہاری کے علم میں ہے کہ ہم نے ٹکٹ بھی منگوا لیے تھے۔ ٹھیرے ہوئے پانی میں کنکر پھینک کے

لطف ولذت اخذ کرنے کا وقت نہیں اب ہمارا، اور ہم نے زمانے بھر کا ٹھیکا نہیں لیا ہے۔ لیکن کچھ ایسا نظر آیا کہ یہ سکوت، سکون نہیں ہے۔ یہ تو سراب ہے۔ زیرِ آب تو بہت تلاطم ہے اور ہم یوں کھیل تماشا دیکھ کے آگے چلے گئے تو سانس گھٹتی رہے گی۔ بخشل نے کہا کہ رات اُس نے ملہاری سے اس لیے اصرار کیا تھا کہ کوئی روزن تو کھلے، ہمیں احساس ہے کہ یہ مداخلت بار خاطر ہو سکتی ہے، اور ہمیں اس دخل اندازی کا استحقاق بھی نہیں ہے۔ نہ ملہاری سے ہمارے تلخ و شیریں کا کوئی پس منظر ہے۔ اِدھر اپنے مسائل و معاملات بھی کچھ کم نہیں ہیں، مگر کوئی تناسب دگرگوں ہے تو قائم ہو جائے۔ تناسب ہی خیر ہے اور تناسب ہی زندگی ہے۔ ملہاری کی نظر میں بخشل کو کوئی اعتبار حاصل ہے تو اُسے بہ قدرِ امکاں حوصلہ کرنا چاہیے ورنہ ہم تو مسافر ہیں، صبح نہیں تو شام کو چلے جائیں گے۔

کمرے میں شابے کے اچانک وارد ہونے پر بخشل رُک گیا۔ ملہاری بت بنا بیٹھا رہا۔ بخشل نے شابے کو ہدایت کی کہ وہ کچھ دیر کے لیے ابھی باہر ٹھیرا رہے اور کسی کو ... آنے کی اجازت نہ دے۔ شابے کو کسی قدر تامل ہوا تھا۔ اُس نے ملہاری کی طرف دیکھا اور سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔

بخشل نے کٹورے سے پانی پیا اور آستین سے ہونٹ خشک کر کے کہا، "دونوں مستانیاں باہر تمھارے لیے دھونی رمائے بیٹھی ہیں۔ بولتی ہیں، وہ تو سارے میں بھٹکتی رہیں۔ سامنے دریا بہتا ہے۔ پر تو اُن کو دکھائی نہیں دیا۔ بولتی ہیں، اب وہ اور کدھری جائیں گی؟"

"کون، کون؟" ملہاری ہڑبڑا کے بولا۔

"وہی تمھاری چمپا اور چندا دیویاں۔ کوٹھے پر ضرور ٹھمکتی کرتی ہیں پر مٹکا بین، نین بازی اُن کو نہیں آتی۔ لگتا ہے، کوٹھے پر تو وہ ابھاگن وقت گزاری کو بیٹھتی ہیں۔ ہم کتنا بولیں، تم کو اُن سے ہم سے زیادہ جان کاری ہے۔ جانے کیا کیا بکتی ہیں۔ اب اُن کی کھوج ختم ہوئی، کنارہ مل گیا، اڑی ہوئی ہیں، دونوں واپس کوٹھے پر نہیں جائیں گی اور مہاراج کی سیوا میں، اُن کے چرنوں میں ساری عمر یا کاٹ دیں گی۔"

"کیوں؟ کیوں؟" ملہاری کی زبان اٹکنے لگی۔

"کچھ تم بھی اپنے من سے پوچھو۔ یہی تو ہم بولتے ہیں، اُن کو ساتھ لے کے یہاں سے جاؤ۔ اب بہت ہو گیا۔ بہت دریں سے آنکھ مچولی کر لی تم نے! ہم نے تمھارے ہاتھ میں چاقو نہیں دیکھا، سنا ہے، اچھی پکڑ ہے، پر ہم کو معلوم ہے اچھا نہیں لگتا ہوگا۔"

"لیکن یہ کیا، کیا..." ملہاری بوکھلا کے بولا۔

"تمھارے من سے اُلٹ تو نہیں بولتے۔ رات تم کو بھی دیکھا تھا، اُن کو بھی۔ تم نے اُن کو کبھی پاس آنے نہیں دیا، پر دور بھی کتنا رکھا۔ ذرا بستر جھانک کے دیکھو، بار بار اُٹھی کو کیوں ہلاتے ہو؟"

"وہ تو اس لیے... اس لیے کہ وہ دوسروں سے لپٹا جاتی ہیں۔" ملہاری نے خفقانی انداز میں وضاحت کی، "اُن کو گھن ہے اُستاد، اس لیے..."

"تال میل کی بات بھی تو ہے ملہاری بابو۔ دونوں مورتیاں ... بولتے ہیں ایک کو اُٹھاؤ، دوسرے کو بٹھاؤ، جی نہیں لگتا ... بخشل نے بیڑی سلگائی اور کش لے کے بولا: "اپنی ... جاؤ۔ ہم نے رات تم کو غلط نہیں بولا تھا۔ یہ ڈھن تو ... کے لیے ہوتا ہے، پوٹلیا میں باندھ کے رکھنے کا نہیں۔ ایک ... سے باہر نکل کے دیکھو۔ اڈے کی چوکی تو سسری بڑی ہرجائی ہوتی ہے۔ دیکھا! اُدھری آنکھوں پر بٹھائیں گے جن کو۔ باہر بھی بُرا نہیں ہے، اور اچھا نہ لگے تو لوٹنے کا راستہ بند نہیں ہو جائے گا، چاقو جیب ہی میں دھرے رکھنا۔"

ملہاری کا جسم پھڑک رہا تھا۔ اُس کی اُنگلیاں کانپ رہی تھیں۔

بخشل نے جانے کیوں یہ صراحت ضروری سمجھی کہ اُسے اڈے پاڑے سے کوئی دل چسپی نہیں ہے، نہ ملہاری کے اڈے پہ اپنی پسند کے آدمی کو لانے کی۔ اڈا گیری کے لیے اُسے سیدھا راستہ معلوم ہے کہ وہ ہمیشہ چاقو پاس رکھتا ہے۔ اُسے ملہاری سے واسطہ ہے۔ پچاس برس کی عمر میں بھی ملہاری کسی زور آور، شہ زور سے کم نہیں۔ ابھی ایک زندگی سامنے پڑی ہے اور کسی سرد و گرم چشیدہ کے بہ قول، عمر تو ارادے سے مشروط ہوتی ہے۔ ارادہ تو دیوانگی کی عمر میں بھی مجہول ہو سکتا ہے۔

دونوں لڑکیاں جنگلی، شردھ، اشتیاق اور آرزو سے لب ریز ہیں۔ کچھ حاصل کرنے اور کسی منزل پر پہنچنے کی تمنا میں وہ سب کچھ ترک کر دینے، کچھ کر گزرنے کے درپے ہیں۔ دھوپ میں ابھی اُن کے رخساروں کا رنگ اُور دمکتا ہے۔ ابھی اُن کی قامتیں کمان کی طرح کھنچی ہوئی ہیں اور اُن پر ہر لباس زیبا ہوتا ہے۔ اُن کے ہونٹوں کا شہد خشک نہیں ہوا اور آنکھوں کا مقناطیس ماند نہیں پڑا ہے۔ اُن کی سانسوں سے خوش بُو جدا نہیں ہوئی۔ ابھی اُن کی خود آرائی، خود پیرائی کے دن ہیں۔ خال خال ہی بالاخانے والیاں، نرت اور بھاؤ کا ایسا شعور رکھتی ہیں۔ انھیں حرص و ہوس ہوتی تو دست رس سے دل فروز اور دل خواہ چیزیں اتنی دور نہیں رہتیں۔ دُکان تو وہ پہلے ہی سجائے ہوئے ہیں۔

جھمل نے بیڑی بجھانے کے لیے وقفہ کیا۔ میرا جی چاہا کہ میں بھی ملہاری سے کچھ کہوں، اُسے باور کراؤں کہ یہ وہی متاعِ ہنر ہے جسے صحرا نشیں، خاک بسر ملہاری نے تمام اندھیروں کے باوجود سینے میں روشن رکھا ہے۔ ملہاری کو اپنی خوش بختی پر ناز کرنا چاہیے کہ جہت تمام، ورخرابیِ بسیار کے بعد ایسے طرح دار، ناز بردار اُس کے طلب گار ہیں۔ بے شک وہ اُس کی ریاضت کا نہایت شیریں ثمر ہیں اور گزرے ہوئے دنوں کے قہر و جبر کا بہ ترین مداوا ہیں۔ ایسے ہم نوا، ہم نفس، دل ساز و دل آرام چارہ گر کسے میسر آتے ہیں۔ یہ سب کچھ تو کسی گم گشتہ خواب کی تعبیر کے مانند ہے۔ اِس میں کچھ مبالغہ نہیں۔ ملہاری ذرا تصور کرے، ایک ایسا گھر جہاں در و دیوار نغمہ بار رہتے ہوں، جہاں مکینوں کو بس ایک دُھن، ایک ہی لگن ہو کہ کسی طور وہ کوئی جادو، کوئی ایسا کرن، ایسی نت کر دکھائیں کہ مثال بنے۔ ملہاری کے لیے اِس سے دل خوش کن ساعتیں کیا ہوں گی کہ ہر وقت چمپا اور چندا، ایسے خوش اندام، خوش کلام رفیق اُس پر سایہ کیے ہوں۔ راگ الاپتے، بدن لہکاتے سراپا، آنکھوں میں چراغ جلائے، پھولوں کے تشت بازوؤں پر اُٹھائے، ہمہ دم اقرار، ہمہ جاں بندگی! اُدھر دروازے کے پار مشتاقانِ دید، پیاس گزاروں کا ہجوم، سائل بن شوق۔ یہ مرتبہ تو دیوتاؤں کو سزاوار ہوتا ہے۔ اور یہ جو فن کی بات ہے، اِس کی کہانی تو کہیں ختم نہیں ہوتی۔ جتنے فنون ہیں، اُنھیں کسی مہم کی طرح سر کرنا پڑتا ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں زیر ہو جاتی ہیں، سمندر کی گہرائیاں رسا ہو جاتی ہیں۔ یہ شیشہ و ریشم کی طرح نازک، احساس و وجدان، کیف و خیال والے فنون کا سفر تمام نہیں ہوتا۔ جتنے قریب جاؤ، کنارے اُور پھیل جاتے ہیں، پاتال اور گہری ہو جاتی ہے، چوٹیاں اور بلند ہو جاتی ہیں۔ شمشیر زن، شہسوار، غوطہ خور اور کوہ پیما مہم سے کام یاب و ناکام واپس آ جاتے ہیں، لیکن یہ جمالیاتی کار، خیال پرور، یہ صورت گر اہلِ فن تو اِن کے لیے سراب کی طرح ہے، تعاقب ہے کہ جاری رہتا ہے، سو ہر دم ایک اشتیاق، ایک اضطراب، ایک آزمائش۔ ایک جیسے لوگ، ایک جیسی نسبتیں، ایک ہی عزم، چمپا اور چندا کی ہم رکابی میں ملہاری کے سفر کی منزلیں کتنی آسان، منزلوں کا تعاقب کیا رواں دواں ہو سکتا ہے۔

جھمل نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ کہنے لگا، رات ہی اُس نے طے کر لیا تھا کہ ملہاری کو اڈّے سے چلے جانے کا مشورہ دے گا۔ چمپا اور چندا تو بعد کو سامنے آئیں اور ملہاری کے اڈّے سے نکل جانے کا امکان تو اُن کے سان و گمان میں نہیں تھا۔ وہ تو یہیں کسی کونے، کسی کوٹھری میں رہنے کو مُصر تھیں اور کہتی تھیں کہ وہ تو مہاراج سے کچھ حاصل کرنا، اُن کی خدمت کرنا چاہتی ہیں۔ وہ مہاراج پر بوجھ نہیں بنیں گی۔ اُن کے پاس ابھی اتنا کچھ ہے کہ عزت سے دو وقت گزر بسر کر سکیں۔ مہاراج کا گیان ہو جانے کے بعد اُنھوں نے بالاخانے سے مستقلاً نجات کا فیصلہ کیا ہے۔ جھمل نے ملہاری سے کہا، گو اتنا آسان نہیں، لیکن ملہاری کے اختیار میں ہے کہ وہ اُنھیں دھکے دے کے، اڈّے کے آدمیوں سے کہہ کے یہاں سے نکال دے۔ وہ کیا کر سکتی ہیں! اُن کی وحشت دیکھ کے ایک خوش گوار تھا کہ جھمل کے ذہن میں تجویز یہ ہوا کہ اُن کے ساتھ ملہاری اپنی ذات کی تکمیل کر سکتا ہے۔ پھر وہ اتنا بکھرا بکھرا نہیں رہے گا۔ جھمل نے اُن دونوں کو اچھی طرح کھکھوڑا اور ٹٹولا ہے کہ وہ ارادے کی کتنی پختہ اور شوق کی کتنی صادق ہیں۔

جھمل نے کم و بیش وہی کچھ دُہرایا جو میں نہیں کہہ سکا تھا۔ اُس نے ملہاری سے پوچھا، اور اِدھر کیا حال ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ چندا اور چمپا کا نظارہ ملہاری کی بینائی کے لیے ٹھنڈک کا سبب بنتا ہے، اور کیا یہ درست ہے کہ اُن کے اوجھل ہو جانے کے بعد ملہاری کی آنکھیں اُن سے بیگانہ ہو جاتی ہیں؟ پھر کون سی دیوار حارج ہے؟ پھر کیا اُسے اڈّے کی فکر دامن گیر ہے، یا اڈّے کے ساتھیوں کی کہ اُن میں سے بہت سوں کی رفاقت میں اُس نے نصف سے زیادہ عمر گزاری ہے، مگر ملہاری کی ترجیحات میں کبھی اڈّا گیری نہیں رہی ہے۔ وہ اتنی مدت اڈّے پر رہتے ہوئے اڈّے پر رہا بھی کہاں ہے۔ اُس نے اڈّے کا حق ہی کتنا ادا کیا ہے۔ اُسے تو اپنا اثاثہ اِس قدر عزیز تھا کہ دونوں وقت خلوت کی جستجو کرتا تھا۔ اُسے تو مشق و سخن کی فکر لگی رہتی تھی۔ کسی دن اُس نے ناغہ نہیں کیا، کسی موسم میں۔۔۔ بل کہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اڈّے کی آڑ میں اپنا ورثہ پرورش کرتا، اپنا سرمایہ بڑھاتا رہا ہے۔ اب اتنا کچھ سمیٹ لینے اور بڑی حد تک مطمئن ہو جانے کے بعد اڈّے پر [illegible] قرار رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اُسے اب سائلوں میں یہ دولت تقسیم کرنی چاہیے۔ یہی اُس کے آبا کا وتیرہ رہا ہے، اور [illegible] رات جھمل نے کہا تھا، ملہاری خاطر جمع رکھے، اُس [illegible] میں اِس داد و دہش کے بعد کوئی فرق نہیں آئے گا۔ [illegible] ہیں، بہت سے لوگوں کو اپنی ترجیحات کی پوری آگہی ہوتی ہے، مگر عمل نہیں کر پاتے، کچھ اپنی کوتاہی، کچھ بیرونی دباؤ کے سبب سے۔ آدمی ترجیحات طے کر لیا کرے تو بہت سے دُکھ آدھے رہ جائیں، اور ترجیحات طے کرنے سے مراد اُن پر عمل کی تقدیم بھی ہے۔ اب آگے کسی عمل میں ملہاری کے لیے پورے سکھ، یا تلافیوں کی کوئی صورت ممکن ہے تو پیش قدمی میں کیا امر مانع ہے۔ اڈّے پر جمے رہنے کے اصرار کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ ملہاری کی ترجیحات بدل گئی ہیں۔ باہر اُسے خیر کی اُمید نہیں۔ انسانوں پر سے اُس کا اعتبار اُٹھ چکا ہے، یا وہ سب کچھ اپنی ذات میں مقید رکھنا چاہتا ہے۔ کسی کو شریک کرنا، کسی کو کچھ دینا نہیں چاہتا۔ وہ اذیت پسند ہو چکا ہے، یا اُسے اڈّے پر ملنے والے آدھے سکھ کے چھن جانے کا اندیشہ ہے۔ اُسے اپنے چلے جانے کے بعد اڈّے کا شیرازہ منتشر ہو جانے کا کوئی گمان ہے تو وہ یہ خام خیالی ذہن سے نکال دے، اور فرض کرے، اگر ابھی جھمل چاقو کھول کے اڈّے کی دھونے داری کے لیے کھڑا ہو جائے! کوئی چاقو بردار اب تک ملہاری کے سامنے یوں صف آرا نہیں ہوا کہ ملہاری سا بے غرض آدمی اُنھیں اور کہاں مل سکتا تھا۔ یہ بے نیازی، نیک نفسی دوسروں میں مروّت کے احساس بیدار کرتی ہے۔ ملہاری اُن کے لیے کبھی کوئی مسئلہ ہی نہیں بنا۔ ممکن ہے، اُنھیں اُس پر ترس آتا ہو اور وہ اُسے اُس کی تشنہ کامیوں کی رعایت دیتے رہے ہوں، اُنھیں خدشہ ہو کہ چھیڑو تو میں زیردستی سے ملہاری جاں بر نہ رہ سکے گا، یا بالکل جنگلی ہو جائے گا، زخمی درندے کی طرح۔

جھمل نے بھری آواز میں کہا، سارے طولِ کلام اور تاویل و تکرار کا خلاصہ یہ ہے کہ ملہاری جیسے خلاق اور ہنرمند کا انجام اڈّے کی چوکی نہیں ہونا چاہیے۔ باہر نکلنے کے بعد ہی ملہاری کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون سی جگہ، کون سی مسند اُس کے لیے موزوں ہے، اُس کی صدا کے والہانہ کتنے لوگ اُس کی جانب کھنچتی ہے۔ شیدائیت، محبوبیت کا یہ لطف اُس نے کہاں چکھا ہے۔

ملہاری کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی تھی۔ جھمل کے چپ ہو جانے پر گہری خاموشی ہو گئی۔ چند لمحوں بعد جھمل نے مجھے اُٹھنے کا اشارہ کیا اور ملہاری سے کہا کہ اُسے کچھ اور نہیں کہنا۔ ملہاری کے چہرے، دست و بازو کے اضطراب سے اُس کی

سرگشتگی ظاہر تھی۔ مجھل کے اُٹھ جانے پر جیسے اُسے ہوش آیا اور وہ گڑبڑا کے بولا، "بیٹھو، بھی بیٹھو اُستاد، کچھ دیر کے لیے۔"

"اپنے پاس بولنے کو اب کچھ بھی نہیں ہے۔ اپنا کام ختم ہوا۔" مجھل کے لہجے سے بے اعتنائی جھلک رہی تھی۔

"تم جو بولتے ہو یہ اِتنا... اِتنا، یہ کس طرح، کس طرح..." ملہاری کی زبان اُس کے ذہن کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔

"سمجھتے ہیں" مجھل نے ہاتھ اُٹھا کر ہنکار بھری۔ "پر باقی کام تمھارا نہیں ہے۔"

مجھل نے کہا کہ ملہاری کا کام محض اڈے کی استواری ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اِتنے عرصے سے اڈے پر بیٹھ کے اُسے اِس آرائش کی ضرورت ہی نہیں پڑی ہے۔ لیکن یہی کچھ تو اُسے تلقین کیا جا رہا ہے کہ وہ خود ایک امیر و کبیر شخص ہے۔ دولت صرف سونے چاندی، زر و جواہر کی نہیں ہوتی۔ بہت سی دولتیں تو آدمی کے اندر ہوتی ہیں، حسنِ تدبیر، خوبیِ فکر، تن درستی، محنت اور علم و ہنر کی دولتیں۔ سکّے اِنھی کا بدل ہوتے ہیں۔ ملہاری نے عزلت گزینی میں جو کچھ جمع کیا ہے، وہی اُس کا سرمایہ ہے۔ اُس نے یہ ہنڈی ابھی بھنائی کب ہے۔ اِس کی مالیت سکّوں میں اِس قدر نہیں، دیگر شکلوں میں بیش از بیش ہے۔ عقیدت اور احترام کا بھی تو کوئی مول ہوتا ہے۔ سونے چاندی، محل دو محلے کی دولت تبھی نظر نواز ہوتی ہے جب اپنے بَل پر حاصل کی جائے۔ یہ ترکے کی دولت تو سڑک پر پڑی ہوئی زمرّد و یاقوت کی ڈھیری کے مانند ہے جو کسی کے ہاتھ لگ جائے۔ یہ تو طلب کی ہوئی اور نہ طلب کی ہوئی خیرات کے مانند ہے اور اہلِ و نا اہل فرزندوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اہل فرزندوں کو اِس کی طلب نہیں ہونی چاہیے۔ عالم باپ کے علم و فضل کا ترکہ بیٹے کو کیوں منتقل نہیں ہوتا۔ اپنے باپ کے نقشِ قدم کے اتباع ہی سے بڑھئی کا بیٹا بڑھئی ہوتا ہے۔ ترکہ صرف سونے چاندی، ساز و سامان اور سکّوں ہی کا کیوں ہوتا ہے، چھوٹنے والی چیزوں کا۔ ملہاری نے کبھی اِس دولت کی آرزو ہی نہیں کی ہے، ورنہ کوئی کمی نہ ہوتی۔

ملہاری کا تردّد بے جا نہیں تھا۔ تین دہائیوں کی تنہائی کاٹنے کے بعد اُسے بستیوں اور گھروں کی سمت سے خوف آنا چاہیے تھا۔ مجھل کو اِسی لیے اِتنا وقت صرف کرنا پڑا۔

سورج چھپ چکا تھا۔ اڈے کے بہت سے لوگ اُس وقت بھی موجود تھے۔ شابے وقفے وقفے سے اُنھیں مطمئن کرتا رہا تھا، لیکن لوگوں کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ صبح سے شام ہو گئی تھی۔ ملہاری باہر نہیں نکلا تھا۔ مغرب کے بعد جب اندھیرا مسلط ہو چکا تھا، ملہاری آہستہ قدموں کمرے سے باہر آیا۔ اُسے دیکھ کے سبھی نے نعرے بلند کیے اور دیوانہ وار اُس کی پذیرائی کی۔ راستے میں ملہاری کی نظر تھم سے لپک نکالے، ہاتھ باندھے کھڑی ہوئی چمپا اور چندا پر گئی۔ وہ ایک لحظے کے لیے ٹھٹکا تھا، پھر سر جھکائے بڑھتا ہوا چوکی تک آ گیا۔ مجھل نے چوکی سے اُٹھ کے اُسے جگہ دی۔ ملہاری ناتواں سا دکھائی دے رہا تھا۔ گم سُم چوکی کے وسط میں بیٹھ گیا۔ چائے تیار تھی۔ شابے نے اعلان کیا کہ اُس نے رات کے کھانے کا انتظام کیا ہوا ہے، سب یہیں کھانا کھائیں گے۔ چائے کے بعد لوگ اپنی اپنی جگہ نسبتاً سکون سے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ مجھل چوکی پر کھڑا ہوا اور اُس نے دھیمی آواز میں کہا کہ کچھ دیر کے لیے خاموشی ہو جائے تو وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لوگوں کو اِس طرزِ تخاطب پر حیرانی ہوئی اور بے [illegible] سرگوشیوں کی بھِن بھِناہٹ کے بعد آخر سکوت ہو گیا تب مجھل نے اُن سے کہا کہ وہ اڈے کے لیے جلد سے جلد نئے دادا کا انتخاب کر لیں۔

سبھی اُلٹ پلٹ سے گئے۔ سبھوں پر جیسے بجلی ٹوٹ پڑے ہوں۔ وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ مجھل نے کہا، "اچھا ہو گا کہ ملہاری اُستاد کے سامنے ہی کوئی آگے آ کے چوکی سنبھال لے۔"

لوگوں کو مجھل کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا، یا اُنھوں نے اِسے مذاق پر محمول کیا۔ پہلے سناٹا سا طاری ہوا پھر بھانت بھانت کی آوازوں کا شور گونجنے لگا۔ اُن کی نگاہیں کبھی مجھل پر منڈلاتی تھیں، کبھی ملہاری پر۔ سرنگوں ملہاری ساکت بیٹھا رہا۔ شابے نے پہل کی اور اپنے لہجے کی برہمی دور نہ کر سکا۔ "کیا؟ کیا بولتے ہو اُستاد؟" مجھل نے پھر ہاتھ بلند کر کے اُنھیں متحمل اور منضبط رہنے کی تاکید کی۔ "ملہاری اُستاد اِدھر ہی سے جا رہا ہے۔" مجھل نے گونجتی ہوئی آواز میں کہا، "اُس کو یہ کام بہت پہلے کرنے کا تھا، پر ٹھیک ہے، سمجھو، ٹائم نہیں آیا تھا۔"

"لیکن کیا۔ کیا ہو گیا اُستاد؟" شابے چیخ کر بولا۔

"تھوڑا نیچے سُر میں آ کے بول۔" مجھل نے ناراضی سے کہا، "رات سارے دیکھ کے بھی بولتا ہے، کیا ہو گیا!"

"پر اُستاد، ایسا کیا، ایسے کیا ؟" شابے سر جھٹک کے بولا، "وہ تو ٹھیک ہے، اپنے کو اِتنا نہیں معلوم تھا، پر یہ کیا ؟" شابے کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ مجھل نے اُسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا، "اب تو جیب لیا ہے آنکھ کے پردے! اور اب بھی پلّے نہیں پڑا تو اپنی بات ذرا دھیان سے سن! اور تم بھی..." مجھل نے ترشی سے کہا۔

لگتا تھا، ہر ایک کے لیے یہ خبر کسی حادثے سے کم نہیں، حیرانی، کبیدگی، پراگندگی، ہر ایک انتشار سے دوچار نظر آیا۔ مجھل نے بھی اُنھیں اِس ہیجان کی مہلت دی اور لمحوں تک کھڑا رہا۔ سب کی مضطرب نظریں اُسے ہدف بنائے ہوئے تھیں۔ جلد ہی اُنھیں احساس ہوا کہ ابھی مجھل کی وضاحت باقی ہے اور یہ اُسی طور ممکن ہے کہ وہ اُسے تاویل و تشریح کا موقع دیں، چناں چہ ہر طرف سنسناتی خاموشی چھا گئی۔

مجھل نے لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھی، سپاٹ لہجے میں کہا، "ایک باری ہی کان کھول کے سن لو، اپنے کو دُہرانا نہیں آتا۔" اِسے آموختہ کہنا چاہیے۔ مجھل نے سیدھے سادے لفظوں میں وہی کچھ کہا جو بہ جبر ملہاری کے سینہ نشیں کر چکا تھا۔ اُس نے چمپا اور چندا کا ذکر نہیں کیا اور کہا کہ اڈے کے لوگوں کو ملہاری سے کوئی ربطِ خاطر ہے تو کسی چون و چرا کے بغیر اُسے تمام تر عزت سے وداع کریں۔

سب دم بخود سنتے رہے۔ مجھل کا بیان نہ اِتنا مختصر تھا، نہ ایسا مبہم، لیکن ناگہانی کا نقش دیر سے مرتسم ہوتا ہے۔ مجھل کے چپ ہو جانے کے بعد جیسے اُس کی بازگشت جاری رہی۔ تعجب، یقین، بے یقینی کی کیفیت اور غالباً ملہاری کے بعد آنے والے دنوں کے ابہام نے اُنھیں گھیرے رکھا۔ ملہاری اُن کی عادت بن چکا تھا اور اُس کے سوا شاید اُنھوں نے کبھی اڈے کی چوکی کا تصوّر نہیں کیا تھا۔ مجھل نے اُن سے یہاں تک کہا تھا کہ ایک نہ ایک دن تو ملہاری کو اُن سے جدا ہو جانا ہی ہے۔ ملہاری تو اب اپنی بچھڑی ہوئی منزل کی طرف جا رہا ہے۔ وہ تو اپنے پیروں پر قائم، اُمید اور عزم سے معمور ملہاری کو رخصت کر رہے ہیں، یہ کوئی سانحہ نہیں۔ اِس پر تو سب کو مسرت کا اظہار کرنا چاہیے۔

مجھل نے اچھی طرح جتا دیا تھا کہ کسی بحث و تمحیص کی گنجائش نہیں ہے، اب وہ ملہاری کا باب تمام سمجھیں اور آئندہ کی فکر کریں۔ کچھ دیر کی کش مکش کے بعد بائیں جانب کے ایک گوشے میں بے چینی دکھائی دی۔ لوگوں نے ٹہوکے دے کے ایک ادھیڑ تنومند شخص کو اُٹھا دیا۔ اُس نے جھجکتے ہوئے کہا کہ ملہاری کو کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ یہیں اڈے پر رہے۔ اُس کے مشاغل میں ہم پہلے ہی بہت کم حارج رہے ہیں، آئندہ اور احتیاط کی جائے گی۔ وہ یہیں راگ دربار جمائے۔ اِس طرح نہ ملہاری اُن سے دور رہے گا، نہ وہ اُس سے۔ ہم اِسے یقین دلاتے ہیں کہ ملہاری کی مرضی بہرحال مقدّم ہو گی۔ وہ نہیں چاہے گا تو اُسے اڈے کے معاملات میں نہیں اُلجھایا جائے گا، اور یوں جتنا ہو سکا، وہ سب اُس کی خدمت ہی کریں گے۔

مجھل نے اُسے بات پوری کرنے نہیں دی، "بیٹھا رہ! ہونچا سنتا ہے کیا؟" مجھل نے اُسے جھڑک دیا، "کیسا بولتا ہے رے... یہ اڈّا ہے، اِدھری ایک طرف راگ دربار جمے گا، دوسری طرف چاقو، بم، پٹّے، دارو، سر پھٹول کا دھندا چلے گا؟"

اُس شخص نے جرأت کی اور کہا کہ ایسا ہے تو عمارت کا نصف حصہ الگ کر کے بالکلیہ ملہاری کے تصرّف میں دے دیا جائے۔ یہ کم پڑے تو پوری عمارت اُس کے لیے وقف کی جا سکتی ہے۔ پڑوس میں کہیں اڈے کی نئی جگہ بنائی جا سکتی ہے۔ ملہاری ہماری نظروں کے سامنے رہے گا اور اِس کی موجودگی سب کے لیے تقویت کا باعث ہو گی۔

"ہاں، رکھو ملہاری اُستاد کو چوتھے پپ۔" مجھل ترخ کے بولا، "اِدھری باندھ کے ہی رکھنا، عمر پٹا لکھوایا ہے اِس نے؟ بس، آگے کچھ نہیں۔" مجھل نے درشتی لہجے میں کہا کہ

سب رنگ

وہ پہلے ہی اُن سے کہہ چکا تھا کہ اُنھیں فیصلہ سنایا جا رہا ہے۔ اُن سے مشورت نہیں کی جا رہی، اتنی صراحت بھی دیرینہ رفاقت کی پاس داری میں کی جا رہی ہے۔ ملہاری کو کوئی بھی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ بھَل نے یہ کہہ کے سارا قصہ ہی ختم کرنا چاہا کہ بہتر ہے، اب اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی جائے۔ اپنی سہولت دیکھ کے ملہاری کل، یا پرسوں کسی وقت یہاں سے چلا جائے گا۔

"نہیں استادا!" پیچھے کی طرف بیٹھے ہوئے ایک نوجوان شخص نے تلخی سے کہا، "تمھاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے، پر ہم کو ملہاری اُستاد سے سننا ہے۔"

اتنی دیر میں پہلی بار ملہاری نے بے تابانہ سر اُٹھایا۔ اُدھر شابے نے نوجوان کو بٹھانے کے لیے بہت ہاتھ چلائے۔ ایک تامّل کے سبب بھَل کی پیشانی شکنوں سے آلودہ ہوئی تھی، تاہم اُس کی آواز تھمی ہوئی تھی۔ اُس نے نوجوان سے کہا، "ادھری ملہاری اور شابے اُستاد کے بلاوے پر آ[illegible] تجھ کو تھوڑی [illegible] ہے۔"

"پر ہم کوئی غلط تو نہیں بولتے۔ ملہاری اُستاد ایسا چپ کیوں بیٹھا ہوا ہے۔" نوجوان کے لہجے میں گرمی بھی تھی۔ تب ہی اس سے پہلے کہ بھَل کوئی جواب دیتا، "ہا، ہا، ہشت، ہشت!" ملہاری نے جنونی انداز میں نوجوان کو خاموش رہنے اور بیٹھ جانے کے اشارے کیے۔ شابے یک دم چوکی سے کود کے لوگوں کو پھلانگتا ہوا نوجوان کے سر پہ پہنچ گیا اور اُس کے بازو پکڑ کے بُری طرح دھتکارنے لگا۔ نوجوان پہلے بے قابو ہوا تھا، لیکن شابے اور آس پاس کے لوگوں کی مداخلت پر سرد پڑ گیا۔

چوکی پر واپس آ کر شابے ہاتھ جوڑ کے بھَل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جواب میں بھَل نے آنکھیں میچ لیں۔ ملہاری بھی پشیمانی کے اظہار میں کھسک کے بھَل کے اور قریب آ گیا۔

اچھا ہوا جو بات جلدی رفع دفع ہو گئی، ورنہ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کتنی آگے جاتی۔

بھَل چوکی پہ کھڑا رہا۔ پھر کسی جانب سے کوئی آواز نہیں اُٹھی۔ لوگوں کے چہرے تمتما رہے تھے، اُن کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ لگتا تھا، ہر شخص آنے والے لمحے کا بے کلی سے منتظر، یا آنے والے لمحے سے مطمئن نہیں ہے۔

"چوکی کا اب اپنے ہی تو، لگ جا تو۔" کچھ توقف کے بعد یکا یک بھَل نے سرد آواز میں کہا، "ملہاری اُستاد نے اِسی ٹائم سے چوکی چھوڑ دی ہے۔ کسی کے گلے میں اٹک ہے تو چاقو نکال کے آگے آ جائے۔"

[illegible] بیٹھے بیٹھے اُچھل پڑا۔ بھَل کے قریب ہاتھ باندھے [illegible] شابے [illegible] کر کھڑا ہو گیا۔ چوکی پر موجود، آمنے سامنے اور [illegible] بیٹھے ہوئے لوگوں کے لیے یہ ایک دوسری اُفتاد تھی۔ [illegible] اذیک کر دینے کی جرأت سے وہ سنبھل نہ پائے تھے [illegible] طرف سے اس سنادی اور حکم نامے نے اُنھیں اور بے اوسان کیا۔ سبھی کی نگاہیں ملہاری اور شابے سے سوال کناں تھیں، مگر خود اُن دونوں کا حال مختلف نہیں تھا۔

"ایک اُستاد کے جانے پر دوسرا آ جاتا ہے۔" بھَل نے پتھریلی آواز میں کہا، "دوسرا دو تو نکل آتا ہے، یا سب کی مرضی سے۔ ہمارے لیے تمھاری مرضی نہ ہو تو نکل کر کے دیکھ لو، ایک دو، چار پانچ، جتنے بھی ہوں۔" ۞

قارئین سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ
ایک دل سوختہ اور دل باختہ نوجوان کا سفر نامۂ زندگی
انگوروں کے خوشوں، آنسوؤں اور آہوں کی داستان
پانچویں درویش کا بیان
باقی واقعات آئندہ شمارے میں
سب رنگ

بتہ وہ ویسے یہ نہیں مانے گا۔ سالا بالکل پاگل ہوگیا ہے۔"
مچھل کے اشارے پر لوگ دُور دُور ہونے لگے۔ اس اثنا میں ملہاری بھی چوکی سے اُتر گیا۔ وہ راموکے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ راموں نے بھی اُسے اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ لیا تھا۔ وہ اور بپھر گیا اور چیخنا کے بولا۔ "ہٹ جاؤ ملہاری اُستاد! بہت ہوگیا۔ تم اب اڈّے کے اُستاد نہیں ہو۔ اڈّے کا تاج اب تمہارے اس گیدھ کی اولاد دُستاد مچھل کے سر پہ ہے۔ تم اندر جا کے تماشا دیکھو۔ تا کے دھنا دھن کروں۔"
لوگوں نے پیچھے ہٹتے ہٹتے دائرہ بنا دیا تھا۔ رامو اچھلتا کودتا ہوا دائرے میں آ گیا۔ مچھل پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اُس نے ابھی تک چاقو نہیں نکالا تھا۔ راموں اُسے للکار رہا تھا۔ ملہاری نے بھی دائرہ پھلانگ لیا اور مچھل کے سامنے دیوار بن کے کھڑا ہوگیا۔ "بس بس اُستاد! اس کو جانے دو... یہ نادان ہے۔"
"پھر اس کو چوکی پہ بٹھا دیں؟" مچھل نے تنک کے کہا۔ "تمہاری مرضی ہو تو...!"
مچھل نے یقیناً ملہاری کو اشارہ کیا تھا کہ وہ سر ہلاتا اور بڑبڑاتا ہوا دائرے سے باہر چلا گیا۔
دونوں آمنے سامنے کھڑے ہوگئے۔ مچھل نے جیب سے چاقو نکال کے آہستگی سے کھولا۔ "ہاں رے! شروع کریں؟" اُس نے دھیمے لہجے میں راموسے پوچھا۔ جواب دینے کے بجائے راموں نے اُچھل کے مچھل کو چاقو سے جھکی دی۔ میں بھی اُن دونوں کے قریب ہوگیا تھا اور میں نے اپنا چاقو جیب سے نکال کے ہاتھ میں دبا رکھا تھا۔
راموں میں خوب پھرتی تھی اور اُس وقت تو بہ طورِ خاص، اُس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی۔ آنکھیں شعلہ بنی ہوئی تھیں۔ جس طرح آنکھوں سے مراد بینائی نہیں ہے، بینائی سے مراد بھی بینا ہونا نہیں ہے۔ اتنے لوگوں کے سمجھانے، روکنے پر راموکو کچھ تو غور کرنا چاہیے تھا، مگر وہ تو بالکل وحشی ہو چکا تھا۔ مجھے ایک ہی فکر تھی کہ وہ اپنے اندھے پن میں کوئی بھی اوچھی حرکت کر سکتا ہے۔
مچھل کو بس دیر لگانی نہیں چاہیے تھی۔ اُس نے پیچھے ہٹ کے راموکو حملہ کرنے کی دعوت دی اور پیچھے ہٹتے ہٹتے اُس نے کسی قدر تردّد کا اظہار کیا اور اُس کا چاقو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے زمین پر گر گیا۔ راموکے لیے اِس سے سنہرا موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔ مچھل نے بہ ظاہر اضطراب کے عالم میں زمین سے چاقو اُٹھانا چاہا تھا کہ رامو بے تحاشا اُس کی طرف جھپٹا۔ اُسے کچھ خیال نہیں تھا کہ مچھل تو شست باندھے ہوئے ہے۔ اُس نے دانستہ چاقو گرایا ہے اور چاقو اُٹھانے میں سُستی بھی دانستہ ہے۔ چاقو اُٹھانے کے لیے جھکنا ایک فریب تھا۔ مچھل کا ارادہ ہی کچھ اور تھا۔ اُدھر سے رامو بڑھا، مچھل کی نظریں اُدھر اُس کی بائیں ٹانگ سے بندھی ہوئی تھیں۔ دونوں کے درمیان گز بھر سے کم فاصلہ رہ گیا ہوگا کہ مچھل نے جھٹ دایاں ہاتھ بڑھایا اور پنجہ ڈال کے راموکی بائیں ٹانگ جکڑ لی۔ پنجہ ڈالنے اور اپنی جگہ سے حرکت کرنے کے عمل میں لمحے بھر کا فرق نہیں تھا۔ جس تیزی سے مچھل نے جھکے جھکے اپنی دائیں جانب جست لگائی، وہ منظر دیکھنے کے لائق تھا۔
راموتوازن کھو بیٹھا، ترچھا ہو کے زمین پر گرا۔ دونوں ٹانگیں چر گئیں۔ دائرہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ مچھل رامو کی ٹانگ جکڑے جکڑے سیدھ میں دُور جا سکتا ہے۔ رامو [illegible] ہوش وحواس قائم نہ رکھ پاتا۔ دائیں کان کی جانب [illegible] فرش سے ٹکرایا تھا۔ فرش بھی ایسا ہموار نہیں تھا۔ [illegible] نے جاقو جلد ہی چھوڑ دیا ہوتا تو اپنے جسم اور حال پر توجہ دینے کی مہلت مل جاتی۔ ہاتھ میں دبائے رکھنے سے چاقو کی نوک اُس کی پسلی کے قریب کہیں پیوست ہونی چاہیے تھی۔ مچھل نے بائیں ٹانگ اس لیے منتخب کی تھی کہ راموکا چاقو اُس کے دائیں ہاتھ میں تھا۔
مچھل نے دائرے کا ایک چکر بھی مکمل نہیں کیا اور دھکیل کے راموکو پرے کر دیا۔ اس جھٹکے کے بعد راموکو تخمینہ کر لینا چاہیے تھا۔ وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ مچھل نے عمداً اس کی ٹانگ سے ہاتھ اُٹھایا ہے، ورنہ اُس کی کھال اُدھڑ جاتی، چہرہ بگڑ جاتا، جانے کتنی ہڈیوں کے جوڑ کھل جاتے۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر شخص ایک گھوڑے پر سوار ہے، دماغ کے گھوڑے پر۔ یہ گھوڑا زور کرتا رہتا ہے اور کبھی یہ آدمی پر سوار ہو جاتا ہے۔ سو ہر وقت لگام پر گرفت مضبوط رکھنی چاہیے۔ راموکے ہاتھ سے لگام چھوٹ گئی تھی۔ وہ دوبارہ اُٹھ کھڑا ہوا، چاقو تان لیا۔ مچھل کی بھی یہی خواہش تھی۔ اسی لیے اُس نے راموکو درمیان میں چھوڑ دیا تھا۔ غالباً اتنے پر اڈّے کے لوگوں کی سیری نہ ہوتی۔ وہ اُسے ایک آزمودہ کار کی شعبدے بازی پر محمول کرتے۔ یہ بازو کا زور، چاقو میں مشاقی کا کرشمہ نہیں تھا، حالاں کہ کسی کڑیل جوان کی ٹانگ ایک ہاتھ سے جکڑے اُسے دائرے کے نصف حصے میں گھماتے رہنے کی شرط ہی زور تھی۔ ایک لمحے کی تاخیر میں راموں مچھل کے سر پر پہنچ جاتا۔ اُس کے ہاتھ میں کھلا چاقو تھا، اور مچھل خود کو نہایت نازک صورتِ حال سے دوچار کیے ہوئے تھا۔ چاقو اُٹھانے کے لیے اُس کا جسم جھکا ہوا تھا۔ یہ ایک باقاعدہ داؤ تھا اور خود کو تشت میں رکھ کے مقابل کی خدمت میں پیش کرنے کے مترادف۔ یا آ بیل مجھے مار کی مثل کے مطابق تھا۔ مکمل یقین کے بغیر کوئی بھی ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔
مچھل نے دوسری مرتبہ بھی پہل نہیں کی۔ فرش سے اپنا چاقو اُٹھا کے خاموش کھڑا رہا۔ راموکے کسی دردمند نے اُسے یہیں تک اکتفا کرنے اور ہزیمت قبول کر لینے کی تلقین کی تھی، لیکن رامو نے شاید سنا نہیں۔ ایسی حالت میں سنائی دکھائی نہیں دیتا۔ مچھل نے دو ایک قدم آگے بڑھ کے دائرے میں [illegible] جگہ بنائی۔ راموں نے اُس کے قریب آ کے پھر چاقو اُس کی طرف جھپٹایا۔ دوسری بار اُس کا یہ اعتماد ہی اُس کی خوش فہمی یا بلا کی خود اعتمادی کے باعث ہی ممکن تھا۔ یہ ایک عام، مگر بہت اہم داؤ ہے۔ مقابل آمنے سامنے ایک دوسرے پر چاقو سے وار کرنے کے لیے پرتو ہیں اور جھکائی دے کے، پینترے بدل کے، کبھی آگے جا کے، کبھی پیچھے ہٹ کے کلائی پر پنجہ ڈالنے کی جستجو کرتے رہیں۔ اس دوران مقابل کی توجہ ہٹانے کے لیے پیروں سے پیروں پر اور خالی ہاتھ سے جسم پر ضرب لگانے کے مواقع بھی ضائع نہیں کیے جاتے۔ نفسی دباؤ، کسی کم زوری سے فائدہ اُٹھانے، غصہ دلانے، نگاہیں گھما کے مقابل کو مختلف تاثر دیتے رہنے کے حربے بھی بہت سود مند ہوتے ہیں، لیکن اصل بات تو زور ہے اور مہارت ہے اور تجربہ ہے اور ہوش برقرار رکھنا ہے۔
مچھل نے تیزی سے پینترا بدل کے خود کو بچایا، شاید دس بارہ، گیارہ بار، پھر یہ چشم زدن کی خبر تھی کہ گیارھویں، بارھویں مرتبہ پینترا بدلنے کے بجائے راموکی کلائی اُس کے پنجے میں تھی۔ آخری بار، کلائی پر پنجہ ڈالنے سے لمحہ بھر پہلے مچھل نے اپنا چاقو گرا دیا تھا۔ راموکا چونک پڑنا فطری تھا۔ مچھل اسی منتشر لمحے کی ٹوہ میں تھا۔ کلائی کا ہاتھ میں آنا تھا کہ مچھل نے اُچھل کے دوسرے ہاتھ سے اُس کی پسلی پر ضرب لگائی۔ راموکی ہول ناک چیخ بلند ہوئی۔ مچھل کے ہاتھ میں کلائی آ جانے پر جوڑ چٹخ جانا لازم تھا۔ پسلی پر ضرب مستزاد تھی۔ راموفرش پر قدم جمائے نہ رکھ سکا اور گر پڑا۔ تکلیف سے وہ دُہرا ہو گیا اور تڑپنے لگا۔
مچھل نے اپنا چاقو اُٹھا کے دائرے سے باہر آنے کے لیے

قدم بڑھائے تھے کہ شابے نے اُس کے پاؤں پکڑ لیے۔ ملہاری بھی تیزی سے مُڑ کے گلے لگ گیا۔ پھر تو ہر طرف سے لوگوں نے جُھل کو گھیر لیا اور نعروں جیسی صدائیں عمارت میں گونجنے لگیں۔

جُھل نے چوکی پر جا کے اُنھیں روکنے کی کوشش کی اور کہا کہ یہ کوئی معرکہ نہیں تھا اور اِس قدر تحسین و آفریں کا کوئی جواز نہیں ہے، لیکن لوگ نہیں مانے۔ پہلی مرتبہ اُنھیں نظر کے فریب کا گمان تھا، دوسری مرتبہ تو اعادۂ فریب ممکن نہ تھا۔ سبھی گواہ تھے کہ جُھل نے رامو سے کیا خسروانہ سلوک کیا ہے۔ اُس نے عین وقت پر چاقو گرا دیا تھا اور رامو کے چاقو پر قبضہ کرنے، اُسے کوئی زک پہنچانے، جسم کا کوئی حصہ کھول دینے سے پہلوتہی کی تھی۔ اب اُنھیں یقین آ گیا ہوگا کہ پہلی مرتبہ بھی جُھل نے رامو کو اُس کی ناپختہ کاری کی رعایت دی تھی۔ ملہاری اور شابے کی منتوں کی وجہ بھی اب اُن کی سمجھ میں آ جانی چاہیے تھی۔

چند منٹ میں سارا معاملہ نمٹ گیا۔ اِسے فیصلہ نہیں کہنا چاہیے۔ سامنے کوئی مقابل ہوتا تو فیصلے کی بات درست ہوتی۔

شابے کے اشارے پر کھانے کا اہتمام ہونے لگا۔

کھانے کے بعد گزرتے ہوئے لمحوں پر چہ میگوئیوں کا سلسلہ ایک حد تک کم ہو گیا تھا۔ پہلے ملہاری کے رخصت ہو جانے کا کوئی غبار اور فشار تھا تو اب یہ ترتیب دل مل جانے کی آسودگی اُن کے چہروں سے عیاں تھی۔ سو ویرے میں زیاں کے اندیشے اِتنے نہیں رہے تھے۔ رامو کھانے میں شریک نہیں تھا۔ میں نہیں دیکھ سکا، لیکن کسی نے مجھے بتایا تھا کہ لوگ اسی وقت اُسے اُٹھا کے کسی کمرے میں لے گئے تھے۔ چمپا اور چندا اپنے سازندوں کے ساتھ ابھی تک موجود تھیں۔ کل ساری رات اور آج کے پورے دن اُنھوں نے ایک پل کے لیے آرام نہیں کیا تھا۔ ملہاری بھی اب بہت پُرسکون نظر آ رہا تھا، یہ خوش دلی، خدشہ مٹ جانے اور کسی نتیجے پر پہنچ جانے کی علامت تھی۔ قہوے کا دور چلتا رہا اور کسی منچلے نے صدا لگائی کہ چندا اور چمپا موجود ہیں، کیوں نہ کچھ دیر کے لیے اُن سے ٹھمری یا دادرا سننے کے لیے کہا جائے۔ ملہاری نے سنی اَن سنی کر دی۔ کسی اور نے بھی تائید نہیں کی۔ اڈّے کا موسم دن میں بار بار بدلتا رہا تھا۔ سبھی تھکے ہوئے تھے اور لگ رہا تھا کہ جلد ہی محفل برخاست ہو جائے گی۔

رات ہو گئی۔ لوگ وہیں جمے ہوئے تھے۔ جُھل ختم کرنا چاہ رہا تھا۔ آج کی شب کسی اور مرحلے کی آزمائش شاید کسی کے وہم و خیال میں نہ تھی۔ جُھل نے حقّے کی نے منھ سے ہٹائی اور چوکی پر دوبارہ کھڑا ہوا تو سبھی بے چین ہو گئے۔ جُھل نے تھکی ہوئی آواز میں اُن سے پوچھا کہ اب اُن کی کیا مرضی ہے؟

سب کے لیے یہ سوال حیران کن تھا۔ وہ اُس کی شکل دیکھا کیے۔ جُھل نے وضاحت کی کہ فرض کیا جائے، ملہاری کے بعد جُھل بھی اڈّے پر قائم رہنا نہیں چاہتا تو اُن کے پاس اُس کی جگہ کون سا آدمی ہے؟

سب گونگے ہو گئے۔ جُھل نے اُن سے کہا کہ اڈّے پر مستقل قیام سے اُسے کوئی دل چسپی پہلے تھی نہ اب ہے۔ اُسے تو دُور جانا ہے۔ وہ تو آج ہی چلا جاتا، ملہاری کی حالت دیکھ کے ٹھیر گیا۔ ملہاری خود کو کھو چکا تھا، اُس کی بازیابی، اُسے اپنے آپ سے آگاہ کرانے کے علاوہ جُھل کو احساس ہوا کہ ملہاری کے بعد لوگوں کو چوکی پر کسی نئے نگراں کے تقرر میں دشواری پیش آ سکتی ہے اور بہت افراتفری ہو سکتی ہے۔ اڈّے کے لوگوں نے تیس سال سے کوئی تبدیلی نہیں دیکھی ہے۔ وہ ملہاری کے عادی ہو چکے ہیں، لیکن چوکی پر لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہی کچھ جُھل اُنھیں جتلانا چاہتا تھا اور یہی کچھ سوچ کے اُس نے اڈّے کی کمان سنبھالنے کا اعلان کیا تھا۔ رامو تو خواہ مخواہ آڑے آ گیا اور اُس نے ایک طرح جُھل کا کام آسان کر دیا۔ رامو نے خود کو ضرر پہنچا کے کچھ حاصل ہی کیا اور بالواسطہ لوگوں کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔ ملہاری کا ارادہ برقرار ہے، وہ جا رہا ہے۔ جُھل کا قیام بھی ملہاری کے رخصت ہونے تک ہے۔ اِس وقت اڈّے سے وابستہ تقریباً سبھی لوگ حاضر ہیں۔ ہو سکے تو رامو کو بھی بلا لیا جائے تاکہ چوکی کے نئے مختار کے مشورے میں وہ بھی شامل رہے۔ جیسا کہ پہلے اُنھیں صلاح دی گئی تھی، اچھا ہوگا، ملہاری کی موجودگی میں کوئی فیصلہ کر لیا جائے، ورنہ ملہاری اور جُھل کو تو ایک دو دن میں یہاں سے چلے جانا ہے۔

جُھل اپنی جگہ بیٹھ کے حقّہ گڑگڑانے لگا۔ اتنی دیر میں شابے اندر سے رامو کو بلا لایا۔ اُس کی حالت نہایت خستہ تھی۔

ٹھیک سے زمین پر قدم بھی نہیں رکھے جا رہے تھے۔ شابے اُسے چوکی پر لے آیا۔ رامو نے چوکی پر آتے ہی جُھل کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ جُھل نے اُس کی کمر پر تھپکی دی، پیروں سے اُس کا سر اُٹھایا اور بازو سے دبوچ لیا۔ "اڈّے پر رہنا ہے تو برف چبانے کی عادت ڈال۔" اُس نے نرم لہجے میں رامو سے کہا اور اُسے پاس ہی بٹھائے رکھا اور چپکے چپکے جانے کیا رموز منکشف کرتا رہا۔

ملہاری کے بازو میں بیٹھے ایک معمر شخص کے اچانک اُٹھ کھڑے ہونے پر سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"میں نے ملہاری اُستاد سے بات کی ہے۔" اُس کی آواز پر عمر غالب نہیں آئی تھی۔ کہنے لگا کہ اڈّے کے لوگوں کو اختیار ہے کہ وہ کل پر چوکی کے نئے مالک کا فیصلہ کر لیں، یا کسی ایک کو متفقہ طور پر منتخب کر لیں۔ واضح رہے کہ اب اُستاد اور اُس کا ساتھی باہر، دونوں میں سے کوئی بھی چاقو کھول کے سامنے نہیں آئے گا۔ اڈّے کے پرانے لوگوں ہی کے درمیان زور ہوگا۔ جیسی یقین دہانی کے بعد بھی کوئی زور کے لیے آمادہ نہیں تو ملہاری کی تائید سے شابے کا نام تجویز کیا جاتا ہے۔ اڈّے کے لوگوں کی نظر میں شابے سے معتبر کوئی اور شخص ہے تو، بڑے آدمی نے کہا کہ وہ اور ملہاری اُستاد شابے کی نامزدگی پر اصرار نہیں کریں گے۔

سب کسی اشارے کے منتظر تھے۔ سبھوں کو جیسے زبان مل گئی تھی۔ لمحوں سکوت رہا، پھر اُنھوں نے بے طرح شابے کے حق میں نعرے لگانے شروع کر دیے۔ رامو کی آواز نہیں نکل رہی تھی، لیکن ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے اُس نے پورے جوش و خروش کا اظہار کیا۔

چمپا اور چندا کو جُھل نے اُسی رات واپس کر دیا تھا کہ بالاخانے جا کے وہ اپنا بکھرا ہوا ساز و سامان سمیٹیں۔ پرسوں ملہاری اُن کے حوالے کر دیا جائے گا، یا وہ ملہاری کے سپرد کر دی جائیں گی۔ یہ سن کے اُن پر شادیِ مرگ کی کیفیت طاری ہوئی، دونوں کے آنسو نکل آئے۔

دوسرے دن اڈّے پر بہت چہل پہل رہی۔ سارے دن جُھل لوگوں کے درمیان گھرا رہا۔ ہر شخص اُس کی قربت کا

خواہش مند تھا، اور معلوم ہوتا تھا کہ جُھل عرصے سے اڈّے کی مسند پر فروکش ہے۔ میرے وہاں رہنے نہ رہنے سے کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ میری حیثیت تو محض ایک تماشائی کی تھی، سو دوپہر کے کھانے کے بعد اڈّے کے ایک آدمی کے ساتھ میں تو باہر نکل گیا۔ شام تک مجھے مختلف جگہوں پر گھماتا رہا۔ مولوی بازار، امام گنج، چوک بازار اور نوابوں کے علاقے، سدام پور، چمپت تلی، قلعہ لال باغ ہوتے ہوئے وہ مجھے سدر گھاٹ کے علاقے میں لے آیا۔ بابو بازار سے کشتی میں بیٹھ کے ہم بوڑھی گنگا کے اُس پار زنجیر کے علاقے میں آ گئے۔ زنجیرا اور پوری شور، کچے پکے مکانوں کی یہ بستیاں دیہات کا منظر بھی پیش کرتی ہیں، شہر کا بھی۔ جُھل کے ساتھ بہت سی جگہیں پہلے کی دیکھی ہوئی تھیں۔ چوک بازار کی شاہی مسجد، لال باغ کی مسجد، قلعے والی مسجد بڑے کٹڑے اور چھوٹے کٹڑے کے مدرسوں میں جُھل اور میں اچھی طرح گھوم بھی چکے تھے۔

سڑکوں کے چکر کاٹتے ہوئے پہلے میری نظریں ہر طرف بھٹکتی رہتی تھیں، کہیں راہ گیروں کے درمیان مولوی صاحب نظر نہ آ جائیں۔ ظاہر ہے، وہ بستیوں ہی میں رہتے ہیں۔ گھر سے کسی وقت تو وہ باہر نکلتے ہوں گے۔ مولوی صاحب سے مشابہ کوئی شخص دکھائی دے جاتا تو دل بری طرح دھڑکنے لگتا۔ ہاتھ پاؤں اکڑ جاتے۔ اب ایسا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اب مجھے نہ کسی پر مولوی صاحب کا شبہ ہوتا تھا، نہ میری نظریں راہ گیروں پر منڈلایا کرتی تھیں۔ کچھ نصیب کی بھی بات ہوتی ہے۔ لوگوں کو بے طلب بھی مل جایا کرتا ہے۔

بہت عرصے بعد اُس روز نرائن گنج کے بازار میں ناگہاں ایک شخص کے سامنے آ جانے پر میرا وہی حال ہوا، آنکھوں میں اندھیرا اُتر آیا، پاؤں منجمد ہو گئے۔ وہ مولوی صاحب کی مکمل تصویر تھا، مگر اُن مولوی صاحب کی، جن کے نقوش میرے رگ و ریشے میں پیوست تھے۔ اب گیارہ سال سے اوپر ہو چکے تھے۔ مولوی صاحب میں تو بہت تبدیلیاں ہو چکی ہوں گی۔ میری حیرت پر اُس شخص نے مجھے گھور کے دیکھا۔ میں بھی سٹ پٹایا، وہ بھی گڑبڑا گیا، ہل کر برگشتہ ہوا۔ وہ تو سنّو کے اُدھڑے ہوئے چہرے کی شکنیں دیکھ کے اُس نے آگے

چھپے جانے میں عافیت سمجھی۔ کچھ دیر کے لیے اُس نے میرے
حواس گم کر دیے تھے۔ مجھے تو پسینا آ گیا تھا۔ میرا رُواں رُواں
جسم میں چبھتا رہا۔ اگر واقعی قسمت کبھی یاوری کرے اور
مولوی صاحب اچانک کسی چوراہے، کسی موڑ پر نظر آ جائیں تو
جانے میرا کیا عالم ہو، میری تو سانس رُک جائے گی۔ بتھل بھی
اِسی آسرے میں بازاروں اور گنجان آباد علاقوں کا سفر پیدل ہی
طے کرنے کو ترجیح دیا کرتا تھا کہ مولوی صاحب یوں بھی تو
کہیں مل سکتے ہیں، مگر آدمی کی آنکھیں تو دو ہی ہوتی ہیں،
صرف سامنے کا دیکھ سکتی ہیں، اور نظر کی حد بھی کس قدر ہے۔

نرائن گنج میں پرانی چیزوں کی دکان پر ایک گُل دان کی
نفاست اور دل کشی نے مجھے روک لیا۔ عجیب صناعی تھی۔
رنگ برنگے پتھروں کے ٹکڑے جوڑ کے اُسے بنایا گیا تھا۔
بہت سجل اور ہلکا پھلکا تھا، شیشے جیسا نازک۔ موم بتی اندر روشن کرو
تو پتھر جگمگانے لگیں۔ پتھر سیپی کی طرح تراشے گئے تھے اور
پتر جیسے کر دیے گئے تھے۔ مجھے فوراً زما کا [illegible]
ایسی چیزوں کا بہت شوق ہے۔ دکان دار بڑا کائیاں [illegible]
قیمت بہت بتائی۔ گل دان مجھے اچھا لگا تھا، میں نے [illegible]
اڈے واپسی تک رات ہو گئی تھی۔ وہاں تو [illegible]
سماں تھا۔ روشنیاں، پکوان، لوگوں کا ہجوم، اڈے [illegible]
یہ آخری رات تھی۔ رات گئے تک کھانے پینے کا شغل رہا۔
گو کسی قسم کی محفل آرائی کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا، لیکن تین بجے تک
لوگ جمے بیٹھے رہے۔ مہاری اور بتھل کے اُٹھ جانے ہی پر
سب منتشر ہوئے۔

اگلے روز صبح کوئی دس بجے جانکی رنگ کی سادہ ساڑھیوں میں
ملبوس چمپا اور چندا اڈے پر آ گئی تھیں، اس سادگی میں بڑی
آرائش تھی۔ کلائیوں میں موتیا کے گجرے اور کانچ کی چوڑیاں،
کانوں میں طلائی بالیاں، گلے میں چمپا کلی، جوڑے میں بھی
پھول گندھے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ دو سازندے بھی تھے اور
کچھ صندوق سامان الگ تھا۔ انھوں نے بتھل سے درخواست کی،
گر مہاری کو اعتراض نہ ہو تو یہ دونوں سازندے بھی بالا خانے کی
زندگی ترک کر کے اُن کے ساتھ جانا چاہتے ہیں۔ دونوں ایک
زمانے سے اُن کے ساتھ ہیں، اپنے اپنے فن کے ماہر ہیں۔
مہاری بھی اُس کا قائل ہے۔ دونوں پکّی خو میں نیاز مند،
وفا پیشہ ہیں۔ نہ انھیں معاوضے کی خواہش ہے، نہ ان کا
آگے پیچھے کوئی ہے۔ اصل میں بالا خانے ہی پر وہ پلے بڑھے،
وہیں اُن کی تربیت ہوئی، اُستادوں سے فن سیکھا اور مہارت
حاصل کی ہے۔ اُن کی حیثیت خدمت گار کی رہے گی، رنگ
کے لیے مہاری کو بھی اُن کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ چمپا در چندا کا
لہجہ التجا آمیز تھا، مگر بتھل کے پاس جواب دینے کے لیے اس
کے سوا کچھ نہیں تھا کہ وہ مہاری سے بات کر کے دیکھتا ہے۔

آخر بتھل چوکی سے اُٹھ کے ہم نے اپنے کمرے کا رُخ کیا
تو مہاری بھی پیچھے چلا آیا۔ وہ بہت گھبرایا گھبرایا سا لگ رہا تھا۔
آنے والا وقت اُس کے لیے جتنا قسم نوی تھا، اتنا ہی بے یقینی کا
بھی۔ مہاری کے دل میں ایک کھٹک تھی۔ یہاں میں لفظ لن
نہیں بن پڑ رہے ہوں گے کہ اب تک چپ رہا تھا، کہنے لگا
کہ چمپا اور چندا دونوں ہی ساتھ کیوں جانا چاہتی ہیں، لا محالہ
کسی ایک کو ایثار کرنا پڑے گا۔ دوسری کی حیثیت پھر کیا ہوگی؟
بتھل نے اُسے بتایا کہ کل صبح اُس نے خیمے میں اُن سے بات
کی [illegible] وہ بھی اُن کی یک جانی و یک جانی پر حیران ہوا تھا۔
[illegible] تسلی ہو گئی کہ ہاں، یہ بھی تو ممکن ہے، نام مختلف،
[illegible] الگ، لیکن دو مختلف آدمی ایک دوسرے کے جزو لازم،
لازم و ملزوم بھی تو ہو سکتے ہیں، ایک وجود کے دو حصے، اُن کے
کہنے کے مطابق انھوں نے خود کو کبھی ایک دوسرے سے جدا
نہیں سمجھا ہے اور آئندہ بھی جدائی کا تصور اُن کے لیے محال
ہے۔ وہ تو مہاری کی داسی بن کے رہنا چاہتی ہیں۔ دونوں کی
طلب ایک، مطلوب ایک ہے۔ اُن کی آرزو ہے کہ مہاری بھی
اُن میں کوئی امتیاز نہ رکھے۔ اُن میں کوئی ایک مہاری کو زیادہ
مرغوب ہے تو اطمینان رکھے، دوسری کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔
اُن کے بہ قول، دوسری یہی غنیمت جانے گی کہ مہاری کی
چھاؤں میں اُسے امان ملی ہوئی ہے اور اُس کے وجود کا دوسرا حصہ تو
شاد آباد ہے، اور دوسری کے لیے مہاری اپنے ہنر کی خیرات میں
بخیلی تو نہیں کرے گا۔ بتھل کی زبانی یہ احوال سن کے مہاری
دیر تک تذبذب میں پڑا رہا۔ بتھل نے اُس کی دل جوئی کے لیے
کہا کہ اُسے یقین ہے، چمپا اور چندا اُس پر کبھی بوجھ نہیں بنیں گی۔

ہے جاتے تھے۔ صفائی کے نوکروں اور دوڈوں کا بھی انبار لگ گیا تھا۔ پھولوں کی پتیاں چاندنی پر بکھر جاتی تھیں۔ محفل کے آس پاس بیٹھے لوگ انھیں چن چن کر چاندنی کی روشنی برقرار رکھنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن پتیوں کا رنگ چھوٹ چھوٹ جاتا تھا۔ گیارہ بجے تک کھانے کا سلسلہ چلتا رہا اور گھنٹے بھر سے زیادہ نہیں لگا کہ اڈے کے اندر اور باہر کی ہر جگہ صاف کر دی گئی۔ جیسے جو قصوں پر کھانے کے بعد عموماً رقص و سرود کی محفل برپا ہو جاتی تھی، کبھی زنانوں کی، کبھی بازار سے کوئی طائفہ آ کے رنگ جمانے لگتا۔ یقیناً محفل کی منتظمہ ہوئی کہ زنانے لوٹا دیے گئے اور بازار سے بھی کسی کو طلب نہیں کیا گیا۔

رفتہ رفتہ بھیڑ کم ہوتی گئی اور اڈے کا سکون واپس آتا گیا۔

جامو، جمرو، زورا اور اڈے کے تقریباً سبھی لوگ آنے والوں سے سلام دعا کرتے، انھیں منظم رکھتے، اُن کے لیے کھانے پینے کے انتظام میں ایسے معروف رہے تھے کہ ڈھنگ سے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے سیورین کے بارے میں معلوم کرنے کی بے چینی تھی۔ امکان یہی تھا کہ سیورین ضد پر اڑی رہی ہوگی۔ نرمی و نازکی اور بات ہے، عزم کی پختگی اور۔ سفر کے دوران محفل کے رُکنے پر میں نے کئی خط فیض آباد لکھے تھے۔ ہمارا کوئی مستقل پتا تو ہوتا نہیں تھا، آج یہاں، کل وہاں، اس لیے کسی جواب کی توقع بھی نہیں کی جاتی تھی۔ شروع کے خط میں، میں نے محفل کی جانب سے زرّیں کو سیورین کا خیال رکھنے کی سفارش کی تھی، حالاں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جامو اور زورا کے ساتھ سیورین کا وہاں پہنچ جانا ہی کافی تھا۔ پھر بھی ایک سی لگی سی تھی۔ سیورین کو حویلی جا کے کوئی پچھتاوا تو نہیں ہوا۔ وہاں زیادہ تر عورتیں ہیں۔ مردوں کے بیچ میں کام کرنے والی عورتوں کا تیور کچھ جدا ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے، سیورین کو حویلی کا روایتی قسم کا ماحول موافق نہ آیا ہو۔ میں نے تو بہت منع کیا تھا، اُس نے دلیلیں دے کر مجھے خاموش کر دیا۔ ماں، باپ کے ختم ہو جانے کے بعد وہ اکیلی بھی بہت رہ گئی تھی، اور وہ کتنا ہی مردوں کے درمیان کام کرتی رہی ہو بہرحال، وہ ایک لڑکی ہے۔ اُس میں ایثار، تحمّل، معاملہ فہمی اور خوش اطواری کی بہت سی خوبیاں حویلی کے مکینوں جیسی ہیں۔ وہ

ایک تعلیم یافتہ، سلیقہ شعار، دوسروں کو اپنی جانب کھینچ لینے والی لڑکی ہے۔ ممکن ہے، پٹنے سے ہمارے چلے جانے کے بعد اُس نے اپنے ارادے پر نظرِ ثانی کی ہو۔ مجھے حیرت تھی کہ مختصر مدت محفل چند دنوں کے ساتھ میں اُس نے خود کو ہم لوگوں کے اتنا قریب سے سپرد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لگتا تھا، جیسے وہ ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ ظاہر ہے، میں کیا، اُس کے سامنے محفل ہی کیا جو کسی سائبان، کسی ستون کے مانند ہے۔ اُس کے پاس جتنا سایہ اور گداز ہے، مجھ میں تو اُس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ مگر تو سیورین سے اُلجھتا ہی رہا تھا۔

بارہ بجے تک ہجوم اڈے کے آدمیوں تک رہ گیا تھا۔ زورا میرے ہاتھ لگ گیا۔ میں نے سیورین کا ذکر چھیڑا تو وہ اُچھل پڑا۔ ”قسم سے راجا بھائی! ابھی کیا بولے، کیسا پاگل چھوکری ہے۔ ابھی آٹھ پندرہ دن نہیں ہوا کہ اُس کا تار آ پڑا، لکھتا تھا، ٹھیک پانچ دن بعد سوموار کو اُدھر پٹنا اسٹیشن پے وہ اپنے کو تیار ملے گا۔“

زورا نے بتایا کہ احتیاطاً جامو نے جوابی تار سے سیورین کو مطلع کر دیا کہ اُسے تار مل گیا ہے۔ بجاب ملنے سے دونوں مقررہ دن روانہ ہو گئے۔ پٹنا اسٹیشن پر ڈبے سے اترے کہ انھوں نے سیدھے اوّل درجے کی انتظار گاہ کا رُخ کیا۔ انھیں اندر جانا نہیں پڑا۔ سیورین منتظر گاہ کے دروازے پر کھڑی اُن کی منتظر تھی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ انھیں دیکھ کے اُس کا سب حال جو، مضطرب نہ جامو اور زورا سے چمٹ گئی۔ اُس کی بوڑھی آیا بھی اُسے وداع کرنے آئی تھی۔ جامو نے سیورین کے لیے اوّل درجے کا ٹکٹ کلکتے ہی سے خرید لیا تھا کہ پٹنا اسٹیشن پر کوئی پریشانی نہ ہو، اور سیورین کو اُن سے الگ زنانہ ڈبے میں سفر نہ کرنا پڑے۔ بوڑھی آیا سیورین کو رخصت کرتے وقت بلکنے لگی اور اُس کی سلامتی کے لیے دُعائیں کرتی رہی، جیسے کوئی بیٹی کو گھر سے وداع کرتا ہے۔ آیا نے جامو اور زورا سے فریاد کی کہ وہ اپنی عزیز ترین بچی اُن کے حوالے کر رہی ہے۔ سیورین بہت نازک، دل کی بڑی اُجلی ہے۔ پٹنا اسٹیشن پر گاڑی زیادہ دیر نہیں ٹھہری۔ سیورین اپنے ساتھ بھرا ہوا ٹفن لائی تھی۔ وہ سیتے بھر اُس کی آنکھیں دمکتی رہیں۔ فیض آباد اسٹیشن پر آ کے جامو نے اُسے زورا کے ساتھ الگ

[illegible] سامنے میں بٹھا دیا۔ جامو فیض آباد کے اڈے کا استاد تھا [illegible] سب اُس سے واقف تھے۔ سواری میں جیوں سیورین نے [illegible] پہلے لی تھی، لیکن ایک عورت کے ساتھ حویلی کی طرف جانے [illegible] تراش لی جاتیں۔ زورا ابھی دو ایک بار فیض آباد آ چکا تھا [illegible] دن قیام کر چکا تھا، مگر اڈے کے آدمیوں کے حوالے سے کتنے [illegible] آباد کے پائے ہوں گے۔ زورا پہلے حویلی میں داخل ہوا۔ کچھ [illegible] اپنے اڈے کا ایک چکر لگا کے جامو بھی حویلی چلا گیا۔

زورا کو زبان کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ زرّیں [illegible] دل میں تو ایک دریا رواں رہتا ہے۔ زورا کہہ رہا تھا کہ [illegible] نے بڑھ کر سیورین کو اپنے بازوؤں کی پناہ میں لے لیا۔ [illegible] چھوٹی اور بڑی سلمہ، میساں، خانم، فروزاں، یاسمن، [illegible] نے سیورین کو کسی اجنبی جگہ کا احساس ہونے نہیں دیا۔ [illegible] نے اُس سے وہی سلوک کیا جو اُن کا خاصہ تھا، اور جو وہ [illegible] دوسرے سے روا رکھتی تھیں۔ سیورین، سامان میں اپنے [illegible] کا بکسا بھی ساتھ لائی تھی۔ اُس کے پاس کچھ [illegible] وہ سب بھجوائیں نے زرّیں کی تحویل میں دے دیا۔

جامو اور زورا ہفتے بھر فیض آباد میں ٹھہرے رہے۔ یہ [illegible] کر کے کہ سیورین کو کوئی اُلجھن پیش نہیں آ رہی ہے، [illegible] نے کلکتے واپسی کا قصد کیا، لیکن جامو پھر بھی متردّد تھا۔ [illegible] گزرا ہوگا کہ اُس نے زورا اور جمرو کو فیض آباد روانہ [illegible] اور دونوں نے تین چار دن ہی وہاں قیام کیا۔ سیورین [illegible] حویلی کا حصہ بن چکی تھی۔ انھیں اُس کے چہرے پر [illegible] کی ذرا سی رمق نظر آتی تو جامو کی ہدایت تھی، اُسے فوراً [illegible] لے جائیں۔ سیورین نے ڈاکٹر رے کے مشورے پر [illegible] کی ملازمت ترک کرنے کے بجائے طویل رخصت کی [illegible] تھی۔ درخواست میں اُس نے کلکتے میں اپنے کسی [illegible] رشتے دار کے ہاں جانے اور مزید تعلیم حاصل کرنے کا [illegible] تھا۔ زورا بتا رہا تھا کہ زرّیں، خانم اور فروزاں کی نمبیری پر [illegible] انگریزی کی تعلیم کا شوق ہوا ہے۔ اپنی اسناد، سپتال سے [illegible] تصدیق نامے اُس کے پاس موجود ہیں۔ اس سلسلے میں [illegible] یا شاید دلّی جانا پڑے۔ منیر علی کے بیٹے اور بھتیجے نے [illegible] داخلے اور دیگر معاملات سے نمٹنے کے لیے اُسے ہر طرح کی اعانت کا یقین دلایا ہے۔

فیض آباد میں جمرو اور زورا دن بھر بیٹھ کر حویلی میں رہتے، رات کو اڈے واپس آ جاتے تھے۔ دو تین دن انھوں نے شہزادوں کی طرح حویلی میں بسر کیے۔ ہر کوئی اُن کی خاطر تواضع کی جستجو میں رہتا تھا۔ زرّیں نے وہاں کچھ ایسا ماحول بنایا ہے کہ ہر کوئی وہاں سرگرم اور مصروف نظر آتا ہے۔ گھوڑے کے باغ میں وہ شام کو بیڈمنٹن کھیلتی ہیں، دن بھر دوسرے کھیل، مطالعہ، رسالے، کتابیں، اخبار، کھانوں کے تجربے اور مقابلے، موسمی پکوان۔ زورا اور جمرو کا وہاں سے آنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔

زورا پھر میرے ساتھ ہی رہا اور دیر رات تک مسرت و شوق سے حویلی کے قصّے، کہانیاں سناتا رہا۔ یہ سارا احوال سن کے میرے سینے پر جھائی دُھند چھٹ سی گئی تھی۔ اس سے مراد تھی کہ سیورین کو

واقعی کسی پناہ کی ضرورت تھی۔ وہ محرومی کے کسی شدید احساس میں جکڑی ہوئی تھی۔ چہرے آدمی کے درونِ خانہ تلاطم کی عکاسی کسی قدر کر پاتے ہیں۔ کچھ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ سامنے نظر آنے والا آدمی کیسے فشار، کتنی آندھیوں سے دوچار ہے۔ حویلی میں سیدرین کا ماجرا سن کر میرا جی بھی اُمڈتا تھا کہ دو ایک روز کے لیے فیض آباد جا کے اپنی آنکھوں سے اُس کی ویرانیت اور شادابی دیکھوں۔ فیض آباد اِتنا دُور بھی نہیں تھا، میں جا کے ہفتے عشرے میں واپس بھی آ سکتا تھا۔

صبح نو بجے آنکھ کھل پائی، وہ بھی سارنگے کے جگانے پر۔ دس بجے تک باہر نکلنا ہو سکا۔ جھل چوکی پر موجود تھا اور ناشتے پر میرا انتظار ہو رہا تھا۔ لوگوں کی تعداد بہت کم تھی، لیکن جیسے جیسے دھوپ چڑھتی اور اترتی گئی، لوگ بڑھتے رہے۔ رات کو تو پھر گزشتہ کل جیسا اِزدحام ہو گیا۔

کسی سے نصیب میاں سے میں نے یوں ہی از راہِ لطف اُن کے خاص پانوں کا ذکر کیا تھا۔ وہ تو بسمل ہو گئے۔ رات کو ہجوم کے درمیان سے ہم تین چار کا یک ساتھ اُٹھنا سب کی نظروں میں آ جاتا۔ نصیب میاں نے موقع دیکھ کر مجھے اشارہ کیا، میں نے پاس بیٹھے جمرو اور زورا کو۔ ایک ایک کر کے ہم چاروں باہر نکل آئے۔ گلی میں موجود سارنگے بھی ہمارے ساتھ ہو گیا۔ نصیب میاں ہمیں سونا گاچھی کے علاقے میں لے آئے۔ وہاں شب بیداری کا وہی عالم تھا، سارا شہر جیسے بازار میں سمٹ آیا ہو، دن پھر طلوع ہو گیا ہو، جھولی، رنگ، روشنی اور ساز۔ نصیب میاں بازار کے نشیب و فراز کے پارکھ تھے۔ کون سا نیا نغمہ آیا ہوا ہے اور کس بالاخانے کا سکہ رائج الوقت ہے، کس کے گلے میں سُرس وتی بیٹھی اور کس کے بدن میں پارا آمیخت ہے، رنگ روپ میں کون شہاب، کون گلاب، کون سراپا شباب ہے، کس کے نرگیں چہرے میں کیسی قیامت ہے، کس کی ادائیں ترازو ہو جاتی ہیں، اور کس کے شیدا عیش ابھر نہیں۔ ایک تو نصیب میاں کی شیریں تھی پہلے ہی کیا کم تھی، اب تو رنگ کچھ دو فزوں ہو گئی تھی۔

رات کی ایک خوبی یہ ضرور ہے کہ بے شمار عیب چھپا لیتی ہے۔ عمارتوں، چیزوں اور چہروں کے عیب۔ ہم کسی کوٹھے پر نہیں گئے۔ چھقن صاحب کی پان کی دُکان ہماری منزل تھی مگر اب وہ پہلی والی دُکان نہیں تھی۔ اُس سے کوئی فرلانگ بھر کی دُوری پر چھقن صاحب نے ایک کشادہ دُکان لے لی تھی۔ سجاوٹ میں بڑی نفاست تھی۔ خود چھقن صاحب کا تکلف بھی کچھ فزوں لگتا تھا۔ اُجلا لباس، ہاتھوں پر وستانے۔ کتھے چونے کا ایک داغ بھی لباس پر نہیں تھا۔ کتھے چونے کے پان کے برتن چمک رہے تھے۔ پان لگانے والی ڈنڈیاں کلیا میں کتھے چونے کی مقدار کے بقدر ہی چُنی ہوئی تھیں مگر چھقن صاحب پان پر کتھا لگا کر ہر بار ڈنڈی قریب رکھے پانی سے بھرے گلاس میں ڈال دیتے تھے۔ چنانچہ ڈنڈیوں پر کتھے کے پرت جم پاتے تھے، نہ چونے کی آمیزش ہو پاتی تھی۔ نصیب میاں اور چھقن صاحب کی چوٹیں دیکھنے کی ہوتی تھیں۔ دونوں کا سامنا ہو جائے تو کتابوں کے کردار زندہ ہو جائیں۔ پان کا تو ایک بہانہ تھا۔ میں تو یہی کچھ دیکھنے آیا تھا۔ دونوں میں مرصع فقروں کا مچلنا ہوتا رہا اور ایک ایک فقرے چست کیے جاتے رہے۔ چھقن صاحب نے ایک بنگالی خدمت گار کو جانے کس لمحے اشارہ کیا تھا کہ وہ جھٹ قریب کی کسی دُکان سے تازہ رس گلے لے آیا۔ نصیب میاں پلکیں پٹ پٹا کے پوچھا، "ہائیں! یہ کیا تکلف ہے بندہ نواز؟"

"تکلف کیسا۔" چھقن صاحب نے جھکتی آواز میں کہا۔ "دیکھ نہیں رہے جناب! اتنے عرصے بعد اپنے چھوٹے صاحب نیا زمند کے غریب خانے پر قدم رنجہ ہوئے ہیں۔ آنکھیں ترس گئی تھیں، ماشاء اللہ وہی بانکپن، وہی چھب ڈھب۔ بازار میں شہزادے کو زیادہ دیر نہ گھمایئے گا نصیب میاں۔"

"کیوں! کیا تیر چل جائیں گے؟" نصیب میاں

چہک کے بولے۔

"گر دو لگا تو کوئی آپ سے سیکھے۔" چھقن صاحب نے بل کھا کے کہا، "ارے صاحب! ابھی ایک گھڑی تو بازار کے شباب کی ہوتی ہے۔ صاحبِ عالم دو چار گلیوں سے گزر گئے تو ذرا سوچیے، کوئی اِن کا نظارہ کرے کہ اُن "

"بس بس چھقن صاحب..." میں نے اُن کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

چھقن صاحب نے تشتری اُٹھا کے میرے سامنے کر دی۔

"لیجیے، شیرینی تو نوش فرمایئے۔"

نصیب میاں پہلے سے تاک لگائے ہوئے تھے۔ مجھ سے پہلے اُنھوں نے تشتری سے مٹھائی کا دانہ اُچک لیا اور اُنگلیوں میں گھماتے ہوئے شوخی سے بولے، "میٹھے بھی ہیں؟"

چھقن صاحب نے نظر بھر کے اُن کی طرف دیکھا اور ایک ثانیے کے تامل کے بعد بولے، "آپ سے زیادہ نہیں میاں؟"

جمرو تو چل نکل گیا۔ زورا کے پلّے کچھ نہیں پڑ رہا تھا، لیکن وہ بھی دیدے پھاڑے چھقن صاحب اور نصیب میاں کے نکلتے ہوئے لفظ سنتا رہا۔ میرے خیریت پوچھنے پر چھقن صاحب کے چہرے پر دُھواں سا چھا گیا، سینے پر ہاتھ رکھ کے سرد آہ بھری اور کہنے لگے، "کیا پوچھتے ہو بھیا، نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں۔"

"آپ پر یہ بیزاری اچھی نہیں لگتی۔" میں نے اُنھیں اُکسانے کے لیے کہا، "آپ کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی کے واقعات تو دُور دُور مشہور ہیں۔"

"فسانے کہو میاں۔"

"طبیعت تو ٹھیک ہے، کاروبار کیسا چل رہا ہے؟"

"بس کاروبار ہی کاروبار ہے۔"

"کیوں، ایسی کیا بات ہے؟" میں نے بے چینی ظاہر کی۔

وہ ٹھنک کے بولے، "نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری! راہ لگ اپنی۔" مجھے دوسرا مصرع یاد تھا۔ میں نے کہا، "یہی تو پوچھتے ہیں، بیزاری کا کوئی سبب تو ہوگا۔"

"اے میاں!" چھقن صاحب کی آواز پر یاسیت غالب آ گئی، "کیا عرض کریں، کس کس چیز کا غم کریں۔ یہ نامرد شکم

ساتھ نہ جُڑا ہوتا تو کب کے سینے ویرانے میں جا بیٹھے ہوتے۔ یہاں تو بس اسی نابکار کی سیری ہوتی ہے۔ یہ چشم و گوش، یہ سینہ و دل کہاں لے جائیں بھیّا! یہاں تو سبھی کچھ بدلا جا رہا ہے۔ پہناوے، ذائقے، گفتار، رفتار، اور رفتار ہی رفتار ہے، جسے دیکھو سرپٹ بھاگا چلا جا رہا ہے۔ یہ تو کوئی اور جگہ ہے۔ ہم یہاں تو نہیں آئے تھے۔ اپنی زبان ہی اب یہاں کوئی نہیں سمجھتا۔ اب تو ہم پان فروش، محض بنواڑی ہیں۔ پان بیچتے ہیں، پہلے دل والے آتے تھے، دل بیچتے تھے۔ اب تو پان بیچتے ہیں۔ نصیب میاں ایسے تین چار طرح داروں سے کچھ آس بندھی رہتی ہے، ورنہ کم بہ دامن " چھقن صاحب کی طبعی شگفتگی لوٹ آئی، کہنے لگے، "... یہ بھی بھلا کتنے دن کے ہیں۔"

"ارے واہ۔" نصیب میاں نے تیورا کے کہا، "دن گن رہے ہیں ہمارے پیارے صاحب۔"

"سچ بولتے ہیں۔" چھقن صاحب چہک کے بولے، "یوں اپنی بھی آپ کو لگ جائے۔ ہزار برس سلامت رہو، اور وہ جو مرزا نوشہ نے کہا ہے "

"آپ باتوں میں اُڑاتے ہو۔" نصیب میاں نے مصنوعی ناگواری سے کہا، "ارے یہ تین چار بھی نہ رہے تو کندھا بھی کیا غیروں سے دلواؤ گے۔ ہمیں تو کچھ یہ نظر آتا ہے کہ دُکان کی لوٹ پوٹ کی ترکیب بھی اکارت گئی۔ نو بہار، گل بہار بی بی نے پھر کسی آزمائش میں ڈالا ہے جو بے سر و پائی ہانکتے ہو۔"

"ہے ہے، ذری کچھ تو تنا مروّت کرو نصیب میاں" چھقن صاحب نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کے ملاجت سے کہا، "سب کے سامنے رُسوا کرتے ہو۔ تم پر بھی پریوں کے پانی نے اثر کر دکھایا۔"

چھٹن صاحب نے حسبِ روایت عطر کی پھریری پیش کی۔ سب کے گلوں میں ہار ڈالے۔ جھنگل کو یاد کرتے رہے، "ہائے، سنا ہے اپنے اُستاد بارش وجی آ گئے ہیں۔ جب سے سنا ہے، بار بیلی کے بیے رتیاں تڑپ رہا ہوں۔ کہنا، صبح سویرے کے لیے نیازمند حاضری دے گا۔" انھوں نے جھنگل کے لیے گلوریوں کا ایک بڑا ہار ساتھ کر دیا۔

چھٹن صاحب سے رخصت لے کے ہم آگے چلے آئے۔ اُن کے بارے میں تھوڑا بہت مجھے معلوم تھا لیکن اتنی جزئیات سے نہیں، جتنی نصیب میاں نے اُس وقت بتایا اور سب کو حیران کیا۔ نصیب میاں کے کہنے کے مطابق چھٹن صاحب کا تعلق بدایوں کے ایک چھوٹے موٹے زمیں دار خاندان سے تھا۔ شروع ہی سے مزاج میں ایک سرمستی تھی۔ لکھنؤ آنا جانا کثرت سے رہتا تھا۔ وہاں کسی طوائف زادی سے آشنائی ہوگئی۔ نام تو اُس کا کچھ اور تھا، شرفن کی عرفیت سے مشہور تھی، چھٹن صاحب اُس کی چوکھٹ سے ایسے بندھے کہ دنیا و مافیہا کا ہوش نہ رہا۔ پھر اُسی پرانی کہانی کی تکرار، ساری زمینیں لد گئیں۔ کہتے ہیں، شرفن اُن کے ساتھ جانے کے لیے تیار تھی، لیکن اُس کی ماں، یا مالکہ وعدے سے پھر گئی اور چھٹن صاحب سے پیچھا چھڑوانے کے لیے راتوں رات لکھنؤ سے غائب ہوگئی۔ چھٹن صاحب جگہ جگہ شرفن کو ڈھونڈتے رہے اور آخر انھوں نے اُسے کلکتے میں جا لیا، مگر اُن کے پاس جانِ ناتواں اور قلبِ سوزاں کے سوا کچھ نہیں بچا تھا۔ بالاخانے کے دروازوں کا قفل سونے چاندی کی کنجیوں سے کھلتا ہے۔ سنا ہے، شرفن نے کسی ذریعے سے زرِ سپید بھجوا کے درماندہ چھٹن صاحب کی مدد کرنی چاہی اور قاصد سے کہا کہ جا کے اُن سے منت کرے، چھٹن صاحب کہ سب کچھ بھول جائیں۔ وہ بس کوئی خواب تھا۔ ہر خواب کی تعبیر نہیں ملتی۔ اسی میں اُن کی بہتری ہے، شرفن کی بھی، مگر کوئی خواب ہوتا تو بھول جانا بھی آسان تھا۔ بھول جانا آدمی کے بس میں ہوا کرتا تو اتنی کہانیاں کیسے تخلیق ہوتیں۔ چھٹن صاحب نے رقم واپس کر دی اور یہی کہلا بھیجا کہ اُن کا نقش تو شرفن کے نہاں خانے میں تابندہ ہے۔ جواب میں قاصد سے کہا کہ یہی انجام نوشتہ ہے تو پھر ہم بھی تمھارے آستانے پر نکلنا چاہیے۔ کوئی کام ہنر آتا نہیں تھا۔ کسی دُور افتادہ رشتے دار نے سلوک کیا، یا آبا و اجداد کی وراثت میں کچھ باقی رہ گیا تھا کہ شرفن کے بالاخانے کے عین مقابل دُکان لے کے پان فروشی شروع کر دی، اس طرح کم از کم ہر وقت شرفن کے دیدار کا تو اہتمام تھا۔

اب بیس سال سے اُوپر ہو رہے ہیں۔ درمیان میں شرفن کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ چھٹن صاحب کا خیال تھا کہ اس پتھر کے ہٹ جانے پر اُن کی کشتی بھی کنارے پر لگ جائے گی، لیکن شرفن بالاخانے کے شب و روز سے مانوس ہو چکی تھی، یا یوں کہا جائے کہ اُس کے دل میں بالاخانے سے باہر کی زندگی کا کوئی خوف بیٹھ گیا تھا۔ خود اُس کی عمر بھی ڈھل چکی تھی، وہ اپنی جہاں دیدہ ماں کی پیروی کرنے لگی۔ نئی لڑکیوں کی خریداری، انھیں رقص و موسیقی کی تعلیم سے آراستہ کرنے اور بار سنگھار، ناز و ادا کے گُر سکھانے کا کام۔ چھٹن صاحب انتظار کرتے رہے۔ گذشتہ دنوں شرفن، پرانے بالاخانے کی شکستہ عمارت ترک کر کے نئی کشادہ جگہ منتقل ہو گئی۔ چھٹن صاحب کی صبح تو شرفن کے دیدار سے طلوع ہوتی تھی اور رات کو اُس کا چہرہ دیکھ کے وہ حجرے کا رخ کرتے تھے۔ شرفن اُن کی دکان پر آتی ہے۔ بس صبح و شام اور دن میں کسی وقت بھی شرفن بالکونی پر نمودار ہوتی ہے، چھٹن صاحب کو تسلیمات کرتی ہے، چھٹن صاحب سینے پر ہاتھ رکھ کے سرِ خم کرتے ہیں۔ روز اُن کی طرف سے ایک گُل دستہ قاصد لے جاتا ہے اور شرفن کے ہاں کوئی نئی قسم کی چیز پکی ہو تو بالاخانے سے آ جاتی ہے۔ کلکتے آ کے شرفن کی ماں نے اُس کا لقب نوبہار رکھ دیا تھا۔ سوناگاچھی کے مشہور بالاخانوں میں ایک نوبہار کا بالاخانہ بھی تھا۔ بدایوں سے ہجرت کرنے کے بعد چھٹن صاحب کا کبھی اپنے شہر سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ کہیں آتے جاتے نہیں، بس دُکان سے حجرے تک۔ حجرے میں رات کا آخری اور دن کا ابتدائی پہر گزر جاتا ہے۔ باقی پہر تو شرفن اُن کے سامنے رہتی ہے، اُن کے قریب۔ گلی کے اُس پار شرفن اب ایک مال دار نائکہ ہے۔ معلوم نہیں، شرفن کی آسودگی مال و زر کی ہے، یا واقعی وہ بہت آسودہ ہے، مگر شاید مال و زر سے بڑی کوئی آسودگی اور

کوئی طاقت نہیں ہوتی۔

میرا جی چاہا تھا نصیب میاں سے کہوں کہ وہ کچھ دیر کے لیے شرفن یا نوبہار کے بالاخانے پر لے چلیں، لیکن جانے کیوں میں خاموش رہا، غالباً چھٹن صاحب کی وجہ سے نصیب میاں انھیں مختلف گلیوں میں گھماتے رہے۔ سوناگاچھی میں کوئی جشن برپا تھا جیسے آج کی رات، آخری رات ہو۔ ہجوم اور بڑھ گیا تھا۔ گھنگھروؤں، سازوں اور گانوں کی آوازیں ہر سُو گونج رہی تھیں۔

اُس طرف کریمن بیگم کا بالاخانہ بھی تھا۔ نصیب میاں نے بتایا کہ کریمن بیگم ابھی تک کلکتے واپس نہیں آئی ہے۔ وعدے کے مطابق جس رات کانتے شہ پارہ کے سودے کا بیعانہ لے کے بالاخانے پر گیا تھا، کریمن بیگم شہ پارہ کو لے کے فرار ہو چکی تھی۔ دوسرے روز ہم تبت کے سفر پر روانہ ہو گئے اور ہمارے [illegible] کے تیسرے روز شہ پارہ خود واڈے پر آ گئی تھی۔ بنارس [illegible] پڑنے میں کریمن بیگم کی آنکھ لگی تھی کہ شہ پارہ بھاگنے کا موقع مل گیا اور کانتے اُسے بمبئی میں جو مین کے پاس چھوڑ آیا۔ کریمن بیگم کی بدشگنی پر کانتے بہت طیش میں [illegible] تا تھا، ایک بار اُس کا پتا چل جائے مگر آدمی کو اپنی خبر نہیں ہوتی، خود اُس کے پاس کتنا وقت ہے، کانتے ہی نہیں رہا۔ قلق نہیں تو کریمن بیگم نے کسی اور شہر کا رخ کر لیا ہوگا۔ ایک شہ پارہ کا ہیرا ہی راستے میں کھو گیا تھا، باقی سارا کچھ تو اُس کی تحویل میں تھا۔ کلکتے سے چلتے وقت زیور، نقدی کی ڈھیریاں ہوں گی اُس کے پاس۔ کہیں بھی جا کے اُس نے پھر دکان کھول لی ہوگی۔ اب کوئی اور شہ پارہ ہوگی۔ کسی جگہ نہ سوداگروں کی کمی ہے نہ سودے کی، نہ بازار کی، اور ہنر تو کریمن بیگم کو پہلے ہی خوب آتا تھا۔

چھٹن صاحب کی عطیہ، بادہ مسالوں اور چاندی کے ورق سے مرصع گلوریوں کا لطف اُٹھاتے گلیوں گلیوں گھومتے ہوئے ہم ایک گلی میں آئے تو چلتے چلتے ایک جگہ نصیب میاں ٹھٹک کے رک گئے اور مجھے ٹہوکا مارتے ہوئے راز دارانہ لہجے میں بولے، "وہ سامنے کانتی بائی کے بالاخانے کی دہلیز کے ساتھ جو آدمی بیٹھا ہوا ہے، اُسے دیکھتے ہو میاں؟"

میری نظریں سامنے کی جانب گئیں۔ کچھ فاصلے پر بالاخانے کی فرشی منزل کے پہلو میں بڑے سے چبوترے پر ایک سن رسیدہ، مجہول قسم کا شخص اپنے آپ میں گم بیٹھا تھا۔

"کون ہے یہ؟" میں نے چونک کے پوچھا۔

نصیب میاں آنکھیں چڑھا کے ورشانے اُچکا کے بولے، "خدا ہی بہتر جانتا ہے، کہانیاں بہت مشہور ہیں۔ ساری کہانیاں"

تن و توش کا متوازن، نکلتا ہوا قد، چہرے کا بڑا حصہ لمبی کھچڑی داڑھی سے چھپا ہوا، رنگت سانولی، سر کے بال اُلجھے اور بکھرے ہوئے، سادہ پوش، شیروانی اور لنگی میں ملبوس۔ عمر ساٹھ سے کچھ اُوپر ہی ہوگی۔ عمارت کی اوپری منزل کا چھجا شاید آگے کو نکلا ہوا تھا اور سائبان کا کام دیتا تھا۔ میرا جی پیچھے

چبوترے پر ایک جانب دو چار صاف ستھرے برتن رکھے ہوئے تھے، اور کوئی چیز اُس کے پاس نہیں تھی۔

نصیب میاں نے بتایا کہ کسی کو نہیں معلوم، کہاں سے آیا ہے اور کیوں۔ کوئی تین ماہ سے اس نے یہاں ڈیرا جمایا ہوا ہے۔ صبح منہ اندھیرے نکل جاتا ہے اور ہُگلی کنارے میلوں پیدل چلتا ہوا واپس آ کے یہاں بیٹھ جاتا ہے۔ صرف کچی سبزیاں کھاتا ہے، وہ بھی فقط دوپہر کو۔ رات کو دودھ کا کٹورا پیتا ہے۔ آدھی رات تک بازار جاگتا رہتا ہے۔ ہر طرف سے اُٹھنے والے، گھنگھروؤں، سازوں اور من چلے راہ گیروں کے شور کے باوجود اپنے خاص وقت پر وہ دنیا سے غافل ہو جاتا ہے۔

کامنی بائی نے ایک صبح بالاخانے کے چبوترے پر اُسے بیٹھا دیکھا تو پہلے تو بڑی کبیدہ ہوئی، پھر شاید وہم و گماں نے آ گھیرا، خاموش رہی اور گھر سے کھانے کا تھال بھیجا۔ تھال واپس کر دیا گیا اور صرف اتنا پیغام قاصد کے ذریعے ملا کہ دودھ اور کچی سبزیاں مرغوب ہیں۔ کامنی بائی نے گاجر مولی، ٹماٹر، کچی کھائی جانے والی طرح طرح کی سبزیاں بھجوائیں۔ ان میں سے چند دانے روک کے باقی واپس کر دیا گیا۔ ابتدا میں راہ گیروں نے کوئی جنونی، سودائی اور بہروپیا سمجھ کے چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی، بعض سرمستوں نے فقروں کی بھی یورش کی اور قریب جا کے حال، حوال جاننے کی جستجو بھی، پتھر کنکر بھی اُچھالے۔ یہ شخص بت بنا بیٹھا رہا۔ کسی سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ راہ گیر پھر خود ہی باز آ گئے۔ کہتے ہیں، کسی وقت سر اُٹھا کے ناگواری سے دیکھا تھا کہ لوگ نظروں کی تاب نہ لا سکے۔ اُس کے بعد وہی ہوا، لوگ فریادیں کرنے اور نذریں گزارنے لگے۔ کوئی شہادت نہیں کہ اس نے کبھی روپیا پیسا قبول کیا ہو۔ یہ انھیں پھینک دیتا ہے اور ہاتھ جھٹک کے دھتکار دیتا ہے، جیسے رُوپے پیسے نہ ہوں، کھنکھیرے ہوں۔

لوگ دہائیاں دیتے ہیں تو سر جھکائے سنتا رہتا ہے، کوئی بہت زیادہ تکرار کرتا ہے تو سر اُٹھاتا ہے۔ اس کی شعلہ بار آنکھیں دیکھ کے فریادی کی زبان ٹھٹھر جاتی ہے۔ کبھی کسی کی منت زاری پر یہ ہاتھ اُٹھا کے اُسے روک دیتا ہے، وہ کچھ نہیں بولتا۔ منت گزار اسے کوئی تائیدی اشارہ سمجھ کے مطمئن ہو جاتا ہے اور خاموشی سے لوٹ جاتا ہے۔

پولیس بھی پہلے پہل کامنی بائی کے چبوترے پر اس کے مستقل قیام سے مضطرب ہو گئی تھی۔ وہ اسے وہاں سے ہٹانا اور مزاحمت کی صورت میں ساتھ لے جانا چاہتی تھی، لیکن کامنی بائی آڑے آ گئی۔ کامنی بائی نے نچلی منزل کا ایک کمرا اُس کے لیے مختص کرنے کی پیش کش کی تھی، لیکن یہ سودا نہیں ہوا۔ لوگوں کو تعجب ہے کہ اُس نے بازار کی یہ جگہ ہی کیوں منتخب کی۔ بہرحال، لوگ اسے اب پاگل نہیں سمجھتے۔ قیاس آرائیوں کے زاویے بدل گئے ہیں کہ ضرور یہ کوئی مجرم ہے اور مفرور ہے، پولیس کا مخبر ہے، یا کسی خطرناک ارادے سے یہاں دھرنا دیے ہوئے ہے، اسے یہاں آنے والے کسی مطلوب کی تلاش ہے، کوئی برگزیدہ بندہ ہے، جانے کیا کیا... پولیس اور چند عجیب قسم کے لوگوں نے اس کا تعاقب کرنے اور اصل حقیقت جاننے کا بہت جتن کیا، کسی کو کوئی سراغ نہ مل پایا۔ ہُگلی کنارے دُور تک چہل قدمی، اور واپسی سے قبل ایک خاص مقام پر غسل، اس کا معمول ہے، اس کے سوا کچھ نہیں، نہ مندر نہ مسجد، نہ گردوارہ نہ گرجا۔ وہ صرف کامنی کے قاصد سے مختصر کلام کرتا ہے۔ یہ ہندوستانی بولتا ہے۔ اس کا مطلب ہے، بنگالے سے تعلق نہیں۔

مجھے حیرت تھی، نصیب میاں کو اس شخص کے بارے میں اتنی تفصیل ازبر تھی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اتنا کچھ سن کے اُسے قریب سے دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ چند قدم کا فاصلہ طے کر کے ہم اس کے پاس پہنچ گئے۔ اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ نصیب میاں نے اپنے مخصوص لہجے اور لہکتے انداز میں اُسے سلام کیا۔ جواب میں اُس نے سر ہلایا ضرور۔

"اپنے ساتھ ہمارے پیارے، جان سے عزیز میاں ہیں۔ دیدار کی ہمت نے، راستے صاف کرنے کی کوئی تدبیر کرو۔ زمانہ ہو گیا، مراد بر نہیں آئی، آخر کب تک۔"

اُس شخص نے جھٹکے سے سر اُٹھایا اور لمحوں تک ہمیں گھورتا رہا۔ یکا یک اُس کے جسم میں ارتعاش سا رونما ہوا۔ وہ بے قرار نظر آنے لگا، اور چبوترے سے اُٹھ کر ہمارے سامنے آ گیا۔ نصیب میاں کا سر پا بل کھا گیا۔ سارے جسم اور زور دار کے جسم بھی اکڑ گئے۔ میں بھی خاصا متجسس تھا۔ اُس کا رُخ میری جانب تھا۔ مجھ سے ایک قدم کی دُوری پر آ کے وہ ٹھہر گیا۔ میں ساکت و جامد کھڑا رہا۔ واقعی اُس کی آنکھیں بڑی گہری تھیں، چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ میں نے بھی اپنی آنکھیں اُس پر مرکوز رکھیں۔ نہ اُس نے پلکیں جھپکیں، نہ میں نے۔ وہ مجھے عجب سی نظروں سے دیکھتا رہا، حیرت، اضطراب، یاسیت اور حسرت آمیز نظروں سے۔ اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو بے اختیار میرے ہاتھ کو بھی جنبش ہوئی۔ جانے اُسے کیا ہوا، میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پہلے دبایا، پھر سینے سے لگا لیا، آنکھوں سے مَس کیا، اور پپڑی جمے خشک ہونٹوں سے بوسہ دیا۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا، مگر اُس کی گرفت مضبوط تھی۔ میں نے بھی مزاحمت نہیں کی۔ نصیب میاں اُس سے کچھ اور کہنا چاہتے تھے مگر اس کا بلند ہاتھ دیکھ کے خاموش رہے۔ اُنھی کے اشارے پر ہم پھر وہاں نہیں ٹھہرے، لیکن مجھے ایسا لگتا رہا، جیسے اُس کی آنکھیں میرا پیچھا کر رہی ہوں۔ مجھ پر پہلی بار منکشف ہوا، میں ابھی کچھ کم خوش عقیدہ نہیں ہیں، شاید جاتی عمر میں آدمی کی وہ ہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ لمحوں تک خاموشی رہی۔ کچھ دُور تک نصیب میاں پوچھنے لگے۔ "کیوں میاں! آپ نے دیکھا؟"

میں نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔

"پتہ کی کوئی بات؟"

"ہاں۔" میں نے دبی آواز میں کہا، "خوب آدمی ہے۔"

"آپ 'خوب' کہہ رہے ہیں۔"

"اور کیا کہوں؟"

"آپ نے غور نہیں کیا۔ وہ صرف آپ کی طرف بڑھا تھا، اور اُس کی کیا حالت ہوئی تھی۔ میں نے نہیں سنا، جب سے وہ یہاں آیا ہے، ایسا کبھی ہوا ہو۔"

"شاید اس لیے کہ میں ہی کچھ طلب گار یا حاجت مند نظر آتا تھا۔"

"گویا اُس نے پہچان لیا میاں... صرف آپ کو... آپ ہی کو کیوں۔ حاجت مند تو ہم سبھی ہیں، ہم میں ہر ایک..."

"آپ کیا باور کرانا چاہتے ہیں نصیب میاں؟" میں نے پژمردگی سے کہا۔

"میاں! ہم تو جیسا کہ ہم نے اُس سے التجا کی تھی، ہم تو وہی چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ جہاں ملیں، جب بھی ملیں، ہم تو اپنے شہزادے کے لیے دُہائی دیتے رہیں گے۔ کیا معلوم، کس کی سفارش، کس کے کلام میں زور ہو۔ ہم سے آپ کا دُکھ نہیں دیکھا جاتا... قسم اللہ پاک کی۔"

"آپ کی محبت ہے نصیب میاں!" میری آواز بکھرنے لگی تھی، "سفر میں ایسے لوگ ملتے رہتے ہیں، طرح طرح کے روپ میں، مگر بس... اب تک جو ہوتا رہا ہے، وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اب تو، سچ پوچھیے تو اعتبار ہی اُٹھ گیا ہے۔"

"نا میاں، نا۔" نصیب میاں نے مجھے پہلو سے دبوچ لیا۔ "مایوسی نہیں، بالکل نہیں۔ جی تھوڑا مست کیجیے۔ آپ نے سنا ہوگا، دیر ہے، اندھیر نہیں اُس کے ہاں۔"

"مایوسی نہیں نصیب میاں... ایسا ہوتا تو گھر میں کیوں نہ بیٹھ جاتے۔ میں تو سفر میں جگہ جگہ ملنے والے ایسے لوگوں کے بارے میں کہہ رہا تھا۔"

"جہاں بھی ممکن ہو۔ جس رُخ، جس گلی کوچے میں۔" نصیب میاں حسرتی آواز میں بولے۔ "جتن تو اپنی طرف سے کرنے ہی پڑتے ہیں، اور کرتے رہنا چاہیے۔ مجھے تو اُس شخص میں کچھ عجیب صفات نظر آتی ہیں۔ آپ نے دیکھا، اُس نے ہاتھ اُٹھا کے مجھے روک دیا تھا۔ لوگوں کا کہنا ہے، ایسا کم کم ہوا ہے۔ یہ اچھا شگون ہے۔ بس سمجھو، کچھ بہتر ہونے والا ہے، خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

میں نے بھی بارہا اپنی ناکامی کو ستاروں اور سیاروں کی گردش پر محمول کیا ہے، لیکن اصل میں تو یہ محض اللہ قدرت کی کرشمہ کاری ہے۔ ان کا بھی ایسا تسلسل ہوتا ہے کہ آدمی دیکھتا

"دیکھو! یہ دو پنکھے ایئر کنڈیشنر کے ساتھ مفت ملے ہیں۔"

رہ جاتا ہے۔ ہم تو کئی بار اپنی منزل تک پہنچ چکے تھے۔ جیسلمیر میں، حیدرآباد، مرادآباد اور نگری سادات میں... بس چند دن آگے پیچھے... اور ان اتفاقات کی نوبت ہی کیوں آتی، اگر مولوی صاحب کے ہاں گرہ نہ پڑی ہوتی۔ کوئی شخص چھپے رہنے یا سامنے نہ آنے پر مُصر ہو، کسی کے سائے سے بھاگتا ہو، کسی نے کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کر لی ہو، تو وہ طلب گار، وہ ناہنجار کتنا اور کہاں تک جائے۔ کون سی کھوہ میں، کتنے دریا اور پہاڑ عبور کرے۔ کتنے گلی کوچوں کی خاک چھانے۔ بس یہی ہوگا، ہم تو نصیب میاں کے بہ قول، اپنے جتن کر رہے ہیں۔ کسی دن بھی گئے ہوں گے یا تو مولوی صاحب پسیج جائیں گے، یا جیسے وہ چاہتے ہیں، ابھی سپر ڈال دیں گے۔ یہی مولوی صاحب کی ناسمجھی ہے۔ وہ نہیں جانتے، یہ کوئی ضد نہیں، یہ تو کسی کی متاعِ جاں کی بات ہے، اس کی روح کی۔ اس کی سانس تو کسی آس سے بندھی ہے۔ نصیب میاں کی آزردگی کا خیال تھا۔ میں نے دبے لہجے میں کہا، "اس شخص کی ہیئت گدائی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ خود بڑا حاجت مند ہے۔"

"بے شک، بے شک، مگر سچ ہے میاں! اپنی دعاؤں میں تاثیر نہیں، جتنی دوسروں کی دعاؤں میں اثر ہوتا ہے، پھر صورت دوسری ہو جاتی ہے۔"

میں خاموش رہا۔

"مجھے تو لگتا ہے بھیا صاحب، اب منزل سے آپ کی آنکھ مچولی والی بات شاید نہ ہو۔ جانے کیوں، دل کہتا ہے، اس بار مراد بر آئے ہی آئے۔"

"ہاں نصیب میاں!" میں نے ان کی دل جوئی کے لیے نرمی سے کہا، "ہر بار ہم کسی اُمید ہی میں گھر سے باہر قدم نکالتے ہیں اور جب تک بن پڑے، جہاں تک بس میں ہو۔"

"بس میاں!" نصیب میاں نے مجھے روک دیا۔ "حوصلہ بلند رکھیے۔ اب آپ دیکھیے گا۔"

نصیب میاں کی خوش اُمیدی کی زور اور جبر و سے بھی شدت سے تائید کی۔

میں نے اُن سے جرح نہیں کی کہ اس سے حاصل بھی کیا تھا۔ سبھی دعا کرتے ہیں، ایک نہیں، بہت سے، بہت معصوم اور پاک باز لوگ۔ قبولیت کی کوئی گھڑی ہوتی ہے، تو معلوم نہیں وہ کیوں نہیں آتی۔"

ہم ایک اور گلی میں مڑ گئے، اور نصیب میاں نے گلا صاف کیا اور اپنا غبار دور کرنے کے لیے کچھ فاصلے پر واقع ایک عمارت کی طرف انگلی اُٹھائی۔ "پہلے اس گلی میں آنا ہوا ہے شہزادے؟" انھوں نے چہکتی آواز میں پوچھا۔

"کچھ یاد نہیں، یہاں تو سبھی گلیاں ایک جیسی ہیں۔" میں نے کہا، "کیوں، کیا کوئی خاص بات؟"

"ارے میاں، کیا پوچھیے... یہاں تو بہار آئی ہوئی ہے۔ اس گلی کے تو ان دنوں سارے شہر میں چرچے ہیں۔"

نصیب میاں نے بتایا کہ سامنے والی نسبتاً اونچی عمارت کا بالاخانہ گلاب بانو کا ہے۔ مجھے یاد آیا، تین مہینے پہلے ہمارے کلکتے آنے پر گلاب بانو کی دعوت آئی تھی کہ ہو سکے تو آج محفل بالاخانے آنے کی زحمت کرے، یا پھر اس کے طائفے کو اڈے پر حاضر ہونے کی اجازت دی جائے۔ جامو نے منع کر دیا تھا۔ محفل تازہ تازہ اسپتال سے اُٹھ کے آیا تھا۔ رات کو اڈے پر محفل آرائی ہوتی یا محفل بالاخانے جاتا، دونوں باتیں اُس وقت نامناسب تھیں!

نصیب میاں کے قدم بالاخانے کی جانب اُٹھ چکے تھے۔

"سنتے ہیں، کوئی آفتِ جاں، گلاب بانو کے جال میں پھنس گئی ہے۔ اتفاق سے اِدھر آنا نہ ہو سکا۔ آج آپ کے ساتھ کیوں نہ جلوہ کر لیا جائے۔" نصیب میاں نے لہک کے کہا۔

گلی میں سب سے ممتاز یہی عمارت تھی، رنگ روغن سے آراستہ، روایتی بالکونی پر سرسراتے ریشمی پردے، پردوں اور جھروکوں کے پیچھے سوئی سوئی سی روشنی۔ زینہ صاف ستھرا اور چوڑا تھا۔ زینہ عبور کر کے ہم ڈیوڑھی جیسے ایک مختصر کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ کیا تھا، کسی شیش محل سے چرایا ہوا حصہ۔ چھت اور دیواروں پر رنگ برنگے شیشوں کے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ چھت پر لٹکے فانوس کی روشنی سے سارا کمرا جھلمل کر رہا تھا۔ فرش پر بچھے دبیز قالین پر عمدہ گل کاری منقش تھی، کوئی ناز نیں، دو جبیں، حیرانی سے خیر مقدم کرنے پر آمادہ، در دونوں ہاتھ پھیلائے ایک بارش آشنا سب ساحل کی دارفتگی۔ اردگرد گلدان دار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہاں سے طرب گاہ میں جانے کے لیے ایک لمبے چوڑے دروازے کی دیوار حائل تھی۔ دروازے پر نفاست سے پھول پتیاں تراشی گئی تھیں۔ حرمن دکان میں رکھی چیزوں کی وقعت سوا ہو جاتی ہے۔

عموماً محفل کے وقت دروازے پر پردے پڑے ہوتے ہیں۔ دروازہ بند تھا اور اُس کے پہلو میں چھریرے جسم کا ایک ادھیڑ عمر شخص اسٹول پر بیٹھا نگرانی کر رہا تھا۔ دروازہ بند ہونے کے باوجود اندر برپا محفل کے نغمہ و ساز کی گونج بیرونی کمرے میں چھن رہی، دھمک رہی تھی۔ سارٹے عرصے تک بازار کے اڈے میں تعینات رہا تھا۔ نگہبان اُسے پہچان گیا اور سٹپٹاتا ہوا اسٹول سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ لمحے بھر کے لیے اُس کا جسم اکڑ سا گیا تھا، پھر اُس نے خفیف مسکراہٹ سے سب کو سلام کیا اور جھجکتے ہوئے بتایا کہ اندر کچھ خاص لوگوں کے لیے محفل جمی ہوئی ہے، اور آج رات گویا انھی کے لیے مخصوص ہے۔ گلاب بانو کی ہدایت ہے کہ آنے والے معززین سے معذرت کر لی جائے۔

"... جا کے گلاب بانو سے عرض کرو کہ کون آیا ہے۔ اپنے ... لاڈلے میاں آئے ہیں۔ بس ذری سی نشست ہو جائے..." نصیب میاں نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

"... خاص صاحب؟" سارٹے نے ناگواری سے پوچھا۔

"... نہیں آتی، مگر کوئی بڑے نواب رئیس اور بے سہارا سے لوگ ہی ہوں گے۔" نگہبان نے مؤدبانہ جواب دیا۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" سارٹے نے بگڑے منہ سے پوچھا۔

"خوب، سارٹے بھائی!" نگہبان شکایتی لہجے میں بولا، "نام ہی بھول گئے خادم کا۔ انجھو ہوں جناب! آپ کا پرانا خدمت گار، نمک خوار۔"

سارٹے نے ترشی سے اُس کا نام دُہرایا۔ "تم کو بڑے صاحب نے کیا بولا۔ اندر جا کے اُس گلاب بانو کو بتلا دو۔"

انجھو کا جسم بل کھانے لگا۔ اُس نے سارٹے سے معافی چاہی اور بولا، "کیا بتاؤں، بی بی نے سختی سے منع کیا ہے۔"

"کون بی بی... کون؟ تیں؟" سارٹے برگشتہ ہونے لگا، "یہ تو سسری کسبی دکان ہے۔"

"کیا بول سکتا ہوں سارٹے بھائی، خادم تو..."

سارٹے آگے آ کے انجھو کے سینہ بہ سینہ ہو گیا، اور جھڑکتی آواز میں بولا، "او نیچ، سنتے ہو کہ ہم کو جیسا بولا ہے، ویسا ہی کرو، یا پھر ہم... ہم دروازہ توڑ دیں۔"

"نہیں نہیں سارٹے بھائی!" انجھو بری طرح گڑبڑا گیا، "آپ فرماتے ہیں تو جاتے ہیں۔"

سارٹے نے کش مکش، بل کہ اذیت سے دوچار انجھو کو مزید کچھ کہنے نہیں دیا اور انگلی اُٹھا کے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ انجھو نے پھر کوئی تاویل و حجت نہیں کی۔ کمرے کے ایک اور مختصر بغلی دروازے سے پتا جھپکتا اندر چلا گیا۔ میں نے سارٹے کو واپسی کا مشورہ دیا تھا۔ نصیب میاں بھی متذبذب نظر آ رہے تھے۔ سارٹے راضی نہیں ہوا، کہنے لگا کہ گلاب بانو بہت ہوا میں اُڑ رہی ہے۔ آج اس طرح یہاں سے چلے گئے تو اُس کا دماغ اور پھر جائے گا۔ سارٹے کو اڈے کا بھرم عزیز ہونا چاہیے تھا۔ میں چپ ہو گیا۔ انجھو جلد ہی لوٹ آیا۔ وہ کیسے

نکل تھا۔ اس کے چند قدم پیچھے زرق برق لباس پہنے، زیورات سے لدی پھندی، ہار سنگھار کیے جو متناسب قامت اور بدن کی ادھیڑ عورت نمودار ہوئی، وہ گلاب بانو ہی ہو سکتی تھی۔ کبھی اپنے وقت کی خوش جمال عورت ہوگی۔ بڑی گھبرائی ہوئی تھی، مگر ہمارے رُوبرُو آ کے سنبھل گئی اور دیدے نچاتے ہوئے بولی،

"اخاہ بندی یہ کیا دیکھ رہی ہے، کیسے کیسے لوگ آئے ہیں۔ یقیناً راستہ بھول گئے ہوں گے، مگر وہ... اُس کا انداز اضطراری ہوگیا۔ اپنے بادشاہ سلامت نظر نہیں آ رہے، مغل وا، خدا اُن کی عمر دراز کرے۔ سنا ہے، کلکتے کی پھر یاد ستائی ہے۔"

"ہاں گلاب بانو! شکر ہے، اُستاد اپنے ٹھکانے پہ آ چکے ہیں،" نصیب میاں نے لکی آواز میں کہا، "ابھی بہت سے مشتاقانِ دید میں گھر سے، ہوئے تھے ایک خلقت جمع تھی واں، ہم بھی، یوں سمجھیے، چپکے سے نکل آئے۔ شہر میں دھوم تو بس آپ کی عشرت گاہ کی مچی ہوئی ہے۔ سوچا، ذرا ہم بھی تو کچھ دید [illegible]" [illegible] اپنے لاڈلے میاں کو اشارہ کیا اور چل پڑے [illegible]

"ارے، یہ لاڈلے میاں ہیں۔" وہ چلکیں [illegible] بولی، "ان کی تو کیا داستانیں سنی ہیں۔ خدا [illegible] اشتیاق تھا۔ ماشاء اللہ، چشم بدوور، جیسا سنا تھا، یہ تو واقعی کسی راج محل سے اُٹھ کے آئے ہیں۔" گلاب بانو نے سر خم کر کے مجھے مخاطب کیا، "آداب۔"

میں نے بھی گردن ہلا دی۔

"ایک ذرا بھنک مل جاتی کہ آپ لوگ یہاں کا رُخ کیا چاہتے ہیں تو بندی کچھ اہتمام کر لیتی۔ اب کیا عرض کروں، اُدھر آگرے کے قرب و جوار میں کسی رجواڑے کے معززین کی فرمائش تھی کہ آج رات صرف اُن کے لیے وقف کر دی جائے، بندی کی تو اسی نیاز مندی و دل داری میں کٹ گئی ہے، ساری زندگی صاحبانِ شوق کے اشاروں کی منتظر، اُن کی خوش نودی کی جستجو میں۔"

"ہاہا، خدا کی قسم کیا کلام ہے۔" نصیب میاں پھڑک کے بولے، "اگلے زمانوں کا سارا سناٹا اُن سنا آئینہ ہو جاتا ہے۔ آپ کو دیکھ کے تو گلاب بانو! یہ لگتا ہے کہ وقت کی آپ پر خاص مہربانی رہی ہے۔ آپ کے لیے تو وقت اپنی رفتار ہی بھول گیا ہے۔ آپ سے کترا کے گزرتا رہا ہے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے، جب جلوہ گر ہو، وہی تیور، تمکنت، وہ سادگی اور شیرینیِ کلام۔ اللہ اللہ، کیسا ریشم اور پھولوں میں رکھا ہے آپ نے خود کو۔"

"کیا نصیب میاں، آپ بھی..." گلاب بانو کا سراپا سوچ سوچ ہو گیا۔ "اپنا احوال تو آدمی خود ہی پہ تر جانتا ہے۔ اب کیا رکھا ہے، بدن کے قفس سے سارے پرندے اُڑ گئے، لُٹ گئی بہار... وہ کیا کہا ہے، خدائے سخن نے۔ اب جانِ جسمِ خاک سے تنگ آ گئی بہت..."

"واہ گلاب بانو! کیا بھولا ہوا شعر یاد دلایا، دوسرا مصرع ذہن میں جھنک رہا ہے... اور کیا خوب ہے۔"

"دوسرا نہ پوچھیے۔ بہت اداس کر دیتا ہے۔"

"ہے کیا؟ بتائیے۔" نصیب میاں مشتاقانہ انداز میں بولے، "ایمان سے سر میں گھوم رہا ہے۔"

"کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھویئے۔" گلاب بانو نے بادبِ تمام شعر مکمل کیا۔

نصیب میاں سر جھٹکنے لگے۔ "غزل کے شعر میں مٹی، ٹوکری، ڈھونا... یہ میر صاحب جیسے صاحبِ کمال ہی کا حصہ ہے۔ اپنا بس چلتا تو..." نصیب میاں نے مشکل سے زبان کو لگام دی۔ نصیب میاں کچھ کہنا چاہتے تھے کہ سارنگے نے تلخ لہجے میں دخل دیا۔ "اپنے لیے کیا بولتی ہو گلاب بانو؟"

"کیا مطلب سارنگے بھیا؟" گلاب بانو نے چٹ پٹاتی آواز میں پوچھا۔

"سارنگے میں! آج گلاب بانو واقعی کچھ مجبور معلوم ہوتی ہیں۔" نصیب میاں نے جھجکتے ہوئے لقمہ دیا۔

"کیوں گلاب بانو؟" سارنگے کا لہجہ کسی زور رعایت سے عاری تھا۔ "اپنے کو صاف صاف بولو۔"

"بندی نے سارا کچھ عرض کر دیا ہے۔" گلاب بانو نے اگلی زبان سے کہا۔

"مطلب، ہم لوگ چلتے ہیں۔"

"توبہ، توبہ، کیا کہہ رہے ہیں آپ سارنگے بھائی۔" یہ آپ کا گھر ہے۔ کبھی ایسا ہوا ہے؟ مغل وا کی طرف سے، اُن سے واسطہ رکھنے والا کوئی اس ناتے سے ادھر آ جائے، دن ہو یا رات، سنہیا رنگ۔

اور اُسے دروازہ بند ملا ہو۔"

"پھر آج کیا ہے؟" سارنے بپھر کے بولا۔ "آج تو بند ہے۔"

"آج بھی نہیں، آپ ہی کے گھر میں ہیں۔ یک نامراد کمرا نہیں، تو یہ سارا گھر آپ کے لیے کھلا ہے۔" گلاب بانو کی لجاجت میں وحشت شامل ہو گئی تھی، کہنے لگی، "آپ نے پوری بات کہاں سنی، بندی نے عرض کیا، آمد کی ایک ذرا خبر مل جاتی تو اِن موئے جنبیوں سے کوئی غرض رکھتی، نہ وعدہ کرتی۔ پرسوں رات ہی کی بات ہے کہ انھوں نے پہلی بار محفل میں قدم رکھا تھا۔ یہاں اور بھی گل رخ کے شیدائی تمنائی موجود تھے، بڑے بڑے صاحبِ حیثیت اور صاحبِ دل۔ اصرار ہوا کہ اب کی آئیں تو محفل انھی کے لیے مخصوص ہو۔ اُس رات ایسی واہ، واہ ... کی، جو سنا ہے، راجے مہاراجوں ہی کا شیوہ ہوتا ہے۔ بندی زیرِ بار تھی، اور سچ پوچھیے تو حیران پریشان بھی۔ اللہ جنت نصیب کرے، نانی آپا کہتی تھیں، ایسی بخشش و عطا کرنے والوں سے ایک ذرا احتیاط ہی دور اندیشی ہے، مگر کوئی کیا کر سکتا ہے... ہر دم جاسکتا ہے کہ بس، یہ اپنی بساط سے زیادہ ہے۔ ... والے کی بھی تو ایک بساط ہوتی ہے۔ گل رخ ... ہے، قیامت ہی آ گئی ہے۔ ہر وقت دھڑ کا لگا رہتا ہے، کس دم کیا تماشا ہو جائے۔ ایک دو ہوں تو سنبھال لیا جائے۔ یہاں تو شمار قطار ہی نہیں۔ حُسن تو چار دن کی چاندنی ہے، اور صرف ایک ہی بار چھلکتی ہے۔ حُسن کی چاندنی کو کم بخت ایک ہی مہینا ملتا ہے، دوسرا، تیسرا نہیں۔ اور ان چار دنوں کی رکھوالی کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں، کیا بتاؤں! تمھیں جلدی بھجوا دیتی ہوں۔ ان گنیوں میں سب سے پہلے اِسی بالا خانے پر رات ہوتی ہے۔ گل رخ کی باگیں الگ کھینچے رکھتی ہوں۔ آخر نو عمر ہے۔ اب دیکھیے، یہ آگرے والے بڑے ناگہانی کی طرح وارد ہو گئے..."

"اُوں ہُوں، عطائے ناگہانی کہو بانو!" نصیب میاں طرح دے کے بولے۔

گلاب بانو فقرہ شناس تھی، برملا نصیب میاں کی تائید کی، "ٹھیک ہی کہتے ہیں آپ۔ سخاوت کی ایسی ارزانی کہ لب کشائی کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ بندی نے وعدہ کر لیا کہ جیسا منشا ہے، تعمیل کی کوشش کرے گی۔ ایسے طلب گار کب ... رنگ

آتے ہیں۔ یہ جواڑوں کے پکھیتی معلوم ہوتے ہیں، اور زمانے کی بدلتی ہوا نے اِن پر بھی اثر کیا ہے۔ راج محلوں میں حکم چلانے والے اِن نوابوں، رئیسوں کو، وہ کیا کہتے ہیں، فیکٹریاں، کارخانے لگانے کا سودا سمایا ہے۔ بتا رہے تھے کہ شہر کے قریب ہی کسی جگہ کارخانے لگا رہے ہیں، کپڑے کے، جوٹ کے، جانے کیا کیا۔ پھر تو یہیں ٹھکانا ہو جائے گا۔ خُوبُو تو وہی شاہانہ مستانہ ہے۔ آتے جاتے اور بلاتے رہیں گے۔"

سارنے نے ہاتھ اُٹھا کے گلاب بانو کو روک دیا۔ "اِتنی گھتا پھیری کی ضرورت نہیں، اپنے کو بولو، ہم چلے جائیں پھر؟"

"کون بد بخت کہتا ہے، آپ یوں چلے جائیں۔ کس کی مجال ہے جو محفل والے کے ہاں سے آنے والوں سے یہ سرتابی کر سکے۔" گلاب بانو کا لہجہ شکوہ کناں ہو گیا۔ "سینے! بندی نے ساری عرض گزار دی ہے۔ یہ گھر ایسا مختصر نہیں۔ آپ کی دل جوئی کے لیے دوسری بیٹھک کھلواتی ہوں۔ ایک گل رخ نہیں، گلاب بانو کے پاس اور بھی پھول جھڑیاں، مہتابیاں ہیں۔ کوئی کسر نہیں رہنے دی جائے گی۔ سازندے البتہ سر دست گل رخ کے ساتھ ہیں، ورنہ وہ بندوبست بھی ہو جاتا! اور یہ تو صرف ایک رات کی بات ہے، بندی نے تو خود ہی پچھلی مرتبہ محفل والے کی آمد پر حاضری کی درخواست کی تھی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" گلاب بانو کی مرصّع تاویل و تکرار سے سارنے جز بز ہونے لگا تھا، منہ بنا کے بولا، "اپنے کو اچھا نہیں لگ رہا، صاف بولے دیتے ہیں۔"

"بندی کو کب اچھا لگ رہا ہے۔" گلاب بانو شکستگی سے بولی۔ "اپنے ساتھ لاڈلے بھائی ہیں... اور لاڈلے بھائی کون؟ اُستادِ محفل! سمجھیں؟"

"لاڈلے میاں سر آنکھوں پر۔ ایک گل رخ کیا، اِن پہ دس گل رخ قربان۔ بس ایک رات کی معافی کی دُہائی ہے۔ کل گل رخ ان کی خدمت میں حاضر ہو جائے گی، یہاں یا جہاں یہ چاہیں۔"

سارنے نے میرے پیچھے کھڑے جبرو اور زورا کی طرف بے چینی سے دیکھا۔ اڈے کے آدمیوں کا وتیرہ ہے کہ اُن کا کوئی معتبر ساتھی کسی معاملے میں جرأت کے کلام کر رہا ہو تو عموماً

وہ رخصت نہیں کرتے۔

"گل رُخ کی بات کون کرتا ہے گلاب بانو!" تیزی سے آگے آ کے جمرو درشتی سے بولا۔ "تم نے کسی کا نام لیا، کسی گل رُخ دل رُخ کا؟ اپنے سے زیادہ چھیڑ چھاڑ مت کرو۔ ہم کو اُسی جگہ جانا ہے، جدھر تمھارے وہ ہنتیا کے نواب، رئیس لوگ بیٹھے ہیں۔ اُن کو جا کے بولو، کون لوگ آئے ہیں۔ وہ سب پچھو آگے کو زبان مت چلانا اور اُن حرام کے جنوں کا تم کو اتنا دھیان ہے تو ہم لوٹ جاتے ہیں، پر..."

"نہیں نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" گلاب بانو سراسیمہ ہوگئی۔

"پھر دیر مت کرو، دروازہ کھولو۔"

گلاب بانو کے چہرے کی لالی پھیکی پڑ گئی۔ اُس کا چہرہ ہی بدل گیا تھا۔ لرزتے ہونٹوں سے کچھ کہنا چاہتی تھی، چپ رہی اور چند لمحوں کے سکوت آمیز تذبذب کے بعد اُس نے اچھو کو اشارہ کیا۔

اندر وسیع و عریض کمرے میں تو منظر ہی دوسرا تھا۔ یہ تو کچھ اور ہی جگہ تھی، کسی نواب، یا راجا کا شبستان، ہال مانند کمرے میں چہار اطراف دیواروں سے ایک ڈیڑھ گز آگے چھوٹی چھوٹی محرابیں، دیواروں میں جا بجا بنے طاقوں پر روشن شمعیں اور محرابوں پر لٹکے رنگ برنگے پردوں سے چھنتی، چھلکتی روشنیاں، کمرے کے وسط میں ایک بڑا فانوس جگمگا رہا تھا، منقش ستونوں سے لگے ہوئے لکڑی کے آرائشی سامان پر تازہ گل دستے، سارا کمرا خوش بوؤں میں بسا ہوا۔ ایک جانب بسنتی لباس میں سازندوں کا ٹولا۔ دو اطراف قالین، بیچ کے فرش پر غالباً لکڑی کی باریک پرت بچھی ہوئی تھی کہ گھنگھرؤں کی جھنک اور رقص کے دوران پیروں کی دھمک قالین کی دبازت سے متاثر نہ ہو۔

دروازے کے دائیں طرف کریم کڑھے ہوئے سلکی کرتوں اور سفید پاجاموں میں تین بدمست آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کی وضع قطع سے ظاہر تھا کہ دھوپ سے کنارہ کر رہا ہے۔ چہرے دمک رہے تھے۔ پختہ عمر کے ایک کم قامت شخص کے جسم پر چربی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ دوسرا ابھی لگ بھگ اُسی کی عمر کا تھا، قد میں کچھ نکلتا ہوا اور نسبتاً کم فربہ۔ تیسرے کی عمر چھتیس سال کے قریب ہوگی۔ جسم توانا تھا، لیکن قدرے اُبھرے ہوئے پیٹ نے غیر متوازن کر دیا تھا۔ اُن کی سلکی شالیں پیروں پر گری ہوئی تھیں۔ تینوں کی رنگت کم و بیش گندمی تھی۔ آٹھواں رنگ دولت کا ہوتا ہے، جو اُن کی اصل رنگت پر غالب تھا۔ اُن کی نشست کے پاس ایک گوشے میں شفاف شیشے کی میز پر صراحیاں اور جام رکھے ہوئے تھے۔

تینوں کے پہلو میں نیم عریاں لڑکیاں تھیں، اور وہ انھیں تقریباً دبوچے ہوئے تھے۔ اُن کے سامنے لکڑی کے فرش پر تین دل کش، نوخیز لڑکیاں رقص کناں تھیں، دو پیچھے، ایک آگے۔ آگے والی لڑکی تو بہ قول شخصے، چاند کا ٹکڑا تھی، جیسے سونے کی بنی ہو۔ مجرے کی محفلوں میں ایسا لباس میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ ہلکے ریشمی کپڑے میں اُس کا بدن چھپائے نہ چھپ رہا تھا۔ اُس کے عقب میں دونوں لڑکیوں کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ سامنے والی لڑکی یقیناً گل رُخ تھی، کستا ہوا، کھنچا ہوا بدن، نقش و نگار [illegible] کی کمر پر [illegible] نام؛ نخوت کی علامت، پھولے ہوئے نتھنے۔ کسی نے کہا ہے کہ حسن و جمال پر ناز و ادا استزاد ہے۔ عشوہ و غمزے کے بغیر حسن شاید نامکمل رہتا ہے۔ اُس کا بدن [illegible] سیاہ پلکوں کے درمیان بڑی بڑی مسکراتی آنکھیں، پارا بھرا، لچک، بل کھاتا سراپا۔

دروازہ عبور کر کے ہم جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے تو سارا کچھ تھم سا گیا۔ ساز بھی لمحے بھر کے لیے منجمد ہو گئے۔ بائیں طرف کی نشست پر ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ گلاب بانو کے اشارے پر سازندوں نے پھر ساز بجانے شروع کر دیے۔ لڑکیوں کے رقص میں بھی پہلے سے کہیں زیادہ تیزی آ گئی۔ گلاب بانو اپنے تینوں 'خاص مہمانوں' یا 'ممدوحین' کے پاس سر جوڑ کے بیٹھ گئی تھی۔ ہماری ناگہاں آمد پر اُن تینوں کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور چہروں پر خون سمٹ آیا تھا۔ گلاب بانو نے مؤدبانہ، ملتجیانہ انداز میں نوجوان سے کچھ سرگوشیاں کیں۔ نوجوان کے دونوں ساتھی بھی گلاب بانو کی معروضات سننے کے لیے قریب ہو گئے اور پہلو میں دبکی لڑکیوں پر اُن کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ سازندوں نے گلاب بانو کو اُن سے ہم کلام دیکھ کے ساز

بند کر دیے تھے۔ اُن تینوں صاحبانِ زر کے اطوار سے خیال تھا کہ خاصی دیر سے وہ خُم لنڈھاتے رہے ہیں۔ ہاتھ پیر اُن کے تابع نہیں رہے تھے۔ شراب دماغ کی نفی کرتی ہے، جو بہت اُلجھاتا، تھکا دیتا اور من مانیاں کرتا رہتا ہے۔ گلاب بانو نے ضرور ہمارے بارے میں انھیں بتانا چاہا تھا، تُن کے نوجوان نے مشتعل نظروں سے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی برہم تھے۔ گلاب بانو کی گزارش انھوں نے سنی اَن سنی کر دی اور کسی تامل کے بغیر ہمیں محفل سے نکل جانے کا حکم دیا۔ گلاب بانو ہاتھ جوڑ کے بنتی کرتی رہی۔ وہ خاصی حواس باختہ لگ رہی تھی۔ ایسے کسی تجربے سے پہلے کب واسطہ پڑا ہوگا۔ رقص کرتی لڑکیاں بھی رقص کرنا بھول گئی تھیں، تیز قسم کا کوئی پوربی گیت گاتی گل رُخ کی آواز بھی بہکنے لگی تھی۔

اس دوران کئی مرتبہ گلاب بانو نے بے چارگی سے ہم پر نظر کی۔ ہم بہ ظاہر مطمئن، بہ باطن مضطرب سارا تماشا [illegible] تھے۔ گلاب بانو کی مسلسل التجا پر ادھیڑ شخص اوسان [illegible] طیش میں آ کے اُس نے جام فرش پر پھینک دیا۔ [illegible] کے چھینٹے اُن تینوں اور گلاب بانو کے کپڑوں اور چہروں پر [illegible] جا بجا تھے۔ جام چوں کہ قالین پر پھینکا گیا تھا، [illegible] کرچیاں دور تک نہ جا سکیں۔ گلاب بانو نے دوبارہ اپنے قریب بیٹھے نوجوان کے پیر چھوتے ہوئے اور دست بستہ تحمل کی درخواست کی۔ اُس کی منتوں کا اُلٹا اثر ہوا اور وہ وحشی ہو گیا۔ اُلٹے ہاتھ سے اُس نے گلاب بانو کے منھ پر طمانچہ رسید کر دیا۔

ہم میں سے بھی کسی سے ہاتھ پانو توڑ کے بیٹھے رہا جا سکا۔ جمرو اور سارنے یک لخت اپنی جگہ سے اُٹھ پڑے اور نوجوان کی طرف لپکے۔ انھیں بڑھتا دیکھ کے نوجوان نے کمال پھرتی سے کرتے کے نیچے بنڈی میں اُڑسا ہوا طمنچہ نکال لیا۔ گلاب بانو واویلا کرتی ہوئی درمیان میں آ گئی تھی، نوجوان نے حقارت سے اُسے ایک طرف جھٹک دیا۔ اُس کے دوسرے ہاتھ میں اُٹھے طمنچے کا رُخ اپنی جانب اُمڈتے ہوئے جمرو اور سارنے کی طرف تھا۔ گرنے کے باوجود گلاب بانو فوراً کھڑی ہو گئی تھی۔ نوجوان اور اُس کے معمر ساتھی بُری طرح مشتعل تھے اور ایک طرح نوجوان کو مہمیز کر رہے تھے۔ میرا تو ٹھٹکنا اور اندازہ کرنے میں کوئی دیر نہیں لگی کہ چند لمحوں میں کیا سے کیا ہوسکتا ہے۔ نوجوان نے طمنچے کی زد پر اور ٹولیوں کے درمیان ہمیں فی الفور دفع ہو جانے کا حکم دیا۔ سارنے، جمرو اور زورا کے ہاتھ جیبوں میں چلے گئے تھے۔ میں نے جھپٹ کے اُن دونوں کو پیچھے سے جا لیا اور بہ وقت انھیں بازیں کرنے کی کوشش کی۔ ادھر ہاتھ اُٹھا کے میں نے مفاہمانہ لہجے میں نوجوان سے کہا، "ہم جاتے ہیں۔ جا رہے ہیں۔"

میری زبان سے یہ سن کے جمرو اور سارنے کو ششدر رہ جانا چاہیے تھا۔ اُن کے گلے میں بانہیں جکڑ کے میں نے اُن سے پرے ہو جانے کی عاجزی کی کہ کم از کم میری خاطر وہ میری بات مان لیں۔ وہ آپے میں نہیں تھے، اور انھیں روکنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اُن کے پیر پکڑنے کے لیے میرے ہاتھ پنڈلیوں تک گئے تھے کہ زچ ہو کے وہ فرش پر پیر پٹخنے لگے۔ اُس وقت نصیب میاں نے بھی میرا ساتھ دیا۔ زورا کا جسم بھی پھڑک رہا تھا۔ نصیب میاں نے اُسے قابو میں کیا۔

دوسری جانب گلاب بانو دہائیاں دے رہی تھی۔ لڑکیاں وہاں سے بھاگ چکی تھیں۔ جمرو اور سارنے کو دھکیلتا، دھکے دیتا ہوا، نوجوان کے سامنے سے ہٹانے میں، بہ ہر حال، میں کامیاب ہو گیا۔ وہ پلٹ پلٹ کے نوجوان اور اُس کے ساتھیوں کو خونیں یار نگاہوں سے دیکھتے اور مغلظات بکتے باہر نکل گئے۔ ہم نے جیسے تیسے، اُلٹے سیدھے قدموں سیڑھیاں طے کیں اور نیچے گلی میں آ گئے۔

جمرو، زورا اور سارنے پر سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ کچھ دور قدم سے قدم ملا کے وہ میرے ساتھ چلتے رہے۔ کسی نے زبان

نہیں کھولی۔ ہم جلدی بازار کے علاقے سے نکل آئے۔

اُن کی برہمی بالکل بجا تھی، اور مجھے اپنی دُوراندیشی پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ اُن کے لیے نوجوان اور اُس کے ساتھیوں پر حاوی ہو جانا کچھ دشوار نہیں تھا۔ گلاب بانو کے دروازے سے نکلتے وقت اُن کی آنکھیں پوری طرح کھلی ہوئی تھیں، لیکن دماغ پوری طرح حاضر نہیں تھے۔ نوجوان کے ہاتھ میں تمنچہ تھا، ورنہ وہ اپنے بس میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ شراب سے تیز دولت اور زر کا نشہ ہوتا ہے۔ جمرو اور سارنگے کے پاس چاقو تھے جو اُنھوں نے بروقت باہر نکال لیے تھے۔ وہ اپنے عمل اور اڈّے سے تعلق کے زعم سے آسودہ تھے۔ دوسرے ہی لمحے کچھ بھی ممکن تھا۔ ہم میں سے کوئی تمنچے کی زد پر آ جاتا، یا اُن میں سے کوئی جمرو اور سارنگے کے چاقوؤں کی۔ پھر وہی ازخمی، وہی معمول، پولیس، بازار بھر میں ہنگامہ، گلاب بانو کے جہن، شہر میں رُسوائیاں، طرح طرح کے قصّے، کہانیاں، افواہوں کا ایک سلسلہ، اور ایک کے بعد دوسرا خون، دوسرا، تیسرا۔ جانے کتنے عرصے تک بے دست و پائی، معطلی۔

جمرو، زورا اور سارنگے اتنا کچھ نہیں جانتے تھے۔ جتنا کچھ میں دیکھ چکا اور آزما چکا تھا۔ بے شک اُنھیں اڈّے کے آدمیوں کی سُبکی، دُور دُور تک جیسی اُستاد مُغل کے اڈّے کی ہیبت پر زک آنے کا خیال مضطرب کیے ہوگا۔ اُنھوں نے مطلق نہیں سوچا کہ یوں مُغل کے اڈّے سے متعلق آدمیوں کی برداشت اور ہوش مندی کا پہلو بھی تو نمایاں ہے۔ آج کے بعد کل بھی تو آتی ہے۔ آج کی پسپائی ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ پرورش سے غصّہ کچھ بین ہو جاتا ہے۔ میرے جسم و جاں میں بھی اُن سے کچھ کم آگ نہیں لگی تھی، لیکن کہتے ہیں، غصّے میں نظرثانی کا جبر، یا زہر مفید رہتا ہے۔ برداشت اور ہوش مندی کی بھی اپنی ایک ساکھ ہوتی ہے، وحشت اور غضب سے زیادہ مؤثر۔

بازار کے سرے پر رات بھر کھلے ایک چائے خانے میں بے جا سکے میں نے اُنھیں یہی کچھ، یہی عواقب و نتائج باور کرانے کے اپنے طور پر جتن کیے۔ صاف ظاہر تھا کہ میری حجتوں سے وہ متفق نہیں ہو پائے۔ اُن کی خاموشی محض مروّت ہے، میرا اتنا نہیں تو اُستاد مُغل کے عزیز از جاں کا لحاظ۔

ہم اڈّے واپس آ گئے۔ رات اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ اڈّے پر کسی حد تک چہل پہل تھی۔ مُغل چوکی سے اُٹھ چکا تھا۔ جا سوا اڈّے کے لوگوں کے درمیان گھرا کسی معاملے میں اُلجھا ہوا تھا۔ اُن سب کو نظرانداز کرتا ہوا اپنے کمرے میں آ کے میں بستر پر دراز ہو گیا۔ جمرو، سارنگے اور زورا کی مفارقت سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھ سے واقعی کوئی کوتاہی ہو گئی ہے۔ خود کو قائل کرتے کرتے کسی وقت آنکھ لگ گئی۔ یہ خوابیدگی بھی کسی اطمینان سے ممکن ہوئی ہوگی۔ جمرو، زورا اور سارنگے کو نیند نہیں آئی ہوگی۔

صبح جلدی آنکھ کھل گئی تھی، لیکن اُٹھنے کو جی نہیں چاہا، بستر میں پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ اڈّے کے کسی آدمی کی دستک پر آخر مجھے اُٹھنا پڑا۔ دس بج چکے تھے۔ چوکی پر اچھے خاصے لوگ مُغل کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ سارنگے، جمرو اور زورا بھی وہاں موجود تھے، چپ چپ اور بجھے بجھے سے۔ میں نے مسکرا کے اُن کی طرف دیکھا تو جواب میں اُنھوں نے بھی وضع نبھائی۔ مُغل کے پرانے شناسا کسی بڑے دُکان دار کی طرف سے ناشتے کا اہتمام کیا گیا تھا، پوری، کچوری، پراٹھے، ترکاری، قیمہ، انڈے، مکھن، ملائی، چائے، ڈبل روٹی وغیرہ۔ بھر سے اُدھر خوانوں کا انبار لگا ہوا تھا۔

جمرو اور سارنگے سے کوئی بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ ناشتا کرتے ہی مُغل مجھے ساتھ لے کے اڈّے سے نکل گیا اور ایک مرتبہ پھر ہم اُس مسجد اور متصل مدرسے میں پہنچ گئے، جہاں میں متعدد بار سر پھوڑ چکا تھا۔ ایک دفعہ تو میں اور مُغل مولوی صاحب کے چھوڑے ہوئے سامان کی تلاش میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔ مُغل نے ملحق بازار اور کولوٹولا اسٹریٹ کی دکانوں پر بھی معلوم کیا، خصوصاً مرادآبادی برتنوں کی دکانوں پر۔ اُب شہر کے نواحی علاقوں میں جانے کی کوئی تک نہیں تھی۔ نواحی علاقے میں ٹھکانہ کرنے کے بعد شہر میں اپنے جاننے والوں کے پاس ایک بار تو مولوی صاحب کو ضرور پھیرا لگانا چاہیے تھا۔ میں تو معمول کے مطابق کسی بچّے کے مانند اُنگلی پکڑے مُغل کے ساتھ چلتا رہا۔ اُس کی طرح میرا ذہن بھی اِس بعید ترین گمان سے ناآلودہ نہیں تھا کہ تو اب ثروت کے

سانحے کے بعد بدحواسی میں مولوی صاحب کسی طرف بھی مُنہ اُٹھا سکتے ہیں، کہیں نہ کہیں تو اُنھیں سر چھپانا ہی ہے۔ کلکتے میں اُن کی موجودگی کا ویسے کوئی امکان نہیں تھا، مگر ہو سکتا ہے، دماغ میں کچھ سما گیا ہو کہ یہاں اُن کی واپسی اور قیام کی توقع میرے لیے خارج از تصوّر ہوگی۔ کبھی چراغ تلے کی جگہ زیادہ محفوظ ہوتی ہے۔ کلکتا سب سے بڑا شہر ہے، بھیڑ میں گم ہو جانے کے امکانات یہاں زیادہ ہیں۔ سارا علاقہ اُن کا دیکھا بھالا ہے۔ شناساؤں کی بھی کثرت ہے۔ ہو سکتا ہے، آپ کے اِس طرف آنے کی اُنھوں نے جرأت کر لی ہو۔ اور کچھ نہیں ہوا، کسی کو مولوی صاحب کی خبر نہیں تھی۔ اندھیرا تو کبھی سمندر سے بڑا، سمندر سے گہرا ہوتا ہے۔ ہمیں اندھیروں میں ہاتھ پاؤں مارتے رہنے کی عادت ہو گئی۔ اپنے معمول کا فریضہ انجام دے کے سہ پہر تک ہم اڈّے لوٹ آئے۔

چار بج رہے ہوں گے، دھوپ بوڑھی ہو چکی تھی۔ ہم اُوپر سے پہنچے تھے کہ تیجا نے چوکی پر آ کے مُغل کے کان میں سرگوشی کی۔

"اپنا ادم کار، بڑ مچھو..." مُغل نے حقّے کی منال دہنوں سے ہٹا کے تعجب سے پوچھا۔ "اب تک وردی ڈالے ہوئے ہے کیا؟ چھٹی نہیں ہوئی اُس کی؟"

"سب کی اُستاد، اب وردی میں نا ہیں، چار آدمی اور بھی ساتھ ہیں۔" تیجا نے مستعدی سے جواب دیا۔ "گھوڑا گاڑی میں آئے ہیں۔"

"پورا پولیسا ہے۔" مُغل نے حقّے کا کش بھرتے ہوئے کہا۔ "ساری عمر ڈنڈا گھماتا رہا ہے، پولیس کا ڈنڈا تو جادو کا ہوتا ہے۔"

مُغل سے اجازت لے کے تیجا فوراً باہر چلا گیا اور قریباً ایک منٹ میں لوٹ آیا۔ اُس کے ساتھ سب سے آگے دراز قامت، سانولی رنگت، گیروے کُرتے، سفید پاجامے اور کھادی کے کوٹ میں ملبوس عمر رسیدہ شخص کا میں چہرہ آشنا تھا۔ وہ کلکتا پولیس میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھا۔ جسم کچھ بھاری ہو گیا تھا اور سفید مونچھیں بھی کچھ اور دراز اور گھنی ہو گئی تھیں، اور کوئی شکاری معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے لمحے میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ادم کار کے عقب میں جو چار آدمی دروازے سے داخل ہوتے نظر آئے، اُن میں تین وہی مستانے تھے، جنھوں نے گزشتہ رات گلاب بانو کے بالاخانے پر ہم سے بدسلوکی کی تھی۔ میری طرح جمرو، سارنگے اور زورا کا حال بھی دگرگوں ہوا۔ اُن تینوں کے ہمراہ اُنھی جیسی چھب ڈھب، بڑی عمر کا ایک بُردبار شخص بھی تھا۔ چاروں کے چہرے تمتما رہے تھے۔ وہ عام مگر اُجلا لباس پہنے ہوئے تھے اور صاف ظاہر تھا کہ گھبرائے ہوئے لگ رہے تھے۔ چاروں نے چوکی پر آ کے مُغل کو نمسکار کیا۔ ادم کار کو دیکھ کے مُغل اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ دونوں بغل گیر ہو گئے اور دیر تک ایک دوسرے کو گدگداتے رہے۔ ادم کار کی زبانی معلوم ہوا کہ سال بھر پہلے وہ ملازمت سے سبک دوش ہوا ہے
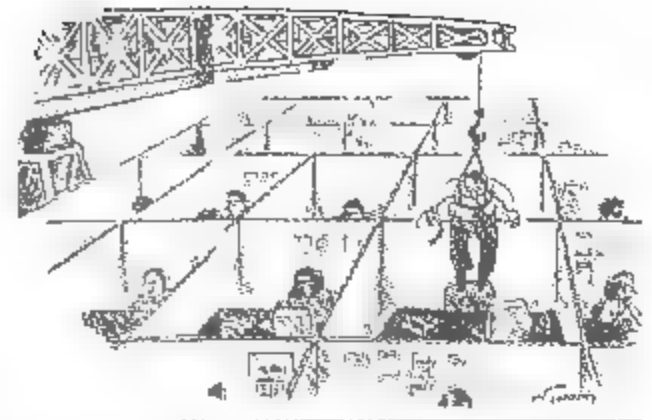
اور اب اپنے کاروبار اور زمینوں کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ ساتھ آنے والے چاروں اشخاص کا تعارف کرانے میں اُس نے بڑی عجلت کی۔ مُغل کو بتایا کہ اُن سے اُس کے دیرینہ مراسم ہیں۔ عرصے پہلے آگرے میں ملازمت کے دوران جو تعلق قائم ہوا تھا، وہ آج تک قائم ہے اور دوستی میں بدل چکا ہے، اور اب اُسی کے ایما پر اُس کے صاحبِ حیثیت اور صاحبِ دل دوستوں نے کلکتے میں کاروبار جمانے کا اہتمام کیا ہے۔

میں، زورا، جمرو اور سارنے مُغل کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ مجھے اوم کار کی آمد کے مقصد کا کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا، لیکن میرا قیاس غلط بھی ہو سکتا تھا۔ اوم کار پولیس کا آدمی تھا۔ مدعا زبان پر لانے میں بھی اُس نے دیر نہیں کی۔ زبان تو سارے انسانی اوصاف میں سب سے ممتاز ہوتی ہے۔ اُسے بات کرنے کا ہنر بھی آتا تھا۔ گزشتہ رات گلاب بانو کے بالاخانے پر پیش آنے والے واقعے کی سنگینی کو اُس نے خوش اسلوبی سے بدمزگی اور تلخی سے تعبیر کر دیا۔ کہنے لگا کہ اُس کے مربی سیر سپاٹے، ایک ذرا وقت گزاری کے لیے گلاب بانو کے بالاخانے چلے گئے تھے۔ گلاب بانو نے ان سے خلوت کا وعدہ کیا تھا۔ وعدے کے مطابق اُس نے دروازہ بند کر دیا تھا اور دربان کو نگرانی کی ہدایت کر دی تھی۔ یہ لوگ اس اعتماد میں تھے کہ محفل اُنھی کی ہے، اُنھی کے لیے مخصوص۔ سو وہاں تھوڑا بہت شغل بھی جاری تھا کہ اس دوران اڈّے کے آدمی وارد ہو گئے۔ اُمید کے خلاف اچانک اجنبی آدمیوں کو داخل ہوتا دیکھ کے اِن سے تھوڑی نادانی سرزد ہو گئی۔ گو گلاب بانو نے انھیں آنے والوں کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی، لیکن صاف بات ہے، انھیں یہ مداخلت زیادہ اچھی نہیں لگی۔ عالم ہی اُس وقت سب کا دوسرا تھا، نہیں سمجھے کہ سامنے کون لوگ ہیں۔ غصے، چاقو نکل آئے، لیکن اڈّے کے آدمیوں نے کمال کیا، بہت تحمّل اور تدبّر کیا، اور بات ٹل گئی۔

اوم کار نے کہا کہ اُسے کچھ علم نہیں تھا۔ صبح گلاب بانو اُس کے پاس فریاد کرتی آئی تھی، کیوں کہ گلاب بانو کو معلوم تھا کہ کلکتے میں یہ معززین اوم کار کے مہمان ہیں، اور اُس کے ایک بنگلے، مہمان خانے میں ان کا قیام ہے۔ کچھ غلطی گلاب بانو کی بھی تھی کہ خلوت کا وعدہ کرتے وقت اُس نے کسی اہم شخص کی آمد پیشِ نظر کیوں نہ رکھی۔ کوئی بھی سرکاری افسر منہ اُٹھائے وہاں کا رُخ کر سکتا تھا۔ اوم کار کہنے لگا کہ اُسے ساری رُوداد معلوم ہوئی تو اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ مُغل اُستاد کے پاس اپنے معزز و محترم دوستوں کی سفارش کرے۔

مُغل بھی لاعلم تھا۔ زورا، سارنے اور جمرو نے شاید کسی کو نہیں بتایا تھا کہ رات ہم سب کہاں گئے تھے اور کیا اَن ہونی ہو چکی تھی۔ ہم میں سے کسی کے بجائے مُغل نے نصیب میاں کو آواز دی۔ نصیب میاں پاس ہی بیٹھے تھے۔ دو قدم کا فاصلہ طے کر کے مُغل کے رُوبرو ہو گئے، اور انھوں نے صورتِ حال کا تخمینہ لگا کے دبے لہجے میں کہ رات گزشتہ کے اندر... سارا ماجرا سنایا اور زیادہ تمہید نہیں باندھی۔ مُغل نے خاموشی سے سنا اور سر ہلانے لگا۔ "ٹھیک ہے اوم کار جی، صاحب بہادر! ان لوگ نے اپن کو کچھ نہیں بولا تھا۔" اُس نے بھاری آواز میں کہا، "آپ ساتھ آئے ہو تو ہم کیا بولیں۔ اپنے لوگوں کو کھینچے رکھیں گے۔ یہی پوچھتے ہو نا آپ؟"

"بس یہی اُستاد! ہم کو پتا تھا، ہم مُغل اُستاد کے پاس جا رہے ہیں۔" اوم کار رَس بھری آواز میں بولا اور اپنے مہمانوں سے مخاطب ہو کے کہنے لگا، "دیکھا آپ لوگوں نے، ہم کیا کہتے تھے، کس آدمی کے پاس جا رہے ہیں۔ آخر کو بڑا بڑا نانا ہے۔"

اُن چاروں نے ہاتھ جوڑ کے مُغل کو نمسکار کیا اور سب سے معمّر آدمی نے واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کے وزنی لفافہ نکالا اور مُغل کے آگے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" مُغل نے ترشی سے پوچھا

"اِسے رکھ لو اُستاد۔ ان کی خوشی یہی ہے۔" اوم کار رازدارانہ انداز میں بولا۔

"آپ ساتھ آئے ہو، چپ رہنا بہتر ہے۔" مُغل نے کسمسا کے کہا، "اُٹھا لو اسے صاحب، اور جا کے کسی مندر پہ چڑھا دو۔ ایک آدھ کی بلی ہونے سے رہ گئی۔ اپنے کو پتا ہے، کس کے کارن۔"

"ٹھیک کہتے ہو اُستاد! بس بھگوان کی کرپا ہو گئی۔" اوم کار نے ہاتھ پھیلا کے فراخ دلی سے اعتراف کیا اور لفافہ مُغل کے پیروں کی جانب کھسکاتے ہوئے بولا، "پر اِسے... اِسے تو اب سویکار ہی کر لو۔"

"نانا، زیادہ مت بولو اوم کار جی!" مُغل نے اکھڑی ہوئی آواز میں کہا، "اب آپ جاؤ۔"

معمّر شخص نے اوم کار کے اشارے پر جھجکتے ہوئے لفافہ اُٹھا لیا۔

وہ سارے جلد ہی چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد مُغل نے ہم سے کوئی بازپرس نہیں کی۔ وہ حقّے کے کش لیتا گم سُم بیٹھا رہا۔ اِس اثنا میں توقع کے مطابق میرے نزدیک موجود جمرو، سارنے اور زورا کچھ اور پاس آ گئے، اور زورا نے میرے ہاتھ پر جسم کا سارا زور ڈال دیا۔ کچھ یہی حال جمرو اور سارنے کا تھا۔ اُنھوں نے میرے دونوں بازو جکڑ لیے۔ زبان سے کچھ نہیں کہا، لیکن آنکھیں بھی تو کلام کرتی ہیں اور کبھی کبھی تو زیادہ فصاحت اور بلاغت سے۔ الفاظ تو لہجے کے محتاج ہوتے ہیں۔ آنکھیں تو بجائے خود لہجہ ہوتی ہیں۔

سورج واپسی کی جلدی میں تھا۔ اوم کار اور اُس کے دوستوں کو گئے گھنٹا، پون گھنٹا گزرا ہو گا کہ سونا گاچھی کے ٹھکیا اور اُس کے دو حواریوں کے ساتھ گلاب بانو اڈّے پہ آن وارد ہوئی۔ واجبی بناؤ سنگھار کیے، نہایت سادہ لباس میں، چوڑی دار پاجامہ، لمبا کرتا، دوپٹے سے سر ڈھکا اور چادر میں بدن لپٹا ہوا۔ مٹھائی اور پھولوں کے ٹوکرے ساتھ لائی تھی۔ گزشتہ رات کی رُوداد سنانا چاہتی تھی کہ مُغل نے اُسے روک دیا اور صرف اتنا کہا، "کوٹھا ہی رہنے دو تو ٹھیک ہے۔"

گلاب بانو کے بدن میں جھرجھری سی آئی، سر جھکا کے لجاجت سے بولی، "یہی ہو گا اُستاد۔ بندی کو رات کا سبق یاد ہے۔ آگے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"
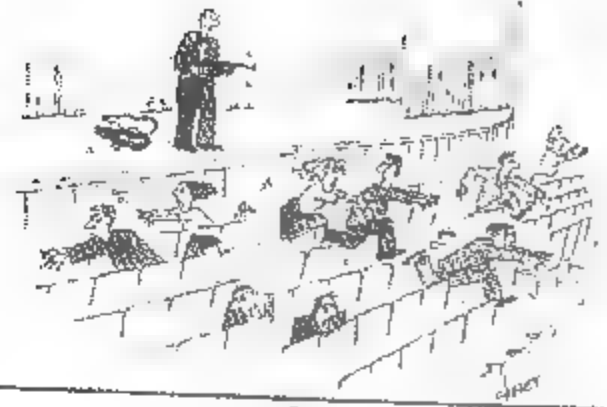
وہ اُٹھ گئی۔ چلتے چلتے اُس کی نظر مجھ پر پڑی، اور آ کے میرے عین سامنے بیٹھ گئی۔ اُس نے مخصوص انداز میں مجھے تسلیم کی، اور اِدھر اُدھر سرسری طور پر دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی، "بندی کو آپ کا انتظار رہے گا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اُس کی آواز اور دھیمی ہو گئی، کتراتے ہوئے لہجے میں چپکے سے بولی، "جب آپ اشارہ کریں گے، کل رُخ خدمت میں پیش ہو جائے گی۔"

میں نے آنکھیں میچ لیں۔

گلاب بانو پھر وہاں نہیں ٹھیری۔

مسلسل پانچ دن تک ہم آس پاس کی بستیوں میں جاتے رہے۔ روز سورج غروب ہوتے وقت اڈّے پر بھاری واپسی ہوتی تھی اور اُس وقت ایک ازدحام مُغل کا منتظر ہوتا تھا۔ دُکان دار، علاقے کے خاص آدمی، پرانی جان پہچان کے لوگ، مختلف اڈّوں کے اُستاد، کئی کارخانے داروں کی طرف سے نذریں آئی تھیں۔ پولیس کے کئی آدمی بھی سادہ لباس میں مُغل سے ملنے آئے تھے۔ لوگوں کی بے اندازہ آمد کی ایک وجہ یہ تھی کہ شام سے رات گئے تک صرف مُغل چوکی پر بیٹھتا تھا اور اُس نے ساتویں دن پھر واپسی کا اعلان کر دیا تھا۔ اطراف کے بہت سے معاملات اُس کی آمد کی وجہ سے رُکے ہوئے تھے۔ علاقے کے بعض لوگ اپنے ذاتی مسائل، مناقشے، قضیے لے کے اُس کے پاس آنے لگے تھے۔ مُغل کو ساری رُوداد سنگین مخالف لوگوں کی طلبی، اُن سے جرح کرنی اور فیصلہ سنانے

ناروا کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ ان میں چند خاندانوں کے طلاق کے معاملات تھے اور کام چوری، کاہلی، گھر کا خرچ ادا نہ کرنے، مار پیٹ، گالم گلوچ، کسی کی جگہ پہ ناجائز قبضے کرنے کے چھوٹے موٹے واقعات بھی شامل تھے۔ اِن لوگوں سے جھَل کے پرانے مراسم تھے۔ شادی بیاہ میں جھَل کی مرضی کو دخل رہتا تھا۔ علاقے کے لوگوں میں ایسی شناسائی کے لیے جامو کو بھی بہت زمانہ چاہیے تھا۔ بھتّے کی تقسیم، علاقوں کی حدود کا تعین اور پولیس سے باہمی طور پر نمٹنے کے مشوروں میں باقی وقت نکل جاتا۔ تین دن سے یہی ہو رہا تھا۔ شام کو اڈّے پہ آ کے جھَل کو ایک پل کے لیے فرصت نہیں ملتی تھی۔ جامو اور اڈّے کے بہت سے آدمیوں کے کہنے پہ جھَل نے دو دن کا اضافہ اور کر دیا تھا۔ عمارت میں سب کے لیے کھانا پکتا رہتا رہا، لیکن کسی رات محفل نہیں جمی۔ جھَل نے جامو کو سختی سے منع کر دیا تھا۔

پانچویں دن صبح ہی صبح مولوی صاحب کی تلاش کے بجائے جھَل نے جیل خانے جانے کا عزم کیا۔ جامو، سار سلے، زورا اور جمرو کے علاوہ میں بھی ساتھ ہو گیا۔ پہلے میرا ارادہ نہیں تھا، پھر میں نے خود کو تلقین کی۔ اڈّے کے آدمیوں کو جیل خانے سے بے مسرت زیب نہیں دیتی۔ بڈّا وکیل بھی ہمارے ہم راہ تھا۔ اڈّے کے لوگ چھوٹی بڑی مدت کے لیے ہمیشہ جیل میں رہتے ہیں۔ اِتنے عرصے بعد جیل کی حدود میں قدم رکھتے ہوئے دل گھبرانے لگا تھا۔ سب کچھ وہی تھا، وہی در و بام، وہی جالے اور دیواروں پر داغ دھبے اور بوسیدگی۔ جیل میں وقت یوں بھی رینگتے ہوئے گزرتا ہے۔ یہاں میں نے سات سال کے قریب عرصہ گزارا تھا، ایک ایک دن گِن گِن کے۔ عملے کے بہت سے لوگ بدل چکے تھے، لیکن نچلے درجے کے بیش تر ملازم اپنی جگہوں پر تعینات تھے۔ وہ مجھے پہچان گئے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ اِن میں جیلر صاحب کا پرانا خدمت گار رام داس بھی تھا،

وہ تو رونے لگا۔ اُس کی کمر کچھ اور جھک گئی تھی۔ جن ملازموں نے ساری زندگی جیل کی چار دیواری میں قیدیوں کی نگرانی کرتے گزار دی تھی، اُن میں اور قیدیوں میں کتنا فرق ہے۔ رام داس کی پوری زندگی بھی یہیں گزر گئی تھی۔ پرانے جیلر کے بعد نیا جیلر آ جاتا تھا، رام داس وہیں قائم تھا۔ خاک روب اور سنتری وغیرہ جانے کب سے جیل کی دیواروں کے اندر مستقل ملازموں کے لیے مخصوص مکانات میں مقیم تھے۔ قیدی بدل جاتے تھے، یہ لوگ یہیں رہتے تھے۔ جیل کے اِن ملازموں کو قیدیوں کے ساتھ رہتے ہوئے یقیناً اُنسیت ہو جاتی ہوگی، تو پھر قیدیوں کی رہائی پر بچھڑ جانے کا دُکھ بھی اُنھیں ہونا چاہیے۔ جیل کے اِن مستقل کارندوں کی حیثیت تو در و دیوار جیسی ہے۔ لوگ آتے، کچھ وقت گزارتے اور اپنے راستوں پر چلے جاتے۔ یہاں عمر قید کے لوگ بھی موجود تھے، مگر اُن کی اسیری کی بھی ایک مدت ہوتی ہے، بچھڑ جانا اُنھیں بھی ہوتا ہے۔ یہ کیسا عجیب ہے کہ ایسی رہائی کسی کے لیے خوشی، کسی کے لیے دُکھ کا باعث ہے۔

سب کو ایک ساتھ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ جھَل نے پہلے وکیل کو خاص خاص نام بتائے تھے، صرف اُنھی سے ملاقات ہو سکتی تھی۔ ہمیں اندر جانے کی اجازت نہیں مل سکی۔ ملاقاتیوں کے حصّے میں یکے بعد دیگرے لوگ آتے رہے اور جھَل کو دیکھ کے نعرے لگاتے، اُچھلتے کودتے رہے۔ جھَل کو ہر ایک کے جیل جانے کا پس منظر معلوم تھا۔ وہ اُن کی کوتاہیوں کی نشان دہی کرتا اور تسلی تشفّی دیتا رہا کہ اُن کے پیچھے اُن کے گھروں کی خبر گیری کی جا رہی ہے اور بڈّا وکیل اُن کی ضمانتیں، یا سزائیں کم کرانے کی کوششیں کر رہا ہے۔ سب کی زبان پہ ایک ہی سوال تھا کہ جھَل آخر کب مستقل طور پر اڈّے کی چوکی سنبھال رہا ہے۔ جھَل نے کوئی حتمی جواب نہیں دیا۔ سب سے یہی کہا کہ دیکھو، ابھی وقت نہیں آیا ہے، ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

طرف سے لوٹتے میں جیلر صاحب کا مکان تھا۔ سونیا رہتی تھی۔ رام داس کو پتا تھا کہ جیلر صاحب کی بیٹی نے سونیا کو پڑھانا شروع کیا تھا۔ سونیا کے انجام کا اُس کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے بھی اُسے نہیں بتایا۔ اپنے اسرار آنکھوں میں چھپائے رکھے۔ بے ضرورت سچ نہیں بولنا چاہیے۔ سونیا رام داس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اُسے 'چاچا' کہتی تھی۔ رام داس سچ جان لیتا تو وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ کاش، اُس دن ایک گاڑی کی تاخیر ہو جاتی، ہم دوسری گاڑی بھی چوک گئے تھے۔ یوں نہ سونیا ملتی، نہ وہ سب کچھ پیش آتا جو سینے میں دفن ہو چکا تھا۔ جب بھی اُس کا خیال آتا، دل ڈوبنے لگتا۔ جیلر صاحب کا مکان دیکھ کے بھی میرا یہی حال ہوا۔ میں نے بہت اُس طرف دیکھنے سے اجتناب کرنا چاہا، لیکن میری نگاہیں بے اختیار اُسی جانب اُٹھ گئی تھیں۔

جھَل نے نچلے درجے کے ہر کارندے کو کچھ نہ کچھ نقدی دی۔ دوپہر کو ہم وہاں سے چلے آئے، جیل خانے سے اور ماضی سے۔

جھَل نے آنے والے دن اپنی روانگی کا اعلان کیا۔ اُس رات اڈّے پر بہت بھیڑ تھی۔ اُس رات شعبان نے بھی دکان بند کر کے گلوریوں کے پُڑوں، پھولوں کی ٹوکریوں اور مٹھائی کے ڈبّوں سے لدے پھندے اڈّے پر آئے اور اُنھوں نے جھَل کی گردن موتیا اور گلاب کے ہاروں سے ڈھانپ دی۔ چھُٹّن صاحب اور نصیب میاں نے کچھ دیر کے لیے محفل زعفران زار بنا دی تھی۔ سارے اور گل رہے تھے کہ ایک بار پھر بازار کی طرف چلیں، لیکن وقت گزر رہا تھا اور رات ہو گئی۔ بازار کا وقت ہی نکل گیا۔

میرا اندازہ تھا، بل کہ مجھے یقین تھا کہ کلکتے سے جھَل سیدھا فیض آباد کا رخ کرے گا۔ فیض آباد سے ہمیں رخصت ہوئے لگ بھگ تین مہینے سے اوپر ہو رہے تھے۔ وہاں اب فروزاں کیا کرتی؟ اُسے حویلی میں جیسے کم و بیش اتنی مدت ہو چکی ہے۔ اُن کے لیے ہی ہمیں فیض آباد کا ایک پھیرا لگانا چاہیے تھا۔ لیکن سب کو دیکھنے کو میرا دل بھی بہت چاہ رہا تھا۔ حویلی کی طرف سے جھَل اتنا بے غم، بے فکر تھا، جیسے وہاں کبھی کسی پیچیدگی کا

امکان ہی نہیں ہے، شاید زرّیں کی وجہ سے جھَل کو یقین تھا کہ جہاں زرّیں موجود ہوگی، وہاں کوئی اُلجھن ہی نہ پیدا ہوگی، لیکن خود زرّیں تو بہت گراں بار ہو سکتی ہے۔ میں نے جھَل سے بات کرنی چاہی، پھر یہ سوچ کے رہ گیا کہ زرّیں کا خیال تو اُسے مجھ سے زیادہ ہونا چاہیے۔ اُسے کوئی فکر نہیں تو مجھے کاہے کی حالانکی پڑی ہے۔ میری طرح اُس کا دماغ بہکتا بھی نہیں ہے، میں نے چپ سادھے رکھی۔

جھَل نے زورا اور جمرو سے کہا تھا کہ وہ چاہیں تو فیض آباد یا بستی چلے جائیں، لیکن دونوں نے ہمارے ساتھ چلنے کو ترجیح دی۔

دوسرے دن صبح ہمیں رخصت کرنے کے لیے سارا اڈّا ہی ہاوڑا اسٹیشن پر سمٹ آیا تھا۔ اُنھوں نے اتنی چیزیں ساتھ کر دیں کہ ڈبّے میں رکھنا اور سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ جمرو اور زورا نے اگلے اسٹیشن پہ بہت سی چیزیں لوگوں میں بانٹ دیں۔ ہم دوبارہ لکھنؤ کی طرف جا رہے تھے۔ کئی دن لکھنؤ کے اطراف، گورکھ پور، اعظم گڑھ، بہرائچ، بستی، گونڈا، ایٹا، اٹاوہ، فتح گڑھ، بدایوں، فرخ آباد، ہردوئی کے شہروں میں گھومتے رہے اور سیتاپور، فتح پور، بارہ بنکی اور سلطان پور ہوتے ہوئے کان پور آ گئے۔ اِن بستیوں سے کہیں بھی فیض آباد کا فاصلہ سو، سوا سو میل سے زیادہ نہیں تھا، لیکن جھَل کا جیسے فیض آباد سے کوئی سروکار ہی نہیں رہا تھا۔ کان پور سے اُس نے سیدھے دلّی آ کے دم لیا۔

کلکتے سے دلّی پہنچتے پہنچتے پچیس دن لگ گئے تھے۔ دلّی میں مولوی صاحب کی موجودگی ممکن نہیں تھی، اس لیے کہ سو میل دور

مرادآباد میں اُن کے ہم شہروں کو ضرور سُن گُن مل جاتی۔

دلّی کے اطراف گنجان شہر آباد ہیں۔ ہم نے وہاں ایک پہر بھی ضائع نہیں کیا اور روہتک، حصار، سرسا، بھٹنڈا، کرنال، پانی پت، سونی پت، ورپٹیالے کا قصد کیا۔ ان شہروں سے واپس دلّی آ کے گڑگانو، فریدآباد، متھرا، علی گڑھ، آگرہ، بھرت پور، جے پور، سوائی مادھوپور، ٹونک، کوٹا، میواڑ، چتوڑگڑھ، اودے پور، جالور، اجمیر، ناگور، جودھ پور اور باڑمیر کے علاقے سے گزرتے ہوئے میرپورخاص آ گئے۔ ظاہر ہے، ہمارا کام شہر کے تاریخی مقامات اور تفریح گاہیں دیکھنا نہیں تھا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی مسلمان آبادیوں میں جا کے گھروں، دکانوں، مسجدوں اور مدرسوں میں اپنا سبق دُہراتا اور ہر جگہ ایک ہی جواب سنتا تھا۔ اس تکرار سے اب ایسی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔

عادت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ آبادی کی نسبت سے بعض شہروں میں ایک دن، بعض میں دو دن لگ جاتے۔ اگلی منزل کے لیے شام کو سواری مل جاتی تو ٹھیک، ورنہ وہیں بسیرا کر لیتے۔ رات کو کسی بستی میں فرصت ہوتی اور نوٹنکی لگی ہوتی، یا سرکس ہو رہا ہوتا تو دو تین گھنٹے یوں گزر جاتے۔ صبح سے شام تک گھوڑا گاڑی، لاری، ریل گاڑی، یا بس پیدل چلتے رہنا۔ کبھی سرائے، کبھی ہوٹل، جہاں جیسی جگہ مل جائے، جس وقت جیسا کھانا مل جائے۔ میرپورخاص سے حیدرآباد (سندھ) پہنچے تو اسٹیشن کی سیڑھیوں پر ایک بچے کو بچاتے ہوئے زورا کا پیر ٹوٹ گیا۔ ہڈی بھی چٹخ گئی تھی۔ باقی ہم تینوں کے پیروں میں بھی بیڑی پڑ گئی۔ تین دن تک زورا کا علاج ہوتا رہا، چوتھے دن بھی وہ سفر کرنے کے قابل نہیں تھا۔ جمرو کو اس کی نگرانی پر چھوڑ کے میں اور مُغل شہدادپور اور نواب شاہ ہوتے ہوئے کراچی چلے آئے۔ بمبئی کی طرح کراچی بھی ساحلی شہر ہے۔ بمبئی سے بہت ملتا جلتا، لیکن یہاں اتنی بھیڑ نہیں تھی۔ مسلمانوں کی ایک کثیر آبادی تھی۔ ہمیں دو دن ٹھہرنا پڑا۔ مسلمان آبادیوں میں شاید ہی کوئی جگہ رہ گئی ہو جہاں ہم نہ جا سکے ہوں۔ چار دن کے غیاب کے بعد ہم واپس حیدرآباد آئے تو زورا کے پیر کی تکلیف بڑی حد تک کم ہو گئی تھی، چلنے پھرنے لگا تھا۔ احتیاطاً دو ایک دن کے آرام کی اور ضرورت تھی۔ ان دو دنوں میں میں اور مُغل ہالا، ٹنڈوآدم اور نواب شاہ ہو آئے۔ مُغل کا ارادہ اب حیدرآباد سے کوٹکا شہر جانے کا تھا۔ ان دنوں تھرپارکر سے آئی ہوئی گانے بجانے اور کھیل تماشا کرنے والوں کی ایک ٹولی کی بڑی دھوم تھی۔ واقعی کچھ غلط نہیں تھا۔ ان کا ہنسنا رُلانا خوب آتا تھا۔ وقت کا کچھ احساس ہی نہیں ہوا۔ آخری رات نوٹنکی دیکھ کے واپس آتے ہوئے جمرو نے دبی زبان میں مُغل سے کہا، "اُستاد! ایک بات بولیں۔"

"کیا ہے رے۔" مُغل نے بھڑک کے پوچھا۔

"کچھ اور مت سمجھنا اُستاد، ماں قسم۔" جمرو نے جلدی سے کہا۔ "اور صرف اپنی طرف سے بولتا ہوں۔"

"پھوٹ بھی تو منہ سے۔" مُغل بگڑ کے بولا۔

"بولتے ہیں۔ اِدھر سے بمبئی بہت نزدیک ہے اور سیدھا جہاز ہے۔ چار پانچ روز اُدھر کا چہرہ دکھا کے اور اُن لوگ کا دیکھ کر لوٹ جائیں تو کیسا۔" جمرو نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

جمرو بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کلکتے سے چلے ہوئے ہمیں [illegible] مہینے کے قریب ہو رہے تھے۔ میرا خیال تھا مُغل [illegible] ہو سکتا ہے وہ بھڑک کے جمرو سے کہے [illegible] فکر ہے تو خود چلا جائے۔ مُغل کے سکوت پر مجھے [illegible] حالاں کہ منہ زور سے تائید کی تھی نہ میں [illegible] کر رہا تھا کہ اس مسئلے سے میں مُغل سے کبھی کوئی بات نہیں کروں گا۔ وہ رات ہم نے سرائے میں گزار دی۔ دوسرے دن کوٹکا جانے کے لیے حیدرآباد شہر سے جُوے ہوئے کوٹری جنکشن کے بجائے سیدھے حیدرآباد اسٹیشن کا رُخ کیا اور کراچی آ گئے۔ چوتھے دن ہمیں بحری جہاز میں جگہ مل گئی۔

بنگال میں کئی بار ہم اسٹیمر میں بیٹھ چکے تھے، لیکن یہ [illegible] بڑا جہاز تھا۔ یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا، کسی محلے کی طرح جس طرف چاہو گھومو پھرو۔ ہم نے زیادہ پیسے دے کے کیبن میں جگہ محفوظ کرائی چاہی تھی، مگر گورے مسافروں کی تعداد زیادہ تھی۔ جہازراں کمپنی بھی ولایتی تھی، پہلے گوروں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ ہمیں عرشے کے ٹکٹ ملے۔ عرشے کا مطلب ہے، جہاز کا سائبان اور صحن۔ اچھا ہی ہوا جو کیبن کا ٹکٹ نہ مل سکا، عرشے کا لطف کچھ اور تھا۔ جہاں جی چاہا [illegible] مسافر [illegible] یہاں سرگرمی زیادہ تھی، طرح طرح کے مسافر، بیشتر ہندستانی۔ گورے مسافر تمام کے تمام کیبنوں میں مقیم تھے۔ جہاز انگلستان سے آ رہا تھا، اس لیے سارے کیبن بھرے ہوئے تھے۔ ٹکٹ والے نے ہمیں بتایا تھا کہ خالی کیبنوں کی کثرت ہوتی تھی، ہندستانی لوگوں کو ٹکٹ کی فراہمی پر غور کیا جاتا ہے۔ گورے مسافر عرشے پر آ کے بھی ہندستانی مسافروں سے الگ تھلگ ہی رہتے تھے۔ عرشے کے مسافروں کے لیے چائے خانہ بھی الگ تھا۔ کیبن کے مسافروں کے لیے مخصوص چائے خانے میں شراب کا بھی اہتمام تھا۔ ٹھیک ایک بجے دوپہر جہاز نے بندرگاہ سے حرکت کی۔ چال میں میانہ روی تھی، ہلکی تھرتھراہٹ۔ خاصی دور آنے کے بعد بھی رفتار میں کوئی ایسا فرق نہیں آیا۔ زورا کے پیر میں ہلکی سی لنگ باقی تھی، لیکن جیسے کوئی کھلونا ہاتھ لگ جائے۔ شروع شروع میں وہ عرشے پر دوڑتا رہا۔ جمرو بھی اس کے ساتھ اِدھر اُدھر قلانچیں بھرتا رہا۔ [illegible] ہم لوگ جہاز سے مانوس ہو گئے تھے۔ اس سے [illegible] جب سفر شاید کوئی اور نہیں ہوتا، جیسے ہنڈولے میں بیٹھے [illegible] جھولا جھلا رہا ہو۔ سمندری لہروں کا بھی کیا زور [illegible] بار ڈگمگا دیتی ہیں۔

[illegible] ہوتے گورے مسافر نئے چمچے سیڑھیوں سے اُتر کے عرشے کی طرف آنے لگے۔ اُن کے چہروں پر [illegible] کی [illegible] گلابی [illegible] تھی، جیسے کا چہرہ ہے، سب کے سب اتنے تروتازہ تھے جیسے آج ہی پیدا ہوئے ہوں۔ عورتیں بھی اُن کے ساتھ تھیں، الگ برنگے لباس سے آراستہ۔ عرشے کے ہندستانی مسافر اُن کو بڑھتا دیکھ کے اپنی اپنی جگہوں پر سمٹتے گئے۔ وہ [illegible] پردہ نگاہوں سے مختصر لباس میں چمکتی دمکتی، اپنے آپ سے بے پروا عورتیں، دیکھتے تھے۔ گوری عورتیں اُن پر ایک اچٹتی سی کراہیت نظر ڈال کے سامنے سے مُڑ جاتی تھیں۔ گورے ہم سے الگ ہی الگ دکھائی دیتے تھے۔ نسل کا تو فرق تھا ہی، مخلوق بھی کوئی اور معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی چال میں ایک تمکنت، آنکھوں میں بڑی شان و شوکت تھی۔ اُن کی مجموعی وضع قطع میں برابری کی جتاتا انداز میں ہنستے تھے۔ عورتیں فرش پر پھونک پھونک کے قدم رکھتی تھیں۔ نگاہوں میں تجسس تھا، وہ تجسس میں متانت تھی۔ گوروں کے بچے بالکل ہوتے چینی گلڑے گڑیا کی مثال ہوتے ہیں۔ جی چاہتا ہے، گود میں بھر کے خوب پیار کرو، گالوں کی چٹکیاں بھرتے رہو۔ اوپر، اپنے اپنے کیبنوں سے نیچے آ کے کچھ گورے چائے خانے کی طرف چلے جاتے تو کچھ جہاز کے دوسرے والے عرشے کی جانب بڑھ جاتے اور جنگلے سے

* * * * * * * * *

ٹیک لگائے ہی لمبی سانسیں کھینچ کے تازہ دمی کی مشق کرتے رہتے۔ وہ سورج ڈوب رہا تھا۔ سمندر میں یہ منظر نہایت سحر انگیز ہوتا ہے۔ مغرب کی جانب اُفق میں شفق کی سُرخی پھیلتی گئی۔ لگتا تھا، سورج رفتہ رفتہ سمندر میں اتر رہا ہے، اور یہ آگ، در خون اُس کی وداع کا ماتم ہے۔ مغرب میں دُور کہیں آسمان جل اُٹھا تھا۔ جب تک سُرخی پہ سیاہی غالب نہ آگئی، گورے وہیں کھڑے غروبِ آفتاب کا نظارہ کرتے رہے۔ ہر چند غروب اور زوال سے اُنھیں کوئی نسبت نہیں تھی۔ انھوں نے داستانیں ہی پڑھی ہوں گی۔ کہتے ہیں، کم یابی و نایابی اشتیاق فزوں کرتی ہے۔ گوروں کے چلے جانے کے بعد عرشے کے کنارے والا حصّہ خالی ہو گیا اور زورا اور جمرو اور دُور کھڑے ہندستانی مسافروں نے پھر وہاں تسلط جما لیا، مگر اب اندھیرے کے سوا وہاں کیا رکھا تھا۔

ساری روشنیاں جلا دی گئی تھیں اور چاروں طرف سے تاریکی میں گھرا ہوا جہاز اس وقت روشنی کا جزیرہ بن گیا تھا۔ روشنیاں اُبلتی کوندتی لہروں پر منتشر ہوتیں تو نیچے جیتے جاگتے ستاروں کا گمان ہوتا۔ تھکن کو عرشے پر ایک معقول جگہ لٹا کے میں، زورا اور جمرو چہل قدمی کرتے جہاز کے عقبی حصّے کی طرف چلے آئے۔ پاس ہی گوروں کا چائے خانہ یا عشرت کدہ تھا۔ شیشے، رنگ اور روشنی نے گڈمڈ ہو کے وہ جگہ طلسماتی سی کر دی تھی، خواب کا سا کوئی احساس۔ باہر سے نظر آ رہا تھا کہ زندگی وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کی اسیر ہے۔ دُنیا میں اُنھیں کوئی غم نہیں ہے اور خدا اُن سے بہت خوش ہے۔ اندر سبھی چہک رہے، چہک رہے تھے شگفتہ اور شاداں۔ میں نے کہیں پڑھا یا سنا تھا کہ گورے رات کا بہت اہتمام کرتے ہیں۔ گورے کیا، تقریباً سبھی دولت مند۔ وقت بھی تو خریدا جا تا ہے۔ جن کے پاس دولت ہوتی ہے، وہ اِسے خرید لیتے ہیں۔ وقت خریدنے سے مراد راحت افزا، نشاط انگیز ساعتوں کی خریداری ہے۔ بے شک اس طرح وقت بڑھایا نہیں جا سکتا۔ یہ میا، سے کی جنس، بیا کا ذماس نہیں ہے۔ ورنہ آدمی ساری دولت لُٹا کے بس اِسے خریدنے کی جستجو کرتا، اپنا وقت سَو برس سے بڑھا کے دو سَو برس کر لیتا، تین سَو برس، ہزار برس۔ جتنی دولت آ گئے ڈالو، اُتنے ہی ماہ و سال بڑھا لو، مگر وقت عدد اور پیمائش میں نہیں مل پاتا تو قدر میں ضرور دل جاتا ہے، کیفیت میں ضرور دل جاتا ہے...

وقت کی خزاں میں پھول، حبس میں دریچے، تاریکی میں چراغ خریدنے کا مطلب بھی وقت میں اضافہ ہے۔ نامہرباں وقت کو مہرباں کرنے، دل چسپ اور دل کُشا وقت کا انتخاب تو آدمی کے بس میں ہے۔ یہ کار مسیحائی اور کرشمہ کاری بہت کچھ دولت کے پاس ہے۔ جو لوگ چراغاں کر کے، تفریحاں سجا کے اور بام و در سجا کے اشتہا انگیز غذاؤں اور معطّر صحبتوں کی دعوت دیتے ہیں، وہ اصل میں وقت بیچتے ہیں۔ وہ گرہیں کھولنے، حبس دُور کرنے کا کاروبار کرتے ہیں۔ جگہ جگہ یہ دکانیں کُھلی ہوئی ہیں۔ شرط صرف دولت ہے اور طلب ہے۔ بے شک رسد بھی مشروط ہے کہ صحرا میں سونے کے آدمی کی طلب بھی ریت ہے اور آدمی ہی صحرا ہو تو سب بے کار ہے، لیکن دولت سے چند ایک سرکشاں آشفتگاں کی نہیں تو بے شمار تشنہ لباں، نا آسودگاں کی سیری ہو جاتی ہے۔ کیفیت کی زندگی، کمیت کی زندگی کا حساب کتاب کیا جائے تو دولت مند بیش تر اپنے منشا کی اور الغرض بڑی زندگی گزارتا ہے۔

سامنے کے چائے خانے میں گورے باہر کی دُنیا سے بے خبر ایک دوسرے میں گم تھے۔ کاؤنٹر کے گرد بیٹھے بدمست جام لنڈھا رہے تھے۔ میزوں پر بھی پیالے چھلک رہے تھے۔ موسیقی کی ہلکی ہلکی تانیں باہر تک آ رہی تھیں۔ وسط کی کھلی جگہ پر مرد و عورتیں باہنوں میں باہنیں ڈالے رقص کر رہے تھے۔ ایک جانب کونے میں دیوار پر آویزاں ہدف پر چھوٹے چھوٹے تیر پھینکنے کا مقابلہ جاری تھا۔ جوئے کی گول میز کے اطراف بھی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ریستوراں کے کسی کمرے میں گوروں کے محبوب مشغلوں، بلیرڈ، ٹیبل ٹینس، برج وغیرہ کا اہتمام بھی ہونا چاہیے۔ سارا ماحول خیال آفریں تھا۔ جھروکوں اور شیشوں کے اُس پار ہندستانی مسافر حیرت سے یہ انجمن آرائی دیکھتے تھے۔ میرے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ کرشنا جی کے ساتھ بمبئی کے کلب میں مجھے ان مناظر کا تجربہ ہو چکا تھا، پھر ربا کے ساتھ بھی۔

جمرو مچل کے بولا۔ ”تھوڑی دیر کے لیے اندر چلتے ہیں لاڈلے!“

”شاید نہیں جا سکتے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”کیوں، کیوں نہیں جا سکتے؟“

”یہ ہمارے لیے نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں ہے؟“ وہ ... بولا۔

”بس نہیں ہے۔“ میں نے ناگواری سے کہا۔

”باہر لکھا ہوا ہے؟“

”لکھا ہوا تو شاید کہیں نہیں ہے۔“ میں نے اِدھر اُدھر تاکتے ہوئے کہا۔ ”لیکن صاف نظر آ رہا ہے، وہاں ہم جیسا بھی کوئی نہیں ہے اور، اور ہم اندر جا کے کریں گے بھی کیا۔ اُن کے درمیان خود کو اجنبی لگیں گے۔ اگر دروازے پہ دربان نے روک دیا تو بڑی کرکری الگ ہوگی۔“

”کیوں روکے گا حرام کا۔ سارا کھیل دمڑی کا ہے۔ اپنی جیب میں بہت پیسے ہیں، قسم سے۔“ جمرو جیب تھپ تھپاتے ہوئے بولا۔

”ہمارے کپڑے! اُن کے ہاں لباس کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ وقت اور موقع کا الگ الگ لباس ہوتا ہے۔“

”پر اُدھر سب کون سے ایک کپڑوں میں ہیں۔“ جمرو ... ”ہمارے بھی کپڑے گھٹیا اور گندے نہیں ہیں، ... اُجلے ہیں۔“

”... ... بھی نہیں ہیں۔“

”... بار بڑائی مار کے دیکھتے ہیں، کیا جاتا ہے راجا“ زورا نے جمرو کو اور مہمیز کیا۔ ”او درا اپنا ہندستانی پیرا ... تو ہے۔ گھومتا پھرتا ہے کیسا کٹھ پتلی کا مانک، اور ... والا بھی ایک دم کالا ہے۔ سالا ابھی مدراسی ہے کہ بنگالی۔“

”وہ خدمت گار ہیں، وہاں کے ملازم۔“ میں نے اُنھیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”چل کے دیکھتے ہیں لاڈلے!“ جمرو بے پروائی سے بولا، ”دروازے پہ کھڑا تھانے دار زیادہ سے زیادہ کیا کرے گا۔ دھکے دے گا نا؟“

”ہاں، لیکن یہ اچھا تو نہیں ہوگا۔“

”نیچے پانی میں تو نہیں پھینک دے گا۔“

”اوہو، تم سمجھتے کیوں نہیں۔“ میں نے چڑ کے کہا۔ ”وہ لوگ ہماری سنگت پسند نہیں کرتے۔“

”تو ہندستانی بیرے کیوں رکھتے ہیں اور اِدھر اِتنی دور کالوں کے دیس میں آ کے کنڈلی مارے کیوں بیٹھے ہوئے ہیں۔“

”میں نے تم سے کہا تھا کہ پلیا پر گاڑی آہستہ چلانا...“

”یہ انھی سے جا کے پوچھو۔“

”انھیں نہیں، کیا اُلٹا بولتا ہوں۔“

ان سے بحث تکرار فضول تھی۔ کچھ ماحول کا اثر تھا، مستی میں آئے ہوئے تھے۔ میں نے بیزاری سے کہا۔ ”ٹھیک ہے، حسرت نکال لو۔“

میرا خیال تھا، وہ باز آ جائیں گے، مگر مجھے ٹھیلتے ہوئے وہ چائے خانے کی جانب بڑھ گئے۔ چند قدم بعد ہی اندر جانے کا راستہ تھا۔ بند دروازے پہ سکھ دربان منڈلا رہا تھا۔

”تم ابھی سردار سے تھوڑا گٹ پٹ کرنے کا ہے راج دادا! سمجھے گا، آدھا فرنگی ہے۔ کالا تو تم بالکل بھی نہیں ہے۔“ زورا نے سرگوشی میں کہا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ ”اور اِس پر نہیں مانا تو چاقو کی جھلکی دکھائیں گے۔ تمنچا بھی ہے اپنے پاس۔“

زورا بل کھا گیا۔

وہی ہوا، ہمیں بڑھتا دیکھ کے سکھ دربان دیوار بن کے حائل ہو گیا۔ اُس نے تحکمانہ انداز میں پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

”دکھائی نہیں پڑتا کیا۔“ زورا کھردری آواز میں بولا۔ ”آپن تم کو چنگا لگتا ہے۔ منتی میں نہیں جا رہا۔ دس طرح کرے گا، ابھی اپدر کدری لکھوا ہے اپن کورو کنے کا؟“

سکھ دربان زورا کے لہجے سے متاثر ہوا اور کسی قدر رسانی

سے اُس نے بتایا کہ جہاز کے کپتان کے حکم کے مطابق جب تک گورے چائے خانے میں بیٹھے ہوں تو ہندوستانیوں کو، چاہے وہ کیبن کے مسافر ہوں، اندر جانے نہ دیا جائے۔

جمرو اور زورا کا ارادہ اُس سے بحث کرنے کا تھا، لیکن سردار معاملہ فہم آدمی تھا۔ اُن دونوں کے تیور بھانپ کے بے بسی کا اظہار کرنے لگا۔ جمرو اور زورا کے پاس اَب یہی رہ گیا تھا کہ وہ سردار کی گردن پر دو چار ہتھڑ لگا دیں، یہ چپ تو پھونک دیں۔ انھوں نے سردار کے ہاتھ پر روپے روپے کے دو سکے رکھے اور لوٹ پڑے۔ سردار نے حیرت سے انھیں دیکھا، ست بچا کے سلام کیا اور روپے جیب میں رکھ کے بولا کہ وہ مجبور ہے۔ اُس کا بس چلے تو ... وہ ہاتھ جوڑ کے منت کرنے لگا۔

جمرو اور زورا سر جھکائے وہاں سے چلے آئے۔ اُن کی دل جوئی کے لیے میں انھیں عرشے کے مسافروں کے لیے مخصوص چائے خانے میں لے آیا۔ یہاں بہت شور تھا۔ سامنے کاؤنٹر پر کشتیوں میں رات کا کھانا لے جانے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ ایک طرف چائے، اُس سے ملحق شراب کا کاؤنٹر تھا۔ مشکل سے ایک کونے میں لوگوں کے اُٹھ جانے پر ہمیں جگہ ملی۔ جمرو اور زورا اپنے برابر والی میز پر ہندوستانی مسافروں کے درمیان ایک گورے مسافر کو دیکھ کے اُچھل پڑے، "لاؤ لے! یہ بندر ادھر کیوں بیٹھا ہے۔" جمرو پلکیں پٹ پٹا کے بولا۔

"آہستہ بولو۔ بہت سے گوروں کو ہماری زبان آتی ہے۔" میں نے دبے ہوئے لفظوں میں کہا۔

"پر یہ ادھر کیوں بیٹھا ہے؟"

"اُس کی مرضی ہے۔"

جمرو اور زورا نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ دونوں جگہ بیٹھنی کی مرضی کیوں ہے، اُن کی نظریں گورے کو حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ گورے اِس طرح عام ہندوستانیوں سے گھلتے ملتے جو نہیں تھے۔ وہ ایک پختہ عمر شخص تھا۔ چست، چاق چوبند، خوش اطوار، چوڑی پیشانی، سر کے آدھے بال اُڑے ہوئے، خشخشی داڑھی، بھرے بھرے گال، گہری چمکیلی آنکھیں، درمیانہ قد، نہ اتنا فربہ نہ ایسا دبلا۔ ہندوستانی مسافروں سے وہ ٹھہر ٹھہر کے، ایک ایک لفظ پر زور دے کے پُر مفہوم واضح کرنے کی تگ و دو کر رہا تھا۔

اُس کے مخاطبوں کی انگریزی واجبی تھی۔ مدراسی معلوم ہوتے تھے، ٹوٹی پھوٹی زبان آتی ہوگی۔ کچھ جھجک بھی رہے تھے، جھجک جھجک کر 'یس، یس' اور 'نو، نو' کر رہے تھے۔ بے قرار انگریز اُن سے ہندوستان کی بابت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ لوگ اپنی بساط کے مطابق جواب دے رہے تھے۔ وہ اُن کے جواب اخذ کرنے کی کوشش کرتا اور بار بار سر ہلاتا تھا۔ شور کی وجہ سے اُن کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی، حالاں کہ بالکل برابر والی میز تھی۔ گورے کا انداز اپنے ہم وطنوں سے قطعی مختلف تھا۔ بے ساختہ، مشتاقانہ، تصنع سے مبرا۔

"کیا ہوتا ہے چقندر کی اولاد؟" جمرو نے بھنّی ہوئی آواز میں پوچھا۔

میں نے آنکھیں میچ کے اُسے روکا۔ "ذرا سننے دو۔"

"اپنے کو کچھ کھسکا ہوا ایسا ای دِکھتا ہے۔"

میں نے اشارے میں تردید کی۔ "بالکل نہیں۔"

"پھر کیا ... دال کا بھاؤ پوچھتا ہے۔ ... مطلب! ادھر نہیں بیٹھ سکتا۔"

"کوئی سیاح ہے، شاید سیر کو آیا ہے۔"

"سیر کو!" جمرو تمسخر سے بولا، "ادھر کیا ہے دیکھنے والے، ناٹ کھاٹ، کیچڑ، ریل وا پے.."

"صرف یہی تو نہیں، یہاں تاج محل، لال قلعہ، اجنتا، ایلورا، ٹیکسلا، موئن جو دڑو، ہمالہ، دریا، جنگل، شکار، جانے کیا کیا بہت سی چیزوں میں اُن کے لیے کشش ہے۔ ہندوستان تو ان کے لیے جادو نگری، بل کہ کسی سمندر کی طرح ہے۔"

اس اثنا میں گورے نے ہماری دل چسپی محسوس کر لی تھی۔ اُس نے 'ایکسکیوز' کہہ کے اور ہاتھ اُٹھا کے مجھے سلام کیا۔ میں نے بھی مسکرا کے جواب دیا۔ ہماری میز پر ایک کرسی خالی تھی۔ گورے نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں سے معذرت کی اور بے تکلف ہماری طرف چلا آیا۔ "اگر میں مخل نہ ہوں تو کچھ دیر کے لیے آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟" اُس نے کرسی کا ہتھا پکڑتے ہوئے انگریزی میں پوچھا۔

"ضرور، ضرور۔" میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا اور جھٹ سے اُس کے لیے خالی کرسی کھینچ کر دی۔

اُس نے شکریہ ادا کیا اور ہاتھ بڑھا کے بولا، "میرا نام ارنسٹ تھامپسن ہے۔"

اُس کے مصافحے میں بڑی گرم جوشی تھی۔ میں نے بھی اُسے اپنا نام بتایا۔

اُس نے زورا اور جمرو سے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند فقروں کے بعد اُس نے شائستگی سے کہا، "ہندوستان کا یہ میرا پہلا دورہ ہے۔"

"مگر پھر آپ کو تو اچھی ہندوستانی آتی ہے۔"

"اوہ!" وہ ہنس کے بولا، "اتنی بھی کہاں، یہاں آنے کے لیے تھوڑی شُد بُد حاصل کی تھی۔ میرا خیال ہے، کچھ بھی نہ کر سکا، اور ہندوستان میں صرف ہندوستانی ہی تو نہیں بولی جاتی۔"

"جی ہاں، یہاں تو کہیں کہیں پڑوسی شہر میں بھی زبان بدل جاتی ہے۔" میں نے اُس کی تائید کرتے ہوئے پوچھا، "کیا آپ سیاحت کے لیے آئے ہیں؟"

"ہاں، ایک طرح سیاحت بھی کہ میں اِس دورے کا عرصے سے آرزومند تھا۔ بہت سن رکھا تھا آپ کے اس عظیم ملک کے بارے میں۔"

"... چپ، کیوں، اب ہمارا کہاں۔" لیکن میں چپ رہا۔

"اب کہیں جا کے موقع ملا۔ سیاحت کے علاوہ اصل میں مجھے حکومت برطانیہ کی ہدایت پر ہندوستان کے سیاسی اور سماجی رجحانات کے مطالعے کی غرض سے آیا ہوں۔ یہاں ان دنوں سیاسی بے چینی شدید ہے۔ انقلابی تحریکیں زور پکڑ رہی ہیں۔ شہر وسعت پا رہے ہیں اور صدیوں کا منجمد دیہی معاشرہ نئے صنعتی عہد میں داخل ہو رہا ہے۔ چناں چہ سماجی تغیرات لازم ہیں۔ عموماً تبدیلیاں ابتدا میں اجنبیت اور مغائرت سے دوچار ہوتی ہیں۔ ان سے مانوس ہوتے ہوتے دیر لگتی ہے۔ حکومت برطانیہ کو عظیم ہندوستان میں اپنی ذمے داریوں کا احساس ہے۔ مجھے کچھ انھی مسائل، اسباب و علل کی تحقیق، یا یوں کہیے کہ تیزی سے بدلتی ہوئی اِس ساری صورتِ حال پر ایک تجزیاتی مقالہ تیار کرنا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں، میرا کام جتنا پیچیدہ ہے، اُتنا اہم بھی ہے۔ شاید مجھے سارے ہندوستان کا دورہ کرنا پڑے۔ یہ برّصغیر تو بجائے خود ایک دُنیا ہے۔"

"ہاں، کہتے تو یہی ہیں، لیکن یہاں رہنے والوں کو کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ تو دوسرے، سمندر پار سے آنے والے ہی جان سکتے ہیں۔" میں نے متانت سے کہا، "واقعی آپ کا کام آسان نہیں۔ ہندوستان بے شمار تہذیبوں، زبانوں اور رجحانات کا مرکب ہے۔"

"کام تو میں نے انگلستان ہی میں شروع کر دیا تھا، جتنی کتابیں، مخطوطے اور دستاویزیں ممکن ہیں، جمع کر لی تھیں۔ سچ تو یہ ہے، جیسے جیسے مطالعہ کرتا گیا، انہماک جنون کی حد تک بڑھ گیا۔ ذاتی طور پر یہ سفر میرے لیے ایک مہم کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاز پر سوار ہوتے ہی میں نے ہندوستانی مسافر تلاش کرنے شروع کر دیے تھے۔ اتفاق ہے کہ مجھے مطلوب آدمی نہ مل سکے۔ جہاز مشرقِ وسطیٰ کے کئی ساحلوں پر لنگر انداز ہوا اور ہر جگہ سے ہندوستانی مسافر سوار ہوئے۔ گو اُن کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی، تاہم تقریباً سبھی سے رابطہ کیا اور خاطر خواہ نتائج نہ مل سکے۔ اب ہندوستان کے دروازے کراچی سے سفر شروع کرنے والے مسافر ہی مکمل ہندوستانی نظر آتے ہیں، اور

میری خوش قسمتی ہے کہ آپ سے جلد ہی ملاقات ہوگئی۔ یہ کتنی اچھی بات ہے کہ آپ جیسا ہم زبان مل گیا۔"

"میں کیا جانتا ہوں۔ میں تو انگریزی میں اتنی شُدبُد بھی نہیں رکھتا، جتنا آپ ہندوستانی سے واقف ہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیا میں اِسے مشرقی انکسار پر محمول کروں۔"

"سنا ہے، ہر انگریز غیر انگریز کو، یہی زبان بولتے ہوئے یہی کہتا ہے۔"

اُس نے قہقہہ لگایا، "آپ کے سلسلے میں ایسا نہیں ہے۔" بس نے تپاک سے پوچھا، "آپ نے یہ زبان کہاں سے سیکھی؟"

"بس ایسے ہی اسکول کالج میں۔"

"میں آپ کو بتانا بھول گیا، میرا تعلق بھی باقاعدہ کیمبرج یونیورسٹی سے تھا۔ اب میں وزٹنگ پروفیسر ہوں۔ عمرانیات اور سیاسیات میرے موضوعات ہیں۔"

"پھر تو آپ سے مل کے بڑی خوشی ہوئی۔" میں نے اُس سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔

"لیکن یقیناً مجھے آپ سے زیادہ..."

میں نے زورا اور جمرو کا تعارف اپنے عزیزوں کی حیثیت سے کرایا اور اُنھیں پروفیسر ہوبرٹ تھامپسن کے بارے میں مختصراً آگاہ کر دینا ضروری سمجھا کہ وہ کوئی بے احتیاطی نہ کر پائیں۔ ہماری گفت گو کے دوران دونوں گونگے بہرے بن جاتے تھے، لیکن پروفیسر ایک خوش خلق اور حساس آدمی تھا۔ اُس نے بیچ بیچ میں اپنی شکستہ ہندوستانی بول کے انھیں اُکتانے نہیں دیا، شامل رکھا۔

زورا نے مجھے ٹوکا کہ میں پروفیسر سے پوچھوں، وہ عام گوروں سے اتنا مختلف کیوں ہے۔ مجھے مناسب معلوم نہیں ہوا، سو میں نے اجتناب کیا لیکن پروفیسر کچھ کچھ زورا کا مقصود سمجھ گیا تھا۔ وہ مجھ سے وضاحت کے لیے اصرار کرنے لگا۔ میں نے اُسے زورا کی بے کلی کی وجہ بتائی تو کھلکھلا پڑا اور کہنے لگا کہ وہ کبھی سرکاری ملازمت میں نہیں رہا ہے۔

تعلیم سے فراغت پا کے وہ لیکچرر ہو گیا۔ اس کے بعد بس کتاب اور طالب علم ہی سے واسطہ رہا۔ یہی کچھ تو جاننے کے لیے اُسے بھیجا گیا ہے کہ انگریزوں کی کون سی ناانصافی، بیچ رہی، کون سے رویّوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں برہمی کو پیدا کیا ہے۔

میں نے پروفیسر کے جواب کی ترجمانی کی تو کچھ بار جمرو اور زورا کے چہروں کی خشونت دور ہوئی۔ جمرو کہنے لگا کہ وہ سمجھتا تھا، سارے گورے لاٹ صاحب اور صاحب بہادر ہوتے ہیں، کمشنر، ڈپٹی کمشنر، کلکٹر۔

میں نے پروفیسر کو بتایا تو بہت محظوظ ہوا۔ چائے آگئی تھی۔ ساتھ میں پیسٹری اور بسکٹ وغیرہ بھی تھے۔ چائے خانے میں نفری بڑھ جانے سے شور زیادہ ہو گیا تھا، بات کرنے کی دشواری ہو رہی تھی۔ سگرٹ بیڑی کا دُھواں ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور جن لوگوں نے شراب پی لی تھی، اُنھیں اپنی آوازوں پر اختیار نہیں رہا تھا۔ ہندوستانیوں کو یوں بھی اُونچی آواز میں بولنے اور غیر ضروری باتیں کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ ہم نے صرف چائے پی۔ پروفیسر نے کچھ کھانے سے پرہیز کیا اور تاویل کی کہ وہ یہاں کی آب و ہوا سے جسمی مطابقت تک کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط کرنا چاہتا ہے۔ اتنی دیر میں ... اجنبیت کا تکدر صاف ہو چکا تھا۔ یکا یک پروفیسر ... سوجھی، اُس نے پوچھا کہ ہم نے ابھی رات کا ... ہوگا۔ میرے جواب دینے پر اُس نے نہایت ادب، اشتیاق سے ہمیں آج رات ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی۔ میں نے عذر کیا کہ ابھی ایسی بھوک نہیں ہے۔ اُدھر ہمارا ایک ساتھی عرشے پر آرام کر رہا ہے۔ شاید اُسی کے ساتھ کچھ دیر بعد کھانے کا مرحلہ طے ہو۔ غالباً میرے انکار میں زور نہیں تھا۔ پروفیسر درپے ہو گیا کہ کوئی بات نہیں، ٹھیک ہے، پھر وہیں چلتے ہیں، وہاں وہ مُغل سے خود درخواست کرے گا کہ مُغل بھی ہم سب کے ساتھ ہو۔ میرے تذبذب اور معذرت سے وہ مایوس نہیں ہوا، کہنے لگا، "جناب! کھانا تو ایک بہانہ ہے۔ دوسرے چائے خانے میں نسبتاً سکون ہے۔ وہاں اچھا وقت گزرے گا۔ مجھے، جمرو اور زورا کو جلد سو جانے کی عادت نہ ہو تو ازراہِ نوازش غیریت نہ برتی جائے۔"

میرا خیال تھا، جمرو اور زورا میری تائید کریں گے۔ وہ فوراً آمادہ ہو گئے، بل کہ جمرو نے صلاح دی کہ وہ کھانے کی کشتی کا مُغل کو پہنچا کے اور اُسے بتا کے ابھی واپس آتا ہے۔ ہم کچھ دیر اُس کا انتظار کریں۔ جمرو اور زورا دونوں ہی چلے گئے اور جلد ہی آ گئے۔ مُغل نے کھانے پر آرام کو ترجیح دی تھی۔ زورا، جمرو کے آجانے پر پروفیسر اُٹھ گیا۔

چند لمحوں میں ہم دوبارہ سکھ دربان کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ اُس نے چرتی آنکھوں سے ہمیں دیکھا کیا۔ پروفیسر نے دروازے پر دربان کی موجودگی کو کوئی اہمیت نہ دی۔ سکھ دربان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اُس نے ہمارے لیے دروازہ کھولا، چائے خانے کے ہم تینوں کے اندر داخل ہونے کے بعد ہی وہ اندر آیا۔

... شستاں ایسی ہی کسی جگہ کو کہتے ہوں گے۔ اُس کا حوال ... سے تعلق رکھتا تھا۔ باہر سے، شیشوں اور جھروکوں کے اُس پار تو عشرِ عشیر بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہاں تو نظارہ ہی کچھ اور تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ ہم کسی جہاز پر سوار ہیں۔ کوئی منزل نہ مسافر، کل آئے نہ آنے، بس یہی ایک ساعت زندگی کا حاصل ہو۔ چائے خانے کی آرائش و زیبائش شاہانہ تھی اور ... تے لوگوں کی آب و تاب مستزاد۔ خوش بو، موسیقی ... ہمارا استقبال کیا۔ سب کی نگاہیں ہم بدنسلوں کی ... رہی تھیں، لیکن پروفیسر ایک معزز و محترم شخص تھا۔ ... کے اُسے تعظیم دی اور دستاریں، ہمارے لیے ... اور ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی۔ پروفیسر ہمیں ایک پُرسکون گوشے میں لے آیا۔ جمرو اور زورا بے زبان سے ہو گئے تھے۔ پھیلے ہوئے دیدوں سے وسط کی خالی جگہ پر رقصاں جوڑے دیکھتے رہے۔ پروفیسر ہماری خاطر مدارات کے لیے بہت بے تاب تھا۔ خدمت گار جلد، یا بہ دیر خود ہمارے پاس آتا، لیکن پروفیسر کو ذرا سی تاخیر گوارا نہ تھی۔ جب تک کاؤنٹر پر جا کے خدمت گار کو اپنی میز پر بھیجنے کی ہدایت نہ کر دی، اُسے تسکین نہ آیا۔ واپس آ کے اُس نے لہکتی آواز میں کہا، "اب آپ کُھل کے بیٹھیے، میری گزارش ہے کہ کوئی تکلف نہ کیجیے۔"

"تکلف تو آپ کر رہے ہیں جناب!" میں نے کہا، "آپ ہندوستان آئے ہیں، آپ کو ہمارا مہمان ہونا چاہیے۔"

"میں نے ابھی ہندوستان کی سرزمین پر قدم کہاں رکھا ہے۔ آپ سے وعدہ، کبھی بلائیں گے تو ضرور آئیں گے۔ بمبئی ہی میں قیام ہے آپ کا؟"

"جی ہاں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اور، اور کیا مشغلہ ہے؟"

میں اُسے کیا بتاتا۔ میں نے سانس بھر کے کہا، "ان دنوں تو سفر میں گزر رہی ہے۔"

"کاروبار کے سلسلے میں؟"

میری آواز ٹمٹما گئی، "ہاں یوں ہی کہہ لیجیے۔"

اچھا ہوا کہ اُس نے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ اِس اثنا میں معمر ہندوستانی خدمت گار بھی آ کے مُخل انداز ہو گیا تھا۔ پروفیسر نے جھجکتے ہوئے ہم تینوں سے پوچھا کہ کیا ہم شراب پینا پسند کریں گے۔ جمرو اور زورا نے میری طرف دیکھا اور انکار کر دیا۔ پروفیسر نے خدمت گار کو سنترے کا رس لانے کا حکم دیا اور کھانے کے کارڈ کا بہ غور مطالعہ کرنے لگا۔ "کھانے میں کیا لیجیے گا؟"

"کچھ بھی، مگر سؤر نہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اُس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا، "اتفاق ہے، میں بھی نہیں کھاتا، بل کہ سُرخ گوشت ہی سے رغبت کچھ کم ہے۔" البتہ سفید، یعنی سمندری گوشت شوق سے کھاتا ہوں۔ کیا خیال ہے، وہی منگوائیں۔"

"بہتر ہے، سمندر میں ہیں، اس کا حق بھی ادا ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں ایک کہاوت ہے: جیسا دیس، ویسا بھیس۔ مگر ہم چاروں کے لیے ہونا چاہیے۔"

دوسرے لمحے اُس کی سمجھ میں آیا اور وہ شوخی سے بولا، "مگر

اعصاف بھی شرما سے۔"

"ہاں، ہاں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ اُس نے طعام نامے پر نشانات لگائے۔

"میں نے خیال رکھا ہے، اطمینان رکھیں۔ قدر کا ضیاع اچھا نہیں ناں، کچھ ندامت سی ہوتی ہے۔"

"ہندوستانیوں کو تو دُکھ بھی ہوتا ہے۔"

"واہ!" وہ پہلو بدل کے بولا، "ہماری آپ کی اچھی نبھے گی۔"

"حالانکہ ہماری ایسی نسبتیں نہیں ہیں۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

وہ چونک پڑا اور ایک ثانیے کے لیے اُس کا چہرہ تمتما گیا، "میں یہی، یہی جاننے کے لیے آیا ہوں۔ نسبتیں کہاں کھو گئیں۔ کیا آپ کے سر پہ سینگ اور میرے عقب میں دُم لگی ہوئی ہے۔"

"کاش کہ ایسا ہوتا! تو امتیاز تو طے ہو جاتا۔"

"ہاں۔" وہ کھو سا گیا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اس بات میں خاصا کرب ہے۔"

"میرا مقصد دل آزاری نہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔" وہ تیزی سے بولا، "لیکن جیسا میں نے پہلے ہی وضاحت کی ہے، مجھے دُوردل [illegible] مت دیکھیے۔"

"تو پھر یہاں کیوں بیٹھے ہوتے۔ یہ تو علاقہ غیر ہے۔"

"میں آپ سے بہت کچھ اخذ کرنا چاہتا ہوں۔" اُس کے لہجے میں بے کلی تھی، عاجزی بھی۔

"آپ کو شاید مایوسی ہو۔ میں تو کچھ بھی نہیں جانتا، اور یہ انکسار نہیں، واقعہ ہے۔ یوں کہیے کہ مجھے ادھر اُدھر دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ جو کچھ جان سکا ہوں، وہ غیر اختیاری ہے۔ محض آنکھوں سے اِدھر اُدھر نظر پڑ ہی جاتی ہے۔ بس اسی قدر آتا ہے۔ آپ ایک عالم و فاضل شخص ہیں۔ جہاز سے اُتر کے یقیناً آپ کو اپنے مطلب کے بہت سے لوگ مل جائیں گے۔ شاید میں بھی اس کام میں کچھ اعانت کر سکوں۔"

"مجھے شبہ ہے، آپ ایسے لوگوں سے آسانی سے ملاقات ہو سکے۔ میرے سامنے ہونے پر مخاطب کو احتیاط مانع ہو گی، ہونی چاہیے۔ شاید میں اس ذمے داری کے لیے موزوں نہیں جو مجھے سونپی گئی ہے۔ انھیں فریقین میں سے کسی کا انتخاب کرنے کے بجائے باہر کے آدمی کو اس فریضے پر مامور کرنا چاہیے تھا۔ حیرت ہے، انھوں نے اس نزاکت پر غور نہیں کیا۔"

"ہو سکتا ہے، باہر کے آدمی کے ساختہ آئینے میں انھیں شکلیں بھی تک نظر آنے کا خوف ہو۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

خدمت گار پھر مخل ہو گیا تھا۔ ایک نے رس لا کے رکھا، دوسرے نے پینیں سجا دیں۔ پروفیسر کچھ دیر تک چپ رہا اور رس کا گلاس خالی کرتا رہا۔ موسیقی کی آواز کبھی ایک دم تیز ہو جاتی، کبھی مدھم پڑ جاتی تھی۔ لوگ مسلسل ناچ رہے تھے اور کسی کو کسی سے سروکار ہی نہ تھا۔ مجھے اس عرصے میں خود کو استوار کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ میں نے طے کیا کہ پروفیسر سے کسی پیچیدہ معاملے پر بات ہی نہیں کرنی چاہیے۔ اس سے حاصل بھی کیا ہے۔ میں کیا اضافہ کر سکوں گا۔ مبادا میرے مُنھ سے کوئی بے محل بات نکل جائے اور فضول میں یہ خوش بسری، خوش وقتی منتشر کر دے۔ بہ ہر حال، پروفیسر ایک فریق ہے اور ایک [illegible] آدمی۔ زیرکی آدمی کی دولت ہے تو کبھی اُسے بہکا بھی [illegible] اُلجھا بھی دیتی ہے۔ کثرت ہر چیز کی بُری ہوتی ہے۔

خدمت گار نے پروفیسر کے حکم کی تعمیل میں عجلت کی، جلدی جلدی کھانا میز پر لگا دیا۔ کہتے ہیں، ہندو کھانے کی جگہ، مسلمان کھانے کی قسم اور انگریز کھانے کے آداب کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں رہا۔ کبھی بچپن میں سنا تھا۔ فرانسیسیوں کی بھی کچھ اسی طرح کی شہرت ہے۔ غالباً اُن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ کھانے کے وقت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ کب، کہاں، کیسے اور کیا کی ترتیب سے یہ دل چسپ قول کہیں سنا تھا۔ پروفیسر نے ایک انبار منگوا لیا تھا۔ ساری میز بھر گئی۔ کیکڑے کا سُوپ، کچی اور اُبلی ہوئی سبزیوں کا سلاد، سلاخوں والے بسکٹ، ڈبل روٹی، مکھن، لیموں کا پانی، مچھلی کی کئی قسمیں، جھینگے۔ ڈونگوں میں کھانے ایسی نفاست سے رکھے گئے تھے کہ لگتا تھا، تراشے گئے ہوں۔ اُنھیں چھوتے، چھیڑتے ہوئے جراحت کا احساس ہوتا تھا، کہیں میلے نہ ہو جائیں، ٹوٹ اور بکھر نہ جائیں۔

"مجھے افسوس ہے، اس جگہ ہندوستانی کھانے نہیں ملتے۔"

پروفیسر نے مصنوعی خجالت سے کہا۔ یہ مصنوعی خجالت بھی آداب کا حصّہ ہے۔

مجھے کہنا چاہیے تھا کہ جتنے بھی تو ہندوستان کی کتنی نمائندگی کرتے۔ میں نے یوں ہی کہہ دیا۔ "مگر کھانے تو ملتے ہیں۔"

"ہاں" اور ایسے بُرے بھی نہیں۔"

"وہ تو یقینی ہے، کچھ کھانے والوں کا حسنِ ذوق بھی کام دکھاتا ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"حسنِ ذوق تو ہندوستانیوں کا بھی خوب ہے۔ لندن میں متعدد ہندوستانی ہوٹل ہیں۔ میں وہاں جاتا رہتا ہوں۔ کیا لذیذ کھانے تیار کرتے ہیں ہندوستانی۔ اس منصب پر اپنی تعیناتی کے بعد تو میں نے معمول بنا لیا تھا۔ مجھے تو بہت سے کھانوں کے نام بھی آ گئے تھے۔ بریانی، یخنی پلاؤ، کباب اور وہ، وہ میٹ بال... کیا کہتے ہیں اس کو؟" وہ اُلجھ کے بولا۔

"کوفتے تو نہیں۔"

"جی، جی ہاں وہی۔" وہ اُچھل کے بولا۔ "اور ہاں، ماش کی دال کا تو جواب ہی نہیں۔ مرغ مسلّم تندوری مرغ اور شیرینی میں زردہ، شاہی ٹکڑے وغیرہ بے شمار قسمیں، بے شمار نام۔"

"پھر تو ہندوستان آپ کے لیے نیا نہیں ہوگا۔ آپ اپنے آبا و اجداد کے مانند پوری طرح مسلح ہو کے آئے ہیں۔" میں نے خود کو روکا، بس میری زبان سے نکل گیا اور بہت پچھتاوا ہوا۔

"لقمہ لیتے لیتے پروفیسر کا ہاتھ بھی رُک گیا تھا۔ اُس نے مضطربانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ یہ قدرت ہر کس و ناکس میں نہیں ہوتی کہ ایک آن میں اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھا گئی۔ "آپ ٹھیر کیوں گئے؟"

"مجھے اپنے لہجے میں آلودگی کا گمان ہوا۔"

"کیا خوب۔"

"آپ کو یقیناً اچھا نہیں لگا ہوگا۔"

"صرف ایک پل کے لیے، اور میں اِسے جہالت پر محمول کرتا ہوں۔" اُس کی آواز میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔

میں نے خاموشی مناسب سمجھی اور کچھ تامّل کے بعد موضوع بدلنے کے لیے زورا اور جمرو سے پوچھا کہ وہ کیسا محسوس کر رہے ہیں۔

"کیا بات ہے اَولے! قسم سے اِدھر تو ہر کوئی ملکہ یا بادشاہ ہے، جارج بادشاہ، ملکہ وکٹوریا۔" جمرو چہک کے بولا۔

پروفیسر نے بھی سن لیا تھا، اُس نے تجسّس سے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں پوچھا۔ "یہ بادشاہ ملکہ لوگ کا کیا بولتا ہے۔"

"کچھ نہیں، بس ایسے ہی۔" میں نے ٹالنا چاہا پھر پروفیسر کو مسکراتے ہوئے بتایا تو اُس نے بہت لطف لیا۔

"بادشاہ اور ملکہ بھی آدمی ہوتے ہیں۔"

"ہاں، مگر ہر آدمی بادشاہ اور ملکہ نہیں ہوتا، ہو نہیں سکتا۔"

اُس نے سر ہلا کے تائید کی اور مزاحاً بولا۔ "اگر سبھی بادشاہ اور ملکہ ہو جائیں تو یہ دنیا کیسی ہو جائے۔"

"پھر کوئی بھی بادشاہ اور ملکہ نہ رہے۔"

"ہاں، ہاں، واقعی واقعی۔" وہ اضطراری انداز میں بولا اور اُس کا چہرہ کھل اُٹھا۔

پروفیسر کے سامنے تشریح کی ضرورت نہیں تھی کہ بادشاہ محکوموں سے ہوتا ہے۔ بادشاہت کے لیے [illegible] موجود ہوں۔ میں نے کہا۔ "آپ نے بھی [illegible] سب سے بڑی خوبی شاہی خاندان سے اُس [illegible] میرے ایک اُستاد کہتے تھے، سنار کا بیٹا سنار [illegible] عالم کا عالم اور نان بائی کا نان بائی نہیں ہوتا [illegible] ہر شخص جاہل پیدا ہوتا ہے، مگر بادشاہ کی فضیلت بادشاہ کے خاندان میں پیدائش ہے۔ صرف بادشاہ کا بیٹا بادشاہ ہوتا ہے۔"

"بہت سے بادشاہ شاہی خاندان سے نسبت کے بغیر بادشاہ بن گئے ہیں۔" پروفیسر نے شستگی سے تردید کی۔ "قوتِ بازو سے، یا سازشوں سے۔"

"شاذ و نادر ہی۔ وہ استثنا کے ذیل میں آتے ہیں۔ مگر بادشاہ بن جانے کے بعد اُن کے ہاں بھی یہ سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ تاج اُن کے فرزندانِ دل بند کے سروں پر چلا جاتا ہے۔ تاج خاندان میں گردش کرتا رہتا ہے۔ قوتِ بازو اور سازشوں سے تخت پر متمکن ہونے والے بادشاہوں کی بھی کافی بھی آرزو ہوتی ہے۔"

مہذّب آدمی کا جو طور ہوتا ہے، کسی طالبِ علم کی طرح پروفیسر سنجیدگی سے سنتا رہا اور کہنے لگا۔ "ہاں، یہ سچ ہے۔ آپ کے یہاں کلام کی گنجائش نہیں، ہے تو جزوی۔ کیسا فکر انگیز پہلو ہے یہ۔"

جمرو اور زورا ہماری گفت گو میں شامل نہیں تھے۔ وہ خوش دلی اور خوش سلیقگی سے کھانے میں مصروف رہے۔ پروفیسر چہکتا، یا قہقہہ لگاتا تو بچّوں کے مانند اُن کی آنکھیں چوڑی ہو جاتیں اور پلکیں تھرکنے لگتیں۔ کچھ یہی حال پروفیسر کا ہوتا تھا۔ ایسے لگا ہے میرے، زورا اور جمرو کے درمیان ہونے والی گفت گو میں پروفیسر کش مکش میں نظر آتا۔ اُس کی سیکھی ہوئی ہندوستانی بڑی ابتدائی تھی۔

پروفیسر کے بار بار ٹوکنے پر ہم نے بساط سے زیادہ کھا لیا۔ مجھے خوشی ہوئی۔ جمرو اور زورا کو چھری کانٹے سے کھانے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ یہ بمبئی میں جولین، فیض آباد میں زرّیں کی رفاقت اور طویل سفر میں طرح طرح کے ہوٹلوں میں تجربے کا ثمرتھا کہ میز کرسی، چھری کانٹے کی واقفیت، یا جدید طرز میں وہ طاق ہو گئے تھے۔ آدمی میں اخذ و استنباط کی صلاحیت ہونی [illegible] چاقو کا ہنر بھی امکان اور شوق سے آتا ہے۔ [illegible] کئی بار خیال آیا کہ خالی اوقات میں پھر اُن کے [illegible] شناسائی کا بندوبست کروں۔ اُنھیں اپنی اس [illegible] کم نہیں تھی۔ معاشرے کی تہ تک پہنچنے، بل کی [illegible] والے کتابوں کے سلسلے میں کیسے فروٹ دوڑتے، [illegible] کی گرفت میں ماہر کی قلم کی گرفت بھی اچھی ہونی چاہیے۔ جولین نے بھی کئی بار مجھ سے کہا تھا۔ کبھی فراغت سے بیٹھنے کا موقع ہی نہ ملا۔ بمبئی پہنچتے ہی کانٹے چل گیا، پھر پیر داور ما جھی، [illegible] اور حیدرآباد سے نوب ثروت یار کا خط آ گیا۔ اور یہ [illegible] آدمی کو خود سے فرصت ملے تو اوروں کی طرف دیکھے۔

کھانے کے بعد خدمت گار نے شیرینی کے دو تکے میز پر رکھ دیے۔ شیرینی کے بغیر دعوت ادھوری رہ جاتی۔ پھر کافی آ گئی۔ انگریز خود گورے ہوتے ہیں، مگر کالی چیزوں سے بڑی رغبت رکھتے ہیں۔ جمرو اور زورا سگریٹ بیڑی نہیں پیتے تھے۔ کبھی کبھی شوقیہ۔ خدمت گار نے تشتری میں رکھا ہوا 'پلیئرز' کا ڈبا ہماری طرف بڑھا دیا۔ انگلستان کے سگریٹ تھے۔ جمرو اور زورا نے کش پر کش لگائے۔

پروفیسر نے اپنی طرح مجھے کوئی کثیر المطالعہ، فلسفی، عالم جانے کیا کیا سمجھ رکھا تھا۔ میں اپنی معلومات کے مطابق اس کا ساتھ دیتا رہا۔ پھر مجھے ایسا لگا کہ پروفیسر چپکے سے کوئی بات کرکے، کوئی شوشہ چھوڑ کے چٹکی بھرنے اور ساتھ ہی چھونے جیسا کوئی کام کر رہا ہے۔ کافی ختم ہو گئی تو اُس نے کیتلی سے میری ور اپنی پیالیوں میں دوبارہ کافی ڈالی اور چسکی لیتے ہوئے بولا،

"مجھے محسوس ہوتا ہے، آپ انگریزوں کے یہاں پہلے جیسے دن نہیں رہے۔ جہاز میں جتنے لوگوں سے ملاقات ہوئی، اُنھوں نے انگریزوں کی تعریف و توصیف کی کہ دیہی ہندوستان کو شہری ہندوستان بنانے میں انگریزوں کا بڑا کردار ہے۔ بجلی، ریل، مواصلات، قانون، صحت اور تعلیم کے شعبوں میں وہ انگریزوں کی کوششوں اور کارکردگی سے متاثر نظر آئے لیکن اس برملا اعتراف کے باوجود ایسا معلوم ہوا کہ اُن کے اظہار میں توانائی کی کمی ہے، خوردہ اور ترشی ہوئی آوازوں میں فرق کرنا بہت مشکل ہے۔ شہری معاشروں سے وابستہ لوگ بالعموم اپنے بیان و اظہار میں یوں بھی شعوری ہوتے ہیں، اور اتفاق ہے بیش تر اُنھی لوگوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔"

"آپ کی اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ضرور، ضرور" وہ چستی سے بولا۔

"آپ کیا جاننے کے خواہش مند ہیں؟"

"یہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"اور جاننے کے بعد آپ کیا کریں گے؟"

"ظاہر ہے، یہ آگہی نئی پالیسیاں مرتب کرنے میں کارگر ہوگی۔ نظرِ ثانی اور ترمیم سے مرد صورتِ حال کی بہتری اور خوش گواری ہے۔"

"میرا خیال ہے شدید دیر ہو چکی ہے۔"

"کیسی دیر؟" وہ اضطراب سے بولا

"ایک بات بتایئے۔"

"خدا مجھ پر رحم کرے۔" وہ سیدھا ہو گیا۔

"میں پیشگی معذرت چاہتا ہوں۔"

"بس خنجر مت گھونپیے گا۔"

"خنجر آپ کا کیا بگاڑے گا، آپ تو بارود کے عادی ہیں۔"

"آپ کے تیور خنجر اور بارود سے کیا کم ہیں، کچھ ایسا لگا جیسے آپ آخری خواہش کے بارے میں پوچھتے ہیں۔" پروفیسر چہک کے بولا، "زندگی کی تھوڑی بہت خواہش باقی ہے کہ ابھی کچھ کام نمٹانے رہ گئے ہیں۔"

"ایسے موقعوں پر ہم ہندستانی کہتے ہیں، ہماری عمر بھی تمھیں لگ جائے۔"

"ہندستانی بہت رومان پسند، خیال آفریں ہوتے ہیں۔ شاعرانہ بیانات تو انھیں خوب آتے ہیں۔"

"یہی تو ان کی کمی ہے۔ یہ خواب و خیال، شاعرانہ اطوار مجموعی طور پر مبالغہ عام کرتے ہیں۔ آئینے کے دوسرے رُخ پر شکلیں ٹٹولنے کا عمل شاعری ہے اور کسی خاص وقت اور مقام کے لیے مخصوص ہو تو موزوں ہے، یا عمر کے آخری حصے میں۔ آسمان سے شکایت کرنے، چاند سے لو لگانے اور ریت کے گھروندے بنانے کی جستجو میں گہری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ یہ ہمہ وقت سوز و ساز اور کھلی آنکھوں کے خواب، یہ بھکاریوں کی حکمرانی اور پانی میں آگ لگانے کی مہم جوئی، اس سے ہندستان کو کیا حاصل ہوا؟"

وہ مجھے دیکھے گیا۔ اس سے کچھ کہا نہ گیا۔ چند لمحے تذبذب میں گزر گئے، پھر اس نے دھندلائی آواز میں کہا، "آپ کیا پوچھ رہے تھے؟"

"میں تو بھول ہی گیا۔ یقیناً کوئی اہم بات نہ ہوگی۔"

"میرے لیے آپ کی ہر بات اہم ہے۔"

"مجھے محتاط ہونا پڑے گا۔"

"مجھے آپ اپنا دوست سمجھیے۔"

"میرے لیے یہ درجہ عزت کا باعث ہے۔"

"اور میرے سفر کا یہ کتنا اچھا آغاز ہے۔"

میرے جی میں بہت سی باتیں آئیں، لیکن میں خاموش رہا۔ اچانک موسیقی تیز ہوگئی تھی اور لوگوں نے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالنے کے بجائے الگ الگ ہو کے رقص شروع کر دیا تھا۔ مرد و عورتیں آمنے سامنے بے تحاشا بدن لہرا رہے، تھرکا رہے تھے، سب جیسے دیوانے ہو گئے ہوں۔ ان کی نگاہیں ساز بجانے والوں کے ہاتھوں پر تھیں، جتنی تیز تانیں، اتنی بے قراری، اُتنے پاؤں … چند منٹ تک موسیقار یہ شعبدہ کرتے رہے۔ پھر زور زور سے تالیاں بجنے لگیں۔ موسیقاروں نے ساز بند کر دیے۔ رقص کرنے والوں نے انھیں ہوائی بوسے نذر کیے۔

یکا یک ایک نوجوان شعلہ اندام، مگر سنجیدہ لڑکی کی آمد پر پروفیسر جز بز سا ہو گیا، اور ہم سب بھی۔

"ہیلو پروفیسر!" لڑکی نے پروفیسر کو انگریزی میں مخاطب کیا، "کیسے ہیں آپ؟"

"ہا، میری جان! میں ٹھیک ہوں۔" پروفیسر نے … کہا، "اور تم، تم کیسی ہو؟ اور وہ اپنا جوان کہاں ہے؟"

"کہاں ہوتا ہے۔" لڑکی نے پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

"وہی حال ہے، تم نے اُسے روکا نہیں؟"

"میری گزارش پر اب وہ چڑنے لگا ہے۔" لڑکی نے … اداسی سے جواب دیا، "میں نے سوچا ہے، اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ کہنے سننے کا حاصل کچھ نہیں۔" پھر وہ متوجہ ہو کے بولی، "آپ بتائیں، سفر کیسا گزر رہا ہے؟"

"بہت پُرلطف، اور آج تو اور زیادہ۔"

"کیوں، آج کیا کوئی نئی بات ہوئی؟"

"آج اس نوجوان سے ملاقات ہوئی، سمجھو، ایک دریافت۔" پروفیسر نے میری جانب انگلی اٹھائی۔ "تم سے تعارف کراتا ہوں۔ یہ نوجوان..." میرا نام لینے کی کوشش میں وہ ہچکچانے لگا۔ میں نے اس کی مدد کی، "بابر زماں... اور یہ میرے ساتھی … جمرو اور زورا۔"

… نے مصافحے کے لیے تپاک سے ہاتھ بڑھایا، پہلے … پھر جمرو اور زورا سے، "میں مایا البرٹ۔" اُس نے … کراتے ہوئے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔

"تم کھڑی کیوں ہو، بیٹھو نا۔" پروفیسر نے خالی کرسی کی … اشارہ کیا، "ہم نہایت عمدہ باتیں کر رہے تھے، … سے متعلق۔"

"میں رقص کے دوران آپ کو دیکھ رہی تھی۔ آپ لوگ … مصروف نظر آ رہے تھے۔"

"…، تم ٹھیک تھیں۔ میں واقعی تمھیں نہیں دیکھ پایا۔ … تمھیں بلا لیتا۔ تمھیں بھی تو ہندستانیات سے خاص … ہے۔" پروفیسر نے سرسری طور پر مجھے مایا کے بارے میں … اس کی ماں ہندستانی، باپ انگریز ہے، اور وہ دو سال … کی شاگرد رہی ہے۔ ہندستانیات کے موضوع پر … ایک مقالے میں وہ اُس کی نگرانی میں کام کر رہی … ماں کی وجہ سے کسی حد تک ہندستانی جانتی ہے اور … کی ابتدائی واقفیت میں اُس نے پروفیسر کی خاصی مدد … لگاتے ہوئے بولا، "اس لحاظ سے میں بھی … اپنی شاگرد کا شاگرد۔"

"…،" مایا نے انکسار سے کہا، "میں خود کتنا … ہوں۔"

سازندے دوبارہ مدھم ساز بجانے لگے۔ موسلا دھار بارش … جیسے پھوار پڑنے لگی ہو۔ وسط کے دائرے میں کچھ … ادھر اُدھر سے اٹھ کے ایک دوسرے میں گم ہونے لگے۔ "آج آپ میرے ساتھ …" مایا نے بات ادھوری چھوڑ دی … فوری عذر تجویز کر کے پروفیسر کے لیے آسانی پیدا کر دی، … سے بولی کہ مہمانوں کی موجودگی میں پروفیسر کے لیے … اُس کی رفاقت مناسب نہیں ہونی چاہیے۔

"ہاں مایا! میں نے تمھیں بتایا نا، ہم بہت دل چسپ اور … خیال میں نہایت اہم مکالمہ کر رہے ہیں۔" پروفیسر نے … خواہانہ انداز میں کہا، "کچھ دیر بعد تک … تمھارے … مجھے سکون کا احساس ہوتا ہے۔"

مایا مسکرائی اور ہماری جانب ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئی۔

میں نے پروفیسر سے رخصت کی اجازت چاہی تو کہنے لگا کہ سچ تو یہ ہے، اُسے رقص وغیرہ، اس ماحول میں اب ایسا لطف نہیں آتا۔ وہ تو مایا کی وجہ سے شریک ہو جاتا ہے کہ مایا اُسے بے حد عزیز ہے، وہ جتنی حسین ہے، اُتنی ہی ذہین بھی۔ کہنے لگا کہ ہر اعتبار سے وہ ایک غیر معمولی لڑکی ہے۔

مایا کو کوئی ادھیڑ ساتھی مل گیا تھا۔ وسطی فرش پر دھیمے دھیمے سُروں پر جوڑے رقص کر رہے تھے، جیسے ہواؤں میں اڑ رہے ہوں، پانیوں میں تیر رہے ہوں، شاید یہی زندگی کی انتہا ہے۔ دولت، طاقت اور اقتدار کے بعد آسائش کی زندگی کئی گنا ہو جاتی ہے، دس گنا، سو گنا...

"کیسا لگ رہا ہے، میری مراد ہے یہ رقص، رقص کا یہ انداز؟"

پروفیسر کے ٹوکنے سے مجھے اپنی محویت پر ندامت ہوئی، "رشک آ رہا ہے۔" میں نے کھلی آواز میں کہا اور خود کو روک لیا۔ دل میں آیا تھا، کہوں کہ حسد بھی کم نہیں ہو رہا۔

"ہندستانی رقص اور موسیقی مغرب سے بالکل مختلف ہے، یہاں تو ایسا رقص نہیں ہوتا؟"

"یہ بے اختیاری تو سرخوشی اور سرشاری ہی میں ممکن ہے۔ یہاں تو سرشاری ہی عنقا ہو گئی ہے۔"

"مگر ہندستانی رقص اور موسیقی تو مذہب سے کہاں جدا ہیں۔ کہتے ہیں، یہ تو ایک باقاعدہ علم، بڑا وسیع اور منضبط علم ہے، یہ تو

یک کارنامہ، یک اعجاز...“

”ماضی کا کارنامہ، داستانِ پارینہ۔ ہندوستان صرف ماضی تو نہیں ہے۔ کبھی مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ ماضی کی عظمت، آثارِ قدیم ہی کا چرچا کیوں، ہمارے حال کا کوئی ذکر کیوں نہیں ہوتا۔ کیا ہم محض ماضی ہیں۔ ہندوستان کا کوئی حال نہیں ہے؟“

پروفیسر کی پیشانی تنگ ہوگئی۔ اُس کی آنکھیں جھنے بھینچنے لگیں۔ ”ہندوستان کا ماضی نہایت عظیم ہے۔“

”ماضی ہی تا ماضی مٹی ہوتا ہے۔ ماضی کی عظمت کا وہ سلسلہ حال تک کیوں جاری نہ رہا؟“

”میں سمجھتا ہوں، بہ ہرحال، اَب ہندوستان ایک بڑے مستقبل کی طرف گامزن ہے۔“

”شکر ہے، آپ نے پہلی بار ایک بزرگ کا طور اختیار کیا۔ مجھے بھی آپ سعادت مندی میں کم نہیں پائیں گے۔“

پروفیسر کشمکش و پیچ کی کیفیت سے دوچار ہوا، پھر جھپٹنے کے انداز میں اُس نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔ اُس کی گرفت سے اُس کے احساسات کا اندازہ ہوتا تھا۔ ”اپنا اتنا اسیر مت کیجیے مجھے، آگے مشکل ہو جائے گی۔“ وہ ڈوبی ہوئی آواز میں بے ربطی سے بولا اور کہنے لگا۔ ”اس عمر میں کیسی پختگی ہے، اور تپش اور کاٹ!“ پروفیسر کی پل پل رنگ بدلتی حالت سے جمرو، ورزدورا بھی حیران ہوئے۔

”معاف کیجیے۔“ یہ گمان بڑا قبل از وقت ہے۔“ میرے لہجے میں کسی قدر ناتوانی آئی۔ ”میں تو پہلا آدمی ہوں۔ آگے آپ کو جانے کتنے میرے ہم صورتوں سے واسطہ پڑے۔“

”قطار میں آپ پہلے آدمی نہیں ہیں۔ انگلستان میں متعدد ہندوستانیوں سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ وہ بھی آپ سے مختلف تھے۔ اَب آپ سے مل کے سوچتا ہوں۔ کیا انگلستان میں اور قسم کے ہندوستانی جاتے ہیں؟“

”ہم میں سے جاتے ہیں، وہ ہاتھ دو پاتو سکے۔ لیکن آپ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی اُن پر آپ کی بلندو بالا عمارتوں، متنوع بہ متنوع شیا سے بھرے بازاروں، کرشمہ ساز مشینوں، دیوہیکل دانش گاہوں، کتب خانوں، عجائب گھروں، آپ کی سطوت و جلالت کی ہیبت طاری ہو جانی چاہیے۔ وہ کیا زبان کھول سکتے ہیں۔ فرق بھی کچھ کم نہیں ہے، تین سو سال، چار سو سال کا بُعد۔ ابھی آپ ہندوستان دیکھیں گے تو یہیں الستطور کا لکھا بھی نظر آ جائے گا۔ ہو سکتا ہے ماقبل تاریخ کی زندہ بستیوں سے آپ کا گزر ہو۔ میں کہتا ہوں موہن جوداڑو، ہڑپا وغیرہ کا واویلا کیوں۔ یہاں تو اُس سے پہلے کی تہذیبیں جوں کی توں سلامت ہیں۔“

”مگر، مگر...“ پروفیسر پُرعزم لہجے میں بولا۔ ”انگریزوں کی خواہش ہے کہ یہ فصل جلد سے جلد کم سے کم ہو جائے۔“

”مگر انھیں یہ خواہش کیوں ہے؟“

پروفیسر کے جسم میں کانٹا سا چبھ گیا۔ ”کیا انھیں نہیں ہونا چاہیے؟“ اُس کی آواز بکھر گئی۔

”کیا ہندوستانیوں نے اُن سے منت کی ہے؟“

”مگر کیا یہ ہندوستانیوں کی خواہش اور مفاد کے خلاف کوئی اقدام ہے؟“

”بے شک نہیں، لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہندوستانیوں نے اس نیکی کے لیے انھیں مدعو کیا ہوتا۔ اُن سے حاجت روائی کی درخواست کی ہوتی۔“

”ہُنہ!“ پروفیسر کا چہرہ بھاری ہو گیا، ہونٹ پھیل گئے۔

”پھر تو داستان لمبی ہو جائے گی۔“

”مگر اپنے موضوع پر تو قائم ہے۔“

”جی، جی ہاں۔“ اُس کا سر دیر تک ہلتا رہا۔

میں نے بچی کھچی کافی سے حلق تر کیا اور ایک بار پھر ارادہ کیا کہ پروفیسر سے اجازت لی جائے۔ جمرو اور زدورا بند سے اور کھنچے ہوئے انداز میں مسلسل سگریٹ پھونک رہے تھے۔ جگہ کا بھی کیا اثر ہوتا ہے۔ آدمی جنٹل مین بن جاتا ہے۔ پروفیسر کچھ سوچتا رہا، پھر یکایک مربیانہ لہجے میں بولا۔

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، سفر شروع کرنے سے پہلے ہدایات اور اپنے کام کی نوعیت کی صراحت کے لیے جن متعلق افسروں سے انگلستان میں میری بات ہوئی، کبھی نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کے لیے بہترین خواہشات کا اظہار کیا۔“

میں نے دل میں آئی بات خود تک محدود رکھی۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ لفظوں کی یہ ترتیب و ترکیب تکرار و تواتر سے اب افادیت کھو چکی ہے۔ میری خاموشی پر پروفیسر کو خود احساس ہوا

اور وہ مجوبیت سے بولا۔ ”مجھے افسوس ہے، میری تاویل بڑی رسمی اور سفارتی قسم کی ہے۔ یہ اُس رسم و راہ سے انحراف ہے جس کے لیے میں نے خود آپ سے گزارش کی تھی۔“

”میں بھی کچھ یہی کہنا چاہتا تھا۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”جواب میں آپ کی خاموشی عین رسمی اور سفارتی تھی۔“ پروفیسر انکھیوں سے مجھے گھورتا ہوا چہکتی آواز میں بولا۔

”یقیناً آپ کی ذمے داریوں میں آتشک شوئی، وکالت اور تبلیغ کے اُمور شامل نہیں ہوں گے۔“

”یقیناً نہیں، بالکل نہیں۔“ پروفیسر نے شدومد سے تردید کی۔

”میں بھی وضاحت کروں، میرا مقصود بھی جواب طلبی نہیں ہے۔ اپنے علم اور قیاس کے مطابق مبہم و موہوم جواب مجھے معلوم ہیں۔ میرا مقصد ہے کہ سوال آپ کے پیشِ نگاہ رہیں۔“

”بے شک۔“ پروفیسر پھر منتشر ہونے لگا۔ ”کیا، کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟“

”ایسا کچھ نہیں۔“ میں نے اٹکتی زبان سے کہا۔ ”بظاہر بچوں کی سی بات ہے۔ بس یوں ہی دماغ بھنکتا رہتا ہے، ریت سی اُڑتی رہتی ہے سر میں۔ کبھی خیال آتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے قیام کا اصل میں مقصد کیا ہے؟“

پروفیسر کا جسم تن گیا۔ وہ کسی معقول جواب کے لیے لفظ ڈھونڈ رہا تھا کہ میں نے اُسے زحمت نہیں دی اور کہا کہ کیا انگریز ہندوستان کو انگلستان بنانے کے خواہاں ہیں۔ یہاں کی نرم و گرم آب و ہوا اِس قدر مرغوبِ خاطر ہوگئی ہے کہ رفتہ رفتہ انگلستان کی ساری آبادی ہندوستان منتقل کر دینے کا عزم ہے، یا پھر ہندوستان کی اکثریت کو اقلیت میں بدل دینے کا کوئی خواب شرمندۂ تعبیر کر دینے کی آرزو ہے؟

”نہیں، نہیں۔“ پروفیسر نے بے قراری سے کہا۔ ”یہ ستم ظریفی انگریزوں سے ممکن نہیں ہے۔“

”ظاہر ہے۔“ میں نے بہ عجلت کہا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔ پھر یہاں اُن کے طولِ اقتدار کا کیا جواز ہے؟ یہ جواز کہ ہندوستان تو سونے کی کان ہے۔ یہاں زر و جواہر کے انبار ہیں۔ زمینیں لالہ زار، شجر ثمربار ہیں۔ ہر شخص خوش حال، اطلس و کمخواب

BANK
”کچھ بدمعاشوں نے ہماری گاڑی چرالی ہے۔“

میں ملبوس ہے اور جنسی بے پھرتا ہے۔ فاتحین کو یہ حق حاصل ہے کہ مفتوحوں سے یہ ناز و نخوت، یہ جاہ و حشمت چھین لیں، چھینتے رہیں، یہ تو فاتحین کی ایک پرانی رسم ہے، اور واقعی یہی کچھ ہے تو انگریزوں کو ہندوستان میں اپنی محبوبیت و مقبولیت کی توقع کیوں کر ہے۔ مفتوحین کا بھی پھر کوئی طور ہوتا ہے۔ کسی اچھی گھڑی، کسی اچھے ہدف کی فکر میں سرگرداں رہنا اور مناسب موقع ملنے پر غاصب سے کوئی رعایت نہ کرنا۔“

پروفیسر پر سکوت طاری رہا۔ میرے چہرے پر اُس کی نگاہیں گڑھی ہوئی تھیں۔ میں نے ٹھیری ہوئی آواز میں کہا۔ ”کیا ہندوستانیوں کی غربت اور ناداری، دیدہ ریزی و جہل شناسی انگریزوں کے علم میں نہیں ہے؟... ہندوستان کی بیشتر آبادی دیکھا ہے، جھونپڑیوں میں رہتی ہے۔ جفاکشی دخت جانی اُن کا شعار ہے، شعار کیا، اُن کے پاس زندہ رہنے کا کوئی اور قرینہ ہی نہیں ہے۔ دفترِ سرکارِ برطانیہ نے طرح طرح کے محصول اُن پر عائد کیے ہیں، مگر تحصیل کا سزاوار تو وہی ہو سکتا ہے، جس کے پاس نانِ جویں اور تن پوشی سے کچھ بچتا ہو۔ کیا درد مند انگریزوں نے کبھی توجہ کی کہ اُن کے محصولات کا بوجھ لوٹ پھیر کے اُنھی بدبختوں کی کمر پر آتا ہے جو پہلے ہی بہت ناتواں ہیں۔ اُن کمل نشیں، قبائل متمدوں پر نہیں، جن کے شانے بہت مضبوط اور جن کے قدموں سے زمین بیزار نہیں ہے۔ یہ صاحبانِ تدبیر

یہاں انگریزوں کے مفادات کے نگراں بن چکے ہیں، وہ اُن کے نائبین کے فرائض نہایت حسن و خوبی سے انجام دیتے ہیں۔ انگریز انھیں خطابات سے نوازتے ہیں، انھیں منصب و دولت سے، حکم رانی کا یہ بالواسطہ طریق کار تو کیمیا گر ثابت ہوئے۔ راستے خود بہ خود روشن ہوتے گئے۔ یہی ہنر مستند و معتبر ٹھہرا ہے، تو اب کوئی نیا تجربہ کیوں کیا جائے۔"

"میں... میں سمجھا نہیں۔" پروفیسر اضطراری لہجے میں بولا، "یہ بالواسطہ حکم رانی سے آپ کی کیا مراد ہے؟"

"کوئی ابہام نہیں، ذرا غور کیجیے تو سب کچھ آئینہ ہو جائے گا۔" میں نے اپنی آواز دھیمی رکھنے کی کوشش کی کہ لہجے میں میرے کسی درونِ خانہ عناد کی تپش کم سے کم محسوس ہو۔ یہ تو بڑا ہی ایک مشکل کام ہے۔ اس کے لیے آدمی کو پتھر کا ہونا چاہیے، یا لوہے کا۔ میں نے کہا، "پروفیسر صاحب! میں سمجھتا ہوں، یہ نکتہ انگریزوں کو بہت پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ ہندستان کے ہنر مند، کاشت کار، مزدور آخری درجے کی زندگی گزارتے ہیں اور عملاً اپنے اپنے علاقے کے راجے مہاراجوں، نوابوں، سرداروں، جاگیرداروں اور زمیں داروں کے نرغے میں ہیں، چناں چہ یہی قرینِ عقل تھا کہ وہ انھی ذی حشم، عالی مقام لوگوں پر توجہ مرکوز رکھیں۔ کہیں انھیں نوازشوں سے زیر بار کیا جائے، کہیں قوت و قدرت سے اسیر کیا جائے۔ ان مقتدر امیروں کی تعداد ہندستان کے حقیر غریبوں کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر تھی، اور ہے۔ دولت مند ویسے بھی خزاں سے بہت ہراساں رہتا ہے۔ زندگی بھر وہ پشتے مضبوط کرتا رہتا ہے کہ آندھیاں اُس کی دہلیز نہ چھو سکیں۔ کہتے ہیں، جتنی دولت، اتنی مضبوطی، پائداری، اتنا ہی خوف۔ انگریزوں نے انھی ہوش مندوں کو شیشے میں اتارا اور فرزندانِ دل پذیر دولتِ انگلیشیہ کے خطاب سے نوازا۔ جن چند ایک سے ہوا کا رُخ نہ پہچاننے کی نادانی ہوئی، انھیں کہیں امان نہ ملی۔ طاقت سے بڑا طاقت کا دبدبہ ہوتا ہے۔ جہاں ضرورت پڑی، وہاں طاقت کا اظہار کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی گئی۔ جو چند ایک عقل دشمن سرکش ثابت ہوئے، انھیں اُن کی زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ جنھوں نے آسمان کے بدلتے ہوئے تیور بھانپ لیے، اُن کے مدارج بلند ہوئے۔ شاید اس مصاحبت میں اپنے ہم رتبہ، ہم پیشگاں کو مغلوب دیکھنے کی بھی ایک حسرت نہاں تھی۔ کم حیثیت امیر بڑی حیثیت کے امیر کے لیے بہت کینہ دل میں چھپائے ہوتا ہے۔ انگریزوں نے ہندستان کے ان صاحبانِ زر و اثر کی باہمی رقابتیں تاک لی تھیں۔ انھوں نے ابتدا میں کم زحمتوں سے مراتب فزوں کیے۔ الغرض، جو اُن کی پناہ میں آیا، وہ سر بلند ہوا، جو کدورت و کبیدگی کا مرتکب ہوا، وہ معتوب و مطعون قرار پایا۔

سامنے رکھے گلاس سے میں نے گھونٹ بھر پانی پیا اور یوں پروفیسر کے چہرے سے کچھ اخذ کرنے کے لیے تامل کیا۔ رنجش اور برہمی کے بجائے اُس کی آنکھوں میں تجسس دیکھ کے مجھے حوصلہ ہوا۔ میرے رُک جانے پر وہ پھر مضطرب ہو گیا تھا۔

"مطلب یہ ہے..." میں نے جکڑی ہوئی آواز میں کہا، "کیا یہ ماجرا حکومتِ برطانیہ کے اہل کاروں کے علم میں نہیں تھا کہ اُن کے عائد کیے ہوئے محصول کن لوگوں پر واجب ہوتے ہیں اور ان کی ادائی کا بار کون اُٹھاتا ہے، اور یہ کہ اُن کے لائق و فائق فرزند گروہ سے کچھ نکالنے کے بجائے بے چارے محکومین سے گرہ حصہ اور تنگ کر دیتے ہیں، نتیجے میں غریب اور دوش پا ہو جاتے ہیں۔ انگریزوں کو اپنے خزانۂ عامرہ کی لب ریزی سے غرض تھی۔ 'کہاں سے، کیسے اور کیوں' کی تشویش حجت کے مترادف تھی۔ حاصل یہ کہ چشم پوشی دانستہ تھی۔ دولت صحیح طور پر تقسیم ہو جایا کرے تو کبھی غریب ہو جائیں، یا سبھی مال دار۔ انگریزوں کو ہندستان میں یہ عادلانہ نظام رائج کرنے کی پوری مقدرت تھی، مگر شاید یہ نیکی انھیں راس نہیں آئی۔ تنگی کے روبرو، اُمرا تک رسائی، یا اُن کی گرفت میں ایسی رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی، جیسی تنگ و تاریک، متعفن اور مردم بیزار گلیوں سے گزر کے انبوہ تک پہنچنے میں ممکن تھی۔ یوں دیکھا جائے تو انگریز ہندستان کے عوام کے حاکم ہونے کے بجائے یہاں کے خواص کے حاکم رہے ہیں۔ درمیان کے یہ لوگ دلالی کے لیے آسانی سے دست یاب تھے۔ کھلی چھوٹ، درگزری اور پشت پناہی اس خدمت کا صلہ طے پائی۔ اصل میں دونوں ہی کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ نیت ایک، مقاصد ایک۔ انگلستان کے آئین کی طرح افہام و تفہیم کا غیر تحریری معاہدہ دونوں کے درمیان ایک زمانے سے عمل پذیر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ انگریزوں کو آگہی ہے کہ اُن کے یہ پیشہ ور کارندے اپنے محکومین کی محرومیوں کے سبب سے معتبر و مفتخر ہیں۔ اس کے سوا اُن کی کوئی اور فضیلت نہیں۔ ادھر یہ نمک خوار و وفا شعار بھی کشورِ انگلستان کے رموزِ سلطانی و جہاں بانی سے خوب واقف ہو چکے ہیں۔ انھیں اندازہ ہے کہ ہندستان میں برطانوی حکومت کے لیے اُن کی حیثیت ستون کی ہے، آڑ کی سی ہے، اور وہ تو تاجِ برطانیہ کا ایک جزوِ لازم ہیں۔ اُن کے وسیلے کی سمندر پار کے آقاؤں کو عادت پڑ چکی ہے۔ اس تن آسانی میں یہ اتنی دور جا چکے ہیں کہ اب کوئی اور عملی حکمت وضع کرنا اُن کے لیے آسان نہیں۔ اتنے عرصے میں ایک مروّت بھی آنکھ میں گھر کر لیتی ہے۔ ویسے بھی گورے سگ پروری میں خاصے ماہر ہوتے ہیں، اور یہ ہندستانی تو غراتے بھی نہیں۔"

اپنے لہجے کی کھسیاہٹ خود مجھی کو بُری لگی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ پروفیسر کسی بہرے میں نہیں کھڑا تھا، میں کوئی مدلل تبصرہ کر رہا تھا۔ سامنے کے دائرے میں لوگ ابھی تک باہم پیوست، مست و بے خود سازوں کے اشاروں پر رقصاں تھے۔ یہ ناگوار وقت اور تحیر آفریں جگہ ان مباحث کے لیے یک سر ناموزوں اور یہ سنجیدگی سراسر بے ذوقی تھی۔ غالباً یہی بہتر تھا کہ اپنی بات مکمل کر کے میں خاموش ہو جاؤں۔ وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جن کا سینہ، جن کا خون اُن کے اظہارِ رائے، لہجہ و لب میں شامل نہیں ہو پاتا۔ پہلے مجھے اس نظم و ضبط کی مشق کرنی چاہیے تھی، مگر وہی ہوا۔ میرے توقف پر پروفیسر پریشان سا ہونے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے ٹوکتا، میں نے نسبتاً بے اعتنائی سے کہا، "سنتے ہیں، وقت یک ساں رفتار سے نہیں چلتا۔ وقت کے تیور کچھ بدلے بدلے سے نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے، یہ سلسلہ تادیر جوں کا توں قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ خواہش کی بات نہیں۔ وقت کی کروٹیں محسوس کی جا سکتی ہیں۔ کسی انتہا پر تو ہندستان کے پس ماندگاں کا ردِعمل بھی فطری ہو سکتا ہے۔ انسانوں کے یہ غول ہزار جان دَردوں کی زندگی بسر کرتے ہوں، جان ور تو نہیں ہیں۔ انگریزوں کو بھی شاید یہ آپ کسی تلاطم کا احساس ہو چکا ہے۔ آپ کی آمد کی وجہ بھی، جیسا کہ آپ نے خود بتایا، کچھ اسی سبب سے ہے۔"

"یقیناً یہی، یہی کچھ ہے" پروفیسر نے اٹکی ہوئی آواز میں تائید کی، اور کہنے لگا، "لیکن صورتِ حال پہلے جیسی قطعاً نہیں ہے۔ انگریزوں نے ہندستان میں ریل کا وسیع نظام پھیلایا ہے۔ بجلی، کارخانے، سڑکیں وغیرہ۔ ان کے فائدے انگریزوں کے منظورِ نظر، مرغوبِ خاطر لوگوں، نواب، راجے مہاراجوں ہی کو حاصل نہیں ہوتے۔ کیا یہ حرکت پذیری مجموعی طور پر ہندستانی معاشرے پر اثر انداز نہ ہو گی؟"

"یہ دلائی بھی خوب ہے" میرے ہونٹ پھیل گئے۔ میں نے زہر خند سے کہا، "کوئی انکار نہیں کہ ہندستان میں شہری معاشرے فروغ پا رہے ہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں کا قیام، نئی سڑکیں، بہتر رہن سہن کی بستیاں، ریلوں کا جال، نلکوں کے ذریعے پانی، ڈاک اور تار کا جدید طریقہ، بڑے شہروں میں آمد و رفت کے لیے لاریوں، بسوں، موٹر گاڑیوں کا رواج، جدید طرز کے شفاخانے، نئی تعلیم کے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں۔ یہ سب کچھ ہوتا دکھائی دے رہا ہے، مگر ساتھ میں کچھ اور اقدام بھی تو ضروری ہیں۔ کیا اُن لوگوں کی سرپرستی سے انگریزوں نے ہاتھ اُٹھایا ہے جو ہندستان کے عام آدمی کی شکستگی کا بنیادی سبب ہیں۔ یہ دورنگی تو ایک تماشا ہوئی۔ کیا ایک مقام سے دوسرے مقام تک ہفتوں کے فاصلے پہروں میں سمیٹنے والی ریل اور پلک جھپکنے میں بام و در روشن کر دینے والے قمقموں نے دُورافتادگاں کے لیے روز و شب کی منزلیں سہل کر دی ہیں۔ ان سیہ روزگاراں کی نس نس میں اُترے اندھیرے مٹا دیے ہیں؟ آپ کے ناز بردار مراعات یافتگاں کے تسلط سے انھیں نجات مل گئی؟ میں پوچھتا ہوں، اس ایک جرأت میں

کیا قباحت ہے۔ آدھی دُنیا پر قائم سلطنتِ برطانیہ مُٹھی بھر اپنے کاسہ لیسوں کے قصیدوں کے آگے لاچار ہے کیا؟ ضرور کوئی اور بھید ہے۔ سرکارِ برطانیہ کو اعتماد نہیں ہے کہ اِن سہاروں کے بغیر وہ ہندوستان پر قبضہ و تصرّف میں کامیاب رہ سکتی ہے؟ دوسری کسی حکمت میں اُسے بساط بکھر جانے کا اندیشہ ہے۔

"ابھی میں اِس باب میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" پروفیسر نے پژمردگی سے کہا۔ "بادی النظر میں آپ ہی کا تجزیہ دُرست معلوم ہوتا ہے، تاہم حکومتِ برطانیہ اپنے بہی خواہوں، پرانے دوستوں کی رفاقت سے یوں ایک جھٹکے میں دست بردار بھی تو نہیں ہو سکتی۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی۔ ان لوگوں کو بے دست کر دیجیے۔ دیکھیے، کیسے بے دست و پا ہو جائیں گے۔ اِن کی موجودگی میں عام ہندوستانی کو نئی زندگی دینے کی خواہش، خواب کی حیثیت رکھتی ہے۔ پچاس فی صد، بل کہ نوّے فی صد ہی آبادی تو آپ کے رفیقانِ خاص کی رعیت ہے، غلام ہی کہیے، یہ اُن کے مالک و مختار ہیں، اَن داتا ہیں۔"

"بات بہت دُور تک جاتی ہے۔" پروفیسر کی آواز کھوئی تھی، "میں سمجھتا ہوں، یہ میری خوش فہمی بھی ہو سکتی ہے کہ ہندوستان میں صنعتی رجحانات اور شہروں کے فروغ سے کوئی تبدیلی، بہ ہر حال، لازم ہے۔ سست رفتاری سے سہی، لیکن فرق پڑنا چاہیے۔"

بہت سے جواب میرے ذہن میں گردش کیا کیے۔ میں نے خود کو باز رکھا۔ مجھے کسی اختلاف و انحراف کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے تو اپنے آپ پر حیرت تھی کہ میری زبان کیوں اِس قدر رواں ہے۔ مجھے ان مسائل و مباحث سے کبھی ایسا شغف نہیں رہا۔ سفر کے دوران کبھی کبھار، اسٹیشنوں کے کتاب فروشوں سے اِکّا دُکّا رسالے، اخبار اور کتابیں خرید کے سرسری نظر ڈالنے سے آدمی عالم فاضل نہیں ہو جاتا۔ کوئی بھی اُلٹی سیدھی بات کسی لمحے مُنہ سے نکل سکتی ہے۔ آدمی کو جس موضوع پر دست رس نہ ہو، اُس پر لب کشائی سے پرہیز ہی کرنی چاہیے، اور میرے سینے میں تمام تر احتیاط کے باوجود یہ کیسی سوزش عود کر آئی ہے۔ یہ تو ایک نقص ہے۔ میں نے خود کو

تلقین کی کہ بس، اِتنا ہی بہت ہے۔ پروفیسر کو زِچ کر کے ہندوستان کے لیے برطانوی سرکار کی فکری نہج بدل جانے کی کوئی توقع میرے دل میں جاگزیں ہے تو کیسا طفلانہ پَن ہے۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ بات بہت دُور تک جاتی ہے۔ شاید مجھ میں تحمّل کہ اُس کے سامنے مدّعا بیان کرنے کی سکت نہیں ہے۔ خود فکری، خود نگری، کوچہ گردی اور جا قو بازی کے سوا مجھے کام بھی کیا رہا ہے۔

ساز دھیمے ہوتے ہوتے ٹھیر گئے اور ہر جانب ہلکا ہلکا شور گونجنے لگا۔ رقص میں مستغرق جوڑے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ مایا نے خوش پوش رقص شریک سے جدا ہو کے لپکتے قدموں سے ہمارے پاس آ گئی، اور پروفیسر سے رسمی اجازت لے کے اُس کے پہلو میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تھکی تھکی لگ رہی ہو، کیا پیو گی!" پروفیسر نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ "تھوڑی سی شراب ایسے وقت اکسیر کا درجہ رکھتی ہے، مگر شراب سے تمھیں بیزاری ہے۔"

"ایسا نہیں کہ کبھی چکھی ہی نہ ہو۔" مایا کے ترشے ہوئے ہونٹ سکڑ گئے۔ "لیکن اب تو اس کے ذکر ہی سے نفرت مجھے ہو گئی ہے۔"

"تو کیا پیو گی؟"

"ابھی رہنے دیجیے۔" مایا اپنے دراز سیاہ بال درست کرتے ہوئے بولی۔ "کچھ دیر بعد..."

وہ مغربی اور مشرقی حُسن کا ایک دل کش امتزاج تھی، سیاہ آنکھیں، گھنی پلکیں، کشیدہ قامت، متجلّی نقش و نگار، ستواں ناک، موتیوں سے دانت، نہ بڑے، نہ چھوٹے، سرخ و سپید رنگت میں جیسے قدرت نے چٹکی بھر زردے کی آمیزش کر دی ہو۔ الغرض، سانچے میں ڈھلا سراپا۔ جانے کیوں، مجھے ڈاکٹر رائے کی بیٹی بینا یاد آ رہی تھی۔ دونوں میں ایسی مماثلت نہیں تھی، مگر حُسن و جمال کی کوئی ایک معیاری مثال نہیں ہوتی، اور کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔ دینی بھی نہیں چاہیے، باطنی خوبیاں بھی تو حُسن کا حصہ ہوتی ہیں۔ مایا کے بارے میں مجھے کیا معلوم تھا، بینا ایک ہمہ صفت لڑکی تھی۔ پروفیسر نے سچ کہا تھا، مایا کی آنکھوں سے ذہانت چھلک رہی تھی۔ رفتار، گفتار، نشست، برخاست سے شائستگی اور نفاست عیاں تھی، اعلا قسم کا سیاہ مغربی لباس پہنے ہوئی تھی۔

"میں مخل ہوئی، آپ کیسی اہم اور دل چسپ باتیں کر رہے تھے کہ گرد و پیش کا کچھ ہوش ہی نہیں تھا؟"

"ہم تمھارے انگلستان اور تمھارے ہندوستان کے بارے میں بات کر رہے تھے۔" پروفیسر نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

"میں شریک نہیں ہو سکتی؟" مایا اشتیاق سے بولی۔

"کیوں نہیں، تم اُس وقت چلی گئیں۔ کاش، تمھیں ہمارے ساتھ موجود ہوتیں۔ اِس نوجوان کی زبان سے جیسے سارا ہندوستان کلام کر رہا تھا، جیسے ہندوستان اپنا مقدمہ پیش کرتا ہو۔"

"اور انگلستان کٹہرے میں کھڑا ہو۔" مایا کے رخساروں پر شوخی پھوٹ پڑی، کم کم چہرے ہنستے ہوئے اِس طرح گل زار ہوتے ہیں۔

"یہ شخص بھی برطانوی راج پر اِس کا تجزیہ کیا فکر انگیز ہے۔"

"کیا کہتے ہیں یہ صاحب؟" مایا خالص ہندوستانی انداز میں کھنک کے بولی۔ ایک لمحے کے تذبذب کے بعد اُس نے میرا نام لیا۔ "بابر رحماں! ابھی نام بتایا تھا آپ نے؟"

"آپ کو بہت یاد رہا۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"یہ بڑی حسّاس، یادداشت کی پختہ ہے۔" پروفیسر ستائشی نظروں سے مایا کو دیکھتے ہوئے بولا، اور دایاں ہاتھ مایا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "یادداشت کی پختگی اور حساسیت آدمی کو مضطرب بھی بہت رکھتی ہیں۔"

"کیا کرتے ہیں آپ؟" مایا نے کھنکتی آواز میں پوچھا۔

مجھے تامّل ہوا، "کیا بتاؤں۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور کہا، "سیر و سیاحت سمجھ لیجیے۔"

"ظاہر ہے، کسی مقصد سے۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی، "میری مراد ہے، کون سے پیشے سے وابستگی ہے۔"

"سچ پوچھیے تو ابھی کوئی کام شروع نہیں کیا، ابھی تو بس یوں ہی..." میں اُسے کیا بتاتا، میں نے جھجک کے کہا، "مجھے کچھ آتا بھی تو نہیں ہے۔"

میرے جواب سے اُس کا تجسس فزوں ہونا چاہیے تھا، لیکن اُس کا تعلق پولیس سے نہیں تھا، اُس کی تربیت ایک متمدّن

"تم جیت گئے تا بر برٹ"

گھرانے اور معاشرے میں ہوئی تھی۔ شاید یہ اخذ کر کے کہ مجھے خود کو افشا کرنے میں کوئی عار ہے، وہ شگفتگی سے کہنے لگی، "یقیناً کسی بڑے گھر سے تعلق ہو گا، میری ماں نے مجھے ہندوستانی رئیسوں کے قصّے کہانیاں سنائی ہیں کہ وہ کوئی کام ہی نہیں کرتے، سیر و سیاحت کرتے ہیں، شکار کھیلتے ہیں، شطرنج کھیلتے، مرغ بازی، کبوتر بازی کرتے، رنگ رلیاں مناتے ہیں اور ہاں، حکم چلاتے ہیں۔"

"حکم چلانا بھی تو ایک کام ہے۔" جی میں آیا، کہوں، 'اور گورے یہاں کیا کرتے ہیں۔' میں چپ رہا کہ طبعِ نازک پر حق بیانی بار ہونے کا گمان ہوا۔ میں نے پوچھا، "آپ پہلی بار ہندوستان آئی ہیں؟"

"میں ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ چھ سال کی عمر تک یہیں رہی، پھر انگلستان چلی گئی، بعد کو یہاں آنا ہی نہیں ہوا۔"

"کچھ یاد ہے یہ ہندوستان؟"

"صرف پرچھائیں، دُھندلی دُھندلی سی یادیں۔" مایا خواب ناک لہجے میں بولی، "ماں نے بتایا تھا، شمالی ہند کے ایک پہاڑی علاقے، نہایت خوب صورت مقام شملا شہر میں میری پیدائش ہوئی تھی۔ ہمارے قریبی عزیزوں کا تعلق

ریاست بھوپال سے تھی، لیکن بیش تر دلّی میں رہتے تھے۔ شادی کے بعد کوئی واسطہ ہی نہیں رہا ماں کا کسی سے۔ اِس لیے کہ ماں نے سارے خاندان سے جھگڑ کے میرے باپ سے شادی کی تھی۔ لیکن سب ہیں۔ مجھ میں اُنھیں دیکھنے کی خواہش مندی ہی ہے۔"

"مایا کا باپ ہندستان میں تعینات برطانوی فوج میں بریگیڈیئر تھا، بہت عمدہ شخص، کم سے کم فوجی اور زیادہ سے زیادہ شاعرانہ خوبیوں کا حامل، کتابوں کا رسیا۔" پروفیسر نے دخل دیا۔ "میرے اُس سے پرانے مراسم تھے۔ عرصے تک وہ مجھ سے دُور ہندستان میں رہا۔ اُس نے کئی بار بلایا، مگر آنا ہی نہ ہو سکا۔ ہندستان میں اُسے ایک ہندستانی لڑکی پسند آ گئی، وہیں شادی کر لی، پھر اُسے انگلستان واپس بلا لیا گیا۔ میجر جنرل کی حیثیت سے ریٹائر ہوا۔ ایک بیٹا ہوا، ایک بیٹی... یہ مایا۔ بیٹا برطانوی شاہی فوج میں پائلٹ ہو گیا تھا۔ دو سال ہوئے، ہوائی حادثے میں زندہ نہ رہ سکا، نوجوان بیٹے کی موت کا صدمہ باپ سے برداشت نہ ہوا، وہ بھی جلد ہی چل بسا۔"

"اوہ!" میں نے افسوس کا اظہار کیا۔

"وہ سب کچھ نہ دُہرایئے پروفیسر۔" مایا نے آزردگی سے کہا، "لوگ بچھڑ ہی جاتے ہیں، اچھے بُرے سبھی۔"

"ہاں، یہ میں کیا ذکر لے بیٹھا۔" پروفیسر شرمندگی سے بولا، "واقعی میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔" پھر موضوع بدلنے کے لیے وہ مجھ سے مخاطب ہو کے تیزی سے بولا، "ہم کیا بات کر رہے تھے؟"

"آپ بھی تو کچھ کہیے، کچھ انگلستان کے بارے میں بتایئے، وہاں کے موسم... کچھ وہاں کی باتیں۔ سنا ہے، آنکھیں چندھیا جاتی ہیں آپ کے کرشمے دیکھ کے۔"

پروفیسر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ "مگر میں استفادہ کر رہا تھا۔" وہ خوش وضعی سے بولا۔

"کچھ مجھے بھی اِس کا موقع دیجیے۔ آپ اوکسفرڈ میں اُستاد رہے ہیں۔ استفادے کی گذارش تو مجھے آپ سے کرنی چاہیے۔"

"اِس کا بھی وقت آئے گا۔" وہ شوخی سے بولا، "ہرچند مجھے شبہ ہے کہ میں آپ کے لیے کسی اضافے کا موجب ہو سکوں گا۔"

"دیکھیے، آپ نے خود ہی میری فہم کی کمی کی تصدیق کر دی۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"اوہ نہیں، بہ خدا نہیں۔" وہ بے چین ہو گیا۔

"مگر کچھ غلط بھی نہیں ہے۔"

"ایسا نہیں ہے۔" وہ سر جھٹکنے لگا، "اِس طرح نہیں جناب! شرمندہ مت کیجیے۔ میں نے کچھ دیر پہلے آپ سے کہا تھا کہ اب تک جتنے ہندستانیوں سے ملنے کا موقع مل سکا ہے، اُن میں آپ سب سے ممتاز ہیں۔ یاد ہے آپ کو؟"

"جی!" میں نے سر جھکا لیا۔

"از راہِ کرم مجھے ایک طالب علم سمجھیے۔" وہ منکسر لہجے میں بولا، "میں نے آپ کی ہر بات تحسین کی ہے۔"

"لیکن میں تو... میں تو..." میں نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا، "یہ ایک بے خیال اور بے علم کی عزت افزائی ہے۔"

"دراصل میرے لیے یہ اعتراف طمانیت کا باعث ہے۔" پروفیسر کے لہجے میں ذرا بھی بناوٹ نہیں تھی، کہنے لگا، "آپ کیسی اہم باتیں کر رہے تھے۔ وہ سلسلہ جاری رکھیے۔ ضرور کوئی لحاظ مانع ہے کیا۔"

"شاید میری وجہ سے۔" مایا چہک کے بولی۔

"نہیں، بالکل نہیں۔ شاید پاس کچھ بچا ہی نہیں ہے۔"

"وہی گریز!" پروفیسر نے بے کلی سے کہا، "میں ... اپنی ستقامت کا یقین دلاتا ہوں۔"

"مجھے اندازہ ہو چکا ہے۔"

"اور درخواست بھی تو میں نے ہی گزاری ہے۔"

"اب آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"میں تو آپ کا بے حد ممنون ہوں، ایک اجنبی کو آپ نے اِتنا وقت دیا۔ یہاں آنے کی زحمت کی۔"

"سچ تو یہ ہے، آپ کے توسط سے ہمیں اِس ممنوعہ جگہ باریابی نصیب ہوئی۔ اِس طرح انگلستان کی ایک جھلک دیکھ لی۔ یہ سب کچھ کیسا خواب ناک ہے۔ موسیقی، خوش بُو اور اِتنے دل کش، خوش منظر لوگ۔ آپ سے ملاقات نہ ہوتی تو اِتنے قریب ہو کے بھی ہم اِس نظارے سے محروم رہتے۔"

"ہاں۔" اُس کی آواز بجھ گئی، "مجھے معلوم ہے، اُنھوں نے اِس جگہ انگریزوں کی موجودگی میں ہندستانیوں کا داخلہ بند کر رکھا ہے۔ صرف چند ہندستانی استثنا میں آتے ہیں،

وہ لوگ ہیں جو کسی انگریز کے مہمان ہوں۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ میں اِس پابندی کی توجیہہ نہیں کر سکتا۔ میرے لیے یہ حیران کُن بھی ہے اور تکلیف دہ بھی۔"

"آپ کا تعلق جیوں کہ دروں و تدریس سے رہا ہے۔ اِس لیے یہ سب آپ کو عجیب سا لگتا ہے۔ کچھ دن ہندستان میں رہ کے آپ اِس تفریق کی توجیہہ آسانی سے کر سکیں گے۔ ہم تو اب عادی ہو چکے ہیں۔ ہمارے لیے یہ اتنی اہم بات نہیں رہی۔"

"ہند..." پروفیسر تاسّف سے چچکا کے رہ گیا۔

"یہ تو نیز انگریزوں کی بات ہوئی۔ وہ بہت زور سے اپنے خاص مزاج اور رسم و رواج کے ساتھ آئے ہیں۔ یہاں تو آپس میں بھی بڑا امتیاز برتا جاتا ہے۔ نواب راجا اور بلند مرتبت جاگیرداروں اور زمین داروں کا بھی اپنے ہم وطنوں سے کچھ ایسا سلوک ہے، اور اِس سے آگے کی منزل بھی ہے۔ یہاں آدمی اچھوت بھی ہوتا ہے۔ ایک کے چھونے سے دوسرا آدمی ... ہو جاتا ہے۔"

"... نے پڑھی ہیں اِس مسئلے پر کئی کتابیں، لیکن امیری ... بجائے اِس امتیاز کی بنیاد ہندوؤں کی ذات پات کا ... ہے۔" پروفیسر کسمساتے ہوئے بولا، "مگر ایک اور بات ... کچھ لوگ غریب، کچھ آسودہ حال، کچھ امیر و کبیر، ایسا کیوں ہے کہ ہر معاشرے میں بعض لوگ غریب، بعض امیر، بعض پست، بعض بلند ہوتے ہیں، یا ہو جاتے ہیں، عام جسمی، یا دماغی اعتبار سے توانا لوگ آگے نکل جاتے ہیں۔"

"معاف کیجیے، میں آپ سے متفق نہیں۔" میں نے ناگواری سے کہا، "کیا آپ جسمی و دماغی اعتبار سے برتر لوگوں کو ہمارے ہاں کے روایتی زمین داروں کے مشابہ قرار دے رہے ہیں۔ ہمارے یہ جاگیردار، اپنے آبا و اجداد کے پس خوردے کے سبب سے ممتاز ہیں۔ یہ جدّی پشتی ورثے دار دوسرے اور خود اپنے معاشرے کے صاحبانِ علم و فن کے کس طرح مماثل ہو سکتے ہیں۔ خداداد خوبی، اکتسابی خوبی اور ورثے کی خوبی میں کوئی تو ترجیح ہونی چاہیے۔ ترکے کی دولت و امارت کے سوا ہمارے سرفراز لوگوں کی اور کیا خوبی ہے۔"

"ہاں، بے شک۔" پروفیسر مایوس آواز میں بولا، "سب سے قابلِ قدر اکتسابی خوبی ہے۔"

"اِس کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے، اور کبھی عمر صرف ہو جاتی ہے۔"

"اور کبھی عمر بھر کے ایثار، تگ و دو کے بعد بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آدمی پیاسا چلا جاتا ہے۔"

"مگر اِس تشنہ کامی کی یہ سرشاری اپنی جگہ ہے کہ عمریں گنوائی تو نہیں۔"

"میں دیکھ رہا ہوں۔" پروفیسر نے چمکتی آنکھوں سے کہا، "دیکھا مایا؟"

مایا کے رخساروں پر ایک رنگ آ کے گزر گیا۔

"کھلی آنکھوں کے خوابوں نے مشرق کو ایک فسانہ بنا دیا۔ مصوری، شاعری، موسیقی، صناعی و عمارت سازی، تصوریت، عینیت۔" میں نے کہا، "مشرق تو اب محض ایک یادگار ہے۔ مغرب کے عجائب خانوں میں سجائی جانے والی کوئی نادر چیز، اور ہندستان تو بہ طورِ خاص۔"

"اِتنا نہیں۔" پروفیسر نے شکایتی انداز میں ہاتھ اُٹھا کے مجھے روکا، "مشرق کی عظمت ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے، ایک زندہ اور فعّال عظمت..."

"مگر حاصل کیا ہے؟"

پروفیسر کے ہونٹ دھڑک کے رہ گئے۔

معاً اُسے پھر کسی خیال نے پریشان کیا، بے قراری سے بولا،

"ہم ہندستان کی بات کر رہے تھے اور میں کہنا چاہتا تھا، شجرے سے سربلند، عزت مآب، ہندستانی نوابین، راجے مہاراجے وغیرہ انگریزوں کی تخلیق تو نہیں ہیں۔ یہ نظام تو انگریزوں کی ہندستان میں آمد سے پہلے بھی رائج تھا۔"

"پر انگریزوں نے اسے ختم تو نہیں کیا۔ انھوں نے اس ادارے کو اور تقویت دی۔ انگریز تو انسانی حقوق کے علم بردار، روشن خیال معاشرے سے آئے تھے۔ انھوں نے عام ہندستانی کو کس انقلاب سے دوچار کیا۔ کون سے اس کے دن پھیر دیے، وہ زیادہ غریب اور زیادہ بے وقار ہوا۔ صدی کے لگ بھگ کا دورانیہ ہے، کوئی مختصر مدت نہیں ہے۔"

"ہاں، ہاں۔" پروفیسر نے بے تابانہ میری ہم نوائی کی۔

"تو خلاصہ یہ ہے آپ کی رائے میں، عام ہندستانیوں کی شکستگی اور مایوسی کی وجہ انگریزوں کے پروردہ، خطاب یافتہ، بااثر، زور آور لوگوں کا وجود ہے۔ جب تک یہ لوگ انگریزوں کی نگاہوں کا مرکز و محور رہیں گے، ہندستان کے عام آدمی کی زندگی میں تبدیلی نہیں آسکتی۔"

"صرف یہی نہیں، یہ تو ایک پہلو ہے۔"

"پھر دوسرا مزید کیا؟ کیا..." پروفیسر بے ترتیبی سے بولا۔

"میری ذاتی رائے کو اجتماعی رائے پر محمول مت کیجیے۔"

"ہر شخص کی رائے کسی ایک طبقۂ خیال کی نمائندگی ضرور کرتی ہے۔"

"ہوسکتا ہے، لیکن میں واضح کردوں کہ میں کسی خاص گروہ 'طبقے' اور مکتبِ خیال سے کبھی منسلک نہیں رہا۔"

"رائے کے قیام کے لیے یہ الحاق ضروری نہیں ہے۔ بہرحال، اسے جانے دیجیے، ہوسکے تو اور اسباب کی نشان دہی کیجیے۔"

"ہاں!" میں نے سر اٹھا کے کہا، "کوئی ایک وجہ نہیں، صبح ہوجائے گی اور اسباب کا شمار ختم نہیں ہوگا، مگر... مگر سب سے بڑا سبب تو آپ خود ہیں۔"

میری اس جسارت اور گستاخی پر پروفیسر کے جسم میں کوئی تموّج نمودار نہ ہوتا تو مجھے اس کے حواس پر ہر قسم کا شبہ کرنا چاہیے تھا۔ اس کے دیدے گھوم گئے، چہرے کا رنگ متغیر ہوا اور وہ عجب بے چارگی کی کیفیت سے ابھر [illegible] نظر آیا، البتہ اس کی آنکھوں میں روشنی جیسے پھوٹنے لگی۔

"انگریز اگر نجات دہندہ بن کے آتے تو ہندستان میں ان کی پذیرائی کسی اور انداز سے ہوتی۔" میں نے تیز لہجے میں کہا، "دیکھنا یہ ہے کہ حاکمیت کی اتنی طویل مدت میں انھوں نے ہندستان کو مکمل طور پر مسخر کیا ہے یا نہیں، اور سیدھی سی بات ہے، ہندستانی ان سے خوش ہیں، یا ناخوش۔"

"کسی جگہ بھی باہر سے آنے والوں کو پسندیدگی سے نہیں دیکھا جاتا۔"

"نہیں جناب!" میری زبان اُمڈ رہی تھی اور نرمی و گداز میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ میں نے پھر اس جبر کی کوشش ہی ترک کردی۔ میں نے کہا، "مصلح، مشکل کشا، نجات دہندہ حاکموں کو سرآنکھوں پہ بٹھایا جاتا ہے۔ ابتدا میں ممکن ہے کہ ان سے [illegible] ت برتی جاتی ہو، لیکن یہ انھی پر منحصر ہے کہ اپنی [illegible] یا کا تکدر وہ کس طرح دُور کرتے ہیں۔ یہی مکمل تسخیر ہے۔ کسی [illegible] ت سُدھارنے، تاریکیاں دُور کرنے اور محض مہم جوئی، [illegible] ودولت کے لیے آنا دو مختلف باتیں ہیں۔"

پروفیسر نے نہ تائید کی نہ تردید، گُم گُم سا بیٹھا رہا۔

"ساری بات نیت کی ہے۔ آپ کتنی ہی ریلیں چلائیں، قمقمے روشن کریں، دانش گاہیں تعمیر کریں لیکن آپ ہندستان کو اپنا ملک تو نہیں سمجھتے۔ آپ کا ملک انگلستان ہے۔ جب تک آپ ہندستان میں ضم نہیں ہوں گے اور ہندستانیوں کی حیثیت سے اس خطۂ زمین کی فکر نہیں کریں گے، ہندستانی آپ کو اجنبی ہی سمجھیں گے۔ آپ کہیں گے کہ انگریزوں کا اپنا ایک وطن ہے، ایک عظیم الشان ملک۔ وہ اس سے نسبت ترک کر کے ہندستانی کیسے بن سکتے ہیں۔ پھر ان سے یہاں کس نے التجا کی ہے کہ وہ اتنی دُور آ کے ہندستان کی گرم مرطوب آب وہوا، اس گرد و غبار میں بسیرا کریں، اور انھیں اپنے وطن سے ایسی ہی وابستگی ہے تو واپس چلے جانے میں کیا پس و پیش ہے۔ وہ آخر یہاں کیوں رُکے ہوئے ہیں۔"

پروفیسر کو خاموش ہی رہنا چاہیے تھا کہ تدبر اور سنجیدگی کا یہی قرینہ ہے۔ کسی مناسب دلیل، معقول جواب ہی کی صورت

میں تب کشائی اچھی ہوتی ہے۔

میں نے اُس سے کہا: "آپ کہیں گے کہ انگریز فاتح ہیں اور فاتحین کو اختیار رہا ہے کہ وہ جب تک چاہیں، اپنے مفتوحہ علاقوں میں قیام کریں۔ ہندستان میں فاتحین کی آمد کوئی نیا حادثہ نہیں ہے۔ پہلے بھی یہاں مختلف سمتوں سے یورش و یلغار ہوتی رہی ہے، مگر ان فاتحین اور آپ میں بڑا فرق ہے۔ چنگیز خاں آئے، لوٹ مار مچا کے چلا گیا۔ سکندر بھی نہ ٹھیر سکا۔ اُنھی جیسے وہ ایک اور مہم جوئی کا شوق پورا کر کے آگے بڑھ گئے۔ اُن کے بعد جس نے بھی ہندستان کا رُخ کیا، وہ اِسی سرزمین کا حصّہ بن گیا۔ وہ سب کے سب مشرقی تھے اور ہندستانی معاشرت اور مزاج سے ایسی مغائرت نہیں رکھتے تھے۔ اُن کے مقاصد انگریزوں سے قطعی مختلف تھے۔ اُن کے پاس ہندستان کے پسے ہوئے لوگوں کو مرتبہ دینے کا ہنر بھی تھا۔ اُنھوں نے اچھوتوں کو اپنے دسترخوان پر ساتھ بیٹھنے کی عزت دی۔ اُنھوں نے ہندستانیوں سے اُنھی کی زبان اور لہجے میں رسم و راہ بڑھ[illegible] بات ہوئی۔ اُنھوں نے ہندستانی بود و باش [illegible] تعمیر کے فن کو وسعت دی اور مختلف گوشوں میں اپنی اور ہندستانی تہذیبوں کا ایک ایسا آمیزہ تیار کیا، ایسا امتزاج پیدا کیا جو ہندستانیوں کے لیے نہایت دل پذیر ہوا۔ اُنھوں نے ہندستانی اطوار سے یک سر انحراف نہیں کیا اور عداوت نہیں برتی، اور وہ تو یہیں بس گئے۔ یہیں شادیاں کیں، یہاں کی دولت یہیں پر خرچ کی۔ اُنھوں نے خود کو ہندستان سے جدا نہیں سمجھا۔

"اور انگریزوں نے کیا کیا؟ تائی کی گرہ کھولنی بھی گوارا نہ کی، نہ جوتے کے تسمے کھولے۔ فرش پر بیٹھنا کسرِ شان جانا، دانتوں پر مُنہ بنایا۔ اپنی زبان پر اصرار کیا۔ اُنھیں ہندستان کی سانولی عورتیں بہت دل کش لگتی تھیں، لیکن اِن عورتوں کو زوجیت میں لینے اور اپنی نسل میں پیوند لگانے سے اجتناب کیا۔ انگریز تو انگریز ہی رہے، لاٹ صاحب، صاحب بہادر۔ ایک صدی گزر جانے کے باوجود وہ ہندستانی نہ بن سکے، اِس لیے کہ وہ ہندستانی بننا ہی نہیں چاہتے۔ یہ کیسا تماشا ہے؟ بادشاہ اُس کنارے، رعایا اِس کنارے، ایک وزیرِ اعظم سے دوسرا وزیرِ اعظم۔ بیچ میں چھ ہزار میل کا فصل، دریاؤں، جنگلوں، پہاڑوں، صحراؤں اور سمندروں کے پار انگلستان کے بادشاہ، وزیرِ اعظم، ایوانِ بالا، ایوانِ زیریں اور پریوی کونسل قائم ہیں۔ اُن کے فرستادگان برِصغیر کے حکم راں ہیں اور تابع فرمان فرماں رواے مملکتِ برطانیہ عظمیٰ بھی۔ اشارے انگلستان سے ہوتے ہیں، کٹھ پتلیاں یہاں شعبدے دکھاتی ہیں۔ کارندوں کی سرخ روئی کارکردگی پر ہے، اور بہتر کارکردگی سے مراد برِصغیر میں برطانوی سلطنت کا پہلے سے زیادہ اور زیادہ استحکام ہے، اور استحکام سے مراد ہندستانیوں کی پہلے سے زیادہ بہتر مال و دولت کی کشید بھی ہے۔ قرائن کہتے ہیں کہ یہ جاں نثار سب خیر ہے کے جاں فزا نامے بہ معصوم اپنے آقاے ولیِ نعمت کو ارسال کرتے ہوں گے۔ ممکن ہے، کبھی اِن مراسلوں میں دہشت کا اظہار بھی ہوتا ہو، لیکن سانحوں کی خبر فاصلوں پر بیٹھے ہوئے متعلقین کو اتنا مضطرب نہیں کرتی جتنا قریب کے لوگوں کو ہلا پہنچاتی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انگلستان میں فرد کش عمل حکم راں اپنے نائبین سے [illegible] کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور شہادتوں کی بنیاد پر [illegible] فیصلے کرتے، یا سابقہ احکام کی توثیق کر دیتے ہیں۔"

پروفیسر اور بابا دونوں کی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ پیالی میں چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی، اُس کا آخری گھونٹ لے کے میں نے حلق تر کیا، اور کسی قدر تھکی ہوئی آواز میں کہا: "یہ سلسلہ سو سال سے کام یابی سے جاری ہے اور ضروری نہیں کہ آئندہ سو سال تک بھی اِسی طرح جاری رہے۔ چوں کہ یہ عمل بھی عقل اور منطق کی ضد ہے، اِس لیے جلد، یا بدیر اسے ندامت سے دوچار ہونا ہے۔ برِصغیر اُنھی لوگوں کا ہے جو یہاں بستے ہیں اور کسی اور طرف نہیں دیکھتے۔ اُن کی کثرت کو کوئی قوت نہیں ہے، لیکن ایک قوت ایک حقیقت تو ہے، سنا ہے، ایک بار چیونٹیوں نے کسی بستی پر یلغار کر دی تھی۔ بستی کے سارے مکیں بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہندستانیوں کی تعداد ہندستان میں تعینات انگلستانی حکومت کے وفا پیشہ کارندوں سے ہزاروں گنا، لاکھوں گنا بڑی ہے، بل کہ لاکھوں اور کروڑوں کا فرق ہے، اور اِس تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ کسی وقت یہ قتال بھی ہو سکتی ہے۔ انگلستان کے زرہ بکتر سجائے حصارِ ہند کارندے اپنے ہتھیاروں، اوزاروں اور مشینوں کے بل پر آج کثرت

پر غالب ہیں تو یہ کوئی مضبوط سائنس نہیں۔ ہوسکتا ہے، کل یہ تعداد سنبھالے نہ سنبھلے، سینوں کے آگے ہتھیار کم پڑ جائیں۔ اب بھی رہنماؤں کے ان غولوں کو کھونٹے پر باندھے رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ سنتے ہیں، کسی علاقے میں انسانوں کی جتنی بڑی کثرت، اُتنی ہی مسائل و مصائب کی افزائش اور کش مکش و کشاکش کی فراوانی، اور حکمرانوں کے لیے نظم و ضبط، انتظام و انصرام کی دشواری۔ اور کہتے ہیں، آدمی ہتھیار نہیں ہوتا، لیکن ہتھیار سے زیادہ مہلک ہوسکتا ہے۔"

اس دوران مجھے احساس ہی نہ رہا کہ میں پروفیسر کا مہمان ہوں اور وہ، بہ ہر حال، نسلاً فرنگی ہے اور گوروں کے مفادات کے لیے یہاں آیا ہوا ہے، اور مایا بھی اُس کے ساتھ ہے، جو نصف ہندوستانی ہونے کے باوجود مغربی اطوار میں ڈھل چکی ہے، لیکن اس ہذیان سے مجھے کوئی تسکین مل رہی تھی۔ ذہن کی جھنجھلاہٹ رہی ہو جیسے۔

میں نے پروفیسر سے پوچھا، "اگر یہ تسخیر کا کوئی جذبہ، فتوحات کا شوق اور قوتِ بازو کا اظہار ہے تو انتہا کیا ہے۔ برصغیر پر حکمرانی سے انگریزوں کی انا کو کوئی آسودگی ملتی ہے تو ہندوستان تو کب سے تسلیم و رضا پہ کاربند ہے۔ اب مزید کیا مطلوب ہے؟ انگریزوں کو خاطر جمع رکھنی چاہیے کہ تاریخ میں مندرج صفِ اوّل کے تمام فاتحین میں اُن کا درجہ بلند ہے۔ انھوں نے دارا و سکندر، چنگیز خان و ہلاکو جیسے فاتحین سے بڑی معرکہ آرائیاں کی ہیں، لیکن کیا انگریزوں نے تہذیبوں کے عروج و زوال کے دل چسپ عبرت انگیز المیوں پر مشتمل کتابوں کو اپنے کتب خانوں سے ہٹا دیا ہے۔ کوئی نئی تاریخ مرتب کرنے کا سودا اُن کے سر میں سما گیا ہے۔ برتر تہذیبیں، کم تر تہذیبوں پر غالب آجاتی ہیں، مگر یہ برتری و کم برتری ہمیشہ کیوں نہیں رہتی۔ ہر تہذیب کو ایک زوال کیوں لازم ہے؟ غالباً اس لیے کہ قومیں اپنے شباب پر پہنچ کے تن آسان ہو جاتی ہیں کہ درختوں پر اُن کے لیے سونے چاندی کے ثمر پیدا ہونے لگتے ہیں۔ پھر وہ اپنی ابتدا کی مشقتیں، ریاضتیں بھول جاتی ہیں۔ پھر نئی نسل آ جاتی ہے۔ اُن کے طور طریقوں میں نازکی، نفاست آجاتی ہے۔ وہ شیشے کے بن جاتے ہیں اور پھولوں سے اُن کا شغف گہرا ہو جاتا ہے۔ جب موسموں کی نیرنگی اعصاب پر اثر انداز ہونے لگے، ذرا سا شور سماعتوں کو بارِ خاطر ہو۔ ہوا کے کسی تیز جھونکے سے چہرے کملانے لگتے ہوں، جب احتیاطیں حد سے سوا ہو جائیں اور مصوری، شاعری، موسیقی کا غلبہ ہو جائے تو نازک اور لطیف قومیں مراجعت کا سفر کرنے لگتی ہیں اور کہیں سے اُجڈ، گنوار، بے تہذیب لشکر تیر کمان اُٹھائے شیش محل مسمار کرتے، چمن زار روندتے ہوئے نمودار ہوتے ہیں اور شبستانوں کو آگ لگا دیتے ہیں۔

"کتابوں میں کچھ یوں مرقوم ہے کہ ایک غیر متعین عرصے کی برتری و بالادستی کے بعد اعلا تہذیبیں نیم جاں ہو جاتی ہیں۔ اگر وہ چاق چوبند، منظم، مربوط اور ہوش مند ہیں تو برتری کی ایک بڑی عمر بھی نصیب ہوسکتی ہے۔ میں کوئی سماجیاتی کلیہ وضع کرنے کا اہل نہیں ہوں، لیکن میرا خیال ہے، اور میں نے کہیں پڑھا بھی تھا کہ تہذیبیں اپنے مختلف اداروں کے توازن و تناسب سے زندہ اور ممتاز رہتی ہیں، اور اداروں کی بے توازنی کی شعوری، غیر شعوری غفلت اور کوتاہی ہر معاشرے سے سرزد ہو جاتی ہے، بل کہ ہوتی رہی ہے۔"

پروفیسر کے پہلو بدلنے اور گہری سانس بھرنے، مجھے جھٹک جانے اور اپنے مفروضے کی طوالت کا گمان ہوا، میں ٹھٹک سا گیا۔

"کیا! کیا ہوا؟" پروفیسر گھبرا کے بولا۔ "پھر کسی غیر ضروری شائستگی یا بے تکلفی کا احساس دامن گیر ہوا؟"

"ہاں، کچھ یہی۔" میں نے بوجھل آواز میں کہا۔ "شاید میں تجاوز کا مرتکب ہو رہا ہوں۔"

"یقین کیجیے، سب کچھ نہایت متوازی اور پُر اثر ہے۔" پروفیسر کے سیمابی لہجے میں بڑی وارفتگی تھی، کہنے لگا، "کئی بار جی کیا، لیکن میں درمیان میں اس صاف گوئی کی داد و ستائش سے یوں باز رہا کہ دخل در معقولات نہ ہو جائے اور یہ اہم سلسلۂ کلام منتشر نہ ہو جائے۔"

"آپ کتنے اچھے انگریز ہیں۔" میں نے بے اختیار کہا، "کیسی دل جوئی کرتے ہیں۔"

"اور آپ کتنے دل نشیں ہندوستانی ہیں، کیسا سچ بولتے ہیں۔" اُس نے شیدائیت سے کہا اور خلطِ مبحث کے اندیشے

میں یا کسی خوش نودیِ طبع کی اس رسمِ ادائی کو سرِ دست موقوف کیا، مجسس لہجے میں بولا، "آپ اداروں کی بے توازنی کی بات کر رہے تھے۔ آپ کے خیال میں کیا انگلستان کا سیاسی اور سماجی نظام اداروں کے انتشار کے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے؟"

"نظر کچھ یہی آ رہا ہے۔" میں نے کسی جھجک کے بغیر کہا، "دُنیا کے طول و عرض میں حکومتِ انگلستان کی توسیع پسندی کی حرص و ہوس بدترین انجام تک لے جاسکتی ہے۔ کچھ ایسا نظر آتا ہے، انگریزوں کو خود نہیں معلوم کہ انھیں اور کہاں تک جانا ہے، جتنی دُور وہ جا چکے ہیں، وہاں سے واپسی بھی آسان نہیں رہی ہے۔ آدمی زیادہ جاتی ہے، مگر ساری دنیا پر یونین جیک لہرانے کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنے سے وہ کیوں گریزاں ہیں؟ وہ ٹھیر کیوں گئے ہیں؟ قریب قریب ساری دُنیا اُن کے آگے تشتری میں رکھی ہوئی ہے اور ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے۔ وہ ارادہ کریں تو دو ایک جگہوں کے سوا کہیں بھی مزاحمت [illegible] نہ کرنا پڑے۔ مقبوضہ دُنیا میں حکمرانی کے پیش از پیش [illegible] ہی شاید انھیں باقی دُنیا پہ پیش قدمی سے روکے ہوئے [illegible] بھی کچھ انگریزوں کی توفیق سے زیادہ ہے۔ وہ اِدھر سے [illegible] تے ہیں تو اُدھر سے سَرک جاتا ہے۔ دُنیا بھی اب پہلے [illegible] نہیں رہی ہے۔ گردش وہی ہے، لیکن تیور بدل گئے ہیں۔ یوں بھی دُنیا کبھی ایک سی نہیں رہتی، یہ ایجادوں کا دور ہے۔ دُنیا کے دوسرے اقبال مند ملکوں کے مانند انگلستان بھی طرح طرح کی ایجادوں کی تجسیم و تشکیل میں مصروف ہے، اور کیا ایسا نہیں ہے کہ کبھی کوئی ایجاد وقت سے پہلے وجود میں آجاتی ہے اور کسی معاشرے کا سارا نظامِ فکر منتشر کر دیتی ہے؟ اور موجد و مولد قوم کا یہ ہے کہ اپنی کسی تخلیق اور ایجاد کے شیریں ثمر اُسے سب سے پہلے نصیب ہوتے ہیں تو زیاں کی آزمائش اور بدہضمی کے مرحلے سے بھی سب سے پہلے اُسی کا سابقہ پڑتا ہے کہ ایجادوں کے منفی اثرات کبھی اُن کے ثمرات سے کثیر ہوتے ہیں۔ نت نئی اختراعات و ایجادات میں انگلستان صفِ اوّل میں شامل ہے۔ وہاں دوسرے ملکوں کی جدید ترین، محیر العقول مصنوعات حاصل کرنے کی بھی سکت کچھ کم نہیں ہے۔ کہنا یہ ہے کہ سامنے انگلستان اور انگلستان کے باہر سے

"جناب! بجٹ کا چالیس فی صد سرو سے پر، تیس فی صد، اشتہاروں پر اور بیس فی صد تقریبات پر... آخر ہم منصوبہ کب شروع کریں گے؟"

آئی ہوئی ایجادیں مل جل کے وہاں کے روایتی معاشرے پر کس قدر اثر انداز ہوتی ہیں، ہوسکتی ہیں، یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔"

"بے شک۔" پروفیسر نے فکرمندانہ لہجے میں بے دریغ میری حمایت کی۔ "انگلستان کے متعدد سنہ بند، بلکہ گھرانے ان کرشماتی مصنوعات کی پذیرائی میں جتنے پُر جوش تھے، اُتنے ہی اب ان سے آزردہ، کبیدہ اور ہراساں دکھائی دیتے ہیں۔ کیوں مایا، تم کیا کہتی ہو؟"

مایا اُچھل سی پڑی۔ "میں... میں کیا کہوں۔ آپ ٹھیک کہہ رہے تھے پروفیسر کہ آپ استفادہ کر رہے ہیں۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ رقص کے فضول مشغلے میں ایک بہترین تجزیے سے محروم رہی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" میں نے عاجزی سے کہا، "میں کیا عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ پروفیسر صاحب کی بندہ نوازی ہے کہ وہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہمارے لیے ممنوعہ اس گوشۂ فردوس میں لے آئے، اور جانے کیوں، یہاں آ کے بیٹھنے میں کب سے اپنا ہوا غبار اُٹھا ہے۔ یہ ایک اجنبی اور عام شخص، سڑک پر چلتے ایک راہ گیر کی عزت افزائی ہے۔ میں آپ سے سچ کہوں، میں ایک بہت معمولی آدمی ہوں، میں اور میرے دونوں ساتھی..."

"وہی مشرق، وہی مشرقی انکسار..." پروفیسر نے تکرار کی۔ اُس کے لہجے میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ "سنا تھا، آج سامنے ہے،

آج نظارہ کرلیا۔"

رفتہ رفتہ ساز پھر بیدار ہونے لگے۔ سازندوں نے اپنے اپنے ساز سنبھال لیے تھے۔ مجھے جمرو اور زورا کا خیال تھا۔ بہت دیر ہوگئی تھی۔ بظاہر ان دونوں نے کسی تکدر کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مگر یہ کیا خاک اُن کی سمجھ میں آ رہی ہوگی۔ انھیں اکتا جانا چاہیے تھا، لیکن یہ سحر آفریں ماحول اُن کے لیے کسی خواب کے مانند ہوگا۔ وہ کافی کی چسکیاں لیتے، خشک میوہ ٹونگتے اور سگریٹ پھونکتے رہے۔ پروفیسر کے چہرے پر بدلتے رنگوں، اس کے اضطراب اور اشتیاق سے وہ کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہوں گے۔ میرے بدلنے کے دوران مایا کی محویت اُن کی نظر میں میرے لیے داد کی حیثیت رکھتی ہوگی۔ اپنے عزیز کی قدر و منزلت پر اس کے رفیق جو فخر و شادمانی محسوس کرتے ہیں، کچھ وہی اُن کی کیفیت تھی۔ ہندستان پر گوروں نے اچھی اعلا دماغی اور بالادستی کی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ جمرو اور زورا اس غلبے سے کس طرح مستشار ہو سکتے تھے۔ وہ گوروں کی نشاط گاہ میں بہ تمام و کمال موجود، ایک گورے اور گوری کی معیت میں، اُن کے مہمان کے رتبے سے معزز و مفتخر تھے۔ خوش بوؤں سے بسی اس جگہ کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اشارے پر مؤدب ہندستانی خدمت گار حاضر ہو جاتے تھے۔ گوروں نے ان کے امتیاز کے لیے خصوصی لباس مقرر کر دیے تھے، بالکل یہاں کے راجاؤں اور اُن کے درباریوں کے لباس کی طرح۔ یہ بھی کیا خوب تماشا تھا۔

"آپ بمبئی میں قیام کریں گے، یا آگے...؟" مایا نے چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ عرصہ بمبئی ہی میں رہنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"کچھ دن ہمارا قیام بھی بمبئی میں رہے گا، کیا آپ سے دوبارہ ملاقات ممکن ہے؟" اس کی پُر تمکنت آواز میں طلب بھی تھی، حسرت بھی، اور بھی کچھ۔

"کیوں نہیں، آپ وہاں کہاں ٹھہریں گی؟"

"ابھی کچھ نہیں معلوم۔" اس کے چہرے پر کشمکش ہویدا ہوئی۔ "رابطے کا کوئی ذریعہ معلوم ہو جائے تو میں خود آپ سے رابطہ کرلوں گی۔"

"ضرور، بل کہ آپ ہمارے گھر آئیے گا، وہاں آپ کو دیکھ کر سبھی خوش ہوں گے۔"

"آپ کا گھر بمبئی میں ہے؟"

"بمبئی میں بھی۔"

"کیا مطلب؟ اور بھی گھر ہیں دوسری جگہوں پر؟"

"جی... جی ہاں۔"

"واقعی! کتنے گھر؟" وہ حیرانی سے بولی۔

"سو، دو سو نہیں، یہی کوئی دو تین۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"لیکن میں کچھ زیادہ وقت بمبئی میں رہوں گا۔" پروفیسر اُچاٹ آواز میں بولا۔ "یاد رہے، اگر آپ کو کوئی مصروفیت مانع نہ ہو، ورنہ مناسب سمجھتے ہوں تو مجھے بھی آپ کو زحمت دینی ہے، میری سکونت کا انتظام کسی بنگلے میں کیا گیا ہے۔ نام یاد نہیں آ رہا، شاید کولابا نام کی کسی جگہ..."

"ہمارے گھر سے ذرا دور ہے، مگر بڑے شہر میں فاصلے کیا اہمیت رکھتے ہیں... اور یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، مصروفیت اور مناسبت کی بات! آپ سے دوبارہ ملاقات میرے لیے اعزاز ہوگی۔ میں تو کہتا ہوں، آپ ہمارے ہاں ہی مہمان رہیں۔"

پروفیسر نے تپاک سے ہاتھ بڑھایا۔ میں فوراً سمجھا نہیں، لیکن پھر میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں زور سے دبا دیا۔

ساز تیز ہو گئے تھے اور مختلف گوشوں میں بیٹھے جوڑے پھر وسطی فرش پر آ کے تھرکنے لگے تھے۔

"آپ میرے ساتھ رقص کرنا پسند کریں گے؟" یکایک مایا نے متمنانہ آواز میں مجھے پیش کش کی۔

"میں... میں کیوں..." آواز کے ساتھ میرا جسم بھی سُن ہو گیا۔ "مجھے بالکل نہیں آتا۔"

"یہ تو بہت آسان ہے۔"

"ہاں، ہاں بہت آسان، بس ایک ذرا سی توجہ..." پروفیسر نے مایا کی ہم نوائی کی۔

"ایک قدم آگے، پھر دو قدم... ان رقصاں جوڑوں کو ذرا غور سے دیکھیے۔"

"پھر کبھی سہی، میرا لباس بھی اس رقص کے لیے موزوں نہیں۔"

مجھے زیادہ عذر کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پروفیسر نے مایا کو کہنی ماری۔ دھاری دار سرمئی سوٹ میں ملبوس دو نوجوان سامنے کے دروازے سے داخل ہوئے، دونوں کی عمریں تیس پینتیس سال کے درمیان ہوں گی، چہرے لال بھبھوکا تھے، جیسے آگ جلتی ہو۔ مایا فوراً اُٹھ گئی اور ہم سب سے معذرت کر کے اُنھی کی جانب بڑھ گئی۔

"مایا کا شوہر ہے۔" پروفیسر چپکے سے بولا۔ "وہ دائیں طرف لبوترے چہرے والا دراز قد نوجوان، میجر البرٹ۔ تین چار ماہ میں لفٹیننٹ کرنل ہو جائے گا۔"

میں نے دیکھا، میجر کے قدم فرش پر ٹھیک طرح جم نہیں رہے تھے۔ اُس کا ساتھی بازو تھامے ہوئے تھا۔ ادھر مایا نے تیز قدموں سے انھیں جا لیا تھا۔

پروفیسر نے آہستگی سے بتایا کہ ابھی تین مہینے ہوئے مایا سے اس کی شادی ہوئی ہے۔ مایا اُس کی بھتیجی ہے۔ [illegible] طور پر دونوں ہی صاحبِ قبول ہیں۔ برنارڈ اپنے [illegible] کا اکلوتا ہے۔ ادھر مایا بھی بھائی کے چلے جانے سے [illegible] کی اکلوتی رہ گئی ہے۔ چار سال سے برنارڈ ہندستان [illegible] اور چھ مہینے کی چھٹی لے کے شادی کے لیے انگلستان آیا [illegible] اب بیوی کے ساتھ واپس جا رہا ہے۔"

"بہت مکمل، شان دار نوجوان ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، بہ ظاہر۔ مایا خوش نہیں ہے۔"

"کیوں؟" مجھے پوچھنا نہیں چاہیے تھا لیکن رہ نہ سکا۔

"مایا کو دیکھا آپ نے! کیسی حسین، پرسوز، نازک، پھولوں جیسی لڑکی ہے۔ تعلیم بھی اعلا حاصل کی ہے۔ شوہر کا مزاج بالکل جدا ہے۔ برنارڈ کے باپ اور مایا کی ماں کی خواہش یہی تھی کہ اُن کی شادی ہو جائے۔ کئی اور بھی مستحق ہوں گی اس رشتے کی۔ مایا انکار کر سکتی تھی، لیکن وہ برنارڈ کو ناپسند نہیں کرتی تھی، اور اصل میں وہ اُس برنارڈ سے واقف تھی جو ہندستان نہیں گیا تھا، اُسے کوئی اندازہ نہیں تھا، ہندستان جا کے وہ کتنا بدل چکا ہے، کثرت سے پینے لگا ہے، اس میں ایک عجیب تناؤ اور تکدر در آیا ہے، کوئی وحشت سی۔ انگلستان آ کے برنارڈ نے بچپن کے دوست ٹونی کے ساتھ ہی تمام تر وقت گزارا۔ شادی کے بعد بھی وہ زیادہ تر ٹونی کی رفاقت کی جستجو میں رہا ہے، اور اب اُسے ساتھ ہندستان لے کے آ گیا ہے۔ مایا تو پہلے کی طرح تنہا ہے۔ مایا نے کبھی شکایت کی تو کان نہیں دھرے، درشتی پر اُتر آیا۔ شادی کے اتنے مختصر عرصے ہی میں دونوں کے درمیان کشاکش شروع ہو چکی ہے، اور آگے بھی کچھ بہتر نظر نہیں آ رہا۔ میں تو بہت ہراساں ہوں، دعا ہی کر سکتا ہوں دونوں کے لیے۔"

"سنو! میں چلتا ہوں، میری بیوی کہیں فون کرنے کی منتظر ہے۔"

پروفیسر اپنی دھن میں کہتا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مایا کے لیے کتنا گداز رکھتا ہے۔

مایا نے ایک جانب سے شوہر کا بازو پکڑ لیا تھا، دروازے کے قریب رکھی کرسیوں پر وہ تینوں بیٹھ گئے۔ ٹونی کی طلبی پر خدمت گار اُن کے لیے شراب لے آئے۔ میں نے دور سے دیکھا، مایا نے شوہر کو روکنا چاہا تھا، لیکن وہ جام اُٹھا کے ایک گھونٹ میں خالی کر گیا اور رقص میں شامل ہونے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اور کیا دماغ میں آئی کہ بے بھر بعد پھر بیٹھ گیا۔ ٹونی نے بازو پھیلا کے مایا کو رقص کی دعوت دی تھی۔ مایا نہیں اُٹھی۔

رقص کرتے جوڑوں کے پاؤں، اُن کے جسم سازوں کے زیر و بم سے بندھ گئے تھے۔ اُن کا اپنا کوئی ارادہ نہیں رہا تھا۔ ساز انھیں جہاں چاہتے، لے جاتے اور واپس لے آتے۔ موسیقی میں بھی حکومت کی کیسی خُو ہوتی ہے۔ سننے والے کو بن تاج کر دیتی ہے۔ گورے حکمراں بھی اس کے اسیر ہو جاتے ہیں، مگر وہ طاعت ہی کیا، جس میں آدمی کی رضا شامل ہو۔

میری اور پروفیسر کی نظریں مایا پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ اُس کا شوہر برنارڈ خاصا خوش نظر آ رہا تھا، اُس کے پاؤں تھرک رہے تھے۔ ٹونی بھی وجد کی کیفیت میں تھا۔ کسی لمحے اُس نے برنارڈ کی توجہ

ہماری طرف مبذول کی۔ برنارڈ کی پیشانی پر بل پڑ گئے، اور دیکھتے دیکھتے اُس کا چہرہ بگڑنے لگا۔ اُس نے ناگواری کا اظہار کیا تھا کہ مایا نے اُس کا بازو تھپک کے کچھ باور کرانے کی کوشش کی۔ برنارڈ یک دم اُٹھ گیا۔ مایا نے اُس کا بازو پکڑ لیا تھا، لیکن وہ اُسے روکنے میں ناکام رہی۔ ٹونی بھی برنارڈ کے ساتھ تھا۔ اُن کا رُخ ہماری جانب تھا۔ دونوں کو اِتنا ہوش تھا کہ رقصاں جوڑوں کے انہماک میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ ہماری میز کے سامنے آ کے برنارڈ رُک گیا اور کسی تمہید کے بغیر اُس نے پروفیسر کو مخاطب کیا۔ ''آپ کو معلوم ہے پروفیسر! یہ جگہ کن کے لیے مخصوص ہے؟''

پروفیسر نے خوش خلقی سے برنارڈ اور ٹونی کو بیٹھنے کی دعوت دی، اور نرمی سے بولا۔ ''یہ میرے مہمان ہیں۔''

''صرف منتخب ہندستانی معززین کو یہاں داخلے کی اجازت ہے۔ یہ نظم و ضبط کا معاملہ ہے۔'' برنارڈ نے تلخی سے کہا

''یہ نہایت معزز لوگ ہیں۔ میں درخواست کر کے انہیں یہاں لایا ہوں، اور واقعہ یہ ہے، اپنے موضوع پر میں نے اِن سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔'' پروفیسر نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کی آواز میں شائستگی جبری تھی۔

''آپ انھیں کتنا جانتے ہیں؟''

''آج ہی، ابھی کچھ دیر پہلے ہم ملے ہیں۔''

''آپ پہلی بار ہندستان آئے ہیں۔ برطانوی حکومت نے ہندستانی رعایا سے رسم و راہ کے کچھ قواعد و ضوابط طے کیے ہیں۔ آپ کو وہاں رہنما ہدایات ضرور دی گئی ہوں گی۔''

''برطانوی حکومت نے مجھے بھی یہاں ایک ذمے داری تفویض کی ہے۔'' پروفیسر کبیدہ ہو کے بولا۔ ''یہاں ہر طبقے کے لوگوں سے ملاقات میرے کام کا حصہ ہے، اور میجر! آپ کو خیال ہونا چاہیے کہ میرے اِن مہمانوں میں سے ایک انگریزی خوب سمجھتا ہے۔''

''سمجھا کرے، میں ضوابط کی بات کر رہا ہوں۔'' میجر برنارڈ نے زہریلی آواز میں کہا۔

''یہ سلوک ہماری روایات کے منافی ہے۔ مجھے اپنی توہین محسوس ہو رہی ہے۔''

''آپ خود روایت شکنی کے مرتکب ہوئے ہیں پروفیسر! بہتر ہے، انھیں عزت سے رخصت کر دیجیے، ورنہ...''

میں فوراً اُٹھ گیا، میرے ساتھ جمرو اور زور بھی۔

پروفیسر شدید ذہنی خلفشار سے دوچار دکھائی دیتا تھا۔ اُس نے مجھ سے ٹھیرے رہنے کی منت کی، اُدھر سے مایا بھی ... بڑھی تھی۔

... میں ہم نے دروازہ عبور کر لیا۔

... سے باہر آتے ہی جمرو نے میرا کندھا پکڑ لیا، ''کیا ... حرام کا جنا ... ؟''

''... دو۔'' میں نے تیز آواز میں کہا۔

''نہیں لاڈے، کس کی تو بل۔''

''میرا بھی خون کھول رہا ہے۔''

''بچھر جانے دو مجھے'' جمرو کا جسم پھڑکنے لگا تھا۔ ''کیا ہوگا، زیادہ سے زیادہ؟''

''نہیں، ابھی نہیں ... اس وقت نہیں ... اس طرح نہیں۔'' میں نے سختی سے کہا۔ ''دیکھیں گے پھر''

نظر آئے گی سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ
ایک بے اختیار بے قرار نوجوان کی داستان جو زندگی
اُمنگوں حوصلوں آنسوؤں اور ہونٹوں کی داستان
بازی گر
بقیہ واقعات آئندہ

بٹھل عرشے کے ایک ستون سے ٹیک لگائے خاموشی سے بیٹھا دھواں کشید کر رہا تھا۔ وہ ایک ماہی خور کی جانب متوجہ تھا، جو اُس کے قریب ہی جہاز کی ریلنگ پر سستانے آ بیٹھا تھا۔ بے کراں سمندر پر ڈولتے جہاز اور کشتیاں ان آبی پرندوں کے لیے کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہوتے، جب دل چاہا سستا لیا، نہ تھکن سے ڈوب مرنے کا ڈر، نہ بار بار ساحل پر لوٹنے سے وقت کا زیاں! دفعتاً بگلے نے سمندر کی جانب زقند بھری اور اوجھل ہو گیا۔ شاید اُسے شکم پُری کا سامان نظر آ گیا تھا۔ جسمانی تناؤ کے اخفا کے لیے میں نے شانے جھکا دیے، اور آنکھیں تو اِدھر سے اُدھر پھیری جا سکتی ہیں۔ بٹھل کی آزمودہ کار بر قیلی گولی میں مسلسل چبا رہا تھا، لیکن میجر برنارڈ کی سلگائی ہوئی آگ فزوں تر ہی ہو رہی تھی۔ واقعتاً میری کیفیت زورا اور جمرو سے مختلف نہ تھی۔ میں نے اُن سے کہہ تو دیا تھا کہ میرا ابھی خون کھول رہا ہے، مگر خون کھولنا ایک بے محل محاورہ تھا، حال اِس سے کہیں سوا تھا۔

پھر خاموشی سے بٹھل کے پاس جا بیٹھے۔ بگلا اپنی چونچ میں نفاست سے بڑی مچھلی دابے ریلنگ پر پھر فروکش ہو گیا۔ مچھلی بری طرح تڑپ رہی تھی۔ بگلے نے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا، اُسے مچھلی کو زمین پر پٹخ مارنے کی مناسب جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ بٹھل خوب شوق سے تماشا گیر تھا، اُس کے چہرے پر معصوم بچوں سی مسکراہٹ کھلکھلا رہی تھی۔ اُس کی بچگانہ محویت دیکھ کے میرا غصہ تمام ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر میں نے بہت ہی کم تاثرات کی حکم رانی دیکھی تھی۔ سو خشکی تو شتہر رہے، کوئی بھلا کب تک چھپائے!

"جارے نڈی! بے است داشتگاری ہے، سیا پاس کچھ عمریا اور گزار جا کے۔" بٹھل نے بگلے کے غم میں سر دھنتے ہوئے کہا، کیوں کہ مچھلی بگلے کی چونچ سے نکلنے میں کام یاب ہو گئی تھی، لیکن بدقسمتی سے جہاز کی اور آ گری، اور اچھلتی ہوئی سیدھی بٹھل سے آ ٹکرائی تھی۔ "اِس کی قسمت اِس کے ساتھ، اور تیرے داؤ تیرے ساتھ۔" بٹھل نے چشم زدن میں مچھلی کو

پونچھ سے پکڑا اور کلائی کے خفیف جھٹکے سے اُسے سمندر کی طرف فضا میں اچھال دیا۔ ماہی خور مچھلی کے ساتھ ہی فضا میں اچھلا، مگر مچھلی اپنی عمر ساتھ لائی تھی، بگلے کی چونچ خالی گئی اور وہ سمندر میں جا گری۔

"کھانا کیوں نہیں کھا دیا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ کھانے کی کشتی میں تمام سامان جوں کا توں تھا، سوائے مچھلی کے ایک آدھ ٹکڑے کے۔

"کھالیں گے رے، اب اُدھری جا کے کھائیں گے۔" جھل نے ہماری طرف نہیں دیکھا۔ وہ پُر شوق نظروں سے ریلنگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"ابھی استاد گھر جانا تکنا ہے۔" زورا نے جمرو کی طرف آنکھ مٹکائی۔

"پہنچو دور ۔۔۔ جدھر سے آئی ہیں۔" جھل بڑبڑایا۔ اُس نے رُخ ہماری طرف پھیر دیا تھا۔ خلافِ طبع اُس کے چہرے کا ہر تھر تھر تھرا رہا تھا، اور کوئی رمق تھی جو خاکستر سینے میں چھپ رہی تھی۔ میں اُس کی بات سمجھ نہیں سکا تھا۔ جمرو نے دیر نہیں لگائی، تلی ہوئی مچھلی اور جھینگوں سے بھری کشتی آناً فاناً اٹھا کے ریلنگ سے باہر اچھال دی۔ جگہ خالی ہوتے ہی جھل نے پاؤں پسار لیے۔ میرے جی میں آئی کہ کچھ کہا مروں، بس اب بمبئی یا فیض آباد، اسے کہیں نہ کہیں تکنا ہوگا۔ اسی کو شوق ہے لاشہ گھسیٹے پھرنے کا۔۔ تو جانے تھا۔۔۔ میجر برنارڈ کے سلگتے ہوئے جملے اور جمرایا ہوا جھل۔۔۔ اچھی کیمسٹری تھی۔ میرے جسم سے پھر آگ نکلنے لگی۔

"تھوڑا کھا کے آئے ہو؟" جھل نے چکارتے ہوئے کہا۔ اُس نے ہمارے چہروں پر نوشتے پڑھ لیے تھے۔

"ہاں قسم استاد کھ جت ہے۔ وہ رہو بھی ہے اور ۔"

"لنگور بھی۔" جمرو نے زورا کے مصرعے پر گرہ لگائی۔

جھل جھانسے میں نہیں آیا۔ کچھ دیر ہم تینوں کی طرف بغور دیکھا کیا، جیسے اُس نے سب کچھ جان لیا۔ پھر سر کو خفیف جھٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں، کہ خود ستائی کسی کی

دست نگر نہیں ہوا کرتی، خاموشی کر یدنے سے گریز، کارِ محال بھی ہے، کارِ خیر بھی۔

"آنکھیں میچ لو رے، بس گھنٹے ہیں۔ اُدھر جلدی سے اینڈنے کو نہیں ملے گا۔" جھل نے نیم باز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر آنکھیں میچ لیں۔ مجھے پیرو کی گیتا اُس کی کولی میں ہمکتی دکھائی دی۔ کیا کہے گا اُن سے؟ رانی، گیتا اور پھر پیرو دادا کا خیال چھم سے در آیا، جیسے اندھیری رات میں چاندنی کے ہلکورے، تازہ تازہ، اور جواں جواں۔

جہاز ٹھمک ٹھمک پھسلتا جا رہا تھا۔ سورج دھیرے دھیرے سمندر کی اور اتر رہا تھا۔ میجر برنارڈ کی شعلہ خیز نگاہیں بھی جاتے دن کے ساتھ ساتھ رخصت ہونے لگیں۔ ہم اور کر بھی کیا سکتے تھے! زور آزمائی، تیجہ انگیز داؤ پیچ، چاقو زنی کے حیران کن کرشمے! زیادہ سے زیادہ میجر برنارڈ اور ٹونی کو پچھاڑ لیتے، مار گراتے، پھر کیا ہوتا، کہاں جاتے؟ اس جہاز میں کون سے رستے، کون سے دروازے تھے۔ [illegible] میں کسی گوری فوج سے مقابلہ کرتے؟ پھر وہی دنگا، وہی سارا خون سے عبارت، بھاگتے دوڑتے چھپتے پھرتے دن [illegible] سب کچھ بے فائدہ اور لاحاصل۔ زورا اور جمرو بھی سوتے چہروں کے ساتھ لیٹ چکے تھے۔ انھیں انگریزی کی معمولی سی جان کاری ہوتی تو میرے روکے سے نہ رکتے، مگر میں نے ایسا کیوں کیا؟ میجر کے نوکیلے کاٹ دار الفاظ، آگ برساتی انگارہ آنکھیں مجھے مہمیز کیا کرتیں، خاکستر بھی نہ کر سکیں۔ یکایک میرے اندر وہی پُر اسرار فنکار، ہم دم، خود آگیں نفرت کا جوالا مکھی پھٹ پڑا۔ پھر نہ جانے کتنا وقت گزر گیا، میں جیسے خلا میں بیٹھا رہا۔ آگ کے گولے مجھ پر برستے بھی رہے اور مجھ پر پھوٹتے بھی رہے اور بجھ بجھ کر مہیب اندھیرے میں گم ہوتے رہے۔

جھل، زورا، جمرو سو چکے تھے۔ شام بھی ڈھل چکی تھی، عرشے پر مسافر کیڑوں کی طرح آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں چار یا پانچ کی ٹولیاں جمی تھیں۔ جن کے بیچ

سے چائے کا دھواں اُڑ اُڑ کے اپنی ہم جنس، مگر سرد ہوا سے گلے مل رہا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیوں پرتی دھیمی سرگوشیاں، دبے دبے قہقہوں سے بوجھل آوازیں، دور جہاز گیر ہوا کا شور یک ساں ویک زو معلوم پڑتا تھا، لیکن یہ میرے اندر سر پٹختی چیخوں کے سامنے ہیچ تھا۔ کاش، یہ چیخیں خنجر بدست ہوتیں، ہتھوڑوں، کدالوں، پھاوڑوں، تیز دھار بھالوں سے آراستہ ہوتیں، تو یہ پتھر کا سینہ چیر پھاڑ دیتیں۔ اُن آنکھوں کو پھوڑ کے آزاد ہو جاتیں جن کے سامنے تمی پاؤں میں گھنگھرو باندھے مجرا کر رہی تھی، اُن راہ گزیدہ قدموں کو چورا چورا کر دیتیں، جن کی راہ تکتے تکتے امی جان منوں مٹی تلے جا سوئی تھیں۔ ماں کا قاتل!۔۔۔ لیکن امی جان کو میں نے نہیں مارا تھا۔ صرف ایک بار کے لیے چھ بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑنا! کیسی ممتا تھی!۔۔ نہیں امی جان یہ آپ کا انصاف نہیں تھا۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کیا برا تھا جو آپ بابر کی بپائی کو حرزِ جاں نہ بناتیں تو شاید تمی کو تھے نہ پہنچتی، جھ [illegible] یہ درنہ ہوتا۔ ابا جان کا غذوں میں چھپے خیرہ کن [illegible] کی اوٹ نہ لیتے۔ میری بہنیں، امی جان میری بہنیں جن کی پرچھائیں کسی غیر نے نہیں دیکھی، اُن پاک باز خان زادیوں کو نظر بازوں کی ہوس ناکی سے چھلنی نہ ہونا پڑتا، فرخ پر مجیدے سا شہدا دانت تیز نہ کرتا، اگر آپ بابر زماں پر لعنت بھیج دیتیں تو یقیناً تمی کا جنازہ کوٹھے سے اٹھنے کی بجائے گھر سے اُس کی ڈولی اُٹھتی۔ آخر میں ہی کیوں؟ مجھی کو زیر بار، مجھی کو گنہ گار کیوں کیا جاتا ہے؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے، مجھے تنہا کیوں نہیں چھوڑ دیا جاتا؟ زندگیاں کیوں مجھ سے وابستہ کی جاتی ہیں؟ میں نے کب کسی سے کہا ہے کہ میرے ساتھ چلو، میرے لیے سب کچھ چھوڑ دو، میری ہم راہی اختیار کرو، مجھ سے محبت کرو۔ میں تو خود تہی دست و تہی داماں ہوں، بھلا کسی کو کیا دے سکتا ہوں۔ میں طلب گار ہوں۔ یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے۔ کیوں میرے لیے کمر بستہ و آمادۂ شوق

رہتے ہیں۔ جان سے جاتے ہیں۔ میرے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے مردہ تصور کر لیا جائے تو کیا دنیا رک جائے گی، گردش تھم جائے گی؟ اور اگر میں مر ہی جاؤں تو کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ میری بے قراری و بے چینی تو میری ملکیت ہے۔ یہ اوروں کو کیوں کھٹکتی ہے۔ جھل کو کیا تکلیف ہے جو مجھے لیے دربدر، مارا مارا پھرتا ہے۔ یہ لوگ تو مجھے نسائیت کے ادنا ترین درجے میں بھی شمار نہیں کرتے۔ یہ اپنی جاں نثاری پر نازاں رہتے ہیں، مگر میں کس بات پر فخر کروں، کیا ہے میرے پاس؟ یہی کہ سلطان، پیرو دادا، مارٹی، کانتے، سونیا، ورنہ جانے کس کس کی موت کے تمغے! اذیتوں کے عذاب! آزردگی کے سونپے گئے سودے! لیکن نہیں، بھلا کسی کا کیا قصور؟ مثال ہے؟ یہ سب ہیر پھیر تو میرے سبز قدموں کا ہے۔ یہ مصیبتیں مجھی سے پیوستہ ہیں۔ یہ راستے میرے دشمن ہیں، دشمن داری میرے اپنوں سے کرتے ہیں۔ فساد کی جڑ تو میں ہی ہوں۔ جاں نثاری دوسروں ہی کا وطیرہ کیوں ہے۔ میں کیوں نہیں مر جاتا؟ کیا مشکل ہے کہ اس جہاز سے کود جاؤں! جھل بھی رو دھو کے چپ ہو جائے گا، کم از کم اس دربدری سے گلو خلاصی تو ہو جائے گی۔ زریں کے پاس، مشفق، حسین و جمیل زر جواہر سے مرصع و باکمال زریں کے پاس جا بسے گا۔ زورا اور جمرو بھی اپنے شہروں کی مانوس گلیوں میں چین سے راج کریں گے۔ کیا اچھا ہوگا جو میرا منحوس سایہ اس دنیا سے اٹھ جائے! بہن بھائیوں کی زندگی میں سکھ چین آ جائے گا۔ کتنے دن ابا جان، فرخ، فارحہ، فریال، اکبر اور جہاں گیر سے دور رہ ہوں، میرے بغیر دہاں راوی نے چین ہی چین لکھا ہوگا۔ میں پھر وہاں جا رہا ہوں، میرے قدم پھر فرخ کے آنگن میں پڑنے والے ہیں۔ نہ جانے اب وہ کس مصیبت سے دوچار ہوں گے، اب کس سے کون جدا ہوگا۔ رانی اور گیتا سے پیرو تو جدا ہو گیا۔ مارٹی بھی نہ رہا، جولین کا رستہ روکنے والا، مسٹر مارٹی! میرے ذہن میں بالترتیب بہت سے چہرے، بن ورمٹ

رہے تھے۔ عرصہ ہوا خود کو حالات اور تخیل کے رحم و کرم پہ چھوڑے ہوئے۔ بے حسی میں خول بند ہو کے جینا کچھ آسان ہو چلا تھا، مگر آج پھر وہی دورہ! وہی لاحاصل خیالات، لاجواب سوالات کا جھگھٹا! کورا، اتنی اہم ہے؟ کیا ایک کورا کے لیے متاعِ جاں زندگیاں بھینٹ کی جاسکتی ہیں؟ میں نے خوامخواہ کورا کا ہوّا کھڑا کر دیا ہے۔ کورا کا خیال آتے ہی میری حالت مزید غیر ہو گئی۔ حبسِ دم سے سینہ جکڑنے لگا۔ تڑپتے ہوئے حلق میں گرہوں کا انبار لگ گیا، نہ جانے وہ کس حال میں ہو گی! یہ طے تھا کہ مولوی صاحب نے مجھ سے بہتر اُس کی پاس داری کی ہے پھر میں کیوں اُس کا دعوے دار بنا پھرتا ہوں۔ وہ مولوی صاحب کے ساتھ سکھ میں ہے، باامان ہے تو رہے۔ میرے منحوس قدم تو اُس کا سکھ چین بھی غصب کر لیں گے۔ اُس کے سر سے مہرباں کا سایہ چھن جائے گا۔ میری امان میں اُسے کیا ملے گا؟ میں تو خود بے امان ہوں۔ میں کورا کا اہل نہیں، میں تو چند دن بھی اُس کی حفاظت نہیں کر سکا۔ یہ میری ہی نامرادی تھی جو اُسے مولوی صاحب کی پناہ میں جانا پڑا، لیکن نہیں! کورا نے میری بے تابی وارفتگی بھی دیکھی ہو گی۔ اُسے چھونے والے شہدوں کے لاشے میں نے آن کی آن میں بر لبِ راہ بچھا دیے تھے۔ کورا سے میری دوری ہی اُس کے لیے بہتر ہے۔ خیالات کے بھنور مجھے چکراتے چکراتے مرکز کی طرف لے آئے۔ بنتی مٹتی تصویروں میں پھر ایک صورت ٹھیر گئی۔ میری آنکھیں جلنے لگیں۔ سانس تو گویا تھی ہی نہیں۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے برش تھاما اور نگا تصویر کو دس برسوں کا پھیر دینے۔ دراز پلکیں کچھ اور اُٹھی کیں، محرابِ چشم کو کچھ اور خم دیا، کچھ اور تراشا، آنکھیں میں کچھ خود سپردگی، کچھ انتظار اور کچھ التماس سمویا، عارض اس عرصے میں بھر آئے ہوں گے، کچھ مزید ابھارے، ستواں اور ترشیدہ ناک پہ مزید نزاکت آزمائی کی، دہکتی پنکھڑیوں کو کچھ اور سرخ کیا۔ ایک سرگرداں لٹ کشادہ پیشانی پر آراستہ کی، رنگت کے آمیزے میں صندلیں تربت کی مزید آمیزش

کی۔ پھر دیکھا کیا۔ دلِ بے قرار نے اُس کے چہرے پہ ماہ و سال کی مشتاقانہ چھیڑ چھاڑ بھی مسترد کر دی۔ اِسے تو وہی کورا درکار ہے، جس کی آخری شبیہ جس کا آخری عکس کلکتہ میں راہ نثار کیا تھا۔ پھر کسی نے وہ شاہ کار تصویر مٹا دی۔ مصور نے نہ ماتم کیا نہ احتجاج، بس خاموش تماشائی، محوِ اضطراب محوِ شوق کہ اب پردۂ غیب پہ کچھ نمودار ہوا چاہتا ہے۔ اچانک میجر برنارڈ کی حقارت بھری تمسخر آفریں نگاہیں مجھ پر گڑ گئیں۔ میرے ہاتھوں میں برش کی جگہ خنجر کا آنا تھا اور چشم زدن میں میجر برنارڈ کی پیشانی پہ پیوست ہونا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔ آسمان نے سیاہ چادر اوڑھ لی تھی۔ میرا جسم پسینے سے شرابور تھا اور سانس درہم برہم۔ آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ صورتِ حال سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ اپنی پیمائش کرتے کرتے میری آنکھ لگ چلی تھی۔ زورا اور جمرو میرے بائیں پڑے تھے۔ بخشل دائیں جانب سیدھی کروٹ لیٹا تھا۔ اُس کے سونے کا یہ انداز [illegible] عرشے پہ موجود تقریباً تمام مسافر نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔ میں نے سر کو دائیں بائیں جھٹکا دے کے [illegible] کی کوشش کی، مگر بے سود، وہاں سر تھیں کوئی چھوڑا تھا۔ میں نے بخشل، زورا اور جمرو کی طرف بہ غور دیکھا۔ آج یہ میرے ساتھ نہ ہوتے تو کم از کم میجر برنارڈ اِس وقت سانس نہ بڑھا رہا ہوتا۔ اچانک ابھر آنے والے اِس گم گشتہ خلجان کی وجہ عقل میں آنے لگی۔ میں آہستہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ عرشے پر نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سائبان کے ستونوں میں طاقچیاں بنی ہوئی تھیں، جن میں شام ڈھلے قندیلیں رکھ دی گئی تھیں، جو اِس وقت ٹمٹما رہی تھیں۔ کیبنوں والا حصہ جگنوؤں سے چمک رہا تھا۔ گمان پڑتا تھا کہ جہاز کے اِس وسیع و بلند گوشے پہ جگنوؤں کا جھنڈ اُتر آیا ہو۔ انجن کی گول چمنی اوپر تک چلی گئی تھی، جس سے نکلتا گاڑھا دھواں رات میلی کر رہا تھا۔ میں بکھرے ہوئے لوگوں سے پیر بچاتا دنبالے کی جانب چلا آیا۔ اندازاً پو پھٹنے تک جہاز بمبئی کے

ساحل پہ لنگر انداز ہو جاتا۔ میں ریلنگ سے لگ کے کھڑا ہو گیا۔ یہاں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ نیچے کالے سیاہ سمندر میں دُور تک ایک سلوٹ دار لکیر تھی، جو جہاز کے پیچھے سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ چاروں اور حدِ نگاہ تاریکی ہی تاریکی تھی۔ جہاز کے انجن کی مدھر گڑگڑاہٹ سناٹے کا وقار مجروح نہیں کر رہی تھی۔ نیم سرد ہوا کے تھپیڑے بھلے معلوم پڑ رہے تھے۔ میری نظریں سیدھ میں بھٹک رہی تھیں، جہاں گاڑھا اندھیرا تھا۔ میرے ہاتھ سینے پہ کچھ ٹٹولنے لگے۔ مالا اُس کے لمس سے معطر تھی۔ جیسے لمحہ بھر پہلے ہی اُس نے چھوا ہو۔ جیسے زنجیروں کی جکڑ سے آزاد ہو گیا۔ سوتے پھوٹنے لگے، لیکن آنکھوں کے صرف گوشے ہی نم ہوئے۔ سمندر بھی غضب کا جادوگر ہے، جلا دیتا ہے۔ نہ جانے میں کتنی دیر یوں ہی کھڑا رہا۔ دفعتاً کوئی بالکل میرے ساتھ آ کے کھڑا ہو گیا۔ خوش بو بتا رہی تھی کہ وہ کوئی عورت ہے۔ وہ عین میرے برابر، بالکل ساتھ کھڑی تھی۔ میں نے اُس کی جانب متوجہ [illegible] نے اور دیکھنے سے گریز کیا۔ ریلنگ پہ جمے میرے دائیں [illegible] کی پشت پہ حرارت آمیز ریشمی لمس کا احساس ہوا تو میں نے [illegible] اُس کا ہاتھ شفاف چاندنی سے دُھلا تھا۔

”آپ رو رہے ہیں مسٹر بابر!“ دھیمی اور نغمگیں آواز میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی اور نہ ہی غیر شناسا، وہ مایا تھی۔

”اور اِس وقت شرمندگی کا اظہار بے معنی ہے مسٹر بابر۔“ اُس نے میرے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کے آنے کی توقع تھی۔“ میں نے شائستگی سے اپنا ہاتھ ریلنگ سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔

”اِس کا مطلب ہے کہ آپ تمام انگریزوں کو یک ساں نہیں سمجھتے۔“ اُس نے اپنا ہاتھ سرد اور برفیلی ریلنگ پہ جماتے ہوئے کہا۔

میں نے وضع دار مسکراہٹ سے اُسے جواب دیا۔ وہ نفی یا اثبات دونوں ہی معنی اخذ کرنے میں آزاد تھی۔

”پروفیسر تھامپسن نہایت افسردہ اور گراں بار ہیں۔ اُنھوں نے کئی مرتبہ آپ سے معافی مانگنے کے لیے آنے کا قصد کیا، لیکن اُن میں آپ کا سامنا کرنے کی تاب نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میرے شوہر نے اُن کی حقیقی شان و شوکت چھین لی ہے۔“ اُس کی آواز آزردہ اور لہجہ پُر ملال تھا، وہ میرے کچھ اور قریب آ گئی۔

دلِ دل در معقولات مجھے بے طرح کھلی تھیں۔ ”آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ میں جہاز کے اِس حصے میں موجود ہوں مسز برنارڈ۔“ میں نے دانستہ اُسے شوہر کی نسبت سے پکارا، حالاں کہ اُس نے اپنا نام بتایا تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دیگر یورپی خواتین اُدھیڑ عمری سے قبل شوہر کی کنیت سے پکارے جانے کو ناشائستہ سمجھتی ہیں اور ناگوار بھی۔

”برنارڈ نشے میں بہک رہا تھا۔ میں نے زیادہ تر اُسے صحیح پسندی اور انصاف کی طرف مائل دیکھا ہے۔“ اُس نے

سفید اسکرٹ اور سفید ہی بلاؤز پر فر کا بھورا کوٹ پہن رکھا تھا۔ شانوں پر جھولتے اُس کے سیاہ بال تیز ہوا میں لہرا رہے تھے گویا کہ رقص کر رہے تھے۔ گہری لال سرخی سے اُس کے ہونٹ اندھیرے میں بھی خوب چمک رہے تھے۔

"مجھے یاد آیا، آپ پچاس فی صد مشرقی بھی ہیں۔"

"وہ!... کیا مطلب مسٹر بابر؟"

"مشرق میں عورتیں شوہر پرست ہوتی ہیں، یہاں خاوند کی حمایت ایک جائی عبادت سمجھی جاتی ہے۔"

"آپ بات کرنے کا ہنر جانتے ہیں..." اُس نے جز بز ہوتے ہوئے کہا، "برنارڈ اور میں اکٹھے کھیل کود کے جوان ہوئے، اُس سے خوب واقف ہوں۔ میں آپ کے پاس اُس کی صفائی دینے نہیں آئی، معافی کی خواستگار ہوں۔ برنارڈ نے زیادتی کی ہے۔"

"ایک حاکم دوسرا محکوم، کیسی زیادتی، کیسی معافی؟" میرا لہجہ تلخ ہو گیا تھا۔ "بات تو پورے ہندوستان کی ہے۔ پروفیسر صاحب شاید مزید کسی عقدہ کشائی کے منتظر ہوں گے۔"

"آپ بہت شان دار انسان ہیں، غصہ آپ کو اور شان دار بناتا ہے۔" اُس نے پُرشوق نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکراہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ میں نے جواب میں کہنا چاہا کہ جاہ و حشم کا شہرہ ہی تو ہندوستان کی بدقسمتی رہی ہے، جو کشاں کشاں فاتحین کو یہاں کھینچتی رہی ہے، لیکن ناگوارِ خاطر ہوا، مجھ سے کچھ نہ کہا گیا۔

"برنارڈ آپ کو وہاں سے اٹھانے پر قادر نہیں تھا۔ آپ از خود ہی چلے آئے۔ پروفیسر تھامسن نہایت قابلِ عزت اور بااثر ہیں۔ اُن کی رسائی کا ہم پلہ اِس جہاز میں کوئی نہیں۔"

"پروفیسر تھامسن کی ہماری سماجی حیثیت اور مرتبے تک رسائی نہیں، جبھی وہ ہمیں وہاں لے گئے... لیکن ہمیں اپنی اوقات کا بخوبی ادراک ہے۔ تبھی ہم وہاں سے چلے آئے۔" میں جواباً کچھ نہیں کہنا چاہ رہا تھا، لیکن زبان سے جملے خود بہ خود پھسل گئے۔

"آپ شادی شدہ ہیں؟" اُس نے خوش گوار انداز میں گفتگو کا رخ موڑنا چاہا۔

"ہاں... نہیں... ہاں ہاں..." غیر متوقع سوال سے میں بڑبڑا گیا تھا۔ کیا خوب سوال تھا کہ سوال بھی متاعِ جاں، جواب بھی متاعِ حیات۔

"انگلستان کے مرد شادی چھپانے کے فن سے خوب آشنا ہیں۔" مایا نے اٹھلا کے کہا۔ وہ میری خاموشی سے من پسند معنی کشید کر رہی تھی۔ خفیف انداز میں وہ میرے کچھ اور قریب ہو گئی۔ میں چپ ہی رہا، جیسے کسی نے قوتِ گویائی یک دم سلب کر لی ہو۔ چیرے گئے پانی کی چرچراہٹ بھلی لگ رہی تھی۔ دیو ہیکل سفینہ تیر کیا رہا تھا، بس پھسلے جا رہا تھا۔ جہاز کسی ساحل کے قریب سے گزر رہا تھا۔ دائیں جانب دُور مدھم مدھم روشنی کے دھبے نظر آ رہے تھے، بستی تھی یا چھوٹا ساحلی شہر۔ چاندنی مایا کے سراپے کو شرابور کر رہی تھی۔ تیز ہوا کے تھپیڑوں میں اُس کے تراشیدہ بال مسلسل لہرا رہے تھے۔ بلاشبہ وہ مشرق و مغرب کا حسین امتزاج تھی، نمکین اور شرمیلا۔

"میرے ماں باپ کے درمیان مثالی تعلق تھا۔ میرے والد کی والہانہ چاہت اور وارفتگی کے باوجود وہ خود کو کم تری کے احساس سے آزاد نہیں کر سکی تھیں۔" مایا نے کچھ توقف کے بعد خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کے دل نشیں انداز میں بولتی تھی۔ اُس کے شستہ انگریزی لہجے میں پنہاں مشرقیت گو کہ اپنا اظہار نہیں کرتی تھی، لیکن انکار بھی نہ تھا۔ "دل جوئی کی ہر کوشش اُن کی آزردگی میں اضافہ کرتی تھی۔ وہ انگلستان کی ہر چیز پر ہندوستانی تمثیل لایا کرتیں۔ جو والد صاحب کو ناگوار گزرتی، لیکن وہ خندہ پیشاں تھے، گرانیِ طبع کے باوجود اُن کی "ہاں میں ہاں" ہی ملاتے۔ مغرب جن طور طریقوں اور رسم و رواج کو فرسودہ اور وقت کا زیاں قرار دیتا ہے، والدہ محترمہ کے نزدیک وہ زندگی کی علامت تھے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ جدت طرازی کے تعاقب میں اندھا دھند دوڑا جا رہا ہے، انسانی رشتوں کو دقیانوسی قرار

دینے کا محض ڈھول پیٹا جا رہا ہے، حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک ذہنی اختراع سے وقوعات نہیں بدل سکتے، البتہ طرزِ وقوعہ تبدیل ہو سکتا ہے۔ سماج کی قید ہی میں انسان کی اصل آزادی ہے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ مغرب نے اپنی قید کے لیے جس قفس کا انتخاب کیا ہے اُس سے آزادی نہیں موت ملتی ہے، اور وہ بھی صدیوں کے بعد، صرف نئی تہذیب کی نمو کے لیے، نئے معاشرے کی تشکیلِ نو کے لیے... اوہ، میں آپ کو زحمت دے رہی ہوں؟..." بولتے بولتے، اُسے کچھ احساس ہوا۔ "دراصل میں آپ کو یہ سب بتانا چاہتی ہوں۔ میں نے آپ کی گفتگو سنی تو یقین جانیے مجھے آپ میں والدہ محترمہ کا عکس نظر آیا، وہی انداز، وہی تلخی، وہی تیکھا پن... پروفیسر تھامسن تو آپ کی مدح سرائی کرتے نہیں تھک رہے۔ اُن کا خیال ہے کہ آپ کی صورت میں انھیں اور اُن کی تحقیق کو گوہرِ نایاب میسر آ گیا ہے۔ وہ آپ کی قربت سے کسی طور دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہیں... اور مسٹر بابر!" میرے نام پر اُس کی زبان لڑکھڑا گئی، وہ سمندر کے رخ میرے متوازی کھڑی تھی، اپنے جملے کا آخری لفظ ادا کرتے ہوئے وہ یک دم میری جانب مڑی۔ اُس نے ٹھیرے ہوئے اور معنی خیز لہجے میں کہا، "مسٹر بابر! آپ کے بارے میں میرا خیال بھی پروفیسر تھامسن سے مختلف نہیں ہے۔ آپ بہت شان دار شخصیت کے مالک ہیں مسٹر بابر!" اُس کی سانس میں خفیف لرزش تھی اور آنکھوں میں طوفان۔

"آپ نے بہت اچھے انداز میں میری دل جوئی کی ہے۔ آپ اِس بیکراں سمندر سے پوچھیے کہ اِس دیو ہیکل فولادی جہاز کی اوقات اِس کی نظر میں کیا ہے۔ جو جواب بحرِ بےکراں کا ہوگا، وہی مجھ ناچیز کی اوقات و بساط ہوگی۔"

"خوب!... بہت خوب مسٹر بابر... کیا خوب صورت طور سے جواب گو ہوئے ہیں آپ... والدہ کہا کرتی تھیں کہ ہندوستانی مزاج کی بے جا عاجزی و انکسار نے اُس کے گلے میں غلامی کا

طوق ڈال رکھا ہے۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بےساختہ بولی۔ اُس کی گویائی میں وقار بدرجہ اتم موجود تھا۔

میں خاموش رہنا چاہ رہا تھا۔ مسلسل پہلوتہی کے باوجود جوابی فقرہ میری زبان سے خود بہ خود ہی پھسل جاتا تھا۔ وہ میرے اندازے سے کہیں بڑھ کر غواص تھی۔ میں اُسے پڑھ رہا تھا، اور وہ مجھے مہمیز کر رہی تھی۔ "جس توجیہ کو آپ کی والدہ عاجزی و انکسار کہتی تھیں، وہ درحقیقت اپنی ذات سے عدم شناسی ہے۔ ہندوستان کے لوگ خود کو فریب دینے کے لیے اسے عجز و انکسار ہی پر محمول کرتے ہیں، اور یہی بیان ہندوستان کے گلی کوچوں سے پنپ کے مغرب کے در و بام تک پیغام بن کے پہنچ گیا۔"

"وضاحت کریں۔"

"آپ نے سرکس کا شیر دیکھا ہے مسز برنارڈ؟" میرا لہجہ کوششِ ناتمام کے باوجود تلخ ہو گیا۔

"ہاں... کئی بار۔" مایا نے فوراً جواب دیا۔ اُس کی آنکھیں شوق سے چھلکنے لگی تھیں۔

"سرکس میں شیر کے علاوہ اور بھی جان ور ہوتے ہیں۔ ریچھ، کتے، بن مانس، بندر، سانپ، اژدھے، وغیرہ وغیرہ۔"

"ہاں... وہیل اور ڈولفن مچھلیاں بھی اب سرکس کی زینت بننے لگی ہیں۔"

"اِن مختلف النوع جان وروں کو اشاروں پر نچانے والوں کی ایک ہی قسم ہے اور وہ ہے حضرتِ انسان۔" میں نے دانستہ توقف کیا۔

"آں... ہاں... بات جاری رکھیں۔" وہ مچلتے ہوئے بولی۔

"کیا یہ جان ور طاقت اور زور میں انسان سے کم ہیں؟ ہم پلہ ہیں؟"

"بالکل نہیں!"

"عجز و انکسار نے ہندوستانیوں کے گلے میں پٹہ نہیں ڈالا۔ ہندوستانی سرکس کے جان وروں کی مثال ہیں۔ اِنھیں سیلابِ بےاماں کی قوت کا اندازہ نہیں۔ انگریز کے پاس مداری کی طرح

بہترین اور انتظامی صلاحیت موجود ہے۔ ورہندُستان کے لوگوں کے پاس اپنی طاقت سے عدم واقفیت ا مداری کرتب دکھا رہا ہے اور شیر سرکس میں ناچ رہا ہے۔"

"میں آپ کی اِس رائے سے متفق نہیں ہوں... طاقت تو سامانِ حرب میں پوشیدہ ہے۔ اِس سے ہمارے لوگ مالا مال ہیں... بمبار طیارے، توپ، بارود، خودکار بندوقیں، ٹینک، تربیت یافتہ فوج، بہترین مواصلاتی نظام، سب سے بڑھ کر سائنس و ٹیکنالوجی کی ہزار جہتی قوت انگریزوں کے پاس ہے۔ آپ کس بل پر ہندُستان کے لوگوں کو طاقت ور کہہ سکتے ہیں۔ مداری اور شیر میں جو فرق ہے، وہی ہندُستانی عوام اور انگریزی حکومت میں وہی فرق تو ہے۔"

"آپ ایسا کہہ سکتی ہیں۔" میں نے یک دم قطعی اور اختتامیہ لہجے میں کہا۔ اُس کا جواب مجھے کچھ سطحی سا لگا، اور کچھ اُس کے انداز میں یکا یک در آنے والے فخر و انبساط نے طبیعت کو مکدر کر دیا تھا۔ سلطفِ کلام نہ رہے تو دلیل کا حسن ماند پڑ جاتا ہے، اور لطفِ کلام تو مخاطب کی فکری برتری کا محتاج ہوتا ہے۔ ذہانت و فطانت آسمانی عطا ہے، لیکن اِس میں پختگی و بالیدگی سِن یا تجربے کی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔ زندگی کی اونچ نیچ اور تجربے سے کم مستفید ذہین و فطین لوگ ٹمٹماتے دیے کی مانند ہوتے ہیں، ذرا لَو بھڑکی تو آسمان اٹھا لائے، مدھم ہوئی تو زمین پر چلنے سے محروم۔

"آپ لاجواب ہوئے ہیں، یا جواب نہیں دینا چاہتے۔" وہ گھبراہٹ سے بولی۔ اُس نے میرے چہرے پر نمودار ہونے والی ناگواری بھانپ لی تھی۔ اُس لمحے وہ بہت اچھی لگی۔ میری زبان پھر متحرک ہو گئی، نہ چاہتے ہوئے بھی۔

"لوازماتِ دنیا پر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ سبھی کچھ فطرت کے مسلّمہ اصولوں کے ماتحت ہے۔ فطری اصولوں کی ابدیّت کو آج کا جدید انسان بھی تسلیم کرتا ہے۔ انسان نے اپنے تئیں اب تک تمام تبدیلیاں قانونِ فطرت کے مسلّمہ اصولوں کے ماتحت ہی کی ہیں۔ انسان کے تمام اکتشافات دریافت محض ہیں۔ لطف کی بات ہے کہ قدرت نے کرۂ ارض پر طاقت کا منبع انسان کو بنایا ہے۔ ارضی مخلوقات میں انسان صرف عقل کی بنیاد پر ممتاز نہیں ہے، بل کہ قدرت نے اُسے یگانگت و یک رُوئی سے بھی نوازا ہے۔ ایک انسان دو انسانوں کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اِس رائے کی حمایت میں فوری دلیل لانے سے میں قاصر ہوں، لیکن مشاہدے نے یہی سکھایا ہے کہ ایک انسان دو کے مساوی نہیں ہو سکتا۔ محض اپنی لیاقت کے بل پر وہ دیگر چند انسانوں پر جز وقتی برتری، حکومت ضرور حاصل کر سکتا ہے، لیکن اِس فتح کو دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ فاتح سلطان ہو یا والیِ سرائے، سبھی کی فتح استقامت کے لیے انسانی سلسلے کی محتاج ہے۔ سلطان کو فاتح بننے کے لیے رعایا نہیں صرف سپاہی اور سامانِ حرب درکار ہوا کرتا ہے، لیکن سلطان کو بادشاہ بننے کے لیے رعایا درکار ہوتی۔ بالکل ایسے ہی پہلے مرحلے پر جنگلی جان وروں کو طاقت کے بل پر پہلی ... میں جکڑ لیا جاتا ہے، لیکن سرکس تماشے کے لیے ... جان ور کے دل و دماغ پر حکومت کرنی ہوتی ... پھرے کب زیرِ نگیں ہوتے ہیں۔ اِسی طرح پہلے مرحلے پر سلطان فتح کے لیے کشتوں کے پشتے لگا دیتا ہے، لیکن دوسرے مرحلے میں انسانوں کی فتح ہی اُس کا سب سے بڑا مسئلہ بنتی ہے۔ یہی دائمی وسعتگی ہے۔ جو اِس مرحلے میں کامران ہوا، اُسی کو تاریخ نے عزت و احترام سے یاد کیا ہے۔ انگریز پہلا مرحلہ تو سامانِ حرب کی برتری کی بدولت سر کر چکے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ انگریزوں کو دوسرے مرحلے کا ادراک نہیں ہے، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ اِس مرحلے پر ناکامی سے دوچار ہیں۔ اُنھوں نے ہندُستان کو طاقت کے بل پر پٹا ڈال کے سرکس میں لا کھڑا کیا ہے، لیکن دل و دماغ کی فتح بہت دُور ہے۔ اِس وقت محض عدم آگہی کی بنا پر شیر بہ جبر و کراہ تماشا دکھا رہا ہے، لیکن جس دن شیر کو احساس ہو گیا کہ اُس کے جبڑے مداری کے

جبڑے سے زیادہ طاقت ور ہیں، اُس دن وہ مداری کو مار کھائے گا کہ اُس کے دل میں مداری کے لیے نرم گوشہ نہیں ہے۔ ہندُستانی عوام کا جبڑا اُن کی خوف ناک اور بے پناہ عددی برتری میں پوشیدہ ہے۔ انگریز امتیاز کے ساتھ اپنی فتح کو دوام دینا چاہتے ہیں، جو کہ ناممکن ہے۔ قدرت نے انسانوں کو مساوی بنایا ہے۔" میں نے کچھ توقف کیا۔ وہ محو اور سحر زدہ انداز میں مجھے تکے جا رہی تھی۔ میں نے غیر محسوس طریقے سے اُس کے اور اپنے درمیان ختم ہو جانے والا فاصلہ بحال کیا۔ جہاز ساحل سے کچھ اور قریب ہو گیا تھا۔ چمکتے ہوئے دھبے کچھ اور واضح ہو رہے تھے۔ دُور اندھیرے میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔ ہیولے متحرک تھے یا جامد، یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا۔ جہاز سست رو تھا، ورنہ اسے اب تک بمبئی پہنچ جانا چاہیے تھا۔ ہو سکتا ہے روشنیوں کے یہ دھبے بمبئی ہی کے قرب و جوار سے ہوں۔ ہوا میں سمندری کراوٹ کے ساتھ ساتھ کچھ فرحت اور تازگی بھی آ گئی تھی۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے جھینپ کے نظریں جہاز سے پیوستہ سفید سمندری لکیر پر مرکوز کر لیں۔

"ہندُستانی شریف النفس ہوتے ہیں..." وہ بڑبڑائی، جیسے کوئی نکتہ اُس کی دست رَس میں آ گیا ہو۔ وہ چونک کے بولی، "آپ نے انسان کے مساویانہ درجے اور امتیاز کی بات کی، آپ کے نزدیک فاتح اور حکم ران میں فرق ہے... لیکن حکم ران اور رعایا کے درمیان عدم مساوات کا جو وسیع پاٹ ہے اُسے آپ کیا کہیں گے مسٹر بابر!" اُس کے لہجے میں انتہائے دل چسپی اور کمال شوق تھا۔

"انسانی رویّوں کو سمجھنے کے لیے قانونِ فطرت کا تھوڑا بہت ادراک از حد ضروری ہے مسز برنارڈ!"

"مجھے مایا پکارے جانا پسند ہے۔" اُس کے لہجے میں تپش بھی تھی اور لرزش بھی۔

میں نے اُس کے اعتراض پر تبصرہ کرنے کی بجائے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ لطفِ کلام گویا در آیا۔ "سلطان

وکیل صاحب... میں نے ناول کے مطابق اپنا کردار ادا کیا

اور حکم ران میں بنیادی فرق ہی امتیاز کی نوعیت کو واضح کرتا ہے۔ سلطان اپنی مرضی اور طاقت کے بل بوتے پر قابض ہوتا ہے، اور حکم ران رعایا کی منشا سے عنانِ حکومت چلاتا ہے۔ جو حکم ران اپنی رعایا کو مساوی درجہ نہیں دیتے انھیں بہت جلد بغاوت، شورش اور حکم کی غیر مقبولیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مقبول حکم ران اور رعایا کے درمیان امتیاز رضا و رغبت سے جڑا ہے۔ کس میں دَم ہے جو کسی پر حکومت کرے، یہ تو من کے سودے ہیں، جسے من چاہے اپنا حکم ران بنائے۔ رعایا کا از خود تفویض کردہ انتخابی حق امتیاز کو جنم نہیں دیتا، امتیاز مسلّط کی گئی حکم رانی کے بطن سے جنم لیتا ہے۔" اُس کی بڑی بڑی شربتی آنکھیں حیرانی سے گویا پھٹنے کو ہو گئیں۔ وہ مبہوت سکتے کے عالم میں کافی دیر مجھے تکتی رہی۔ پھر خود کار انداز میں بڑبڑائی، "آج سے پہلے ہندُستان میری نظر میں ایک پسماندہ سرزمین تھا... آپ کی نکتہ بیانی نے میری نظر ہی بدل دی۔ من چاہے حکم ران کا انتخاب تفریق کو ختم کرتا ہے۔ بہت خوب مسٹر بابر! بہت خوب! اِس نکتے کی مزید وضاحت کریں گے؟"

"اِس نکتے کو آپ اپنی ذات پر منطبق کیجیے! کیا آپ کی منشا کے بغیر آپ پر کوئی حکومت کر سکتا ہے؟ بہ جبر و کراہ کسی کا کہا ماننے پر آپ کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ جب آپ کے شوہر نے ہمیں طعام گاہ سے نکال باہر کیا، بہ ظاہر آپ

نے بھی برنارڈ کی تعمیل کی۔ سچ بتایئے! اس میں آپ کی کتنی منشا تھی؟" اُس کی آنکھیں بہنے لگیں۔ آگہی داور اک کی شدت اُس کے چہرے پر نئی مصوری کر رہی تھی۔ "مایا! میرا سوال غور سے سنیئے گا۔ میری گفتگو کا خلاصہ و ماحاصل ہے۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں!" وہ بولی، جیسے بینا ٹائز کے زیر مشق بولتے ہیں۔"

"میری آپ سے چند گھنٹوں کی ملاقات ہے۔ اس مختصر جان کاری کے باوجود یہ سوال میرے ذہن میں کلبلایا ہے۔" اچانک یک جھجک مانع ہوئی اور میں سوال کرتے کرتے ٹھہر گیا۔ اُس نے قطع کلامی کو میرے طرز بیان پر محمول کیا، اور بے تابی سے کچھ دیر میرے بولنے کا انتظار کیا۔ لیکن جب خاموشی کئی لمحوں پر محیط ہوگئی تو وہ مضطرب ہو کے بولی، "براہِ کرم! پوچھیے!"

"ازروئے دل بتایئے ماریا! میجر نارڈ آپ [illegible] کتنے عرصے حکومت کر سکتا ہے؟" میرے منھ [illegible] چاقو نکل گیا۔ اُس کا چہرہ دفعتاً تاریک پڑ گیا تھا [illegible] آنکھیں بجھ سی گئیں۔ "آپ کا جواب ہی ہندوستان [illegible] انگریز سرکار کو پیغام ہوگا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی [illegible] مدعا تمام کر دیا۔ وہ ایک ٹک مجھے تکتی رہی جیسے کوئی خلا میں جھانکتا ہو۔ میرے سوال نے اُس کا یقین، اعتماد اور سر سے سائبان کھینچ لیا۔ مغربی سہی آخر وہ عورت تھی۔ اُس نے کچھ بولنا چاہا لیکن اُس کے ہونٹ لرز کے رہ گئے۔ اچانک جیسے بجلی کوندی۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی، اور زار و زار سسکنے لگی، بھل بھل اُبلنے لگی۔ "آپ نے یہ کیسے سمجھا! مسٹر بابر!"

میں نے اُسے دھیرے سے علیحدہ کرنا چاہا۔ اُس نے گرفت مزید مضبوط کر لی۔ "سامنے کی بات ہے... رات کا یہ وقت ہے ہی خاوند اور زوج کے لیے... اور آپ اسے... آپ اس کے برعکس خاوند کو چھوڑ کے اُس کے محبوب کی دل جوئی کرنے چلی آئی ہیں۔"

"میں برنارڈ سے نفرت کرنے لگی ہوں۔ جس کا اظہار و ادراک آج پہلی مرتبہ ہوا ہے، آج یوم آگہی ہے مسٹر بابر۔" اُس کا لہجہ گلوگیر تھا۔ وہ بدستور سسک رہی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ مجھ پر بھی تو کسی کا سکہ رواں دواں تھا۔ ایک بلا شرکت غیرے حکومت تھی، نہ ہجر کا گلا نہ وصال کی امید، نہ سود و زیاں کا حساب، یہی ایک پُر شوق آبلہ پائی ہم رکاب ہے، نہ تشنگی کا احساس نہ سیرابی کی لذت۔ کتنی صدیاں بیتیں، بس سیر چشم کو دیکھے اور کوئی لمحہ تھا جو وہ اوجھل ہوئی ہو۔ کورا کی حکومت کیسی شان دار تھی۔ پایۂ تخت پر اُس کی گرفت کیسی پُر اسرار تھی، جسے نہ سپاہ کی ضرورت نہ انتداب کا خوف! میں نے ایک جھٹکے سے مایا کو خود سے علیحدہ کرنا چاہا کہ یک دم جیسے دائیں کاندھے کا جوڑ ہل گیا۔ ضرب پی تلی اور زور دار تھی۔ شدید درد نچلے دھڑ تک سرایت کر گیا۔ اس سے پیش تر میں صورتِ حال کو سمجھ پاتا، میرے سر پر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ [illegible] کی دل دوز چیخ ابھری۔ وہ چیختی ہوئی دہالے کے [illegible] پر پڑی۔ میرے سر میں بڑی زور دار آواز سے گھنٹے [illegible] منظر بری طرح چکرانے لگا۔ میں نے بے، حقیر [illegible] وہ بہرا کے مایا کے اوپر ہی گر پڑا۔

[illegible] ہندستانی کتیا کے بچے! تیری اتنی وقات! اتنی جرأت!" وہ میجر برنارڈ کی آواز تھی، غیض و غضب سے بھری ہوئی۔ مغلظات کا طوفان اُس کی زبان پر اُمڈ رہا تھا۔ ہیجان، وحشت، جنون اور بہت کچھ اُس کے لہجے میں عیاں تھا۔ میں نے خود کو دائیں ہاتھ کے زور پر اٹھ کے مایا پر سے ہٹانا چاہا، مگر بازو نے بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ دفعتاً بائیں پہلو پر زوردار ضرب لگی۔ برنارڈ نے پوری قوت سے لات ماری۔ میں اُلٹ کے فرش پر چت ہو گیا۔ اب سارا منظر میرے سامنے تھا۔ برنارڈ اور ٹوٹی مایا کے سرہانے کھڑے تھا۔ وہ پھٹ پڑنے کو تھا۔ اُس کے منھ سے کف بہہ رہا تھا، چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ نشے میں جھول رہا تھا۔ مایا اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ دفعتاً برنارڈ نے جھک کے اُسے بالوں سے پکڑ کے اُٹھایا۔

"ہندستانی کتیا کی بیٹی!... حرام زادی!... گلچھرے اُڑا رہے

ہندستان جارہی ہے؟" برنارڈ نے مایا کے بال پکڑے پکڑے ہی ڈھیلے ہاتھ کا طمانچہ رسید کردیا۔ میرے لیے حواس بحال کرنے کا یہی موقع تھا۔ بقول جُھل کے تلوے اور زمین کے گٹھ جوڑ کے ساتھ زندگی جڑی ہے۔ جس کے تلوے نے زمین چھوڑ دی، وہ گیا۔ میں نے سانس روک کے جسم میں اُٹھنے والے شدید درد کو قابلِ برداشت کیا۔ ظالم نے نپی تلی ضربیں ماری تھیں۔ برنارڈ یقیناً لڑائی بھڑائی کے فن میں تربیت یافتہ تھا۔ وہ مایا کو بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا۔ مایا اُس کا منہ نوچ رہی تھی، اور ترکی بہ ترکی اُسے مغلظات کا جواب دے رہی تھی۔ ٹونی اُن دونوں کو جدا کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے اپنی دونوں ٹانگوں کو قوس کی مانند اوپر اٹھایا اور پشت کے زوردار جھٹکے سے تلووں کو زمین کی طرف گرادیا۔ اگلے ہی لمحے میں اپنے قدموں پر کھڑا تھا۔ اگر میں کروٹ کے بل کھڑا ہوتا تو ایک لمحہ ایسا ضرور آتا جب وہ تینوں میری نظروں سے اوجھل ہوتے، اور یہ سارا کھیل ہی نظر کی چوکسی کا ہے۔ معمولی سی غفلت مجھے ایک اور نپی تلی ضرب سے ہم کنار کرسکتی تھی، جس کا میں اِس وقت متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ مجھے کھڑا ہوتا دیکھ کے برنارڈ نے مایا کو ٹونی کی طرف دھکیلا اور طمنچہ نکال کے مجھ پہ تان لیا۔ شدید غصے سے اُس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ میرے لیے اندازہ لگانا مشکل نہ تھا، وہ گولی چلانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ نشے میں ڈولتے ہوئے جنونی سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ مجھ سے کم از کم تین گز کے فاصلے پر تھا۔ جیب سے چاقو نکالنے کی مہلت نہیں تھی، چہ جائیکہ کھٹکا دبا کے اُسے کھولا جائے۔ میں نے یک سوئی سے نظریں طمنچے پر جمادیں۔ لبلبے کی خفیف تحریک پر میں حرکت کرنے کے لیے تیار تھا، لیکن گولی سے بچ نکلنے کے آثار مفقود تھے۔

"تیسرے درجے کے شہری! تمھاری اوقات بھوکی مچھلیوں کی خوراک سے زیادہ نہیں... حرامی کتے!" برنارڈ وحشیانہ انداز میں پوری قوت سے چلا رہا تھا۔ شدتِ جذبات سے اُس کی گردن کی نسیں ابھر آئی تھیں۔

میری کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ دماغ میں کچھ چٹخنے لگا۔ وہ گولی ہی چلاسکتا تھا، لیکن اِس عرصے میں اُس کی گردن کی ہڈی ضرور تڑخائی جاسکتی تھی۔

"کتیا کے بچے... چل پیچھے کی جانب چل۔" اُس نے چیختے ہوئے کہا، اور پستول سے مجھے ریلنگ کے ساتھ لگنے کا اشارہ کیا۔

میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ جُھل کی برفیلی گولی جل کے خاکستر ہوگئی۔ میں نے فیصلہ کرلیا۔ مزید کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اُدھر مایا ٹونی کی گرفت میں بے طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ اُس کی چیخیں کافی تیز تھیں۔ برنارڈ پر جست لگانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ وہ فوجی افسر تھا، اُس کا نشانہ خطا جانے کا امکان ندارد تھا۔ میں نے پنجوں کا دباو زمین پر دیا کہ جُھل نظر آیا۔ وہ برنارڈ کے عقب میں پنجوں کے بل دنبالے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ جُھل نے نظریں چار ہوتے ہی مجھے برنارڈ کا حکم ماننے کا اشارہ کیا، میری سانس جہاں کی تہاں رہ گئی۔ ٹونی کی نظر کسی بھی لمحے جُھل پر پڑ سکتی تھیں، لیکن وہ مایا سے الجھا ہوا تھا، اور کچھ میری جانب بھی متوجہ تھا۔ وہ برنارڈ کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ میں نے الٹے قدموں دنبالے کی ریلنگ کی طرف کھسکنا شروع کردیا۔ جُھل دھیرے دھیرے برنارڈ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ گز سوا گز کی دوری رہی تھی۔ معمولی سے آہٹ یا ٹونی کو موجودگی کا احساس جُھل یا مجھ میں سے کسی ایک کی جان لے سکتا تھا۔ میں چند قدم کھسک کے ریلنگ سے لگ چکا تھا۔

"ریلنگ پر چڑھو اور سمندر میں کود جاؤ۔ میرے حکم کی فوراً تعمیل کرو!"

برنارڈ کے چہرے پر یکایک ایک مخصوص اور زہرخند مسکراہٹ نمودار ہوئی، قاتل بھی اور متجسس بھی۔ بلاشبہ بپھرے ہوئے سمندر میں تھک ہار کے ڈوب مرنا گولی کی موت سے زیادہ ہول ناک اور روح فرسا تھا۔ جُھل اُس کے سر پہ آ چکا تھا۔

"کود جاؤ سمندر میں۔ ورنہ تمھاری ٹانگوں میں گولیاں مار کے سمندر میں پھینکوں گا... لیکن زندہ ہی۔" اُس نے تمنچے سے مجھے ہانکا۔ پھر تضحیکانہ لہجے میں بولا، "پوربندر قریب ہے۔ تیرتے ہوئے اُدھر پہنچ جانا۔"

میں برنارڈ کی جانب پشت کیے بغیر ریلنگ پر چڑھنے لگا تو جُھل نے سخت نظروں سے گھورا۔ میں الجھ گیا، کچھ تھا جسے میں نظر انداز کررہا تھا۔ دفعتاً جُھل کا سر برنارڈ کے عقب سے غائب ہوگیا۔ اُس کے عین پیچھے پروفیسر تھامسن اور زورا نظر آرہے تھے۔ جرو بھی یقیناً اُنھی کے ساتھ ہوگا۔ پھر کوندا لپک گیا، اور چشم زدن میں برنارڈ منہ کے بل زمین پر آرہا۔ جُھل نے نیچے بیٹھ کے خاص انداز میں برنارڈ کے دونوں ٹخنے اپنی جانب کھینچ لیے تھے۔ جُھل نے اُس کے ٹخنوں کو زمین سے اٹھا کے اپنی جانب کھینچا تھا، اگر وہ ایسا نہ کرتا تو برنارڈ کا پلک جھپکتے ہی زمیں بوس ہونا ناممکن تھا۔ طمنچہ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کے سیدھا میرے قدموں میں آ گرا۔ میں نے طمنچہ اٹھانے کی بجائے ٹونی کی فکر کی، جو عرشے کی جانب بھاگنے کو پر تول رہا تھا۔ مجھے بڑھتا دیکھ کے اُس نے مایا کو میری جانب دھکیل دیا۔ میرے لیے فوری طور پر پلٹنا یا دائیں بائیں ہونا ممکن نہیں تھا۔ میں مایا سے الجھ گیا۔ اِس سے پیش تر میں مایا کو ایک طرف کرتا ٹونی نے دنبالے سے عرشے پر چھلانگ لگادی۔ کیبنوں والے حصے تک ٹونی کے صحیح سلامت پہنچنے کا مطلب ہمارے لیے بے پناہ مشکلات تھیں۔ میں پیچھے جانے لگا تو جُھل نے مجھے منع کردیا۔

"مشٹنڈا اِدھری ہے... سنبھال لے گا رے۔" وہ اچھلتا ہوا میری طرف آیا تھا۔ "منہ دے آیا تھا تو بتانے میں تیرا ہرج نہیں تھا۔ ایسے نہ ستایا کر۔" جُھل سیدھا مجھ سے آ ٹکرایا۔ اُس نے دو ہتڑ میرے سینے پر مارا۔ پھر تڑپ کے اپنی آغوش میں جکڑ لیا۔

برنارڈ اوندھا پڑا ڈکر رہا تھا۔ اُس کے منہ سے خون کی پتلی لکیر بہتی ہوئی ریلنگ تک چلی گئی تھی۔ نیچے گراتے ہی جُھل نے دونوں ٹخنے اُس کے کولھوں سے ملا دیے تھے۔ پھر اُتنی ہی تیزی سے وہ اُس کی مڑی ہوئی ٹانگوں پر گرا تھا، اور گرتے ہوئے اُس نے کہنی کی کاری ضرب کمر کے عین درمیان میں ریڑھ کی ہڈی پر لگائی تھی۔ برنارڈ کے زمین پر پڑا رہنے کے لیے یہ بہت زیادہ تھی۔

"میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں... یہ سب میری وجہ سے ہوا۔" مایا ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"کیا گٹ پٹ کر رہی ہے رے؟" جُھل نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ اُس نے معنی خیز نظروں سے مایا کو دیکھا۔

دفعتاً الجھن کا سرا میرے ہاتھ آ گیا۔ برنارڈ مجھ سے انگریزی میں کہہ رہا تھا، جُھل کیسے اُس کی بات سمجھ رہا تھا، اور مجھے تعمیل کرنے کے اشارے دے رہا تھا؟ میں نے جُھل کی طرف دیکھا۔

"چوکھٹا پڑھ لیتے ہیں رے۔ اِن کی گٹ پٹ سا بھی ہوتی ہے۔" جُھل نے میری ٹھوڑی پکڑتے ہوئے کہا، "بابا جی کچھ بولے ہیں اِس کے بارے میں۔" اُس نے پروفیسر تھامسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ بھی سہمے ہوئے ہمارے قریب آگئے تھے۔

"خدا کا شکر ہے مسٹر بابر! آپ کی جان بچ گئی۔ متوقع جواب طلبی کی آپ چنداں فکر نہ کریں... حکومت برطانیہ کے گراں قدروں میں شمار ہے۔" پروفیسر تھامسن نے حیرانی سے جُھل کو دیکھتے ہوئے کہا، جیسے گڑگانو کے جاٹ بھینس دیکھتے ہیں۔ "یہ بہت طاقت ور اور حیرت انگیز انسان ہیں۔ آپ کی اور آپ کے دوستوں کی رفاقت مطلوبِ خاطر ہے مسٹر بابر!"

اِس اثنا میں زورا ٹونی کو کاندھے پر ڈالے دنبالے پر چڑھ آیا۔ اچھا خاصا شوروغل مچ چکا تھا۔ میں نے دنبالے سے نیچے جھانک کے دیکھا۔ وہ ایک دوسرے پر چڑھے کھڑے تھے۔ عرشے کے سوئے ہوئے مسافروں کی بڑی تعداد دنبالے کی سیڑھیوں پر جمع ہوچکی تھی۔ سبھی کی نظریں استعجاب اور فکرمندی سے ہماری طرف تنی ہوئی تھیں۔

سرگوشیوں اور چہ مگوئیوں کی بھنبھناہٹ سمندری شور پر حاوی ہو چکی تھی۔ صورت حال ہماری توقع سے زیادہ گمبھیر تھی۔ بھٹکل کی پیشانی پر فکر کی لکیریں نمایاں ہو چکی تھیں۔

ہمارے چاروں طرف سمندر تھا اور جہاز پر ہماری گرفتاری یقینی تھی۔ فوجی افسر پر حملے کو انگریز غداری سمجھتے تھے، جس پر کسی بھی قسم کی رعایت نہیں کی جاتی تھی۔ پروفیسر تھامپسن کو ہندستان کی صورت حال کا ذرا بھی ادراک نہیں تھا۔ وہ خلوص نیت سے ہمیں بے فکری کی تلقین کر رہے تھے، لیکن ہمارے لیے وہ محض تسلیوں سے بڑھ کر نہیں تھی۔ میں نے اُن کی بات بھٹکل تک بڑھانی مناسب نہیں سمجھی۔ وہ مضطر کھڑا رہا۔ عرشے پر ہجوم بدستور بڑھ رہا تھا۔ برنارڈ بے ہوش ہو چکا تھا۔ مایا اُسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پروفیسر تھامپسن اس کی مدد کو بڑھے۔ دونوں نے مل کے برنارڈ کو سیدھا کر دیا۔ اُس کا چہرہ خون سے تر بتر تھا۔ [illegible] آگے بڑھ کے برنارڈ کا گرا ہوا طمنچہ اٹھا لیا۔ طمنچہ [illegible] کرتے ہوئے اس نے سرگوشی میں مجھے کچھ [illegible] زور اور جبر کی طرف بڑھ گیا، جو دبے کی [illegible] عرشے کے مجمع کو گھور رہے تھے۔ میں نے بھٹکل [illegible] پروفیسر تھامپسن اور مایا کو اعتماد میں لیا۔ دونوں نے فوراً ہامی بھر لی۔ پروفیسر تھامپسن نے کہا، "تمہارا ساتھی جہاں دیدہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے وطن عظیم بہادر انسانوں سے بڑا ہے۔ اس سنگین صورت حال میں آپ چاروں کے چہرے پرسکون ہیں نہ کوئی خوف نہ سراسیمگی۔"

"نہ بہت افسوس ہے کہ میں آپ کے پاس ایک مصیبت کے ہمراہ چلی آئی۔ آپ گرفتار ہو گئے تو اس کے بعد برنارڈ کی غضب ناکی کا مجھے بخوبی اندازہ ہے۔ یہ کینہ پرور انسان ہے۔ آپ کو شدید نقصان پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا۔ آپ کے ساتھی نے درست فیصلہ کیا ہے۔ میں ہر قیمت پر آپ کا ساتھ دوں گی۔" مایا نے پروفیسر تھامپسن کی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اُس کی والہانہ نگاہیں بصد شوق میرا طواف کر رہی تھیں۔

بھٹکل نے ہر قیمت پر گرفتاری نہ دینے کا فیصلہ کر لیا [تھا]۔

ہم آنے والے پل کی نوعیت کا اندازہ لگانے سے [قاصر] تھے۔ جہاز پر کم و بیش سو کے لگ بھگ مسلح محافظ تو [موجود] ہوں گے۔ بھٹکل برنارڈ، ٹونی، مایا اور پروفیسر تھامپسن کو یرغمال بنا کے کسی قریبی ساحل پر اترنا چاہتا تھا۔ فی الحال ہماری بمبئی یاترا ملتوی ہو چکی تھی۔ یہ بہت بڑا اقدام تھا۔ تاج برطانیہ سے براہِ راست ٹکر! جہاز سے اترنے کے بعد ہماری مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہونے والا تھا۔ کہاں تک چھپتے پھرتے؟ ہمارے حلیے ہندستان بھر میں [عام] کر دیے جاتے۔ دیس بھر کے تھانوں سے ہماری گرفتاری طلب کی جاتی۔ کھوجی اور ہرکارے طول و عرض میں دوڑ پڑتے۔ ہم بمبئی جا رہے تھے، ہماری تلاش بھی بمبئی سے شروع ہوتی۔ بمبئی میں ہمارے حلیے کا چند گھنٹوں میں سراغ لگا لیا جاتا۔ [illegible] فرخ، فربہ، فریل، اکبر اور ان سب کی زندگی [illegible] تھی جن کا ہم سے ذرا بھی واسطہ تھا۔ میں وہاں پہنچا [illegible] تھا، لیکن میری نحوست تو پہنچ رہی تھی۔ ہمیں گرفتاری [illegible]۔ بھٹکل یہ سب کچھ مجھ سے پہلے سوچ چکا ہوگا، [illegible] کے بدلے جہاز والوں سے وہ کیا مطالبہ کرنے والا تھا، اس سے میں بے خبر تھا۔ دفعتاً انجن نے گڑگڑانا بند کر دیا اور جہاز کی رفتار سست ہو گئی۔ میں نے چمنی کی طرف نظر دوڑائی، وہاں سے دھوئیں کا اخراج تقریباً بند ہو چکا تھا۔ یقیناً جہاز کو روکا جا رہا تھا۔ جہاز کو اس وقت روکنا بعید از عقل تھا۔ ممکن ہے انجن میں خرابی پیدا ہو گئی ہو یا پھر کسی مشکل کی وجہ سے معمول کے مطابق روکا گیا ہو۔ ہماری وجہ سے جہاز کو ٹھہرانا ناممکن سی بات تھی۔ دفعتاً کیبن والے حصے سے غلغلہ بلند ہوا۔ بھگدڑ کی طرح لوگوں کا ریلا عرشے کے عقب کی جانب آیا۔ لوگوں کی بھنبھناہٹ چیخ و پکار میں تبدیل ہو گئی۔ دفعتاً یکے بعد دیگرے کئی طمنچے دھاڑے۔ عرشے پر سناٹا چھا گیا۔ میں نے پیچھے جھانک کر دیکھا، بھٹکل نے یک دم میری طرف جست لگائی اور مجھے رگیدتا ہوا فرش پر پڑ گیا۔

"چپکا پڑا رہ رے۔۔۔ ملک نے فرشتے بھیجے لگتے ہیں۔"

میرے نیچے گرتے ہی طمنچہ چلا اور گولی وہیں لگی جہاں کچھ دیر پہلے میرا سر تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کے دیکھا، زورا اور جمرو بھی ہمارے ساتھ ہی فرش پر لیٹے تھے۔ عقب میں پروفیسر تھامپسن، ماریا، برنارڈ اور ٹونی لیٹے ہوئے تھے۔

"استاد بڑا لفڑا ہے۔ جہاز کے آجو باجو ڈاکوؤں کی کشتیاں لگ گئی ہیں۔" زورو نے جھل کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ سرکتا ہوا جھل کے ساتھ آ لگا تھا۔

"ڈاکو نہیں لگتے رے!" جھل نے دھیمے سے جواب دیا۔ وہ خاصا متفکر دکھائی پڑتا تھا۔ میں نے بہت کم اُسے اِتنا فکر مند دیکھا تھا۔ دفعتاً ہمارے عقب میں ٹن ٹن کر کے کئی مرتبہ لوہا بجا۔ ہم چاروں چشم زدن میں پلٹے، گویا یک جان ہوں۔ ریلنگ کے پائپ پر چاروں طرف آنکڑے پھنسے ہوئے تھے۔ اُن سے بندھی تنی ہوئی سفید رسیاں نیچے کی طرف جا رہی تھیں۔ زورا اور جمرو نے کھٹاکے سے چاقو [illegible] آنکڑوں کی رسیاں کاٹنے کی اجازت جھل سے طلب کی۔

"کتنی کاٹو گے؟ ہزاروں دکھتے ہیں... آنے دو رے۔" جھل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ہم چاروں [illegible] اُٹھ کے بیٹھ گئے۔ ہماری دیکھا دیکھی ماریا اور پروفیسر تھامپسن بھی اُٹھ بیٹھے۔

"آپ لیٹ جاؤ... ٹو گٹ چٹ کر دے رے!"

میں نے جھل کی ترجمانی کرتے ہوئے اُنھیں بدستور بیٹھے رہنے کا کہا۔ ہماری نظریں آنکڑوں اور رسیوں پر جمی تھیں۔ ہم انتہائی چوکنے بیٹھے تھے، حالاں کہ ہماری سلامتی کا انحصار آنے والوں پر تھا۔ نہ جانے یہ کون لوگ تھے۔ ان لوگوں نے جہاز کس طرح رکوالیا، اور جہاز کے تربیت یافتہ مسلح محافظوں سے یہ کس طرح نمٹیں گے؟ بحری قزاق عموماً اس طرح کے بڑے جہاز نہیں لوٹا کرتے، اور نہ ہی ایسے منظم بحری قزاقوں کا تذکرہ اب تک سنا تھا۔ دنبالے سے سطح سمندر کا فاصلہ تیس سے پینتیس فٹ تھا۔ دفعتاً پردۂ غیب سے کچھ نمودار ہوا۔ جہاز کے بیرونی کنارے پر ریلنگ کے جنگلے کے نیچے دو آنکھیں نمودار ہوئیں۔ ہمیں اپنی جانب متوجہ پا کے غڑاپ سے غائب ہوگئیں۔ لحظہ بھر بعد پورے دنبالے پر تینوں اطراف سے بندوقوں کی نالیاں برآمد ہوئیں، جن کی تعداد پچیس کے لگ بھگ اور سبھی کا رُخ ہماری طرف تھا۔

"اے خبردار! ہلنے کا نئیں اے۔" سامنے کی طرف سے چیخ کے کہا گیا۔ ہم تو پہلے ہی برضائے تقدیر بیٹھے تھے۔ "ہتھیار وغیرہ پھینکنے کا ہے۔ باپو کی طرف سے جندگی کی جمانت ہے بھاوا۔"

جھل نے چاقو پھینک دیا۔ ہماری تقلید ناگزیر تھی۔ چابک دستی اور تنظیم سے وہ تمام دنبالے پر آ موجود ہوئے۔ اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کے طمنچے اور چاقو سمیٹ لیے اور اپنے میں سے ایک نمایاں شخص کے سامنے پیش کیے، جو یقیناً منصب دار تھا۔ اُن میں بیش تر سیاہ فام اور حبشی نژاد تھے۔ چند کی رنگت عام ہندوستانیوں کی طرح نیم سیاہ یا گہری گندمی تھی۔ [illegible] بھی کرتے پاجاموں میں ملبوس تھے۔ کرتے جیسے ہوئے [illegible] تے، سیاہ، سرمئی، جامنی، کتھئی اور سبز رنگت کے تھے، جب کہ پاجامے یکساں طور پر سفید براق تھے۔ کسی کے [illegible] رومال بندھا تھا، اور کسی نے مخصوص انداز میں گردن پہ لپیٹ رکھا تھا۔ کانوں میں بالیاں اور ہاتھوں میں چاندی کے منقش کڑے تھے۔ "انہاں باندراں کا کئیں کوٹھایا... اے بھاؤ... اے گھوڑا سرکاری دیکھے نا۔" منصب دار نے برنارڈ کا طمنچہ بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ سب اپنی جگہ پر بندوقیں تانیں ساکت کھڑے تھے۔ اُن میں صرف منصب دار ہی حرکت کر رہا تھا۔ اُس نے ہماری طرف خاص توجہ نہیں کی۔ البتہ ماریا کو دیکھ کے اُس کی آنکھیں چمک گئیں۔ "چھوکری سوتی ہے۔" اُس نے ماریا پر ہاتھ چپکاتے ہوئے کہا۔ ماریا بری طرح سہمی ہوئی تھی، اُس کا سینہ دھونکنی کی مانند پھول پچک رہا تھا۔ خوف زدہ ہرنی کی اصطلاح ماریا ہی کے لیے ایجاد ہوئی تھی، پسینے سے شرابور، دیدے پھٹے ہوئے۔

"ابھی میری سکل دیکھنے کا نہیں ہے۔ کچے پکا کے چار

بلبلیے نجر نہیں آتے کا؟" اُس کے منھ سے فقرہ نکلتے ہی چار آدمی مایا اور پروفیسر تھامسن پر جھپٹ پڑے۔ سوتی ڈوریاں اُن کے پاس تھیں۔ چند ہی لمحوں میں اُن دونوں کے ساتھ ساتھ برنارڈ، ور مارٹی کی بھی مشکیں کس دی گئیں۔ پھر ایک نے مایا کو کاندھے پر ڈالا، اور کمال مہارت سے ریلنگ پر چڑھ کر رسّی پر جھولتا ہوا سمندر کی طرف اتر گیا۔ پروفیسر تھامسن مسلسل خاموش تھے کہ ان کی تحقیق عملی دور سے گزر رہی تھی۔

باقی تینوں کو بھی اُسی طرح جہاز سے نیچے اتار دیا گیا۔ اُنھوں نے ہم سے تعلق محض بندوق تاننے تک محدود رکھا تھا۔ منصب دار چاروں گوروں کو اپنی نگرانی میں نیچے کشتیوں میں اتروانے میں مصروف تھا۔ وہ مسلسل ہدایات دے رہا تھا، اور بل کھاتے ہوئے سانپ کی مانند بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ اُن چاروں کو نیچے پہنچانے کے بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہوا۔

"انگریج کو لوٹنے کا تھ بھوا؟... ابھی اِدھر بھاروٹیہ باپو آ گیا ہے۔ تم لوگ کا کام ختم۔ نیچے جا کے سونے کا ہے۔" اُس نے انگلی نچاتے اور جھومتے ہوئے کہا۔ اُس کا جملہ مکمل ہوتے ہی بتھل ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو رے نیچے! اب اِن کا وقت ہے۔" بتھل لاتعلقی سے عرشے کی سیڑھی اتر گیا۔ جیسے اُس نے منصب دار کو دیکھا ہی نہ ہو، اُس کی آواز تک نہ سنی ہو۔ ہم بھی خاموشی سے نیچے اتر آئے۔ ہمارے پیچھے تمام بندوق بردار بھی اتر آئے، اور منصب دار کی ہدایات پر اِدھر اُدھر دوڑنا شروع کر دیا۔ عرشے کا منظر ہی عجیب تھا۔ پورے عرشے پر قطار باندھے ریلنگ کے ساتھ ساتھ سیکڑوں مسلح افراد بندوقیں تانیں کھڑے تھے۔ جن کے پاس بندوقیں نہیں تھیں، اُن کے ہاتھوں میں عریاں، چمکیلی تلواریں تھیں۔ کیبنوں کے اوپر جا بہ جا مسلح افراد تعینات نظر آ رہے تھے۔ یقینی طور پر جہاز پر اُن کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ کیبنوں سے منتخب انگریزوں کو نکال نکال کے باہر لایا جا رہا تھا۔ عرشے کے وسط میں بھاری جثّے کا ایک آدمی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اُس نے سیاہ رنگ کی باقاعدہ پگڑی باندھ رکھی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی جہاز کے انتظامی عملے کی وردی میں ملبوس ایک شخص کھڑا تھا۔ عرشے پر بکھرے ہوئے مسافر سمٹ کے ایک ستون کے نیچے بیٹھے محوِ تماشا تھے۔ اُن کے چہروں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خوف زدہ ہونے کی بجائے حیران ہیں۔ کیبنوں سے نکال لائے جانے والے انگریزوں کو فرداً فرداً کرسی پر فروکش موٹے آدمی کے سامنے لایا جاتا۔ وہ ساتھ کھڑے جہاز کی انتظامیہ کے فرد سے کھسر پھسر کرتا۔ پھر اُس کے اشارے پر انگریز کی مشکیں کس کے جہاز سے نیچے اتار دیا جاتا یا پھر کیبنوں کے ساتھ ہی ایک کونے میں کھڑا کر دیا جاتا۔ البتہ جوان عورتوں کو بغیر کسی صلاح مشورے کے جہاز سے نیچے پہنچایا جا رہا تھا۔ یہ کارروائی کئی گھنٹے جاری رہی، حتیٰ کہ سورج اُگ آیا اور اندھیرا چھٹنے لگا۔ اُنھوں نے عرشے کے دیسی مسافروں سے تعرض نہیں کیا۔ اُن کی زبان، [illegible] لباس، اُن کا تعلق کاٹھیاواڑ سے بتا رہے تھے۔ کراچی سے [illegible] بمبئی تک کاٹھیاواڑ کا ساحل تھا۔ کاٹھیاواڑ میں [illegible] کئی ہندو مسلم ریاستیں تھیں۔ یہ سرسبز و شاداب [illegible] جنگلات کی وجہ سے پورے ہندستان میں مشہور تھی۔ [illegible] کے راجے مہاراجے اور نوابین شکار کی غرض سے عموماً یہیں کا رخ کرتے تھے۔ ہمارے ہم راہ بیٹھے ہوئے ایک کاٹھیاواڑی مسافر نے مسلح افراد کے بارے میں انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ یہ باروٹیہ باپو کے کراتی کار ہیں۔ باروٹیہ باپو کی ہیبت گجرات سے نکل کے پوری انگریز سرکار میں پھیل چکی ہے۔ مہان دیالو ہیں۔ مہاجن، ساہوکاروں اور بنیوں کو لوٹتے ہیں، اور غنیمت غربا میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ گجراتی مسافر کرشنا داس پولیس میں نوکر تھا۔ وہ باروٹیہ باپو کا تذکرہ عزت و احترام سے کر رہا تھا۔ باروٹیہ کے کارندے اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے تو وہ گاہے گاہے اپنی معلومات سے اپنے اردگرد بیٹھوں کو مستفید کر رہا تھا، جن میں ہم بھی شامل تھے۔ اُس کی بتائی ہوئی معلومات کے مطابق گجراتی

میں باپو عزت و تکریم کی علامت ہے، جب کہ باروٹیہ لٹیرے کو کہتے ہیں۔ باروٹیہ باپو کا مطلب "معزز لٹیرا" ہے۔ باروٹیہ چھلاوا ہے، سیکڑوں کارندوں کے ہم راہ آناً فاناً غائب ہو جاتا ہے، زمین نگل گئی یا آسمان نے اُچک لیا، واردات کے بعد باروٹیہ کا سراغ نہیں ملتا۔ اُس کا عمومی ٹھکانا گرنار کا گھنا اور خطرناک جنگل تھا۔ گر کے جنگل میں وہ کہاں روپوش ہوتا، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ باروٹیہ کے گروہ میں شمولیت کے بعد واپسی نہیں تھی، اور یہ بھی دل چسپ بات تھی کہ آج تک کوئی کارندہ گروہ چھوڑ کے نہیں گیا تھا۔ گرفتار ہونے والوں کو حوالات میں قتل کر دیا جاتا۔ انگریز افسروں اور سپاہیوں کو اغوا کرنے کے حوالے سے باروٹیہ باپو کی شہرت ملکہ برطانیہ تک پہنچی ہوئی تھی۔ مشہور تھا، ملکہ گرفتاری کے بعد باروٹیہ سے ملاقات کا اشتیاق رکھتی ہیں۔

[illegible] نے بہتیری مرتبہ باروٹیہ کے گرد میلوں گھیرا ڈالا، [illegible] مگر باروٹیہ کا بال بیکا نہ کر سکی۔ اُس کی گرفتاری کے [illegible] ولایت سے بن بن کے آئے، مگر وہ پیش بندی کا [illegible] پہلے ہی حملہ کرنے کی کام یاب حکمتِ عملی اُس کا [illegible] آندھی کی مانند تند و تیز شب خون مارتا۔ مہمان خانوں، ڈاک بنگلوں، سرکاری دفتروں سے ملحقہ انگریز آبادیوں پر کڑے پہرے دھرے رہ جاتے، اُس کے ہاتھ جو انگریز لگتا، اٹھا لے جاتا۔ اُس کی گرفتاری کے لیے اٹھایا جانے والا ہر قدم جب تک واپس نہ لے لیا جاتا، شب خون بڑھتے ہی جاتے۔ سپاہیوں کے کٹے ہوئے سر اور انسانی لوتھڑے چوراہوں پر پھنکوا دیے جاتے۔ یہاں تک کہ اُسے گرفتار کرنے کا خواہاں نوخیز مہم جو سرد پڑ جاتا، باروٹیہ کی فائل بند کر دی جاتی، لیکن عمل داری کا بھرم رکھنے کے لیے رسمی کارروائیاں جاری رہتیں۔ تبادلے اور تعیناتیاں ہو جاتیں، کوئی سر پھرا گورنر آ جاتا، تو وہی چکر دوبارہ چل جاتا، لیکن خوش قدمی نے ہمیشہ باروٹیہ ہی کو چنا۔ وہ انگریز سرکار کے لیے مستقل دردِ سر بنا رہا، اور اُس کی گرفتاری انگریز سورماؤں کے لیے خواب۔ اُس نے 'تیری بندوق، تیری چھاتی' کے مقولے پر خوب عمل کیا تھا۔ عام حالات میں وہ اغوا کنندگاں کے عیوض بھاری اسلحہ حاصل کرتا، اور یہی اسلحہ باروٹیہ کی ہیبت بنائے ہوئے تھا۔ ایک لٹیرے کے لیے فوجی پیش قدمی کو ہتک سمجھنے کے باوجود باروٹیہ باپو کی گرفتاری کے لیے خصوصی فوجی کمپنیاں بھی تشکیل دی گئیں، برما کے محاذ سے نامی گرامی افسروں کو بلوایا گیا۔ گرفتاری پر گراں بہا انعام اور اعلیٰ ترین سول و فوجی اعزازات کا اعلان کیا گیا۔ مقامی افراد کو نتیجہ خیز معاونت پر سونا تول کر تفویض کرنے کا لالچ دیا گیا۔ گجرات بھر میں مخبروں کا جال بچھایا۔ معمولی سی مخبری کو بھی ہنگامی اہمیت دی جاتی، مگر باروٹیہ چھلاوا تھا، کبھی ہاتھ نہ آیا۔ البتہ مخبری کے مضبوط نظام کی وجہ سے باروٹیہ کو مسلسل متحرک رہنا پڑتا، جو اُس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ بھاری جثّے کے ساتھ حرکت کرنا اب آسان نہیں رہا تھا۔ مڈبھیڑوں میں اضافہ ہونے لگا۔ ابتدا میں یہ جھڑپیں صرف فرار حاصل کرنے کے لیے کی گئیں، کام یابی نے ایک دن تن کے کھڑا ہونا بھی سکھا دیا۔ گئے برس شب خون مارنے والے باروٹیہ نے دوبدو لڑائی میں ایک کمپنی کے چھکڑے اڑائے تو کاٹھیاواڑی عش عش کر اٹھے اور باروٹیہ کو کراتی کار گردانا گیا۔ انگریز سرکار نے جرائم پیشہ افراد کی فہرست سے اُس کا نام خارج کر کے باغیوں میں شمار کر لیا اور یوں باروٹیہ ایک لٹیرے سے کراتی کار بن گیا۔ جن اشرافیہ سے وہ بھتّے اور تاوان وصولتا تھا وہ اُسے امداد، نذرانے دینے لگے، کاٹھیاواڑ میں اُسے قبولِ عام کی سند مل گئی۔ اُس کے متقابل ریاستی راجوں، مہاراجوں اور نوابین کی عمل داری مفقود ہو کے رہ گئی۔ ریاستی عمّال باروٹیہ کے کارندوں سے باز پرس بھی گناہ سمجھتے۔ ایک مرتبہ راجوں اور نوابین نے مشترکہ وفد دلّی بھیجا، جس نے وائسرائے سے ملاقات کی، اور کہا کہ حکومتِ برطانیہ باروٹیہ سے چھیڑ چھاڑ کر کے اُسے ڈاکو سے کراتی کار اور مجاہد بنا رہی ہے۔ باروٹیہ کو اُس کے حال پر چھوڑنا ہی مناسب حکمتِ عملی

ہوگئی۔ اُسے کراچی کار کا رتبہ حادثاتی طور پر ملا ہے، ورنہ حقیقت میں وہ ڈاکو ہی ہے۔ اگر انگریز سرکار اُس کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجتی رہی تو عن قریب پورے کاٹھیاواڑ پر باروٹیہ کا راج قائم ہوجائے گا۔ وائسرائے نہ صرف مان گیا، بل کہ باروٹیہ کے خلاف ایک نئی چال چلی، وفد کو ڈاکوؤں کا ایک چھوٹا گروہ تشکیل دینے کی صلاح دی گئی، جس پر ریاستوں نے سہاوے عمل کیا، اور باروٹیہ کی طرز کا ایک جعلی گروہ تشکیل دیا گیا۔ اس گروہ نے درمیانے طبقے کے لوگوں سے لوٹ مار شروع کردی۔ باروٹیہ کے خلاف عوامی جذبات بھڑکانے کے لیے خصوصی طور پر عورتوں کو اٹھا لیا جاتا، گاؤں اور بستیوں کو جلا دیا جاتا۔ باروٹیہ عورتوں کے معاملے میں بدنام تو تھا ہی، چناں چہ انگریز سرکار کا تیر نشانے پر جا لگا۔ باروٹیہ کے بھرم میں گھاٹا پڑنے لگا۔ اُسے باپو کہنے والوں کی زبان [illegible] لگی۔ باروٹیہ بھی اس گمبھیرتا میں بیک کے نہیں بیٹھ [illegible] نے اپنے خطرناک چھاپہ مار جیو۔ے بھائی کو [illegible] ہر حال میں قلع قمع کرنے کا ہدف دے دیا، اور [illegible] طرف خود اُس نے انگریز خواتین کو اٹھانا شروع کردی۔ [illegible] سات انگریز خواتین کی برہنہ لاشیں مانادور، پانوا، جام نگر، کشورم پور، بندو، دھوراجی واساداور، پراچی، دلوادا کے چوراہوں پر پھنکوا دی گئی تھیں۔ اُن کی موت کی وجہ کثرت جماع تھی۔ باروٹیہ نے اِس سے بڑھ کے ایک قدم اور اٹھایا۔ اُس نے گر کے جنگل کی سیاحت کو آئی ہوئی برطانوی اشرافیہ کی تین انتہائی معزز خواتین کو اغوا کرلیا۔ گر کا جنگل ببر شیروں سے اٹا پڑا ہے۔ مشہور ہے کہ افریقا کے بعد گر کا جنگل دنیا کا اکلوتا مقام ہے جہاں ببر شیر پائے جاتے ہیں۔ بمبئی میں مقیم انگریز گاہے گاہے یہاں سیاحت کے لیے آتے تھے۔ اغوا ہونے والی تین معزز برطانوی خواتین میں سے ایک کا تعلق شاہی خاندان سے تھا اور وہ بہت بڑے افسر کی یکتائے حسن وجمال بیوی تھی۔ باروٹیہ کی اِس کارروائی سے پہلو تہی دِلّی کے لیے ممکن نہ تھا، لیکن پیش قدمیاں بے سود رہیں۔ چند ماہ بعد خبر مشہور ہوئی شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی معزز خاتون مادام باروٹیہ باپو کے بچّے کی ماں بننے والی ہے۔ وہ باپو پر دل و جان سے فریفتہ ہوچکی ہے، باروٹیہ [illegible] کے عشق ہوش رُبا میں بری طرح گرفتار ہوچکا ہے اور اُسے اپنے ساتھ چوکی پر بٹھاتا ہے۔ پھر اطلاع آئی کہ اُس نے باروٹیہ کے نہایت خوب صورت بیٹے کو جنم دیا ہے، یہ اطلاع تھی یا جوالا مکھی، دلی سے لندن تک سب کچھ لرز گیا۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا گیا گر کا جنگل کھنگال ڈالا گیا، لیکن باروٹیہ کا سراغ نہ ملنا تھا اور نہ ملا۔ جاسوس اِتنا جان سکے تھے کہ باروٹیہ نے زیر زمین ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ اِس واقعے کے ٹھیک تین ماہ بعد اِس سے بڑی خبر کاٹھیاواڑ کے چوراہوں میں سننا گئی، مادام مارتھا [illegible] کے اکلوتے فرزند کو لے کر فرار ہوئی تھی۔ باروٹیہ آپے سے باہر ہوگیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو دل و جان سے چاہتا [illegible] اُس نے پہرے داری پر معمور دس کارندوں کو شیروں کے آگے ڈال دیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے فراق میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ دلی حب گئی اب گئی، باروٹیہ کسی بھی لمحے قہر وغضب بن کے انگریزوں پر ٹوٹ پڑنے والا ہے۔

کاٹھیاواڑی مسافر کو برا شتیاق سے باروٹیہ باپو کے متعلق بتا رہا تھا، اُس کی چمکیلی آنکھیں سامعین سے بار بار ستائش طلب کرتی تھیں، جیسے باروٹیہ وہ خود ہی ہو۔ اُس کی مبالغہ آمیز گفتگو سے صرف نظر کیا جائے تو بھی اِس دھڑے سے برطانوی بحری جہاز سے انگریزوں کو اغوا کرنا کسی قزاق کا کام نہ تھا۔

جہاز سے تمام انگریز عورتیں اتار لی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ پچاس کے لگ بھگ دیگر برطانوی باشندوں کو بھی اتارا گیا تھا۔ انھوں نے دیسی مسافروں سے ذرا بھی تعرض نہیں کیا، بل کہ اُن سے کلام بھی شائستگی سے کیا جا رہا تھا۔ انھوں نے عرشے کے کسی مسافر کو نہیں لوٹا تھا البتہ کیبنوں

سے صندوق بھر بھر کے لے جا رہے تھے۔ دیسی مسافروں سے اُن کی اُنسیت کی اِس سے بڑھ کے مثال اور کیا ہوگی کہ ہمیں دنبالے سے نیچے اتارنے والوں میں سے ایک ہماری طرف سے گزرا تو اُس نے بے پروائی سے چاقو ہماری طرف اچھال دیے تھے، البتہ طمنچے کی ملکیت اُس نے اپنا ہی حق جانا۔ بجھل بڑے سکون سے بیٹھا بیڑی پر بیڑی سلگائے جا رہا تھا۔ وہ پھسلتی ہوئی ایک آدھ نظر جہاز پر دوڑتے پھرتے باروٹیہ کے کارندوں پر ڈال لیتا، اور پھر بیڑی کا لمبا کش کھینچ کے مرغولے چھوڑنے میں مگن ہو جاتا۔ عرشے کے بہت سے مسافر بھی کاندھوں پر بندوقیں لٹکائے اِدھر اُدھر لپک رہے تھے۔ یقیناً جہاز پر کمال منصوبے سے قابو پایا گیا تھا۔ جہاز کے عملے میں باروٹیہ آدمی شامل تھے۔ کراچی سے سوار ہونے والوں میں بھی بیش تر باروٹیہ کے آدمی تھے۔ جو اپنے ساتھ اسلحہ بھی جہاز پر چڑھانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ جہاز پر عدم مزاحمت باروٹیہ کارندوں کی مشاقی کی گواہ تھی۔ ایسے منظم گروہ کی تشکیل کرنے والا کوئی معمولی انسان نہیں ہو سکتا تھا۔ بجھل کے وجود سے چھلکتی آزاد منشی واقعی بے فکری تھی یا وہ ایسا ظاہر کر رہا تھا۔ معاً ایک خیال کوندے کی طرح لپکا، پھریری سی وجود میں دوڑ گئی۔ بمبئی کی بندرگاہ پر حالات ہمارے لیے سنگین ہو سکتے تھے۔ بجھل بمبئی کی سوچ رہا تھا۔ یہ معمولی واقعہ نہ تھا۔ وہاں ذرّے کی بھی کھال اتاری جاتی۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ ہم سے تعرض نہ کیا جاتا۔ دنبالے پر میجر برنارڈ اور ہماری جھڑپ کا پورا عرشہ چشم دید گواہ تھا۔ نہ جانے وہ اِس واقعے کو کس تناظر میں لیتے، لیکن یہ بات مترشح تھی کہ بمبئی میں جہاز سے اترتے ہی ہماری گرفتاری یقینی تھی... کسے خبر کہ باروٹیہ سے ہی ہمارا تعلق جوڑ دیا جاتا۔ حالات بہر صورت ہمارے خلاف تھے۔

اجالا سمندر پر اتر آیا تھا۔ باروٹیہ کے کارندوں نے جہاز خالی کرنا شروع کر دیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ خون خرابے کے بغیر اِتنی بڑی کارروائی کر کے جا رہے تھے۔ بچے کچھے انگریز مسافروں کو اُنھوں نے کیبنوں میں دھکیل کے تالا بند کر دیا تھا۔ بقیہ کو وہ کشتیوں میں لاد کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ اِس کے باوجود اب بھی مکھیوں کے جھنڈ کی طرح کشتیاں جہاز سے چمٹی کھڑی تھیں، دھیرے دھیرے آگے پیچھے ہوتی ہوئیں۔ جہاز کے لنگر نہیں گرائے گئے تھے۔ دفعتاً کسی نے سور پھونک دیا، سوتے پھوٹ پڑے، جہاز پر قابض مسلح افراد "جے ہند" کے نعرے لگاتے ہوئے مچلنے تڑپنے لگے۔ سمندر کی کھلی فضا میں بھی کان پھاڑ شور بلند ہو رہا تھا۔ وسط میں کرسی کے ہتھے پر سے بیٹھا ہوا موٹا بھی جھٹکے سے مؤدب کھڑا ہو گیا۔ دفعتاً عرشے پر ایک قد آور شخص نمودار ہوا، اُسے دیکھتے ہی یوں لگا جیسے جہاز کے در و دیوار رقص اور وجد میں آ گئے ہوں۔ سلامی کو بیک وقت سیکڑوں بندوقیں گرجیں۔ کئی نے گریبان چاک کر لیے۔ وہ دیوانوں اور جنونیوں کی طرح "جے ہند، جے ہند" چیختے اور چلاتے جا رہے تھے۔ نو وارد سے پیوست ہونے کے لیے اُن کی بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی، مگر کوئی اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ وہ شخص کچھ دیر کھڑا اُن سب کو دیکھا کیا۔ اُس نے سفید کُرتا پاجامہ اور گلے میں سرخ اونی مفلر لپیٹ رکھا تھا۔ ہاتھوں میں موٹی موٹی جڑاؤ انگوٹھیاں، پاؤں میں سلیم شاہی کھسے، تیل میں چپڑے کاندھوں تک آتے سپاٹ کالے بال، دائیں کان میں چاندی کا پتلا کڑا، جھلسی ہوئی سانولی رنگت، چہرے کے تیکھے اور جاذب نقوش، بھاری مگر چست و ورزشی جسم کا مالک وہ شخص یقینی طور پر "باروٹیہ بابو" ہی تھا۔ حلیے بشرے سے وہ ڈاکو دکھائی نہیں پڑتا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک طلسمی شخصیت کا مالک تھا۔ وہ کچھ دیر سنجیدگی سے چاروں اور تڑپتے، پھڑکتے اور مچلتے ہوئے اپنے کارندوں کو دیکھتا رہا۔ یکا یک اُس نے قطعی انداز میں اپنا ہاتھ بلند کیا، گویا جسموں سے سانس کھینچ لی ہو، یک دم ایسا ہول ناک سناٹا چھا گیا، جیسے جہاز پر کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو۔ وہ ہاتھ گرا کے کرسی کی جانب بڑھ گیا، اور لوگوں کی بھن بھن پھر شروع ہو گئی۔ اُس کے

دائیں بائیں اور عقب میں دس سے زائد افراد کا جتھا تھا۔ وہ سب کے سب چھٹے ہوئے چیدہ لوگ نظر آتے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں بندوقوں کی بجائے برہنہ اور چمچماتی دو دھاری تلواریں تھیں، اور چہروں پر زخموں کے مخصوص نشان۔ وہ کرسی پر جا بیٹھا۔ عرشے کے سنّاٹے اور سہمے مسافر پہلے بھی ہونٹ سیے ہوئے تھے اور اب بھی مہر بہ لب تھے۔ موٹا اُس کے سامنے دست بستہ کھڑا ہو گیا اور اُسے کارگزاری سے آگاہ کرنے لگا، جواب میں وہ صرف گردن ہلاتا رہا۔ پھر اُس نے موٹے سے کچھ کہا، موٹا یک دم پھڑک کے سیدھا ہوا اور دھاڑا، "مجیدے بھائی، رامو نیل، کیرکا، کالو تنہا!"

اُس کی آواز گونجتے ہی جہاز کے طرفین میں دوڑ مچ گئی، صرف چند لمحوں میں وہ چاروں باروٹیہ کے سامنے آ موجود ہوئے۔ اُن کی صورتیں شناسا محسوس ہوئیں۔ مجھے گمان گزرا ... جہاز کے مسافروں میں شامل تھے، اور چلتے پھرتے میری نظروں میں آئے تھے۔ باروٹیہ اُن سے تیز تیز سوال ... رہا تھا، اور وہ سر جھکائے جلدی جلدی جواب دیے جاتے، ... تفصیل سے آگاہ کر رہے تھے۔ ہم تک اُن کی ... سرگوشیوں کی مانند آ رہی تھیں۔ جن سے کچھ اخذ کرنا ممکن نہیں تھا۔ تاہم وہ یقینی طور پر اپنی کارگزاری سے آگاہ کر رہے تھے کہ کس طرح یہ فتنہ ساماں جہاز قابو کیا۔ دفعتاً اُن میں سے ایک نے بات کرتے کرتے ہماری طرف اشارہ کیا تو پورا جہاز ہمیں دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا۔ اُنھوں نے دنبالے پر میجر برنارڈ سے ہماری جھڑپ کے بارے میں بتایا ہوگا۔ باروٹیہ نے نظر گھما کے سیدھا میری جانب دیکھا۔ میں اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نظریں چار ہونے سے قبل ہی میں نے زاویۂ نگاہ تبدیل کر لیا۔ بجھل ایک ٹک باروٹیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی کنپٹیاں پھڑکتی ہوئی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ ہمارے نزدیک کھڑے افراد نے اچانک جھپٹا مارا اور مجھے کھینچ لیا۔

"اے تیرے کو دیکھنے کا مَیں ہے، بابو بلانے کا ہے؟" اُن میں سے ایک نے میرے پہلو میں زوردار لات رسید کرتے ہوئے کہا۔ میں کسی مزاحمت کے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر بھی اُنھوں نے پشت پر دو ہتڑ مار کے مجھے دھکیلا۔

"نواب صاحب، اِدھر چلیں گا تیرا باپ۔"

"دھیان سے رے! بھیجا ٹھنڈا رکھ۔" بجھل نے سرگوشی کی۔ اُس کی آنکھیں جل کے انگارہ ہو رہی تھیں۔ جمرو اور زورا کے چہرے پھٹ پڑنے کو تھے۔ بجھل کا ہاتھ جمرو کے پہلو پر مضبوطی سے جم گیا۔ مجھے دھکیلتے ہوئے باروٹیہ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ اُس نے چمکتی آنکھوں سے میرا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ آنے والے لمحے کا کچھ پتا نہیں تھا۔ کسے خبر کہ وہ میرے متعلق کیا سوچ رہا ہے۔

"نام بول!" باروٹیہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ اُس کی آواز کاٹ دار اور تیشہ صفت تھی۔

میں نے ایک لمحے کو توقف کیا کہ گدی پر کسی نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ "اسکول کا ماسٹر نام پوچھنے کا نئیں اے۔ بول بے، بول۔"

"یا بزرماں!" میں نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ ظالم نے بجلی کا ہاتھ مارا تھا۔

”گوری چمڑی سے تیرا کیا ناتا تھا؟“ بارونیہ غرّایا۔

”کچھ نہیں! وہ اپنے شوہر کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔“ میں نے بغیر کسی توقف کے اُسے جواب دیا۔ سوال سے اندازہ ہو چلا تھا کہ اُسے کسی طرح کی آگاہی دی گئی ہے۔ کاٹھیاواڑی مسافر ہمیں بتا چکا تھا کہ بارونیہ بابو انگریز عورتوں کا رسیا ہے۔

”اپنا ناتا بول! تیرا ناتا کیا ہے؟“ بارونیہ نے میری پشت پر کسی کو اشارہ کیا۔ میری ریڑھ کی ہڈی پر کسی نے کہنی ماری۔ پھر فوراً ہی دونوں پہلوؤں پر گھٹنوں کی زوردار ضرب پڑی۔ بیک وقت پڑنے والی دو متوازی ضربوں نے میرے پیٹ کو جیسے چکی کے پاٹوں میں پیس دیا۔ میرے منہ سے پانی نکل آیا۔ دم سینے میں گھٹتا محسوس ہوا۔ میں نے خود کو گرنے سے بچایا۔

”جہاز ہی میں ملاقات ہوئی تھی۔“

”انگریجی بھی جہاج میں سیکھی تھی؟...“ بارونیہ نے زہرخند لہجے میں کہا، ”کیا سمبندھ ہے تیرا انگریجوں سے؟“

”انگریزوں اور انگریز خاتون سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے! تمھیں بتانے والوں کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم بمبئی اپنے گھر جا رہے ہیں۔ مسز برنارڈ سے میری جان کاری چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہے۔“

”بڈھے انگریج سے بھی جہاج میں ہی جان پہچان ہوئی ہوگی؟“ بارونیہ نے تمسخرانہ انداز میں سوال کیا۔

”وہ پروفیسر تھامسن ہیں۔ میری اُن سے جہاز کے ریستوراں میں ملاقات ہوئی اور اُنھوں نے ہی مجھے مسز برنارڈ سے ملوایا تھا۔“ میں نے جلدی جلدی اُسے جواب دیا۔ میں نے کوشش کر کے اپنا لہجہ فدویانہ ہی رکھا تھا، لیکن صاف محسوس ہو رہا تھا کہ گرہ مضبوط پڑ چکی ہے۔ وہ مجھے انگریزوں کا گماشتہ ہی سمجھ رہا تھا۔

”گھنٹوں کی جان پہچان! گوری شوہر سے بچھڑ گئی۔ چاقو پستول!“ بارونیہ نے دیدے گھماتے ہوئے کہا۔

”اَرے باپو! لے چل اِسے... اِسے انگریج کا... لگنے کا ہے۔“ ساتھ کھڑے موٹے نے اُسے مشورہ دیا۔ میرے جسم میں چیونٹیاں رینگ گئیں۔ اگر یہ مجھے لے جاتے تو جھنجل جیسے جی مجھے جہاز سے نیچے نہ اترنے دیتا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کے بعد میرا نام و نشان بھی نہیں رہے گا۔ میرا ہاتھ جیب پر جم گیا جس میں خنجر موجود تھا۔ میں بارونیہ سے قریباً ڈیڑھ گز کی دوری پر کھڑا تھا۔ اُس کے دائیں بائیں چار افراد اور چار ہی لمبی اور چمک دار تلواریں اُس کی پشت پر سونتے مستعد کھڑے تھے۔ اگر میں جست لگا کے بارونیہ کے سر پر پہنچتا تو اگلے ہی لمحے میرا سر عرشے پر پھڑک رہا ہوتا۔ اُس کے بعد جھنجل، زورا، جمرو... مجھے چند لمحوں میں کچھ کرنا تھا، مگر کیا! سیکڑوں بندوق برداروں کے نرغے میں اور وہ بھی بیچ سمندر کے، کوئی بھلا کیا کر سکتا تھا۔

”اور کتنے بھاڑو تیرے ساتھ ہیں؟“ بارونیہ نے گرجتے ہوئے کہا۔

”جہاز پر اور ہندُستانیوں کی طرح ہم چار دوست بھی سفر کر رہے ہیں۔“

”مجیدے بھائی!“ بارونیہ نے غالباً اُسے پکارا، [illegible] نے میرے بارے میں جان کاری دی۔

”چار ہی ہیں باپو! یہ اُن کے میل کا نہیں دکھائی پڑتا۔“ مجیدا گھگھیایا۔ بارونیہ کرسی سے اچھلا۔ جیسے کوندا لپکا ہو۔ چٹاخ پٹاخ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ”آپ ہی فیصلے کر رہا ہے۔ میں بھالو ہے کیا؟ جیادا وقت ہے؟“ مجیدے ساکت اور خاموش کھڑا رہا۔ بارونیہ کے طمانچوں سے اُس کا دایاں گال پھٹ گیا تھا۔

”کبڑو! میری سکل ہی دیکھو گے! جہاج پر ہی ٹھکانا بنا لوں... ڈھول پیٹوں۔“ بارونیہ چنگھاڑتا ہوا موٹے کی طرف پلٹا۔ وہ مجھ سے صرف ایک ہاتھ کی دوری پر رہ گیا تھا۔ میں اُسے چاقو کی زد پر رکھ لیتا، مگر اُس کے بعد کیا ہوتا؟ اُس کے بعد بھی خلاصی ناممکن تھی، صورتِ حال مکمل طور پر ہمارے خلاف تھی، تاہم میرا ہاتھ جیب میں رینگ گیا، اور چاقو پر مضبوطی سے جم گیا۔ مجیدے پھدک کے جھنجل کی نشست کی طرف دوڑا چلا گیا۔ اُس کے ساتھ کئی بندوق بردار بھی حرکت میں آ گئے۔ چند لمحوں بعد جھنجل، زورا اور جمرو بھی میرے برابر کھڑے تھے۔ بارونیہ کچھ دیر ہمیں گھورتا رہا۔ وہ واپس کرسی پر براجمان ہو چکا تھا۔ اُس کی نظریں ہم چاروں کا طواف کرتے کرتے یک دم جھنجل پر ٹھہر گئیں۔

”پلا پلایا سانڈ ہے سالا! تُو بول... انگریج کدھر لے جانے کا ہے؟“

”انگریزوں سے اپنا ناتا رشتہ نہیں ہے! ابھی تیرا وقت ہے، جو مرضی بول۔“ جھنجل نے تن کے جواب دیا، اُس کے جبڑے سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔

”رستے داری اللہ دے رستے داری تو ہے... کیا لگنے کا ہے۔“ بارونیہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”[illegible] یہ چھوکرا نہیں لگتا۔“

”[illegible] کا یار بھی ہے کیا؟“

”[illegible] ابھی تیرا وقت ہے! سنبھال کے رکھ۔“

”[illegible] جور ہے سالا!“ خلافِ توقع بارونیہ کے چہرے [illegible] ٹ پھیل گئی۔

”جور کاٹنے پہ بولتا ہے، تم زبان سے بولے ہو!“ جھنجل کا لہجہ آگ بھڑکانے والا تھا۔

وہ کچھ دیر پھر جھنجل کو گھورا کیا۔ وہ نظریں تھیں یا پیمانہ، مگر اُس نے کچھ تول لیا تھا۔ پھر وہ زہرخند لہجے میں بولا، ”ٹھکانے پر ہی جورواروں کا جور دیکھنے کا ہے۔“

جھنجل کا تیر خطا نہیں ہوا تھا۔ بارونیہ اُڑتے پاڑے کا استاد نہیں تھا، لیکن کس بل تو ضرور مشترک تھا، بل کہ بارونیہ کو امتیاز حاصل تھا کہ اُس نے کس بل سے چوکی نہیں چھینی تھی، بل کہ بنائی تھی۔ بارونیہ حکم دے کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے منہ سے جملہ نکلتے ہی ہمارے اطراف میں کھڑے سورما ہم پر جھپٹ پڑے۔ ہم چاروں کو رسیوں سے بری طرح جکڑ دیا گیا۔ بارونیہ جا چکا تھا۔ جہاز سے کرانچی کاروں کی واپسی شروع ہو گئی تھی۔ ہمیں گٹھے کی شکل میں جدا جدا باندھا گیا تھا۔ سب سے پہلے مجھے گھسیٹ کے ریلنگ تک لے جایا گیا۔ اُس کے بعد ناف کے پاس بیٹے ہوئی رسّی میں ایک کنڈا پھنسا کے مجھے جہاز سے نیچے لٹکا دیا گیا۔ چانک جیسے رسّی کو چھوڑ دیا گیا ہو۔ میں جہاز کی بیرونی دیوار سے رگڑتا ہوا تیزی سے نیچے گرا، مگر کسی نے فوراً ہی رسّی کو تھام لیا۔ شدید جھٹکے سے کمر کی ہڈی جاتی محسوس ہوئی۔ منہ سے پانی نکل آیا۔ ہاتھوں میں تھام کے کنڈا نکالا گیا، اور مجھے کشتی میں ایک طرف اچھال دیا گیا۔ میرا سر تختے پر دھڑام سے لگا۔ ”دوسرا پھینک؟“ کسی نے چیخ کے کہا۔ اُس کے ساتھ ہی میرے ذہن پر تاریکی چھا گئی۔

نمکین کرکراہٹ سے منہ بھرا محسوس ہوا۔ چہرہ سلگتے ہوئے کوئلوں پر رکھا محسوس ہوا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اُٹھنا چاہا، مگر کراہ کے رہ گیا۔ جسم میں پھوڑے پھوٹ رہے تھے۔

”جور کی کھینچ!“

”جلدی کرنے کا۔“

”بڑھیا ہے کیا چھلکا... سارا سب خود ہی کھانے کا ہے۔“

”دھندا نہیں سرکار۔“

”اچھا اچھا... ابھی نکل۔“

”اے گیگا... ادھر دوڑ۔“

”سیدھا چلنے کا بھی وا۔“

”آجو باجو چوکس ہے، پھر نہیں کرنے کا۔“

”تلاول پر روک ہے۔“

”ابھی یہ تیرا کام نہیں ہے، چل نکل!“

”لے رکھ لے۔“

”نہ باپو، بہت ہے۔“

”باپو کی اچھا ہے۔ رکھ لے... یہ بھی ہے... جس کا ٹھرا ہے۔“

”جی جی، سرکار کی جے۔“

"اے پللو! جلدی! ابھی تیری باری آنے کا ہے۔"
اس طرح کی مختلف آوازیں کان میں چھید کر رہی تھیں۔ میں نے بمشکل زور لگا کے خود کو سیدھا کیا۔ میں کسی تپتی ہوئی ریت پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ پشت پر سختی سے بندھے ہوئے تھے، باقی جسم آزاد تھا۔ ریت منہ میں بھر گئی تھی۔ دانت کرکر چرچر کر رہے تھے۔ شانوں سے رگڑ رگڑ کے منہ صاف کیا۔ آنکھوں میں مرچیں ناچ رہی تھیں، اور حلق میں کڑوے کانٹے اُگے جا رہے تھے۔ یہ کیسی افتاد تھی۔ اب کوئی ستم تھا جو روا نہ کیا جاتا۔ نہ جانے مغل، زورا اور جمرو کس حال میں ہوں گے۔ اُن کے ساتھ کیا بیتی ہوگی! دھیرے دھیرے میری آنکھیں کھل گئیں! دن چڑھ آیا تھا، سورج زمین کی طرف لپک رہا تھا۔ ہم ایک ویران ساحل پر غلے کے ڈھیر کی طرح پڑے تھے۔ کنارے پر دُور تک چھوٹی چھوٹی کشتیاں نظر آ رہی تھیں۔ جن کی تنی ہوئی رسیاں پانی میں گم تھیں۔ میرے دائیں بائیں جہاز سے اتارے گئے انگریز مسافر آڑھے ٹیڑھے پڑے تھے۔ اُن میں سے بیش تر بے ہوش تھے، جب کہ بعض ویران اور متحیر نگاہوں سے ساحل پر دوڑتے بھاگتے مسلح افراد کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے دانت بھینچ کے کہنی کے بل خود کو سمیٹا اور اُٹھ بیٹھا۔ بے اختیار میری نظریں چاروں طرف گھوم گئیں۔ اُن میں سے وہاں کوئی نہیں تھا۔ میرے دل کو کسی نے سینے سے نوچا اور حلق میں رکھ دیا۔ تشنج کی سی کیفیت سے میں لرزنے لگا۔ اُن تینوں کو یہیں کہیں موجود ہونا تھا۔ میں ساحل کے رُخ بیٹھا تھا۔ پیچھے مڑ کے دیکھا تو ذرا اونچائی پر دُور تک چھکڑوں کی قطار کھڑی تھی۔ ہر چھکڑے میں دو بیل جتے تھے: کالے، سفید، چتکبرے اور گول سینگوں والے۔ گاڑیوں پر کھلے رنگوں کی جھولیں پڑی ہوئی۔ گاڑی بان باگیں تھامے ہوئے تھے۔ قطار سے جدا ایک چھکڑا، ہمارے بالکل ساتھ چوبی رُخ پر کھڑا تھا۔ چھکڑے میں بوریاں لدی جا رہی تھیں۔ کچھ افراد اغوا زدگان کو بوریوں میں ڈال کر اُس کا منہ سُتلی سے سینے میں مصروف تھے۔ بوری بند کرنے کے بعد اُس کے اوپری حصے سے ایک ٹکڑا کاٹ دیا جاتا۔ یہ سانسوں کی آمد و رفت کا سامان تھا۔ یہ منظر دیکھ کے گونا گوں اطمینان محسوس ہوا۔ مغل، جمرو اور زورا کو مجھ سے پہلے بیل گاڑیوں میں روانہ کر دیا ہوگا۔ یکایک ایک خیال آنے پر میں نے پھر چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ مایا، پروفیسر تھامسن، میجر البرٹ برنارڈ اور ٹونی میں سے بھی یہاں کوئی موجود نہ تھا۔ انھیں بھی کسی محفوظ ٹھکانے کی طرف بھیج دیا گیا تھا۔ ایک بیل گاڑی میں تین بوریاں لادی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد پچھلے حصے سے کھلی ہوئی کپڑے کی جھول کو مکمل بند کر دیا جاتا۔ پھر چرچوں کی آواز سے چھکڑے کے چوبی پہیے حرکت میں آ جاتے۔ اُن کی جگہ دوسری بیل گاڑیاں آ لگتیں۔ لوگوں کو بوریوں میں بھرنا، بوریاں چھکڑوں میں لادنا، ایک چھکڑے کی جگہ دوسرے چھکڑے کا لگنا اور ہدایات جاری کرنے والے موٹے کی زبان [illegible] حالت میں متحرک تھے۔ کچھ ہی دیر میں میری باری آ گئی۔ ایک نے گُدی سے پکڑا اور دوسرے نے شانے سے کھینچ اور بوری والے کے پاس پہنچا دیا۔
"رستے میں خاموش رہنے کا ہے۔" بوری والے نے میرے پیروں پر بوری چڑھاتے ہوئے کہا۔ بوری عام ناپ سے بڑی دکھائی دیتی تھی۔ "پانی، دارو، کھانا سب ملنے کا ہے۔ بس خاموش رہنے کا ہے..." بوری پہلوؤں تک چڑھ گئی تو بولا "میرا باپ اندر جانے کا ہے... چِرائی نہیں کرنا۔ رندھاوا قسائی ہے سالا۔ جان جانے کا ہے بھاوا۔"
بوری میں اترنے کے بعد ہی معلوم پڑ سکتا ہے کہ بوری بند ہونا کیسا لگتا ہے۔ گھٹنے اور کہنیاں ساتھ مل گئی تھیں۔ نہ جانے مجھ سے قبل اُس بوری میں کیا بھرا گیا تھا۔ سڑی ہوئی سبزی کی بساندھ دماغ پھاڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد چہرے کے عین سامنے ٹکڑا کاٹ کے بوری میں سوراخ کر دیا گیا۔ اب باہر سے سانس لیا جا سکتا تھا۔ پھر بوری کو اٹھا کے چھکڑے میں پٹخ

دیا گیا۔ پشت کی طرف سے مسلسل بندھے رہنے سے کاندھوں کے جوڑ بری طرح دکھ رہے تھے۔ پہنچوں اور ہتھیلیوں کو مہارت سے جکڑا گیا تھا۔ رسیوں سے ہاتھ آزاد کرنا ناممکن تھا۔ میں خاصی تگ و دو کر چکا تھا۔ بیلوں کے سانسوں کی تیز آواز کے ساتھ گاڑی کے غیر ہموار پہیے حرکت میں آئے تو احساس ہوا کہ یہ سفر کتنا ہول ناک اور تکلیف دہ ہوگا۔
"ٹن، ٹن، ٹن۔" بیلوں کے گھنٹے بجنے لگے۔
"ہِچ ہِچ... ٹک، ٹک، ٹک... آ آ میرے شیر ببر۔" گاڑی بان ہشکارے دینے لگا۔ ہمارے نیچے پختہ سڑک نہیں، مسلسل آ جا رہے پگ ڈنڈی ابھر آئی تھی۔ "چرخ چوں" کے شور کے ساتھ پہیوں اور پگ ڈنڈی کی ذرہ بھر ناہمواری بھی ہتھوڑے برسا رہی تھی۔
"وحشی سُوّر! اِس سے بہتر ہے ہمیں جان سے مار دو!" میرے برابر والی بوری سے کوئی انگریزی میں چیخا۔ اُس کے ساتھ "ٹھک" کر کے دھمک پیدا ہوئی۔ "جندگی پیاری ہے تو [illegible] ہے بھاوا۔" گوربان کی آواز آئی، غالباً اُس [illegible] مڑ کے چیخنے والے انگریز کو سونٹا مارا تھا۔ میں گاڑی کے [illegible] حصے میں پڑا تھا۔ میرے بائیں طرف بالترتیب دو بوریاں اور پڑی تھیں۔ چھکڑے نامعلوم منزل کی جانب رواں دواں ہو چکے تھے۔ کسے خبر تھی کہ جاں کنی کا یہ سفر کتنا باقی تھا، چند گھنٹے، پورا دن یا پھر کئی دن۔ تکلیف کا بھی عجیب عاشقانہ مزاج ہے، اِسے جتنا سہا جائے اتنی پُرلطف اور جاں گیر ہو جاتی ہے۔ عدم سے وجود میں آتی ہے اور پھر معدوم بھی ہو جاتی ہے۔ بوری کے حبس میں جکڑا اجڑا لاچار جسم، ٹھک چج، چوں چوں کرتا گاڑی کی چولوں کا شور، گڑھوں کی ضربیں اور مسلسل زبان چلانے والے گوربان کا شور مل جل کے تکلیف پر حاوی آ گئے۔ کوئی کب تک پڑا رہے۔ میرے ساتھ والا انگریز سسکیوں سے رو رہا تھا۔ میں نے بہ مشکل کروٹ لی، گاڑی کے دائیں تختے سے جا لگا۔ ہوا کے لیے بوری میں بنایا گیا روزن میری گردن پر تھا۔ اگر یہ تھوڑا اوپر ہو جائے تو کم از کم نظروں کا ساتھ تو ہو جائے۔ پیروں اور دانتوں کی مدد سے ایسا کیا جا سکتا تھا۔ میں نے پاؤں کی انگلیوں میں بوری کا سوت پکڑنے کی کوشش کی، مگر بوری کی سوت پنجوں کی پکڑ سے موٹی تھی۔ میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ آخر کچھ دیر کی مشق کارگر ثابت ہوئی، بوری پنجوں کی گرفت میں آ گئی۔ میں نے کئی بار یہ عمل دہرا کے مشق پختہ کی۔ پاؤں کی نسبت بوری کا منہ سے پکڑنا آسان رہا۔ متواتر کوششوں سے بالآخر میں بوری کا روزن اپنے چہرے پر لے آنے میں کام یاب ہو گیا۔ میرے عین سامنے تختے میں اچھی خاصی درز تھی، باہر کا منظر صاف نظر آنے لگا۔ سائے ڈھل رہے تھے۔ دُور تک سبزہ اور گھنا جنگل تھا۔ پگ ڈنڈی کے ساتھ ساتھ درختوں کی قطار تھی، جن میں صرف تنے ہی مجھے نظر آ رہے تھے۔ شیشم، جامن اور کہیں کہیں کیکر کے درخت تھے۔ باہر کا منظر نظر آنے سے وقت کچھ سہل ہو گیا تھا۔ میں آنے والے وقت کے بارے میں سوچنے لگا۔ اگر میں کسی طرح اپنے ہاتھ آزاد کر لیتا تو یہاں سے بچ نکلنا کچھ مشکل نہیں تھا، لیکن اِس طرح میں مغل، جمرو اور زورا کا نشان گم کر سکتا تھا۔ خاموشی سے پڑے رہنا ہی درست معلوم ہوا۔ میرے ہم سفر انگریزوں نے آپس میں گفتگو شروع کر دی تھی، وہ دونوں

فوجی تھے، ورچھٹیاں گزار کے واپس ہندستان آرہے تھے، وہ ملکہ برطانیہ کو مغلظات سے نواز رہے تھے۔ انھیں فوج میں جبری بھرتی کیا گیا تھا۔ ایک نے حالیہ چھٹیوں میں نئی محبوبہ بنائی تھی اور دوسرا اپنی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرکے آرہا تھا۔ اُس کا ارادہ اب ہندستان کے نمکین حسن سے خوشہ چینی کا تھا۔ اُس کا دل اپنے گھریلو خدمت گزار کی بیٹی کستوری پر آگیا تھا۔ کستوری نے شادی کے بغیر ہاتھ رکھوانے سے صاف انکار کردیا تھا۔ کستوری کا باپ بھی حکومت برطانیہ کا ملازم تھا، اِس لیے اُس نے بھی ہاتھ رکھنے سے گریز ہی کیا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ جب تک ہندستان میں نوکری ہے تب تک کستوری سے شادی کرلینے میں کیا حرج ہے۔ کستوری کا ذکر کرتے کرتے اُس نے باروشیہ بولو کو بے دریغ گالیاں بکنا شروع کردیں۔ میں خاموشی سے بس سنا کیا۔ انھوں نے دو ایک مرتبہ مجھے پکارا تھا، جواب نہ پاکے انگریزی سے نابلد سمجھ لیا تھا، اور ایک دوسرے سے بات کرکے اذیت جھیلنے کی کوششیں کرنے لگے تھے۔ باروشیہ نے اُن کی پکی پکائی کھیر کی کھٹ ونچی اسٹ دی تھی۔ محاورے ایجاد کرنے والے بھی خوب تجربہ کار ہوتے ہیں، اُن کی باتیں سنتے اور درخت گنتے گنتے مجھے بھی گویا سولی پر نیند آگئی۔

دھکّے کی زوردار ضرب سے ہوش آیا۔ اُس درد کی کوئی تعریف ہو تو یہاں کی جائے، معاملہ درد سے کہیں آگے جاچکا تھا۔ جڑے جڑے جسم پتھرا گیا تھا۔ بوری کی قید سے جان نہیں چھوٹی تھی۔ چھکڑے پر سے بوری گھسیٹ کے زمین پر چھوڑی گئی تھی۔ عجلت کار نے دوسری بوری بھی کھینچ کے میرے اوپر ہی پٹخی تھی۔ کسی نے ٹھڈا مار کے بوری میرے اوپر سے گرائی۔ بوری میں سے دل دوز چیخ ابھری، ”تیری ماں کا... سالے بندر کے تخم چپ! لاڈ صاب... ہونہہ۔“ کسی نے غرّاتے ہوئے پے در پے کئی لاتیں اُسے رسید کیں۔ اِس مرتبہ کوئی چیخ بلند نہ ہوئی۔ کھردری زمین پر بوری گھسیٹی جانے لگی۔ میں باہر کا منظر دیکھنے سے قاصر تھا۔ بوری کا

روزن پیچھے کو کھسک چکا تھا۔ چند گز گھسیٹ کے بوری کا منہ کھول دیا گیا۔ پھر تو جیسے ٹھنڈی اور آزاد ہوا والہانہ پن سے سینے میں گھستی چلی گئی۔ بوری کی بساند ناقابلِ برداشت تھی۔ نہ جانے کون سا پہر تھا۔ آسمان پر چاند کے بنا ہی ستارے جھلملا رہے تھے۔ جہاز سے اغوا کیے گئے تمام افراد وہیں آڑے ترچھے ایک دوسرے پر لدے پڑے تھے۔

یہ گھنے درختوں کے جھنڈ میں ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ درمیان میں الاؤ روشن تھا۔ جلے ہوئے زیتون کی مہک چاروں طرف رچی ہوئی تھی، الاؤ کے قریب ہی کچھ ہرن پڑے تھے۔ کچھ افراد عرق ریزی سے اُن کی کھال اتارنے کا کام کررہے تھے۔ چند لمحوں تک میں سمجھ نہیں سکا کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ میں یہاں کیوں پڑا ہوں۔ معاً ایک گھٹا گھٹا سا ابال سینے میں اٹھا۔ ایک خیال کے جھماکے نے بدن میں بجلی گرمادی۔ میں نے تڑپ کے نظریں گھمائیں۔ چند گز کے فاصلے پر میجر برنارڈ نظر آیا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے مسکینی برس رہی تھی۔ کچھ اور آگے پروفیسر تھامسن بھی نظر آگئے۔ اُن کی حالت زار دیکھ کر ترس آتا تھا۔ ہندستان اُن پر تحقیق آزما تھا۔ پھر نظر پڑتے ہی میری اٹکی ہوئی سانس چل پڑی۔ اُس کی آنکھیں مجھے دیکھ کے چمک رہی تھیں۔ زورا اور جمرو بھی وہیں قریب ہی بیٹھے تھے۔ جہاز سے اغوا کی گئی خواتین میں سے یہاں کوئی نہیں تھی۔ لگ بھگ ستّر کے قریب انگریز ایک قطار میں پڑے تھے جن میں سکت تھی، دم خم تھا وہ بیٹھے تھے۔ باقی بے حس و حرکت پڑے تھے۔ سبھی کے ہاتھ پشت سے بندھے تھے۔ جامن، سپیدے، گوندنی اور شیشم کے تناور درخت تیز ہوا میں مستا رہے تھے۔ درختوں کے گھیرے کے ساتھ ساتھ مسلح افراد بھی چوکس کھڑے تھے۔ بھل بڑے سکون سے جما بیٹھا تھا۔ جیسے چوکی پر بیٹھا ہو۔ کبھی کبھی اردگرد سے کوئی کراہ اُٹھتا، یا گاہے گاہے سیال رو پڑتے، ورنہ سناٹا ہی سناٹا تھا۔ باروشیہ کے کارندے بالکل خاموشی سے

کھڑے تھے۔ ہمیں بھی خاموش رہنے کی تنبیہ کی گئی تھی۔ بندوبست سے یہ عارضی پڑاؤ محسوس ہورہا تھا۔ لگتا تھا کہ ذرا دم لینے اور شکم پری کے لیے ٹھیرا گیا ہے۔ اُن کی منزل ابھی دُور ہے۔ ایک مرتبہ پھر بیل گاڑی کے اذیت ناک سفر کے تصور سے دماغ جھنجھنا اٹھا۔ یوں ہی پڑے پڑے کئی ساعتیں گزر گئیں۔ جنگل کے خطرناک اور موٹے موٹے مچھر بڑی شان سے ہماری ضیافت اُڑا رہے تھے۔ ہرنوں کو بڑے بڑے پارچوں میں تقسیم کرلیا گیا تھا۔ انھیں بھوننے کا انتظام کیا جارہا تھا۔ ہمارے پیٹ میں خوراک نام کی کوئی چیز گئے ہوئے چوبیں گھنٹوں کے مساوی وقت تو گزر ہی گیا تھا۔ نقاہت فطری امر تھا۔

”پانی پلادو! خدا کے لیے پانی پلادو!...“ ٹونی سسکتے ہوئے چیخا۔ ”ایک گھونٹ دے دو، میں مر رہا ہوں۔“

اُس کے قریب ہی کھڑا سیاہ فام بندوق بردار دوڑتا ہوا آیا اور بندوق کا بٹ ٹونی کے پہلو میں دے مارا۔ ”سب میں باٹرہ سب کو باٹر... باٹر پلانے کا ہے... چل تیری ماں کا... سالا۔“ ٹونی کی چیخ پر اُس نے ایک مرتبہ پھر بٹ کی ضرب لگائی۔

”مار دو مجھے... میں تمھاری منت کرتا ہوں۔ صرف ایک گولی میرے سر میں اُتار دو!“ ٹونی بری طرح سے تڑپتے ہوئے چیخنے لگا۔ اُسے ضرب لگانے والا سیاہ فام انگریزی کی شدبد رکھتا تھا۔ اُس نے ایک جھٹکے سے بندوق سیدھی کی اور کھٹکے سے گولی چڑھالی۔ ٹونی سمیت چاروں طرف سانپ سونگھ گیا۔ کوئی لمحہ تھا کہ لبلبہ دبتا۔ سیاہ فام کچھ دیر ٹونی کو گھورا کیا۔ معاً اُس نے منھ بھر کے ٹونی پہ تھوک دیا۔ ”اور نال اوپر اٹھادی۔ ”بکر نہ کر... وخت آنے پر گولی بھی ملے گی۔“

اچانک درختوں کے درمیان سے وہی موٹا برآمد ہوا جو جہاز پر کرسی جمائے بیٹھا تھا۔ وہ شاید باروشیہ کا نائب تھا۔ ”اوکلسا! کون شور مچا رہا ہے؟“ اُس نے سیاہ فام کے قریب پہنچ کے اُس سے استفسار کیا۔

”پانی مانگ رہے ہیں بھاوا۔“ سیاہ فام کلسا کی آواز میں نرمی سمٹ آئی تھی، شاید سفارش بھی کہ پانی پلادیا جائے۔

”پانی سے کون منع کیا۔ پلاؤ پانی۔ روٹی کھلاؤ... ابھی جندہ رکھنے کا ہے۔ سور بالکل نہیں۔“ موٹے نے یہ عجلت ہدایات دیں۔ اُس کا گریبان کھلا تھا۔ کرتے کی شکنوں اور بے ترتیبی سے لگتا تھا کہ بدحواسی میں جسم پر چڑھا کے آیا ہے۔ اُس کے لٹکے ہوئے گلے مرغ ہورہے تھے۔ جیسے کسی نے نوچا کھسوٹا ہو، تھپڑ یا ہو۔ وہ جتنی تیزی سے آیا تھا اُتنی ہی تیزی سے پیچ کتا ہوا چلا گیا۔ کلسا الاؤ کے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کے پاس چلا گیا۔ نہ جانے وہ وہاں کیا باتیں کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کے ساتھ دو افراد اور چلے آئے۔ اُن میں سے ایک رتبے میں برتر لگتا تھا۔ چہرے کی روشنائی بتارہی تھی کہ خوب نشیب و فراز سے گزر چکا ہے۔ وہ میرے قریب ہی آ کے کھڑا ہوا، اور بولا، ”ہم آپ سب کی مشکیں کھول رہے ہیں، پانی بھی دیا جائے گا اور کھانا بھی ملے گا۔ جنگل کے چپّے چپّے پر ہمارے آدمی پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر کسی نے ہوشیاری دکھلائی وہ خود تو مارا جائے گا ہی، لیکن عتاب کا شکار سب ہوں گے۔ کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا۔ بصورتِ دیگر زبان سے نہیں گولی سے بات کی جائے گی۔“ اُس شخص نے نہایت شستگی اور روانی سے انگریزی میں کہا۔ پھر اُس نے وہی ہدایات ہمارے لیے بھی ترجمہ کردیں۔ اپنی بات مکمل کرکے وہ واپس الاؤ کی جانب چلا گیا۔

”دھلکسی آجاد کرنے کا ہے۔“ کلسا نے ہماری پشت پر کھڑے کسی شخص کو مخاطب کیا۔

معاً ہمارے عقب کے درختوں سے کئی افراد نکل آئے۔
انھوں نے بندوقیں درختوں کے ساتھ ہی چھوڑ دی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں ہمارے ہاتھ کھول دیے گئے۔ ہاتھ آگے کی طرف لاتے ہوئے میں نے محسوس کیا جیسے کچھ غلط کر رہا ہوں، اُن کی اصل جگہ تو پشت ہی پر ہے۔ کہنیوں سے شانوں تک ہاتھ بالکل اکڑ گئے تھے۔ زورا اور جمرو جھل کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ میں جھل سے پچیس سے تیس گز کی دُوری پر تھا۔ میں نے سوچا کہ کلسا سے کہوں وہ مجھے میرے ساتھی کے قریب بیٹھنے کی اجازت دے۔ کلسا میرے قریب سے گزرا بھی، لیکن میں اُس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ تھوڑی دیر بعد یک ننگ دھڑنگ شخص کمر سے مشک لپیٹے آن وارد ہوا۔ اُس نے لنگی نام کے چیتھڑے سے سر ڈھانپا ہوا تھا۔ پانی دیکھ کے سب بے حس و حرکت پڑی ہوئی قطار میں پھر یری دوڑ گئی۔ گویا زندگی نے سکرا کے انگڑائی بھری ہو۔
"چلو چلو پلاؤ سب کو" کلسا نے مشک بردار سے کہا ... نے مشک رجو سے اُتار کھی تھی کہ وہ کہنہ مشق سقہ ہی ... اُس کیکر میں ٹپکا ہے۔" ...سی نے ٹوٹی کی طرف اس... ہوئے کہا۔ اُس کی آواز میں اطمینان بھری چاشنی کا رچاؤ تھا۔
"ٹھیرو...ٹھیرو... اے بھاوا جرا روکنے کا ہے۔" الاؤ کی طرف سے ایک پستہ قد اچھلتا کودتا ہوا آیا۔ اُس کی آواز سن کے ٹوٹی کی طرف بڑھتا ہوا اپن بار ارک گیا۔
کلسا نے اُسے دیکھ کر منہ چڑایا، "او گانجھے! تیرے کو کیا مستی چڑھی ہے؟"
"اتنا بڑے بڑے لوگ میجر، کرنل، کمشنر، کلکٹر، چلو میں پانی بکیں گے کیا؟"
پستہ قد رچے کلسا نے گانجھا کے نام سے پکارا تھا اتے کولھے مٹکاتے ہوئے کہا۔ گانجھے کا قد بمشکل 4 فٹ ہوگا۔ اُس کا سر جثے کی نسبت دگنا بڑا تھا۔ پکوڑا سی ناک کے نیچے دو دھاری تلوار مونچھیں، اس پر خوب اُس کی چکیلی آواز!
"نوٹنکی لگانے کا نہیں ملکو! سور نہیں کرنا!" کلسا نے گانجھے کو ڈپٹتے ہوئے تنبیہ کی، گویا کہہ دیا کہ لگا کو تماشا!
"روکنے کا نہیں کلسا، اپن گانجھا سیکسپیئر ہے سالا!" ایک دوسرے نے آواز لگائی۔
"گھونٹا تو بھرنے دو، مر رہے ہیں سور۔" ایک تیسرے نے گرہ لگائی۔
"پانی تو سیوچ کا ہے.. جو رام رام کرے، اُسے پڑوا!"
"ہر آنے والا آواز کستا ہوا آرہا۔ اِدھر اُدھر سے کھسکتے ہوئے چار چھ وہاں جمع ہو گئے تھے۔ گانجھا اپن ہارے سے چمٹا کھڑا تھا۔" میں اپنی مرجی سے پانی پلانے کا ہے۔" اے کلسا! بولے نا اس کو!"
"پانی تو حجرت حسین کی نیاج ہے۔ کربلا والوں کا نجرانہ ہے۔ پانی پلانا کرانتی ہے بابو!" ایک باریش جوان ... ہوئے کہا۔ وہ الاؤ سے اُٹھ کے چلا آیا تھا۔
"... تھمرا ہم سمجھا ہوں کرانتی، سمجھانے کا نہیں ہے۔"
... اسلاح دینے والے نے باریش جوان کی طرف ... ہوئے کہا، وہ ایک دم غصے سے اکھڑ رہا تھا۔
"... دھرم سب کی اجت کرنا سمجھاتا ہے باپو!" باریش جوان نے بھی تنک کے جواب دیا۔
"او بچارے... وسیندو! اپنے مندر مسجد ٹھیک ہے۔ کرانتی ہے کرانتی اکاٹھیا واڑ کی کرانتی۔" کلسے نے فوراً بیچ میں پڑ کے دونوں کو جھڑک دیا۔
"تجھے جو کرنا ہے کر پھر اِدھر سے کھسک۔ موج میلہ ٹھکانے پر اچھا لگنے کا ہے۔" کلسے نے گانجھے کی طرف رخ پھیرتے ہوئے اُسے بھی جھڑکا۔ قیدیوں کی نگہبانی کرنے والوں میں کلسا کی ممتاز حیثیت نظر آئی تھی۔ اُس کی نرم گوئی رعب و دبدبے میں حائل نہ تھی۔
گانجھے کی جسمانی ساخت اور چہرے کے نقوش نوٹنکی کے مسخروں جیسے تھے، یہ معمہ ہی رہا ہے کہ نسانی خدوخال مزاج کے تابع ہوتے ہیں، یا مزاج خدوخال استوار کرتا

ہے۔ بہ ہر حال، صورتوں کی آئینہ گری کا اقرار سبھی نے کیا ہے۔ پست قد، غیر متناسب بڑا سر، اُبلتی آنکھیں، سیاہ رنگ، بھدے ہونٹ اور لڑھکتی ہوئی چال کے مالک یہ مسخرے سرکسی اور نوٹنکیوں کا جزو لاینفک ہوتے ہیں۔ انھیں ٹھنگو، چھوٹا، بغلی، طفیلیہ، پستہ، ناٹا اور اس طرح کے دیگر ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ کہیں سے گزر جائیں تو راہ گیروں کی نظریں لطف کشید کرتی ہیں، دبا دبا استہزا تو کہیں واشگاف ٹھٹھول اِن کے ہم راہ چلتا ہے کہیں بیٹھ جائیں تو تماشا ج جاتا ہے۔ ان میں اور میر زادیوں میں سرمو ہی فرق ہوتا ہے۔ طوائف کا دھندا بالا خانے میں بیٹھ کے چلتا ہے۔ ہزار حیلوں سے تماش بین سیڑھیاں چڑھتے ہیں، لیکن یہ وہ خوش نصیب ہیں جن کے لیے بستیاں، گانو، شہر، گلی کوچے، دنیا کا چپہ چپہ بالا خانہ ہے۔ سوائے اُس کھولی کے جسے اندر سے بند کر کے یہ خود کنڈی لگالیں۔ ورنہ یہ، تکلیں یا نا تکلیں، پائی دو پائی، چونی اٹھنی، حتیٰ کہ روپیہ بھی انھیں دیا جاتا ہے کہ کارِ خیر ہے، گویہ خالق نے کوئی غلطی کر دی ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ گا تجھے کے میدان میں رونما ہوتے ہی دائیں بائیں آگے پیچھے سے پہریدار کشاں کشاں سارس کے گرد کھنچے چلے آئے تھے۔ درختوں کی اوٹ سے بھی نکل نکل کے مسلح افراد آ رہے تھے کہ جھگیٹے کی کوئی صدا نہیں ہوا کرتی، اس کی پُر کشش آوازیں محسوس کر لی جاتی ہیں۔ بس در و دیوار اس سے مستثنیٰ ہیں، اور غوں تو سبھی کے خود رو ہوتے ہیں، کیا انسان تو کیا جان ور!

میں ٹھگنے کے قریب جا بیٹھنے کی تدبیر سوچ رہا تھا۔ ہم ایک ناگہانی مصیبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ خاک بداماں جھٹکنے سے مُنھ پہ ہی آ گئی تھی۔ اب تک پیش آنے والے حالات سے یہ واضح تھا کہ باروٹیہ اور اُس کا گروہ کاٹھیاواڑی مسافر کے بیان سے کہیں زیادہ منظم اور سریع الحرکت ہے۔ کاٹھیاواڑ کے ساحل پہ برطانوی بحری جہاز کا اغوا ہر اعتبار سے ایک غیر معمولی کام تھا۔ اب تک پورے ہندستان کی مشنیری میں کھلبلی مچ گئی ہوگی۔ ایک ایک انگریز کی بازیابی تک وائسرائے کی جان پر بن آئے گی۔ بمبئی میں شکلا بابو کے ہاں اخبارات و رسائل پڑھنے کے مواقع بہم رہتے تھے۔ اُن دنوں میں نے پڑھا تھا کہ ہندستان میں ملازمت کے دوران ہلاک یا لاپتا ہونے والے انگریزوں سے متعلق خبریں شائع کرنے کی برطانیہ میں پابندی تھی۔ اخبار کے مطابق انگلستان میں غیر قوموں پر حکومت کا فلسفہ رد کیا جا رہا تھا۔ وہاں کے دانش ور اور اہلِ سخن ایسی مہم جوئیوں کو بے سود اور وقت کا زیاں قرار دے رہے تھے۔ ایسے حالات میں طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے کم و بیش نو افراد کا اغوا قیامت خیز ہی تھا۔ نہ صرف دلّی کی باج گزار کاٹھیاواڑ ریاستیں ان کی بازیابی کے لیے بھرپور وسائل جھونک دیں گی، بل کہ اس کارروائی میں انگریز براہِ راست ملوث ہو سکتے تھے۔ کاٹھیاواڑی مسافر کے مطابق اگر واقعی باروٹیہ اپنے بیٹے کا حصول چاہتا ہے۔ تو صورت [illegible] پریشان کن نہیں تھی۔ ان اغوا زدگان کے تباد[illegible] انگریزوں کو باروٹیہ کے سو پوت بھی دینے پڑتے تو وہ بہ رضا و رغبت ایسا کرتے، لیکن اگر معاملہ کچھ اور تھا تو صورتِ حال تشویش ناک تھی۔ کشتیوں کے ایک پورے شہر کے ساتھ جہاز پر دھاوا بولنا اور اس آسانی سے انگریز افسران کو بوریوں میں بھر کے چھکڑوں پر روانہ کر دینا زور آوری کا بے وقوفانہ گھمنڈ تھا یا پھر باروٹیہ کو ریاست کی پشت پناہی حاصل تھی۔ پوری بندرا انسانوں سے لدے ہوئے چالیس یا پچاس چھکڑوں کا دھڑلے اور بنا روک ٹوک کے دن بھر سفر کرنا ناممکن بات تھی، لیکن ایک بات میں بھول رہا تھا، اتنا بڑا واقعہ لامحالہ ایک طویل منصوبہ بندی کا متقاضی تھا۔ پہلے جہاز کا عملہ یقیناً اس واقعے میں ملوث تھا۔ جس وقت باروٹیہ کے کرائے کار جہاز پہ چڑھے تھے تب تک شاید جہاز انتظامیہ کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ مسلح محافظوں سے نامعلوم اور پُر اسرار طریقے سے نمٹا گیا تھا۔ یقیناً باروٹیہ کے آدمیوں کی بہت بڑی تعداد جہاز میں پہلے ہی سے سوار تھی جن میں بارسوخ افراد بھی شامل تھے۔ جو جہاز کی مکمل جان کاری رکھتے تھے۔ ایسی رسائی راتوں رات کا کھیل تماشا نہیں تھی۔ دو چار روز یا مہینا نہیں، برسوں پہلے قدم اُٹھایا گیا تھا۔ ریاست کی لاعلمی میں کشتیوں کی اتنی بڑی نقل و حرکت ناممکن سی بات تھی۔ نوربان بھی اپنے لب و لہجے سے گروہ کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے کی بات ہے اتنی منظم کامیابی میں اجرتی چھکڑوں کی جگہ موجود نہیں تھی۔ چھکڑے اُن کے اپنے ہی تھے کوئی لٹیرا یا ڈاکو اتنے وسائل مہیا نہیں کر سکتا تھا۔ معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ یہاں قیام عارضی ہے بس کچھ ستا کے چل دیا جائے گا۔ جھنڈ کے دائیں بائیں سے اُن کی آمد و رفت متواتر تھی۔ یہاں صرف [illegible]و قیدی رکھے گئے تھے۔ قافلے کے کرتا دھرتاؤں، انگریز [illegible] کا پڑاؤ ساتھ ہی کہیں تھا۔ ہمیں چھکڑے سے [illegible] گئے کئی گھنٹے ہو گئے تھے۔ انگریز قیدی خوف سے [illegible] ہوئے تھے۔ ان میں سے بیش تر پہلی مرتبہ [illegible] جا رہے تھے۔ اپنی راج بانی میں ایسے سلوک کی توقع انھیں بالکل نہیں تھی۔ نفرت سے بھبکتی، سلگتی انگارہ آنکھیں مسلسل اُن کا طواف کر رہی تھیں۔ قریب سے گزرنے والے تھوکنے اور لات مارنے سے نہیں چوکتے تھے۔ انھوں نے ہمیں توجہ کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ البتہ ہمیں دیکھتے ہوئے اُن کی آنکھوں میں الجھن اور ٹیڑھ پیدا ہو جاتی اور زاویۂ نگاہ تیزی سے تبدیل کر لیا جاتا جیسے دیکھ کر چوری کر لی ہو۔ صاف لگتا اُن کے لیے انگریز قیدیوں کے درمیان ہماری موجودگی اچنبھا تھی۔ ہم اس منظرنامے میں موزوں نہیں تھے۔ اہم نہیں تھے، اور قاعدہ ہے کہ اہمیت ہی آپ کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور زندہ رکھتی ہے، باروٹیہ نے ہمیں انگریزوں کا کوئی اہم آلۂ کار یا گماشتہ سمجھ کے جہاز سے اُٹھوالیا تھا، لیکن جب اُس پہ اپنی غلطی کا حال کھلتا، جو کہ جلد یا بہ دیر کھلنا ہی تھا۔ تو کیا ہمیں عزت و احترام سے رخصت کر دیتا؟ انگریز کے گم شدہ ہونے کی چھاپ ہی ہماری اہمیت تھی۔ ہماری حیثیت پر شک و شبہ جہاز پر ہی ہمیں فائدہ پہنچا سکتا تھا۔ اب ہمیں چھوڑے جانے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ تاوقتیکہ انگریزوں کا کوئی فیصلہ نہ ہو جائے، جو گروہ اپنے گرفتار ہونے والے ساتھیوں کو قتل کرنے کی شہرت رکھتا ہو اُس کی طرف سے قیدیوں کو رہا کرنے کی روایت یقیناً نہیں ہوگی۔ ہر چند باروٹیہ کے آدمی جہاز پہ ہندستانی مسافروں سے خوش روی سے پیش آئے تھے۔ ہمیں ہمارے چاقو تک لوٹا دیے گئے تھے لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ ہمیں رسیوں سے جکڑ کے اور بوریوں میں ٹھونس کے یہاں تک لایا گیا تھا۔ ظاہر ہے آنے والا وقت ہمارے لیے کسی طور پر اچھا نہیں تھا۔ ٹھگنا اس خوش گمانی میں بیٹھا تھا کہ وہ پُرسکون نظر آ رہا ہے۔ مجھ سے نظریں چار ہوتے ہی وہ بے فکری سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا۔ یہ زورا اور جمرو کی طرف کوئی فقرہ اچھال دیتا، لیکن آنکھوں کی سوزش کو کوئی کیا کہے، جو دل کی سوختگی کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اب کے نظریں چار ہوئیں تو ٹھگنے نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے وہیں تک کے بیٹھے رہنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ ہمیشہ سے ایسا ہی کرتا ہے۔ "جنٹلمین! وائسرائے ہند تشریف لائے ہیں!" گا تجھے نے گھن گرج سے لے اٹھائی تھی۔ سَر کا مختصر سا سینہ مرغے کی طرح باہر نکلا ہوا تھا۔ ایک تازہ ٹہنی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ اُس کے خاکی کرتے کا دامن سفید چوڑی دار پاجامے میں روپوش ہو گیا تھا اُس کی توند خاصی مضحکہ خیز تھی، مانو پیٹ کے آگے بڑی گیند چپکا دی ہو۔ وہ وائسرائے ہند بن کے تشریف لا چکا تھا، آنکھیں پیشانی پر تنی ہوئیں، ٹھوڑی اوپر اٹھی ہوئی، پین ہرا اُس کے پیچھے مٹک کے کھڑا تھا۔

"وائسرائے کی پتلون میں ناڑا ہے۔" کسی نے ہانک لگائی۔ سب نے مُنھ پھاڑ کے قہقہہ لگایا۔

"ایک منک کا وائسرائے... ہاہاہا۔" ایک جیسے بالوں

والے نے تان اٹھائی۔ وہ پیٹ پکڑ کے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ واقعی اُسے دیکھ کے مسکراہٹ کلبلانے لگی تھی، چہروں پر معصومیت بھی کوئی چیز ہے۔ گانجھا اس فقرے بازی سے کچھ ورتن گیا۔ اُس نے نپے تلے قدم اٹھائے اور پہلے قیدی کے پاس لڑھکتا ہوا پہنچ گیا۔ بین بارا اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔

”ٹم واٹر منگتا؟“ اُس نے انگریز کے چہرے پر شجنی بکائی اور حیرت انگیز پھرتی سے اچھل کے ہوا میں لوٹ گیا۔ کرتب یہ تھا کہ قلابازی کے دوران شجنی انگریز کی تھوڑی پر ہی ٹکی رہی، گویا اُس نے اپنا بازو کاٹ کے وہیں رکھ دیا، اور قلابازی لگا کے پھر بازو سے جڑ گیا ہو۔ انگریز قیدی بھی حیرت سے آنکھیں پٹپٹانے لگا۔ اُدھر تماش بینوں نے سیٹیوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اچھل اچھل کے اور چیخ چیخ کے دادو تحسین کے ڈونگرے برسائے جانے لگے۔ سکوت کی ہدایت دینے والا کلب بھی اُن میں شامل تھا۔ گانجے کی حالت دیدنی تھی وہ فخر و نخوت سے پھٹ جا رہا تھا۔ اُس نے اُسے پانی نہیں پلایا، بل کہ ایک قدم بڑھا کے دوسرے کے پاس پہنچ گیا۔ ”ٹم شریف آدمی لگتا ہے۔ ہم ٹم کو پانی جرور پلائے گا۔“ گانجھے نے دیدے نچاتے ہوئے کہا۔ اُس کے کولھے غیر محسوس انداز میں مٹک رہے تھے۔ اور لہجے میں اچانک بے پناہ لوچ، بلا کا درد اور غضب سے بے پناہ ہم دردی سمٹ آئی تھی۔ پھر اُس نے جھپٹ کے بین بارے سے مٹی کا کٹورا پکڑا۔ ”اس میں پانی ڈالو ظالم لوگ! ٹم لوگ کو شرم نہیں آئی، اتنا پیارے لوگاں کو پانی نہیں پلاتا۔“

بین بارے نے مسکراتے ہوئے مشک کی ڈوری ذرا ڈھیلی کر کے ڈھو برے میں پانی بھر دیا۔ بہت دور سے پانی کی مترنم چھن چھناہٹ میرے کانوں کو بھلی لگی۔ انگریز کی آنکھوں میں پانی بھر آیا وہ کپکپاتے لرزتے ہونٹوں سے کٹورے کو تک رہا تھا۔ ”ٹم اچھا دِکھتا ہے، منہ کھولو ہم خود ٹم کو پانی پلائے گا۔“ گانجے نے کٹورا اُس کے منہ کے قریب لے جاتے ہوئے کہا۔ کٹورا قریب آتے دیکھ کے اُس نے

جھٹ منہ کھولا۔ گانجھا اچانک دھڑام سے زمین پر گرا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا، مگر کٹورا اُس کے دائیں ہاتھ کی انگلی پر ساکت و قائم تھا، جس سے پانی کا قطرہ بھی نہ چھلکا تھا۔ انگلی کی نوک پر کٹورا تھامے رکھنا کوئی کمال نہ تھا، لیکن اس طرح تڑپتے ہوئے پیالے کو استقرار بخشنا واقعی کمال تھا۔ اِس مرتبہ سیٹیوں کے شور میں پورا جنگل شریک ہو گیا تھا۔ وہ اچھل اچھل کے چیخ رہے تھے۔ بعض ایک ہاتھ کولھے پر اور ایک گردن پر جمائے ٹھمکے لگا رہے تھے۔ وہ اچھل اچھل کے انگریزوں کو چڑا رہے تھے جو انھیں سکتے کے عالم میں ہونقوں کی طرح تک رہے تھے۔ بعض کے چہرے آنسوؤں سے تر تھے۔ گانجھے کے زمین سے اُٹھتے ہی ماحول ٹھنڈا پڑ گیا۔ گانجھا تیسرے کی جانب بڑھ گیا۔ پھر وہ اس طرح مختلف کرتب دکھاتا ہوا چوتھے، پانچویں سے آگے کی طرف بڑھتا گیا، لیکن اُ... کسی کے حلق میں ایک قطرہ بھی نہ ٹپکایا تھا۔ پیا... لے ماروں نے اُس کی طرف امید بھری نظروں سے تکنا چھوڑ دیا تھا، لیکن وہ مستی اور جنون میں اچھلتا کودتا بڑھتا چلا آ رہا تھا کہ جتھل تک پہنچ گیا۔ میرے جسم پر باریک باریک چیونٹیاں سنسنانے لگیں، زورا اور جمرو کے نتھنے پھڑکتے دکھائی دے رہے تھے۔ جتھل ویسے ہی بیٹھا تھا۔ وہی خالی اور لا تعلق چہرہ، کسے خبر تھی کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

”اے دیس والا بابو ہے نا! ابھی تیرے کو پانی کیا سربت پلانے کا ہے۔“ اُس نے کٹورا گھماتے ہوئے ہوا میں اچھالا اور واپس تھام لیا۔ اُس کے ہاتھوں سے برسوں کی ریاضت جھلکتی تھی۔

”ادھری پیاس نہیں ہے رے... آگے جا۔“ جتھل کے لب ہلے اور میرا سانس بند ہونے لگا۔

”نہ رے نہ بھگوان! ابھی بابو کو گنگا جل پلانے کا ہے۔“ اُس نے پیالہ جتھل کے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ جتھل کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ میرا دل بے طرح

سے ڈولنے لگا تھا۔ یہاں معمولی سی بھی گڑبڑ موت کا سیدھا پیغام بن سکتی تھی، لیکن میں اپنی آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میرے ہاتھ چاقو پر جم گئے۔

”دیس والے ناراج ہیں۔“ آخری لفظ ادا کرتے ہوئے اُس کا لوچ دار لہجہ غصّے میں مدغم سا ہو گیا۔ ”چل بابو! تو بھی کیا یاد کرنے کا ہے۔ منہ کھول سا باس!“ اُس نے پیالہ ہونٹوں کے بالکل قریب کر دیا۔ اُس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس قطار میں کوئی ایسی کج روی کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے، اور کچھ انگریزوں کی کھکھیاہٹ نے اُس کی آتشِ شوق مزید بڑھا دی تھی۔ وہ ہٹیلا ہو گیا۔ ”سا باس پانی پی۔“ بیٹھے ہوئے جتھل سے اُس کا قد کوئی سوت دو سوت بھر ہی اوپر ہو گا۔ میں دل میں دعا کرنے لگا کہ جتھل منہ کھول کے تھوڑی ہتک برداشت کر لے، مگر اُس پستہ قیامت نے لپک کے جتھل کی گدّی پر تھپڑ جمایا اور اُس کے بال پکڑ کے پیالے لگی اور جھٹکا دیا۔

”تیری ماں کی... سالے... اپن کے استاد پر ہاتھ ڈالتا ہے۔“ زورا شیر کی دھاڑا اور بجلی کی طرح تڑپا تھا۔ اُس پر ہاتھ جما کے اُسے پرے دھکیل دیا۔ گانجھا گیند کی طرح گھسٹتا ہوا کئی فٹ دور جا گرا تھا۔ اس سے پیش تر جتھل اُس کا ہاتھ پکڑتا زورا چاقو لہراتا، تڑپتا، بل کھاتا کھڑا ہو گیا تھا۔ ”ابھی اپن کھڑا ہے اِدھر... آ و سالو... کوئی مائی کا لال ہے تو آوے اِدھر، لگا دے اپن کے استاد کو ہاتھ... اپن کاٹ کے پھینک دوں گا۔ تم سمجھتا کیا ہے حرامی لوگ! اپن ان سوروں کی طرح ہے؟“ زورا چیخ چنگھاڑ رہا تھا۔ غیظ و غضب سے اُس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ کلسا پریشان نظروں سے زورا کو دیکھ رہا تھا۔ باقی مجمع کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یکا یک یہ کیا ہو گیا۔ میں نے چاقو جیب سے نکال کے ہاتھ میں دبا لیا تھا، بس کھٹکا دبا کے کھولنے کی دیر تھی۔ مجھے زورا اور جمرو کی طرف سے اِسی بات کا ڈر تھا۔ جتھل کی صورت ویسے ہی تھی، تاثرات سے عاری، مگر آنکھیں اُس کے قابو سے باہر ہو رہی تھیں۔ ہمارے اِرد گرد

سیکڑوں کی تعداد میں بندوقیں اور طمنچے موجود تھے۔ یہاں چاقو کا بھلا کیا کام! اس سے پہلے کہ کہیں سے گولی چلتی یا باروٹیہ کے آدمی کوئی جوابی قدم اُٹھاتے۔ چشم زدن میں جتھل چیتے کی طرح اچھلا اور زورا پر جا پڑا۔

”ادھر استاد تمھارا بجڑوا بیٹھا ہے۔ اُس کو زندہ سمجھ لیا ہے رے!“ جتھل نے زورا کو لاتوں اور ٹھڈوں پر رکھ لیا، ”صرف چاقو نہیں سکھائے تجھے... چاقو چلانے آ گیا... یہ تیرے باپ ہیں، رشتے دار ہیں۔ حرامی دوسرے بھی مروائے گا۔“

جتھل اُسے بری طرح رگید رہا تھا۔ لاتوں ٹھڈوں اور ہاتھوں سے اُس کو تھپڑ رہا تھا، اور زورا تو وارفتگی و عقیدت میں بے سدھ ہوا جا رہا تھا، گویا شادیِ مرگ سے لرز رہا ہو۔ اُس نے چاقو پھینک دیا تھا۔ اُس نے ایک سسکاری نہیں بھری۔ مجمع اُسے بھی تماشا سمجھ کے دیکھ رہا تھا۔ انھیں ہو رہی بے کسی کا اپنے وجود کی طرح ہی یقین تھا اور کچھ جتھل اُسے بے طرح کے جنون سے پیٹ رہا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ ہانپتے ہوئے رکا۔ زورا نے تڑپ کے اُس کے پانو پکڑ لیے۔ اور بچوں کی طرح بلک بلک کے رونے لگا۔ ”استاد ابھی رکتا کیوں ہے؟ ماں قسم! اکھا مزا آ رہا تھا، ابھی اپن کی آنکھیں نوچ دے استاد... اپن کا بھیجا پھوڑ دے استاد! یہ سالا تیرے کو لیے دیکھتا نہیں، منگتا۔“ زورا مچل جا رہا تھا، اور دیوانوں کی طرح جتھل کے قدموں سے لپٹا انھیں چوم رہا تھا۔

جتھل کی صورت پر زردی کھنڈ گئی تھی، کوئی لمحہ تھا جو ایک سایہ اُس کے آر پار ہوا، اور پھر وہی لاتعلقی، وہی بے اعتنائی۔ وہ زور زور سے سانس بھر رہا تھا۔ اُس کے اندر

سب کچھ نہیں تھا۔ کریدی ہوئی راکھ کا ڈھیر تھا، جس نے انگارے کو نہ جانے کہاں چھپایا تھا۔ عجیب نظروں سے جھل نے زورا کو گھورا۔ ان میں بہت کچھ تھا بھی اور بالکل خالی بھی تھیں۔ "زندہ ہیں، مرے نہیں رے!" اُس نے ایک جھٹکے سے زورا سے ہاتھ چھڑوایا اور اپنی جگہ آ کے بیٹھ گیا۔ مجمع کی حیرانی اور سکوت ہویدا ہو گیا۔ اُن کے چہروں سے خشونت تو گویا نوچ لی گئی تھی۔ وہ سب زورا کو ہمدردی سے دیکھ رہے تھے۔ یہ وہی زورا تھا جو انہیں کچھ لمحے قبل خنجر لہرا لہرا کے للکار رہا تھا۔ چند لمحوں پہلے میں نے دو چار کو مار کے مرنے کا یقین کر لیا تھا، لیکن اب اُن کے چہروں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قہر و غضب ٹل چکا ہے۔ یہ جھل ہی کا کرشمہ تھا۔ بقول جھل کے دماغ کی سرخی ہاتھ پیروں کی سچائی نگل جاتی ہے۔ مشق اور ورزش جسم کی نہیں دماغ کی ہوتی ہے۔

وہ آپس میں بھنبھنانے لگے تو کلسا کی آواز آئی، "اِدھر سے اُٹھنے کا ہے۔ ابھی استاد کی گود میں بیٹھو۔" وہ زورا سے مخاطب تھا۔ اُس کی آواز میں نرمی اور پچکار تھی۔ پھر سبھی کے دوستانہ قہقہے اُمڈ پڑے۔ اُن میں سے بعض ہنستے ہنستے پیٹ پکڑ کے دہرے ہو گئے۔ پھر تو جیسے قہقہوں کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ وہ بڑھ چڑھ کے زور و شور سے چلّانے لگے۔ کافی دیر یہ ہنسی گویائی جاری رہی۔ انگریز قیدی مسلسل حیرانی سے تک رہے تھے، وہ یہ معاملہ سمجھ نہیں پائے تھے۔ معاً ایک گیند لڑھکتی ہوئی آئی اور زورا سے لپٹ گئی۔ وہ گانجھ تھا، وہ زورا سے لپٹ کے بلکنے لگا۔ "اے استاد! تم تو ایک دم اصیل گھوڑا لگنے کا ہے۔ سیو کی سوگندھ! تم چاقو لہرا کے اپنا دل لوٹ لیا۔ اِدھر جندگی گجرنے کا ہے۔ استاد کی سیو کا ایسا نیارا پن نہیں دیکھنے کا ہے۔ ابھی سو گولی چلتا میرے اوپر۔"

"واہ استاد نے کیسا سیر پلا ہے۔" گانجھے نے زورا کی گردن میں ہاتھ ڈالا اور اُس کی پیشانی چوم لی۔ زورا، جو اُسے مسلسل گھور رہا تھا، یک دم مسکرا دیا۔ اِس مرتبہ سیٹیوں کی چیخ پکار کا شور درختوں کے پتے پتے سے اُمڈ پڑا تھا۔

"ارے گنجوا! گانجھے نے عاشقی معشوقی شروع کر دی ہے۔" کسی نے راگ چھیڑا اور ٹھمکے لگنے شروع ہو گئے۔ کچھ دیر یہ شور و غل جاری رہا۔ پن بارے نے مشک کا مُنہ کھول دیا۔ اُس نے قیدیوں کو کٹورا بھر بھر کے پانی پلانا شروع کر دیا تھا۔ کئی پہروں کے پیاسے بدحواسی سے پانی پی رہے تھے۔ لرزتے اور پھڑپھڑاتے ہونٹ آدھا گرا رہے اور آدھا حلق میں انڈیل رہے تھے۔ آخر پروفیسر تھامپسن کو بھی پانی پلا دیا گیا۔ وہ اب تک نڈھال پڑے ہوئے تھے۔ میجر برنارڈ خلا میں تک رہا تھا۔ پانی پی کے ٹونی کے چہرے پر رونق لوٹ آئی تھی۔ جھل کو گانجھے نے اپنے ہاتھوں سے پانی پلایا، اور زورا سے لے کے اُس کا بچا ہوا پانی خود پیا۔ انگریز قیدیوں کے چہروں پر بھی رونق اُبھرنے لگی تھی۔ الاؤ والوں نے ہرن بھون لیے تھے۔ بھنے ہوئے ٹکڑوں کو مزید ٹکڑے کر کے پہرے داروں میں تقسیم کیے جا رہے تھے۔ اشتہا انگیز خوشبو تیزی سے ہمارے اردگرد پھیل رہی تھی۔ پھر کلسا کی ہدایت پر ایک ایک ٹکڑا قیدیوں میں بھی تقسیم کیا جانے لگا۔ قدرے بڑا اور اچھی طرح سِکا ہوا ٹکڑا دیا گیا۔ گوشت باقاعدہ مسالا لگا کے بھونا گیا تھا۔ اُدھر کچھ نے سوڈے کی بوتلیں کھول لی تھیں۔ وہ ٹکڑیوں میں بیٹھ کے گوشت چبا رہے تھے، سوڈے کے جھاگ ایک دوسرے پر اُڑا رہے تھے۔ میرے قریب سے کلسا گزرا تو میں نے اُس سے جھل کے قریب جا بیٹھنے کی اجازت طلب کی۔ "ابھی زیادہ مستی سوجھنے کا ہے، اِدھر ہی بیٹھ، چلنے کا ہے!" اُس نے درشتی سے مجھے جھڑک دیا اور الاؤ کی طرف چلا گیا۔ کافی دیر یوں ہی گزر گئی، معاً باردٹیہ کی نیابت کرنے والا موٹا نمودار ہوا۔ وہ تازہ دم دکھائی دے رہا تھا اُسے دیکھتے ہی کلسا دوڑتا ہوا، اُس کے قریب چلا گیا۔ شاید اُس نے کلسا کو کوچ کرنے کی ہدایت دے دی تھیں۔ موٹا جہاں سے آیا تھا وہاں واپس چلا گیا۔ کلسا دیگر آدمیوں کو ہدایت دینے میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ہمارے ہاتھ دوبارہ پشت پر باندھ دیے گئے۔

دائیں بائیں مشعل برداروں اور بندوق برداروں کے جلو میں ہمیں جھنڈ سے باہر لے جایا گیا تو اندازہ ہوا کہ ہم تقریباً پانچ سو افراد کے نرغے میں گھرے ہوئے تھے۔ جھنڈ میں فرلانگ بھر چلنے کے بعد ایک کھلا میدان آ گیا تھا۔ یہ رات کا غالباً تیسرا پہر تھا۔ ستاروں کی ٹمٹماہٹ میں اردگرد کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی چھکڑوں کی قطار بھی کہیں سے چلی ہوئی وہاں پہنچ رہی تھی۔ یعنی بوریوں میں بند ہونے کا مرحلہ دوبارہ شروع ہونے والا تھا۔ یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ انگریزوں کو زندہ ہی رکھنا چاہتے تھے، ورنہ رسیوں باندھ کے بوری میں ٹھونسنا، چھکڑوں میں لادنا، پھر اتارنا، رسیاں کھولنا اور اب دوبارہ باندھنا کار آسان نہیں تھا۔ اِس مرتبہ پیروں کے ساتھ مُنہ پر بھی کپڑا باندھا گیا۔ شاید وہ اب کسی ایسی جگہ سے گزرنے والے تھے جہاں اُن کے لیے خطرہ تھا۔ رسیاں باندھنے والے گنتی کر رہے تھے۔ اندھیرے میں کچھ دور مزید بتیاں جل رہی تھیں۔ شاید وہاں دوسرے پڑاؤ والے سوار ہو رہے جا رہے تھے۔ تیسرے چھکڑے پر ہی میری باری آ گئی۔ جھل، زورا، جبرو اور میں پچھلی طرف تھے۔ جسم کا پھوڑا اب کچھ کم دکھ رہا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد میری بوری پھر چھکڑے میں پھینک دی گئی۔ پھر کسی نے اُسے چھکڑے کے بغلی تختے سے جما دیا۔ دو مزید بوریاں پٹخے جانے کے بعد چھکڑا چل پڑا۔ اِس چھکڑے کے پہیے ہموار تھے اور چوبیں بھی مضبوطی سے ٹھکی ہوئی تھیں۔ اِس میں "چرخ چوں" کا شور نہ ہونے کے برابر تھا۔ خوش قسمتی سے بوری کا روزن عین میرے مُنہ پر ہی تھا، ورنہ مُنہ پر کسی پٹی کی وجہ سے اُسے موزوں کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ بیلوں کے سم تک سانیت اور توازن سے کھرکھری زمین پر پڑ رہے تھے، جس سے مدھر آواز پیدا ہو رہی تھی۔ کسے خبر تھی کہ اب یہ سفر کتنا طویل تھا اور کب تک یونہی چھکڑے کے جھٹکے سہنے تھے۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ قسمت کی یاوری سے ایک مرتبہ ہم ان کے چنگل سے نکل جائیں، میں پھر گھر سے نکلنے کا نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے میں بہت خوف ناک تجربے سے گزرا تھا۔ جھل نے ایک داؤ کھیلا تھا جو کارگر ہوا۔ بہت ممکن تھا کہ جھل کو ایسا موقع بھی نہ ملتا، پہلے ہی گولی چل جاتی، یہ وہ ٹھٹھول مذاق میں زورا اور جھل دونوں ہی کو بھون ڈالتے، لیکن میں بھی تیار تھا۔ کوئی نہ مرتا تو خنجر سے اپنا سینہ خود کھول لیتا۔ اب مزید کوئی نہیں۔ جھل ہی خالی نہیں ہوا، مجھ میں بھی سکت نہیں تھی، میرے سینے میں بھی خلا بھرتا جا رہا تھا۔ جھل نہیں مانتا تو مجھے ہی بات جانا چاہیے۔ گورا کا تو صرف میں سودائی تھا، اُس کے لیے فقط میری جان تھی، کوئی اور کیوں سولی چڑھے۔ زریں بھی تو تھی، وہ بھی تو کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ جھل زریں کی خوشی میں پگھل جائے گا۔ مجھے جھل پر طیش آنے لگا۔ باردٹیہ کے چنگل سے نکلنے کی دیر تھی۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب بہت ہو چکی، مجھی کو کچھ کرنا ہو گا۔

دن چڑھ آیا تھا۔ چھکڑا رات سے مسلسل چل رہا تھا۔ میرے پڑوس کے بوری نشیں چھکڑے کے چلتے ہی خراٹے مارنے لگے تھے۔ جن کی خرخراہٹ اب تک جاری تھی۔ میں تختے کی درز سے باہر کا منظر دیکھنے میں مصروف تھا۔ باجرے کی کچی فصلیں دُور تک نظر آ رہی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بستیاں گزرتی جا رہی تھیں۔ حیرت انگیز طور پر چھکڑے بغیر کسی روک ٹوک کے اور اطمینان سے رواں دواں تھے، حالانکہ اغوا کی اتنی جارحانہ واردات کے بعد ریاستی پولیس کی جگہ جگہ ناکہ بندی ہونی چاہیے تھی۔ چہ جائیکہ چھکڑوں کی قطاریں گزر جائیں۔ باہر کے منظر میں انسانی چہل پہل کا اضافہ نظر آنے لگا، شاید کوئی بڑا قصبہ یا شہر نزدیک تھا۔ کچھ ہی دیر میں چھکڑے کی رفتار سست ہو گئی، کچے پکے مکانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ صرف اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ ہم کاٹھیاواڑ میں ہیں کس ریاست کس علاقے، قصبے میں ہیں اس کا قطعاً اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ دن چڑھتے کے ساتھ ساتھ گرمی کی

حدت میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ میرا پورا جسم پسینے سے تر بتر تھا۔ چھکڑا لاری اڈے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ یہ کچی پکی سڑک اس قصبے یا شہر میں داخل ہوئے بغیر ہی دائیں جانب مڑ رہی تھی۔ اڈے کے اکلوتے سائبان کے نیچے سرخ رنگ کی لاری کھڑی تھی، اور اس کے اکلوتے دروازے سے لوگ سوار ہو رہے تھے۔ اجلے لباس اور ہنستے مسکراتے چہروں کے ساتھ ایک بڑھیا دروازے پر رک کے کھڑی ہو گئی۔ وہ کچھ پڑھ کے پھونک رہی تھی۔ جھاڑ پھونک کے بعد نہ جانے کہاں سے اس نے ایک کبوتر نکالا اور فضا میں چھوڑ دیا۔ اور لرزتی ہوئی لاری میں سوار ہو گئی۔ پھر اچانک میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ کوندے سے لپک لپک کے میرے چہرے پر پڑنے لگے۔ شاید مجھے وہم ہوا تھا۔ میں نے جھپٹ کے دیکھا۔ وہ صد فی صد وہی تھے۔ انھیں تو میں کروڑوں کے ہجوم میں شناخت کر سکتا تھا۔ مجھے کوئی دھوکا اور غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی، وہ مولوی صاحب تھے! مولوی محمد شفیق خان! ان کے ہاتھ میں صندوقچہ تھا۔ اُن کے بائیں ساتھ ایک برقع پوش لرز رہی تھی۔ اُس کے سر پر ریشمی سرخ رنگ کا مخملیں جزدان تھا۔ وہی تھی وہی تھی، وہی تو تھی، وہی قد و قامت، وہی سراپائے گلِ ناز، وہی خیالِ دل ستاں، وہی اندازِ جاں، یہ خواب نہیں ہے، یہ تو ہو بہو وہی ہے۔ میں تو برقع کے آر پار دیکھ سکتا تھا۔ "کورا! ٹھہرو، رکو میں آ رہا ہوں! میں نے چیخ کے اُسے پکارنا چاہا، مگر مجھے احساس ہوا کہ میرا منہ زنبوروں سے بری طرح جکڑا ہوا ہے، اور چھکڑا اس منظر کو دھندلانے کے لیے سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ میرا سانس رک چکا تھا۔ دل سینہ توڑ کے کہیں باہر دھڑک رہا۔ "مولوی صاحب خدا کے لیے رک جائیے!" میں نے بری طرح تڑپتے ہوئے چیخنا چاہا، مگر سوائے معمولی سی کھرکھراہٹ کے بوری سے باہر کچھ نہ نکلا۔ پھر مولوی صاحب نے اشارے سے اُسے لاری میں چڑھنے کو کہا۔ اُس نے شہزادیوں کی سی متانت اور وقار سے یاقوتی پاؤں لاری کے قدمچے پر رکھا۔ میں نے اپنا سر چھکڑے پر پٹخنا شروع کر دیا۔ میں وحشت اور جنون سے فٹ فٹ بھر اچھل رہا تھا۔ "شخص ب کہاں ہے تو؟ میں کورا کو تلاش کرنے کی ہیبت نہیں رکھتا تھا نا! تو تو خرم خاں ہے۔ کلکتے کا نامی گرامی استاد شخص کہاں ہے تو؟ "شخص میرے ساتھ خاک نوردی کا حق ادا کر۔ شخص یہی ہیں مولوی شفیق خان صاحب! اور اُن کے ساتھ... اُن کے ساتھ۔"

میں رو رہا تھا، گھگھیا رہا تھا، بری طرح چیخ رہا تھا، اور پوری قوت سے اپنا سر چھکڑے کے تختے پر پٹخ رہا تھا، لیکن آوازیں بوری ہی میں گھٹ گھٹ کے مر رہی تھیں، "او کوئی تو روکے، وہ میری کورا ہے! مولوی صاحب کے پاس میری امانت ہے! خبردار مولوی شفیق احمد خان خبردار! جو اب تم نے کورا پر ملکیت جتائی... چھکڑے والے میری بات سنو! میرے پاس جواہرات سے بھرے صندوق ہیں... وہ سب تم لے لو... خدا کے لیے تم ہی چھکڑا روک دو۔" لیکن چھکڑا تو جیسے میری فریادوں سے سرپٹ دوڑنے لگا تھا۔ "کوئی روکے!" میری ہچکیاں بندھ رہی تھیں۔ آخر کار مولوی صاحب بھی لاری میں غائب ہو گئے۔ مجھے اپنا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اُس کے مرمریں ہاتھ، خم دار لمبی انگلیاں، لاری کے قدمچے پر جمی ہوئی دودھیا پنڈلیاں، قد و قامت اور اس متاعِ جاں کے سوا کوئی اور نہ تھی۔

میں ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ میری آہ و بکا سے آسمان
جھک پڑتا، یا شاید گردش لیل و نہار تھم جاتی، اگر نہیں رکا تو

وہ تو ریان نہیں رکا۔ چھکڑے کی چوبی تختوں پر میرا وجود
ماہی بے آب، مرغ بسمل کی طرح پھڑک رہا تھا۔ میں بھول

چکا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کن حالات میں گرفتار ہوں۔ میرے ذہن میں تو وہ مرمریں ہاتھ رقصاں تھے جو لاری کے دروازے پر نزاکت سے جمے تھے۔ آہ! بدنصیبی بھی کسی دیس کی باسی نہیں ہوتی۔ اس کی حکومت تو کرۂ ارض سے ماورا ہے، یہاں بھی جاتی ہے وہاں بھی جانے گی۔ کوئی بستی، کوئی قریہ، کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں میں کورا کی تلاش میں نہیں گیا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ بدبختی سائے کی طرح قدم بہ قدم میرے ہم راہ رہی تھی، اور میں کبھی اسے ٹھوکر نہیں مار سکا تھا، پاپوش بنائے رکھا تھا۔ آج وہی پاپوش منہ پر پڑی تھی۔ قدرت نے میرے ساتھ دشمن داری نبھائی تھی اور وہ بھی بے وضع۔ کیا برا تھا اگر اس بوری میں سوراخ نہ ہوتا؟ اور کسی کا کیا بگڑ جاتا جو میں اُس سوراخ سے باہر کا منظر دیکھنے کی استطاعت نہ رکھتا؟ اور اس میں کیا مضائقہ تھا کہ مولوی صاحب کے لاری میں سوار ہونے اور اس طالع خور چھکڑے کے اڈے کے سامنے سے گزرنے میں یہ ناقابلِ یقین وقتی مطابقت نہ ہوتی۔ چھکڑا پانچ یا دس منٹ پہلے گزر جاتا یا مولوی صاحب چھکڑا گزرنے کے صرف ایک منٹ بعد ہی اڈے پر پہنچے آتے۔ ستم ظریفی کا استعارہ میرے حال پر تمام تھا۔ چند لمحے قبل ہی میں کورا کی تلاش سے حتمی طور پر دست بردار ہوا تھا اور عین اُس سمے جب میں جھولیوں میں خوشیاں انڈیلنے کی ٹھان چکا تھا، میرے دل میں کورا کی ازسرِنو جوت جگا دی گئی تھی۔ دفعتاً ایک خیال لپک سا گیا اور اس زاویے سے سوچ کے میں نہال ہو گیا۔ میں جسے بدبختی سمجھ رہا تھا، وہ خوش بختی تھی۔ دستِ قدرت میری پشت پر تھا، اور یقیناً میرے ساتھ تھا۔ یہ واقعہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا تھا، یقیناً اس سارے منظر کو کہیں دُور ترتیب دیا گیا تھا۔ کوئی تیسرا بھی ہے جو اس تماشے سے لطف کشید کر رہا ہے، کٹھ پتلیاں متحرک رہتی ہیں اور ڈوریوں کے سِرے پسِ پردہ وہ نادیدہ ہیں، گویا ابھی صدق کے اَور امتحان مقصود ہیں، سوختگی کے مزید ثبوت درکار ہیں۔ دفعتاً ایک تیسرے زاویے سے خیال آیا تو میری طفل ہچکیاں بافرار ہوئیں۔ میں کورا کی جستجو سے دست برداری کا ارادہ باندھ چکا تھا، اور عین اُس لمحے بے بسی و بے بضاعتی کے عالم میں یوں سرِ راہ نظر آنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ قدرت اُس کی خاطر داری کمر بستہ ہے۔ یہ اُسی کی مطلب براری کا اہتمام ہے۔ کسے خبر تھی کہ وہ کس تڑپ سے مجھے تکتی ہوگی۔ کون جانتا ہے اُس کے سینے میں اُبلتے آتش فشاں کو۔ کون سُن سکتا ہے، کے اُس جاپ کو جو وہ میرے نام پر جپتی ہوگی۔ تیسرے خیال پر میری سوچ جم گئی کہ کورا بھی میری تلاش میں ہے اور اُس کی تلاش میرے جان لیوا انتظار کے پنجرے میں بند ہے اور قدرت بھی اس کھیل تماشے پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے۔ انسان بھی عجیب ہے، بندگی میں نت نئے دروازے تراشتا ہے۔ سو میں نے بھی تراش لیے تھے۔

چھکڑا اپنی رفتار سے چل رہا تھا اور ہلکے تڑپتے [illegible] بیت چکے تھے۔ کورا کا نظر آنے کے بعد دوبارہ [illegible] بڑا سانحہ تھا کہ غم میری جان لے ہی لیتا، لیکن [illegible] خیالات و تصورات نے اتنا مضبوط تانا بانا بُنا کہ وہ ہاتھ بھرتی [illegible] نظر آئی۔ مجھے جلد از جلد بوری اور اس چھکڑے سے گلوخلاصی کرنی تھی۔ اگر میں آج یا کل تک اُس اڈے پر پہنچ پاتا تو قوی امکان تھا کہ کچھ سراغ مل ہی جاتا۔ ظالموں نے مشکیں اس قدر کس کے اور مشاقی سے باندھی تھیں کہ ہزار جتن کے باوجود میں کلائیوں پر سے اُن کی گرفت ذرا بھی ڈھیلی نہ کر پایا تھا۔ بارونیہ نے انگریز سرکار کے ساتھ بہت بڑا ہاتھ کیا تھا۔ دلّی میں بہت بڑا بھونچال آ گیا ہوگا۔ اپنے فوجی افسروں کی بازیابی کے لیے انگریز ریاستی جنجال پر اکتفا نہیں کریں گے۔ بہت ممکن تھا کہ وہ ریاست پر فوج کشی بھی کر سکتے تھے۔ بارونیہ مغویوں کو یقینی طور پر انتہائی خفیہ اور دشوار گزار جگہ پر ہی لے جا کر رکھتا اور یہ چھکڑے انتہائی مستعدی سے بلا کسی روک ٹوک اُس منزل کی جانب گامزن تھے۔ بلاشبہ ہمیں ایسی جگہ لے جایا جا رہا تھا، جس کا انتخاب انگریزوں کی مدافعت کو مدِنظر رکھ کے کیا گیا ہوگا۔ بارونیہ کے ایسے خطرناک ٹھکانے پر پہنچ کے بچ نکلنا کوئی کارِ آسان نہیں تھا۔ مجھے جلد از جلد رہائی کی کوئی تدبیر کرنی تھی، اس مرتبہ کورا کا سراغ گم ہو جاتا تو دوبارہ کبھی ہاتھ نہ آتا۔ دفعتاً کسی نے مجھے ٹوکا کہ عقل، زور اور جبر کے بغیر فرار کا سوچنا ہی رذیل کا کام ہے، لیکن میری کلائیاں مخصوص انداز میں مسلسل حرکت کرتی رہیں۔ یہ دل بھی بڑا ہی جواز کار ہے، فوراً ہی ڈھارس بندھائی کہ عقل کے لیے میرا آزاد ہونا اس قید سے زیادہ مفید ہے۔ میں اپنے ہم راہیوں کے لیے آزاد ہو کے ہی کچھ کر سکتا ہوں۔ چاقو میری جیب میں موجود تھا، اُسے بس انگلیوں کی لپک کا انتظار تھا۔ میں نے درز سے جھانکا تو باہر شام سیاہ مور کی طرح پَر پھیلا رہی تھی۔ حیرت انگیز طور پر چھکڑوں کے اس قافلے کو اب تک کسی نے نہیں روکا تھا، جس کے دو ہی مطلب تھے یا تو اطلاع نہیں پہنچی تھی یا پھر ریاست کے والی درپردہ بارونیہ کی پشت پر تھے۔ بارونیہ، ریاست یا اغوا شدگان سے میری دل چسپی مفقود ہو چکی تھی۔ مجھے ہر حال میں یہاں سے فرار ہونا تھا۔ ٹور بان بہت ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔ میں نے گھٹنوں اتنی چیخ کی تھی، خوب دِ ویلا مچایا تھا، جس کا اُس نے رتی بھر بھی اثر نہیں لیا تھا۔ مجال ہے جو اُس نے مڑ کے بھی جھول میں جھانکا ہو۔ میرے برابر میں پڑی ہوئی دونوں بوریوں سے آنے والی کراہیں اور انگریزی کھسرپھسر اب بند ہو گئی تھی۔ شاید وہ تکلیفوں اور جھٹکوں کو اوڑھ کے سو چکے تھے یا نڈھال بے سدھ پڑے تھے۔ میں نے کچھ سوچ کے برابر والے بوری نشین کو ہلایا، اور انگریزی میں کہا، ”میری بات سنو! تم جاگ رہے ہو؟“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا تھا، ہرچند کہ مجھے صد فی صد یقین تھا کہ ٹور بان کو انگریزی کی اتنی ہی شُد بُد ہوگی جتنی عقل کو تھی، لیکن پھر بھی احتیاط کا تقاضا تھا کہ سرگوشی ہی کی جائے۔ جواب میں میرا پڑوسی کراہ کے معمولی سا کسمسایا تھا۔ غالباً وہ بے ہوش تھا۔ میں نے اس مرتبہ کافی قوت سے گھٹنا مارا اور کہا، ”محترم دوست! میری بات سنو!...“ وہ پہلے کی نسبت زیادہ آواز سے کراہا اور کسمسایا، لیکن جواب ندارد تھا۔ ”محترم ساتھی! اگر آپ میرے ساتھ پر آمادہ ہو جائیں تو ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔“ میں نے گھٹنے کی شدید ضرب سے اُسے تیسری مرتبہ ہلاتے ہوئے کہا۔

”وہ ہوش میں نہیں ہے۔“ تیسری بوری سے لڑکھڑاتی ہوئی آواز آئی۔ آواز جوان تھی، لیکن وہ میری مدد نہیں کر سکتا تھا۔ ”تمھارے پاس کون سا طریقہ ہے۔ مجھے نکلنا ہے، میں تمھاری ہر ممکن مدد کر سکتا ہوں۔“ اُس نے میرا جواب نہ پا کر دبی، لیکن پُرجوش سرگوشی کی۔ یہاں بھی بدقسمتی آڑے آ رہی تھی، اگر میرے برابر والا اسی طرح باہوش اور پُرجوش ہوتا تو مجھے یقین تھا کہ اس قید سے فرار ممکن ہے۔

”میرا نام لیونارڈ ہے۔ میں فوج میں تازہ بھرتی ہوا ہوں۔ میں اب تک کسی لڑکی کو اپنا دوست بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ آغازِ سفر میں گم راہ نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے ابھی بہت جینا ہے۔“ وہ دل گیر ہو کے بولا۔

”دوست! تم میری معاونت کی اہلیت نہیں رکھتے۔ تم میرے برابر میں نہیں ہو۔“ میں اُس کے ساتھ باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گزرنے والا ایک ایک پل قیمتی تھا، میں یک سوئی سے بچاؤ کا راستہ سوچنا چاہتا تھا۔

”اگر تم پشت سے پشت ملا کے ایک دوسرے کی رسّیاں کھولنے کا کوئی منصوبہ رکھتے ہو تو میں تمھیں آگاہ کرتا ہوں، میں اور میرا ساتھی کئی پہر اس مشق میں مصروف رہے ہیں۔ ہم دونوں تربیت یافتہ فوجی ہیں، لیکن ناکام رہے ہیں۔“ لیونارڈ کروٹ کے زور پر بے ہوش ساتھی پر چڑھ آیا تھا۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ معمولی سی جدوجہد سے لیونارڈ یا میں درمیان والے بے ہوش کی جگہ لے سکتے ہیں۔

”نہیں، دراصل میری بغلی جیب میں چاقو موجود ہے۔“ میں نے لیونارڈ کی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

"چاقو!... اوہ، یہ تو عمدہ بات ہے، لیکن چاقو سے فائدہ اٹھانا کیونکر ممکن ہے؟"

"ہاں، بہ ظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"تم واپس تختے سے چپک جاؤ، میں تمھارے قریب آتا ہوں۔"

"مجھے بتاؤ تو سہی، تم کرنا کیا چاہ رہے ہو۔"

"وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے اُس طرف آنے کے لیے کچھ جگہ فراہم کرو۔" مجھے اُس پر طیش آ رہا تھا۔ باہر سورج تھک ہار کے گھر کو لوٹ رہا تھا۔ کیا خبر وہ پھر کہیں پڑاؤ ڈال دیتے۔ لیونارڈ تیزی سے دوسری طرف ہو گیا۔ میں نے پوری طاقت کو دائیں کندھے پر جمع کیا، پھر اُس کندھے کو مرکز مان کے نچلا دھڑ اٹھانے کے لیے زور لگایا۔ دونوں ٹانگوں کی معاونت سے دوسرے ہی لمحے میں برابر کی بوری کے اوپر تھا، اور کروٹ بدل کے تیسرے ہی لمحے میں لیونارڈ اور اُس بے ہوش آدمی کے درمیان میں تھا۔ اب اس درمیانی بوری کو دھکیل کے میری جگہ تک پہنچانے کا مرحلہ تھا۔ یہاں جل کا داؤ کارآمد تھا۔ ٹھل نے اِس داؤ کی خوب مشق کروائی تھی، تاہم کبھی استعمال کا موقع ہی نہیں آیا تھا۔ جل کے داؤ میں ہاتھ بے آب کی طرح تڑپتا ہوتا ہے۔ جل کا داؤ مٹھری داؤ کا توڑ ہے۔ مٹھری داؤ میں مخالف کی پسلیاں بازوؤں کے مضبوط شکنجے میں کس کے توڑ دی جاتی ہیں۔ مٹھری داؤ میں پھنسا ہوا شخص اگر جل کا مشاق ہے تو مضبوط ترین حلقہ بھی توڑ دیتا ہے۔ میرے دوست بہت معمولی جنبش کی ضرورت تھی۔ بہت تھوڑی سی کوشش بارآور ثابت ہوئی۔ لیونارڈ کو بھی خاصی صبر ہیں آئیں، وہ سخت جان تھا۔ جھگڑے کا تختہ اور دوسری جانب میں اُس کے لیے چکی کے دو پاٹ بن گئے تھے، تاہم اُس نے ذرا بھی اُف نہیں کی، تو ذرا دیر بعد میں درمیان میں پڑا تھا اور درمیان والا میری جگہ پہنچ چکا تھا۔

میرا سینہ بری طرح پھولنے پچکنے لگا تھا۔

"اُف میرے خدایا! تم لوہے سے بنے ہوئے ہو، بہت طاقت ور، بہت شان دار۔"

"میرے دائیں پہلو کی جیب میں چاقو ہے۔ تمھیں وہ چاقو اپنے منہ کی مدد سے میری جیب سے نکالنا ہے۔" میں نے اوپر کی طرف کھسکتے ہوئے کہا، تاکہ میری جیب کا مقام اُس کے چہرے کے قریب آ جائے۔ "تم بھی کچھ نیچے کی طرف کھسکو۔" میں نے جلدی جلدی اُسے کہا۔

"میرے دوست! میں وہ چاقو تمھاری جیب سے کیسے نکال پاؤں گا؟" بوری کی پرت بہت بھاری ہے۔ میں اپنے منہ کے ذریعے اُس کے نیچے کسی چیز کو حرکت نہیں دے پاؤں گا۔"

"کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں، ہم بہ ہر حال قید ہیں..." وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ واقعی بوری کی پرت اتنی بھاری تھی کہ اُس کا منہ کی گرفت میں آنا بھی کار محال ہی تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے امید تھی، یقین تھا کہ یہاں سے آزادی ممکن ہے جب کہ بوری میں ذرا بھی گنجائش نہیں تھی کہ آدمی اٹھ بیٹھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا... بالفرض میں چاقو تمھاری جیب سے نکال کر لاتا ہوں، تب بھی کیا حاصل ہوگا۔ وہ چاقو ہماری مدد کر سکے گا؟"

اُس کی آواز میں مایوسی کا غلبہ میں نے محسوس کر لیا تھا۔ مایوسی اور کامیابی دو متضاد چیزیں ہیں۔

"تم ایک مرتبہ چاقو میری جیب سے نکال کے بوری میں گرا دو۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم یقینی طور پر آزاد ہو سکیں گے۔ یہ ایک کرشماتی چاقو ہے۔" میں نے اُس کے سامنے امید کا چراغ جلایا، حالاں کہ میں چاقو سے متعلق اُتنا ہی فکر مند تھا جتنا لیونارڈ اس وقت بوری کی موٹی پرت کے متعلق تھا۔

"ٹھیک ہے، میں کوشش کرتا ہوں۔" لیونارڈ کا لہجہ یک دم خوشی اور جوش سے معمور ہو گیا۔ میں ممکنہ حد تک اوپر

کی جانب کھسک کے سمٹ گیا تھا۔ لیونارڈ بھی نیچے کی طرف کھسک چکا تھا۔ کافی بل جل کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اب میری جیب عین لیونارڈ کے منہ کے قریب ہے تو میں نے کہا، "میری کہنی کے بالکل ساتھ جیب کا منہ ہے۔ اُس سے تھوڑا نیچے تم سخت اُبھار سے چاقو کو محسوس کر لو گے۔ کسی طرح اُسے کھسکا کے میری کہنی تک لے آؤ، یعنی جیب کے منہ تک، اس کے بعد جیب سے باہر وہ خود نکل آئے گا۔"

"مجھے یقین نہیں کہ تمھارا چاقو کرشمہ دکھا سکے گا، تاہم میں کوشش ضرور کروں گا۔"

لیونارڈ نے کچھ اِس طرح کہا کہ ان حالات میں بھی میں مسکرا پڑا۔ دوسرے لمحے میرا پورا جسم سنسنا گیا۔ لیونارڈ کا منہ عین چاقو کے اوپر پڑا تھا۔ "یہی ہے... اِسے اوپر کھسکاؤ۔" میرے منہ سے برجستہ جملہ نکلا تھا۔ جواب میں لیونارڈ صرف "اوغ اوغ" کر کے رہ گیا۔ لیونارڈ نے اپنی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ چاقو کبھی دائیں کھسک جاتا کبھی بائیں، لیکن اوپر نہ آتا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک مسلسل جتے رہنے کے بعد لیونارڈ ہانپ گیا۔ "نہیں، یہ ناممکن ہے۔ میری ناک، ہونٹ اور ٹھوڑی بری طرح چھل چکے ہیں۔ ان سے خون رسنے لگا ہے دوست۔"

نہ جانے کیوں مجھے کوفت ہونے لگی۔ میں نے ہی اُسے اس کام پر آمادہ کیا تھا، لیکن جب وہ تگ و دو کر رہا تھا، مجھے اپنا آپ خود غرض لگا، حالاں کہ وہ سب کچھ اپنی آزادی کے لیے کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، رہنے دو!" میں یہی کہہ سکتا تھا۔

"نہیں میرے دوست! آدھا گھنٹا میں نے ضائع نہیں کیا، کچھ سیکھا ہے، کچھ مشق کی ہے۔ اب میں آسانی سے یہ کام کروں گا۔" لیونارڈ نے کچھ دیر خاموشی اختیار کرنے کے بعد کہا۔

"تم اسے کچھ دیر پہلے ناممکن کہہ رہے تھے۔"

"میں ہانپ گیا تھا، وقتی تھکن غالب آ گئی تھی۔ اب مجھے یقین ہے میں یہ کر لوں گا۔"

"تمھاری مرضی۔"

لیونارڈ دوبارہ اپنی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ میرے ذہن سے ٹھل، جبرو اور زورا کا خیال محو ہو چکا تھا۔ مجھے یہاں سے نکل کر اُس نامعلوم بس اڈے تک پہنچنے کی جلدی تھی، جہاں ایک کائنات موجود تھی۔ لیونارڈ اِس سے قبل جوش سے کام لیتا رہا تھا، مگر اب وہ ہوش سے کام لے رہا تھا۔ صرف پانچ منٹ بعد چاقو میری جیب سے نکل کر بوری میں گر چکا تھا۔

"وہ ہرا... ہندُستانی لباس سے واقفیت نہیں ہوتی تو شاید یہ چاقو تمھاری جیب سے نہ نکال پاتا۔ یہ تو بہت آسان کام تھا... کرشمہ دکھاؤ... جلدی سے کرشمہ دکھاؤ..." وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولا۔

اب میرا امتحان شروع تھا۔ مجھے اپنا منہ چاقو تک لے جانا تھا یا پھر چاقو اپنے منہ تک لانا تھا۔ چاقو کا کھٹکا منہ سے دبوچ کر کھولنا تھا۔ دستے پر منہ جما کر چاقو سے کئی کٹھن کام لینے تھے۔ میں نے چاقو کو منہ تک لے آنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں ٹانگوں کو اوپر بلند کر کے کئی جھٹکے دینے سے چاقو اوپر تو آ گیا تھا، لیکن وہ میرے کندھوں کے نیچے تھا۔ کافی دیر مسلسل کوششوں اور تجربوں کے بعد چاقو میرے منہ میں دبا ہوا تھا۔ اسی دوران لیونارڈ مسلسل بولتا رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں نے جذباتی استحصال کر کے چاقو باہر نکلوایا ہے، لیکن میں خود کچھ کرنے سے قاصر ہوں۔ چاقو کا دستہ منہ میں پکڑا تو ٹھل کی بات یاد آ گئی۔ اُس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ لاڈلے بکائی سے بڑا کوئی کانٹا نہیں، اور ارادے سے بڑا کوئی بل نہیں ہوتا۔ یہ بڑے بڑے سورماؤں کو پچھاڑ دیتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو سورما تنکے کی طرح گر جاتے ہیں۔ میں نے لیونارڈ کو یک سر نظر انداز کر دیا، اور بھلا دیا کہ اس بوری سے باہر بھی کہیں تل بستے ہیں۔ چند گھنٹے قبل جو کام ناممکن لگ رہا تھا، وہ ممکن ہو چکا تھا۔ تھوڑے سے محتاط عمل کے بعد ایک کھٹکے سے چاقو کا تیز دھار پھل باہر آ گیا۔ میں نے

دستے کو موزوں کر کے اپنا چہرہ دائیں سے بائیں گھمایا۔ چاقو کا پھل بوری کو چیرتا ہوا باہر نکل آیا۔ کافی دیر تک اور شدید جدوجہد کے بعد میں بوری کا اتنا حصہ کاٹنے میں کامیاب ہو چکا تھا کہ میرا چہرہ بوری سے باہر نکل آیا۔ چاقو کو دانتوں میں دبا کر پاؤں کی رسیاں کاٹنے کا میرا ارادہ تھا۔ پیروں تک اپنا چہرہ لے جاتے کمر کی تمام ہڈیاں چیخ چیخ گئی تھیں، چاقو میری بے ایسے ہی تھا جیسے مچھلی کے لیے پانی۔ میں نے بہت آرام سے پیروں کے قریب سے بوری کاٹ لی۔ ڈوراندیشیوں نے رسی کیا باندھی تھی، پیر جکڑ دیے تھے۔ موٹی رسی کے بیس سے زائد بل تھے۔ رسی کاٹنے میں بھی کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ تھوڑی دیر بعد میرے پیر آزاد تھے اور میں مکمل طور پر بوری سے باہر تھا۔ لیونارڈ پوری کارروائی اپنی بوری کے سوراخ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ حیرت سے گنگ ہو چکا تھا۔

"تم انسان کیں جادوگر ہو... حیرت انگیز... بہت زبردست"

"سب سے اہم اور ابتدائی کارنامہ تم نے سرانجام دیا ہے۔" میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے کہا۔ ہاتھوں کو آزاد کروائے بغیر چھکڑے سے کودنا انتہائی بے وقوفی ہو سکتی تھی، کیوں کہ باہر کی صورت حال کا مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا۔ انگریز فوجیوں کے اغوا کا معاملہ تھا۔ یقیناً ان چھکڑوں کو سخت حفاظتی حصار میں لے جایا جا رہا ہوگا۔ سڑک کے دائیں بائیں گھنے جنگل میں مسلح گھڑ سوار قافلے کے ہم راہ یقیناً چل رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ میرے تمام خدشات عبث ہوں، لیکن جلد بازی نقصان پہنچا سکتی تھی، اور مجھ میں اس وقت کسی نقصان کا تحمل نہیں تھا۔ ثوربان غالباً کانوں میں روئی ٹھونس کر بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ اب تک کے سفر سے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں تھا کہ چھکڑے سے کود جانے پر کم از کم ثوربان کو کوئی فرق نہ پڑتا۔ آخر کار ہاتھوں کی رسیاں کاٹنے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ اس سے قبل میں نے سوچا تھا کہ چاقو اپنے پیروں میں تھام کے لیونارڈ کو آزاد کراؤں گا، اور پھر لیونارڈ میرے ہاتھوں کی رسیاں کاٹ ڈالتا، لیکن اس میں ایک قباحت تھی، ایک لمحہ ایسا ضرور آتا جب میں مکمل طور پر لیونارڈ کے رحم و کرم پر ہوتا۔ میں اُس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اُس پر اعتبار کرنا شدید حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آخر کار مجھے اُس پر بھروسا کرنا ہی تھا کہ دفعتاً چھکڑے کی درزوں کا خیال آیا۔ میرے پیروں کے درمیان اچھی بھلی درز تھی اور اُس کا حجم بھی معقول تھا۔ چاقو کا دستہ بہ آسانی اُس میں پھنسایا جا سکتا تھا۔ دستے کو درز پر موزوں کر کے میں نے پنڈلی کی ضرب ماری تو درز میں جم گیا، لیکن دوسری ضرب عین پھل پر لگی۔ پیروں میں جوتی نہیں تھی۔ تیز دھار پھل ہڈی تک پہنچ کر ہی رکا۔ زخم لمبا اور گہرا آیا تھا۔ خون پانی کی طرح پھوٹ پڑا، اور یہ وقت خون دیکھنے کا نہیں تھا۔ باہر چاند عروج پر تھا۔ میں نے فوراً دوسری ضرب دستے پر ماری۔ تین چار راست ضربوں سے دستہ درز میں پھنس چکا تھا۔ اس کے بعد ہاتھوں [illegible] کروانے میں خاص دشواری پیش نہیں آئی۔ تلوے سے خون منہ زور نالے کی طرح بہہ رہا تھا۔ اب ایک لمحہ بھی اس چھکڑے میں ٹھہرنا میرے لیے ناممکن تھا۔ چند ثانیوں میں لیونارڈ بھی آزاد تھا۔

"تم جادوگر ہو... اگر میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا تو کبھی یقین نہ کرتا۔ او میرے خدا!... اتنا خون... اِسے روکو فوراً۔" لیونارڈ کی نظر تختے پر پڑی، جو خون سے تر بہ تر تھا۔ اُس کے چہرے سے بھی خون برابر رس رہا تھا۔

"ابھی اِس کا وقت نہیں ہے۔" میں نے جلدی جلدی تیسری بوری کاٹ ڈالی، وہ ہنوز بے ہوش تھا۔ پھر میں نے کچھ سوچ کر اُس کے ہاتھ اور پیروں کی رسی نہیں کاٹی۔ اُس کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ کہتے ہیں، سفر کا ساتھ چند لمحوں ہی کا کیوں نہ ہو گہری انسیت پیدا کر دیتا ہے۔ اُس بے ہوش انگریز سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن پھر بھی اُسے چھوڑتے ہوئے مجھے دکھ ہوا۔ لیونارڈ نے جھٹ اپنی قمیص پھاڑ ڈالی۔ وہ میرے پیروں سے لپٹ گیا۔ "تیزی سے خون بہہ رہا ہے۔ تم چند منٹوں میں ہلاک ہو سکتے ہو۔ اِسے روکنا ہوگا۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ میں بے حد ڈھیٹ واقع ہوا ہوں۔"

"مانتا ہوں تم سخت جان ہو... بہ ہر حال، ایک انسان ہو۔ ابتدائی طبی امداد کی فوجی تربیت حاصل کی ہوئی ہے میں نے... ایسے ہرگز نہیں جانے دوں گا۔" اُس نے بہت تیزی سے اپنی قمیص کو پٹیوں میں تقسیم کرتے ہوئے کہا۔ وہ میرے بالکل سامنے آ گیا تھا۔

"تم اپنا راستہ لو... مجھے بہت جلدی ہے... بے فکر رہو، موت ہی تو ہے جو مجھے نہیں آتی۔" میں نے اُسے ایک طرف دھکیلنے کی کوشش کی۔ میرے لیے ایک ایک لمحہ کوہ ندا تھا۔ ہر پل میں کوراسے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ لیونارڈ بیس اکیس برس کا خوش شکل نوجوان تھا۔ خون واقعی آبشار کی مانند بہہ رہا تھا۔ [illegible] کے طور پر جسمانی نقاہت مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ [illegible] نے میرے قدموں سے لپٹ گیا۔

"اسے میری خود غرضی سمجھ لو۔ تم شان دار انسان ہو... [illegible] یقین ہے کہ آئندہ درپیش خطرات سے بھی تم ہی مجھے بچا سکتے ہو۔ تمھاری زندگی میرے لیے بہت اہم ہے، میرے دوست! یہ پاؤں کا کاری زخم ہے۔ نچلا حصہ ہونے کی وجہ سے تھوڑی ہی دیر میں تمھارے جسم سے خون کی آخری بوند بھی نکل جائے گی۔" اُس نے گڑگڑا کے کہا۔ مجھے اُس کی بات ماننا پڑی۔ اُس نے ایک پٹی کو کئی تہوں میں لپیٹ کر زخم پر رکھا اور پھرتی سے اُس پر گانٹھ باندھ دی۔ اُس نے سرکام آناً فاناً کیا تھا۔

چھکڑے پر پڑی جھول کو میں نے تھوڑا سا کاٹا۔ باہر اندھیرا تھا۔ چاندنی اپنا تعارف کروانے میں ناکام نظر آ رہی تھی۔ ہمارے چھکڑے کے بالکل پیچھے دوسرا چھکڑا چلا آ رہا تھا۔ اُس کے پیچھے تیسرا، پھر چوتھا اور اِس طرح لمبی قطار تھی۔ یقیناً ہم سے آگے بھی اِسی طرح قطار تھی۔ ایک چھکڑے میں دو بیل جتے تھے۔ اگر ہم اِس طرح فوراً دائیں بائیں کود جاتے تو اندھیرے کے باوجود دیکھ لیے جانے کا قوی امکان تھا۔ کچی سڑک کے دائیں بائیں درختوں کے جھنڈ تھے۔ ہم لاکھ کوشش کرتے، لیکن وہ وسیع الحجم گھیرا ڈالنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ بہ آسانی دوبارہ پکڑے جاتے یا پھر مار دیے جاتے۔ بہتر یہی تھا کہ بہت دُور تک جانے کے بعد بھی، اہلِ قافلہ کو ہماری گم شدگی کی خبر نہ ہوتی، لیکن یہاں سے جانا بہ ہر حال، بہ ہر صورت تھا۔ بائیں جانب درختوں کے جھنڈ چھکڑے سے قدرے قریب تھے، جب کہ دائیں طرف یہ فاصلہ نسبتاً کئی گنا زیادہ تھا۔ مناسب یہی تھا کہ بائیں جانب سے جھول کاٹ کے جھنڈ میں محتاط چھلانگ لگا دی جائے۔ اس کے بعد کے معاملات تو بہ تقدیر چھوڑ دیے جائیں۔ اب سوچنا بے کار تھا۔ میں نے بائیں جانب بہت احتیاط سے جھول میں قدِ آدم نقب لگائی۔ دفعتاً ایک خیال نے مجھے پتھر کر دیا۔ گویا روح سلب کر لی گئی ہو۔ میرے فرار سے مشتعل، ترور اور جھرو پر بار دولیہ کا قہر بھی نازل ہو سکتا تھا۔ وہ میرے رفیقوں ہی کی حیثیت سے زیرِ عتاب آ گئے تھے۔

میرے ساتھ لیونارڈ کا فرار اِس خیال کو مزید تقویت پہنچا سکتا تھا کہ ہم انگریز سرکار کے آلۂ کار ہیں۔ اگر اسی طرح اکا دکا کو فرار ہونا ہوتا تو ہم میں سے ہر کوئی انفرادی طور پر پہلے پڑاؤ سے قبل یا پڑاؤ کے دوران ہی ہو جاتا، اور بہ آسانی۔ یہاں تو ایک سے دوسرے کی سانس جڑی تھی۔ مجھے نہیں جانا چاہیے تھا۔ مشعل کے بغیر یہاں سے جانا مجھے زیب نہیں تھا۔ یک دم میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایسے نہیں، یوں تنہا فرار نہیں ہونا، لیکن پھر کسی غیر مرئی قوت نے مجھے اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں چھکڑے سے زمین پر گرا اور ہرن کی طرح بڑھتا ہوا درختوں کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ کورا یہاں سے بہت قریب، یہیں کہیں، میرے آس پاس ہی تو تھی۔ تقریباً مجھ سے ذرا آگے لیونارڈ بھی اوٹ لے چکا تھا۔ کسی کو خبر نہ ہو سکی، بیس سے پچیس چھکڑوں کا یہ قافلہ اپنی روانی میں آگے بڑھ گیا۔ ان کے عقب میں خاصی تعداد میں مسلح گھڑ سوار تھے۔ وہ چھکڑوں کی نگرانی پر معمور تھے۔ انھیں یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے دو قیدی جنگل میں روپوش ہو چکے ہیں۔

جب آخری گھڑ سوار گزرا تو میرے اندر کوئی مچل گیا۔ ایک طوفان میرے در پے ہوا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کوئی بچہ یا شوریدہ سر جوان۔ بس میں تنک کے سڑک پر نکل آیا۔ دایاں پاؤں میرے ساتھ نہیں تھا۔ وہ وہیں درختوں کی اوٹ میں رہ گیا تھا۔ گھڑ سوار خراماں خراماں جا رہے تھے۔ مجھے اپنا دل معدوم ہوتی ٹاپوں سے کھلواڑ کرتا محسوس ہوا۔ ذرا سے تیل پر وہ یقیناً ٹوٹ پڑتے۔ کسی ایک کو گرا کے بندوق چھیننا کیا مشکل تھا۔ اُس آدمی کا کیا بیاں ہو کہ جو صراط پر ہو اور اس کے دائیں بھی صراط ہو اور بائیں بھی صراط ہو۔ میں نے خنجر کو علم کیا اور گھڑ سواروں کے تعاقب میں لڑھکتا گھسٹتا دوڑ پڑا۔ دفعتاً کسی نے چھلانگ لگائی اور مجھے لپیٹتے ہوئے سڑک سے نیچے اتر گیا۔ لیونارڈ میرے دل و دماغ سے محو ہو چکا تھا۔

"میرے عزیز دوست تم پاگل ہو رہے ہو!" لیونارڈ نے میرے منہ پر ہاتھ جماتے ہوئے سرگوشی کی۔

"ہاں، میں پاگل ہوں... تم اپنی راہ پکڑو!" میری آواز میں بے پناہ سفاکی در آئی تھی۔ وہ میں نہیں کوئی اور ہی تھا۔ سمتیں چار ہیں، مگر میرا شیرازہ ہزار سمتوں میں بکھر گیا تھا۔ میں نے اُسے روئی کے بے وزن گھٹڑ کی طرح اُچھال پھینکا۔ میں تڑپ کے اُٹھا، لیکن ایک پاؤں سے کیسے اٹھا جاتا، تڑپ کے رہ گیا۔ لیونارڈ اِس مرتبہ میرے پیروں سے لپٹ گیا۔

"مجھے معلوم ہے تمھارے ساتھی اُن کے پاس ہیں... اس وقت تمھاری جان خطرے میں ہے۔ بہت سا خون بہہ چکا ہے اور اب بھی رساؤ جاری ہے۔ میرے عزیز دوست! تمھاری زندگی تمھارے ساتھیوں کے لیے زیادہ اہم ہے۔"

اس دوران ٹاپیں یک سر معدوم ہو گئیں۔ حلق میں ہوا کا گھومتا ہوا گولا اٹک گیا۔ خنجر آراستہ دست [illegible] بے جان اور جسم بے روح ہو چکا تھا۔ میں نے پھر [illegible] سے اٹھنا چاہا۔ اِدھر کچھ تھا ہی نہیں جو اُٹھ جاتا۔ بے بسی آنکھوں میں اتر آئی۔ میں نے لیونارڈ سے کہنا چاہا کہ از راہِ خدا [illegible] کی بجائے اس خنجر سے میرا سینہ چیر ڈالو، میں تمھارا احسان مانوں گا، مگر ہونٹ پھڑ پھڑا کے رہ گئے، لیکن ایک زبان جس کے اشتراک سے کائنات کا خمیر اٹھا ہے، وہ بھی بولتے، سنتے اور سمجھتے ہیں، لیونارڈ سے کیا ماورا۔ وہ تڑپ کے میرے پیروں سے اُٹھا اور سینے سے لگا لیا۔ اُس نے میرا سر اپنی گود میں رکھا اور مجھے بھینچ لیا۔

"واقعی مشرقی لوگ محبت کے خوگر ہوتے ہیں... اُن سے تمھارا بہت قریبی تعلق گمان پڑتا ہے، لیکن تم فکر نہ کرو، میری زندگی تمھاری مرہونِ منت ہے۔ میں وائسرائے کا ذاتی محافظ ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ تاوان وغیرہ کا مطالبہ کریں گے۔ حکومت بہت جلد تمام مغویوں کو بہ خیریت بازیاب کروا لے گی، اِس وقت تمھیں فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔ میں اِس ویرانے میں آگ جلا سکتا ہوں...

زخم میں راکھ بھرنے سے خون رک سکتا ہے۔ راکھ میں نقصان دہ جرثومے نہیں ہوتے۔"

کچھ لوگ بس اچھے ہوتے ہیں اِن لوگوں کا تعلق کسی مخصوص علاقے، رنگ و نسل یا مذہب سے نہیں ہوتا۔ یہ لوگ ہر جگہ، ہر خطے، ہر نسل، ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں۔ لیونارڈ سے چند جملوں کی ملاقات تھی، لیکن وہ وارفتگی و بے ساختگی سے مجھے بھینچے ہوئے تھا، گویا جنم جنم کا ساتھ تھا۔ چھکڑے سے ہماری گم شدگی کی اطلاع کسی وقت بھی قافلے میں گردش کر سکتی تھی، وہ اچانک یہاں پلٹ سکتے تھے۔ لیونارڈ کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر فوراً محفوظ ٹھکانے کی تلاش میں نکل جائے، لیکن وہ بھی اَوروں کی طرح مجھ سے چمٹ کے بیٹھ گیا۔ وہ مجھے سہلا رہا تھا، پچکار رہا تھا اور تسلی دے رہا تھا۔ مجھ سے کچھ نہ بولا گیا۔ غشی کی کیفیت طاری تھی۔ سر میں گول گول چمکتے ہوئے دائرے ناچ رہے تھے۔ "ہم اِس وقت راستے پر بیٹھے ہیں۔ کسی پوشیدہ جگہ تک فوری پہنچنا از حد ضروری ہے۔" لیونارڈ نے مجھے سہارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ زندگی میں اب کیا باقی رہا تھا۔ صرف خون کے سہارے ہی تو نہیں جیا جاتا۔ توانائی کے لوازمات کچھ اَور ہی ہوا کرتے ہیں۔ میں نے پھر بھی ایک مرتبہ اُٹھنے کی کوشش کی، شاید میں کھڑا بھی ہو گیا تھا، مگر پھر لڑکھڑا گیا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

ٹکوے کا ناچتا ہوا درد دماغ سے تال میل ملا رہا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو لیونارڈ مٹھی میں راکھ بھر کے ٹکوے پر لگا رہا تھا۔ قریب ہی چند لکڑیاں جل رہی تھیں۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، لیکن سیاہی بہ دستور جوبن پر تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر کے مجھے سڑک سے دُور لے آیا تھا۔ ہم ایک درخت کے تنے سے لگے بیٹھے تھے۔ یہ گھنا جنگل تھا، درخت پر درخت اور جھاڑی پر جھاڑیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ گاوڑا اور گیدڑوں کی چیخیں گاہے گاہے گونج رہی تھی۔

"تم نے ناحق اپنا وقت خراب کیا۔" میں نے اُسے بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"بہت مضبوط آدمی ہو۔ بہ مشکل دو گھنٹے بے ہوش رہے ہو۔ اگر میں تمھارے حلق میں محلول خوراک انڈیلتا رہتا تو تب بھی چوبیس سے چھتیس گھنٹوں تک ہی تمھیں ہوش میں آنا تھا، میرے لیے یہ بہت حیرت انگیز بات ہے۔" اُس کے چہرے سے حیرانی مترشح تھی۔

"تمھیں بتایا تھا! میں بہت ڈھیٹ واقع ہوا ہوں۔ موت میرا مذاق اُڑاتی ہے۔"

"تازہ زخم کی وجہ سے تم متحرک تھے، لیکن اب یہ ممکن نہیں۔ آٹھ انچ لمبا اور ایک انچ کے لگ بھگ گہرا زخم ہے۔" لیونارڈ نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔ وہ بہت مہارت سے کھولی گئی پٹیوں کو دوبارہ لپیٹ رہا تھا۔

"اپنی راہ کھوٹی مت کرو۔ چاقو اپنے پرائے کی شناخت رکھتے ہیں۔"

"زخم کو سیا نہ گیا تو مہینوں پڑے رہ سکتے ہو۔" اُس نے عجیب انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ گویا ترازو میں تول رہا تھا۔

لیونارڈ بلا شبہ میرے ساتھ اپنائیت اور ہمدردی کر رہا تھا، لیکن مجھے اُس کی دست گیری سے غیریت کی بُو آ رہی تھی۔ کم از کم جنگل میں تو مشرق کو بالادست ہونا چاہیے۔ میری منزل کھو گئی تھی۔ دوراہا ایک جانب رُرکی کے اڈے تک جاتا تھا اور دوسری جانب مشعل کے تعاقب میں۔ مشعل صرف میری وجہ سے بوری میں بند اذیتیں سہہ رہا تھا۔ اُس کے لیے ایسی شعبدہ گری بائیں ہاتھ کا کھیل تھی۔ دل بھی عجیب ہے سر دار بھی راستے سجھاتا ہے۔ کہنے لگا کہ تمھیں مشعل کی ضرورت رہتی ہے۔ مشعل تمھارا محتاج نہیں، لیکن کورا کا صبر پیانے سے ہوا ہے، اُسے تمھاری ضرورت ہے، وہ منتظر ہے تمھاری۔ میں بڑبڑا کے اُٹھا، شدید درد نے جسم پر قفل ڈال دیے تھے، لہرا کے ہی رہ گیا۔ اُبلتے ہوئے چشمے کی طرح

میرے پورے بدن سے تکلیف پھوٹ پڑی تھی۔ لیونارڈ بے تابی سے سرہانے پر آگیا۔ اُس نے میرے کندھوں کو تقریباً دھکیلتے ہوئے تختے سے لگا دیا۔

"تمھاری جواں مردی اور بہادری میں کلام نہیں، لیکن میرے دوست یہ زخم جراحت کا متقاضی ہے۔ تمھیں سمجھنا چاہیے کہ ہم کسی قصبے یا شہر میں موجود نہیں ہیں۔ یہ خطرناک جنگل ہے، یہاں سے عمومی طور پر بھی نکل گزرنا کارِ محال ہے، چہ جائیکہ بندہ شدید زخمی ہو۔"

وہ غصّے سے بولنے لگا۔ اُس کے لہجے میں برہمی، ناراضی، شکوہ اور خلوص سبھی کچھ تھا۔ نہ جانے یہ کیوں میری خاطر اتنا کشٹ کاٹ رہا تھا۔

"میں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے جانا ہے، خواہ گھسٹ کے ہی جانا پڑے۔" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ میں اُس کے سے نرمی اور حلاوت کہاں سے لاتا۔

"یہاں کوئی بھی ٹھہرنا نہیں چاہے گا۔ ہندوستانی بے حد جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ یہ ٹھنڈے دل سے سوچ کر عمل کرنے کا وقت ہے۔ تدبیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔"

"میں نے تمھیں ٹھہرنے کو نہیں کہا۔ چلے جاؤ یہاں سے۔" آخر میں پوری قوت سے چیخ پڑا۔ سینے سے کچھ نکل کے لفظ میں تحلیل ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے، تم اس جھنڈ سے باہر نکل کے دکھا دو۔ میں تمھیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" لیونارڈ ہاتھ جھٹک کے کچھ سے دور جا کھڑا ہوا۔

میں محسوس کر رہا تھا، مجھ میں اُٹھ کھڑے ہونے کی سکت نہیں تھی، لیکن اس آتشِ غرور کا کیا کیا جائے جو سینے میں دہک رہی تھی۔ میں نے اُٹھنے کی جان توڑ کوششیں کیں، لیکن درد اور نقاہت نے آڑے ہاتھوں لیا۔ لیونارڈ دور کھڑا مسکراتا رہا، لیکن اُس کے انداز میں استہزا نہیں تھا۔ آخر میں نڈھال ہو کے گر پڑا۔

"اب تم خود کو میرے سپرد کر دو۔ دن کی روشنی میں انسانی آبادی تلاش کریں گے۔ میں خوراک کا بندوبست کرتا ہوں۔ تم جامن کے درخت تلے بیٹھے ہو۔"

وہ چلا گیا۔ میں نے آنکھیں موند لیں۔ میرے پاس مقدر کو کوسنے کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ اِس سے بہتر بار دیپ کی قید تھی۔ مجھ میں بھٹل کو دوبارہ اپنی منحوس صورت دکھانے کا قطعاً یارا نہیں تھا۔ بار دیپ کوئی معمولی ڈاکو نہیں تھا۔ گرد و نواح کی بستیوں میں لازماً اُس کا اثر و رسوخ ہوگا۔ تبھی تو وہ اِس آسانی سے گزرتا چلا گیا تھا۔ اب تک ہمارا فرار پوشیدہ نہ رہا ہوگا، اور اصولی طور پر وہ بہر قیمت ہماری تلاش میں لگے ہوں گے۔ وہ یہاں کے باسی ہیں، چپے چپے سے شناسا ہوں گے۔ وہ جلد یا بدیر ہم تک پہنچ سکتے تھے، اور میں اب کورا کا سراغ گنوانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ کورا کا خیال آتے ہی بھٹل کسی کونے میں جا دبکتا تھا، اور کچھ میں بھی اپنے دو غلے پن سے واقف تھا۔ لیونارڈ نے چھوٹا سا الاؤ روشن کیا تھا، مگر روشنی حسبِ ضرورت تھی، وہ ناشپاتیوں سے لدا پھندا کچھ دیر میں لوٹ آیا۔ قاشیں کاٹ کاٹ کے میرے مُنھ میں ٹھونسنے لگا۔ اُس کا کہنا تھا کہ میں جتنی زیادہ ناشپاتی کھاؤں گا بدن میں اُتنا ہی خون بھرے گا۔ میں اُس کے سامنے سپر ڈال چکا تھا۔ وہ خاصا باتونی اور دل چسپ بیاں تھا۔ اُس کی ذہانت میں سادگی کی آمیزش نمایاں تھی۔

وہ بات بے بات مجھ سے محبت اور عقیدت کا اظہار کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ میری وجہ سے اُسے دوبارہ اپنی محبوبہ سے ملنے کی امید ہو چلی ہے، ورنہ وہ دل چھوڑ بیٹھا تھا۔ اُس کے نزدیک اِس وقت مجھے چھوڑ کے آگے بڑھ جانا محبوبہ سے بے وفائی کے مترادف تھا۔ وہ جینی کا ذکر کرتے ہوئے بچّوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ اُس نے بتایا کہ جینی لندن پولیس میں افسر ہے وہ آئندہ برس شادی کر رہے تھے۔ جینی ڈھیر سارے بچّوں کی خواہش مند تھی، وہ شادی کے بعد بھرپور گھریلو زندگی کے خواب دیکھتی تھی۔ اُس معاشرے کی فضیلت کا کیا بیاں ہو جس میں عورت گھریلو

زندگی کے خواب دیکھ رہی ہو۔ لیونارڈ نے بتایا کہ اُسے جینی کا ڈھیر سارے بچّوں والا منصوبہ بالکل پسند نہیں ہے، لیکن وہ جینی کی خاطر داری کے لیے ہاں میں ہاں ملاتا ہے، تاہم اُس کے منصوبے میں بھرپور ساتھ دینے کا عزم بھی رکھتا تھا۔ لیونارڈ کے بہ قول بار دیپ نے حماقت کی تھی، کیوں کہ انگریز حکومت کسی صورت معمولی درجے کے ڈاکو کے سامنے نہیں جھکے گی اور نہ ہی اپنے آدمیوں سے دست بردار ہوگی۔ اُس کا خیال تھا کہ آج صبح دلّی حرکت میں آجائے گا۔ بار دیپ نے انتہائی غیر محتاط نقل و حرکت کی تھی۔ حکومت آناً فاناً اُس کے ٹھکانے کا کھوج نکال لے گی، لیکن میرے خیال میں ایسا خطرناک قدم اُٹھانے والا غیر محتاط نہیں ہو سکتا تھا۔ لیونارڈ نے میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں جاننا چاہا، پھر میری خاموشی پر اُس نے اصرار نہیں کیا۔ وہ بہت دیر تک بولتا رہا۔ اُس نے دیو مالائی ہندوستان میں ملازمت کے تجربات، مشاہدات اور دل چسپ واقعات سنائے۔ وہ ایک پیشہ ور داستان گو کی طرح گفتگو میں مزاحیہ چٹکلے کا تڑکا لگانے کا ہنر جانتا تھا۔ اُس کی زبان خوش سلیقگی سے آراستہ تھی۔ وہ میری انگریزی پر حیران تھا۔ اُس نے کسی ہندوستانی کو اِتنی شان دار اور شستہ انگریزی بولتے نہیں سنا تھا۔ وہ نہ جانے کب تک اور کیا کیا بولتا رہا۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ کب مجھ پر غنودگی طاری ہوئی اور کب میں سویا۔

تیز چہکار میں میری آنکھ کھلی۔ پرندے بھی صبح صبح گئے دن کی خبر اس دل کھول کے نکالتے ہیں اور خوب باتیں کرتے ہیں۔ اُن کا نوکیلا شور بہت تیز تھا، لیکن خوش سماعت تھا۔ دھوپ نے گھنے درختوں کے اوپر پہرا بٹھا لیا تھا اور فرحت بخش تمازت کو ملگجی روشنی کے ہم راہ نیچے بھیج دیا تھا۔ چاروں طرف سے نکھرا ہوا سبز رنگ پھوٹ پڑ رہا تھا۔ یہ جامن، ناشپاتی، بیر، زیتون، شیشم اور پیپل کے جنگلی درخت تھے، جن پر چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پھولوں سے لدی بیلیں چکرا رہی تھیں۔ میں نے کچھ ہی دیر میں اندازہ لگا لیا تھا یہ انتہائی گھنا جنگل تھا۔ اِس کے بیچ سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ آگے بڑھنے کے لیے سڑک کے پہلو ہی میں سفر کیا جا سکتا تھا جو بے حد خطرناک تھا۔ لیونارڈ میرے پہلو میں بے خبری کی نیند کر رہا تھا۔ میں اپنے جسم میں خاصی توانائی محسوس کر رہا تھا۔ یہ ناشپاتیوں کا کمال تھا: وہ میٹھاس بھری اور رسیلی تھیں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے ڈھیر میں سے ایک اور ناشپاتی اُٹھالی۔ مجھے بھوک نہیں تھی، تاہم میں نے بالجبر ایک ایک کر کے تمام ناشپاتیاں کھا لیں۔ ہمارے اِرد گرد موجود تمام درخت رزق سے لدے ہوئے تھے۔ دفعتاً جھاڑیوں میں سے ایک غزال نے مُنھ نکالا۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں میں حیرانی اور معصومیت بھر کے کچھ دیر دیکھا کیا، پھر چھپاک سے غائب ہو گیا۔ سرسراہٹ بتا رہی تھی کہ اُس نے خوب قلانچیں بھری تھیں۔ لیونارڈ بھی بیدار ہو گیا تھا۔ وہ کسل مندی سے کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا، پھر بولا: "کیا محسوس کر رہے ہو دوست!"

"تمھارا بہت شکریہ... بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے اُس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ جنون کو جواز بنا کر تار روائی کو روا نہیں رکھ جا سکتا تھا۔ میرا رویّہ غیر مہذبانہ تھا اور وہ ایک مہذب دنیا کا نمائندہ۔

"شکر ہے! اب بخار نہیں ہے..." لیونارڈ نے فکر مندی سے میری پیشانی کو چھوا۔ "تم نیند میں رات بھر بولتے رہے ہو۔ تکرار کی وجہ سے ایک لفظ مجھے سمجھ آسکا۔ تم متواتر کسی کورا کو پکار رہے تھے۔"

"ذہنی خلل کا عارضہ ہے مجھے... ایسا عموماً ہوتا رہتا ہے۔"

"کورا تمھاری جینی کا نام ہے؟" اُس نے آنکھ ماری، اور وفورِ اشتیاق سے نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے... یہاں سے نکلنے کی فکر کرنی چاہیے۔"

"طرح دینے میں ملکہ رکھتے ہو۔"

"تم جب سو رہے تھے تب میں نے کوشش کی تھی۔ میرا خیال ہے کچھ وقت ہوگی، تاہم میں چل سکتا ہوں۔"

اِسے کیسے بتاتا، کورا کا نام کسی دوسرے کے مُنھ سے ادا ہوتا

مجھے کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔

"قطعاً نہیں۔ تمھارا زخم بھرنے تک میں نے یہیں ٹھہرنے کا منصوبہ بنالیا ہے... ذرا سی بے احتیاطی گھاؤ کو ناسور بنا سکتی ہے۔ بہت خطرناک زخم لگایا ہے تم نے۔"

لیونارڈ نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

"کچھ تو میرے جسم کے لیے سوغات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب میرے لیے ٹھہرنا ناممکن ہے۔ میرا اتنا خیال ہے تو میں تمھارے سہارے چل سکتا ہوں۔"

"بات سہارے کی نہیں ہے میرے دوست! پاؤں پر جیسے ہی دباؤ پڑے گا زخم ہرا ہو جائے گا۔ تمھیں کم از کم تین دن یہیں ٹھہرنا ہوگا۔" اُسے میری صورت پر گھنڈتے ہوئے دلائل واضح نظر آرہے تھے۔ کچھ سوچ کے بولا۔ "ایک ترکیب یہ ہو سکتی ہے کہ کسی درخت پر مچان بنا کر تمھیں وہاں چھوڑ دوں اور سڑک پر کسی سواری سے امداد طلب کروں۔"

"ایسی غلطی کا سوچنا بھی مت۔ وہ باولے کتوں کی طرح ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے، اور تم ایک لاکھ افراد کے مجمع میں بھی فی الفور غیر مقامی شناخت کر لیے جاؤ گے۔ مقامی آبادی کی صورت حال سے ہم قطعاً ناواقف ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ہم کس جگہ پر موجود ہیں۔ مجھی کو آگے چلنا ہوگا۔" وہ ضد کر رہا تھا اور مجھے کوفت ہونے لگی۔

"تو پھر تین دن تک تم ہاتھ پاؤں چراں خاموش پڑے رہو... یہ جنگل رزق سے بھرا پڑا ہے۔ گوشت، پھل اور پانی یہاں وافر مقدار میں موجود ہیں اور دسترس میں بھی ہیں۔"

اُس سے بحث کرنا بے کار تھا، لہٰذا میں نے فی الحال ہتھیار ڈالنا مناسب سمجھا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کے ہی میں یہاں سے جا سکتا تھا، اور یہی سچ تھا۔ میرے تلوے میں ٹیسیں وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جا رہی تھیں۔ کسی بھی امداد کے آنے سے پیش تر یہاں سے نکلنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میں چند قدم بھی نہیں چل سکوں گا۔ یہ آبرومندی کا خلجان تھا جو میں تنہا نکل کھڑے ہونے کے دعوے کر رہا تھا۔ کچھ دیر میں میرے شانے خود بہ خود ڈھلک گئے میں نے خود کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا۔ میں نے سنا تھا جنگل میں زخمی مسافروں کو جڑی بوٹیاں مل جاتی ہیں جن کی جادوئی تاثیر لمحوں میں گھاؤ بھر دیتی ہے۔ امی نے بچپن میں خضرؑ کی کہانیاں سنائی تھیں۔ خضرؑ کی مسیحائی مسافروں ہی پر منحصر تھی۔ ستارہ دست پریوں کے قصے بھی بچپن میں بے شمار سنے تھے کہ کس طرح وہ مصیبت زدہ مسافروں کی دست گیری کرتی ہیں۔ حقیقتاً میں نے بھی ایسے ہی کسی کرشمے کے انتظار میں خود کو راضی کر لیا تھا۔ قدرت نے بڑا لطف کیا تھا۔ کورا کو ایک مرتبہ دکھا دینا ہی سیر چشمی تھی۔

لیونارڈ خربوزے سے ملتے جلتے ایک پھل کا ڈھیر اُٹھا لایا تھا۔ میرا چاقو اُس کے پاس تھا، پھر اُس نے ایک قدرے بڑے، لیکن سوکھے ہوئے پھل کو اندر سے ... کیا اور مجھے بتایا کہ یہاں بالکل قریب ہی شفاف پانی ... ہے۔ وہ اس پھل میں میرے لیے پانی لے آ... وہ چند لمحوں میں پانی بھر کے لے آیا۔ میں اُس کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ وہ خوشی خوشی سب کام کر رہا تھا اور مجھے یہ سب زہر لگ رہا تھا۔ اُس کی چابک دستی دیدنی تھی۔ اس سے بڑھ کے اُس کا ذوق و شوق قابلِ دید تھا۔ وہ پھل میوۂ شیریں تھا۔ لیونارڈ نے بھی طبیعت سے کھایا اور میں نے بھی معدے میں اُسے ٹھونس ٹھونس کے بھرا۔ پانی بھی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم فارغ بیٹھے تھے۔ مجھے پھر کوفت ہوگئی۔ چل کھڑا ہونے کو جی مچلنے لگا۔ شکم سیری کے بعد میں خود کو توانا محسوس کر رہا تھا۔ نقاہت بہ تدریج ختم ہو رہی تھی۔ میں نے تنے کا سہارا لے کے اُٹھنے کی کوشش کی۔ لیونارڈ لاتعلق بیٹھا رہا۔ اُسے معلوم تھا میں گر پڑوں گا۔ جب میں بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا تو وہ حیرت سے آنکھیں پٹپٹانے لگا۔ میں یکا یکی اور آسانی سے کھڑا ہوا تھا۔ یقیناً مجھے خوشی ہوئی۔ لیونارڈ کی نگاہوں میں ستائش ہی ستائش تھی۔

"میں چل سکتا ہوں لیونارڈ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میرے لہجے میں تفاخر کی معمولی رمق لیونارڈ نے ضرور محسوس کی ہوگی۔

"میں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، لیکن یقین نہیں کر سکتا۔ نصف طبیب ہوں۔"

میں نے جیسے ہی قدم بڑھایا، درد کا برق رفتار سوتا زانوں سے نکل کے تلوے کی طرف دوڑا۔ پھر تلوے اور دماغ میں بہ یک وقت ایسے شدید دھماکے ہونے لگے کہ بالآخر قوتِ ارادی کو مات ہوئی اور میں خاموشی سے دوبارہ بیٹھ گیا، اور لمبے لمبے سانس بھرنے لگا۔ لیونارڈ نے چاقو بند کر کے میری طرف اچھال دیا۔

"بہت کٹیلی دھار ہے اس کی۔ تم نے بوری کاٹتے وقت انتہائی مہارت سے چلایا تھا۔ تم چاقو زن ہو۔" لیونارڈ نے ... ادل بدلنے کو دانستہ نیا موضوع چھیڑا تھا۔

"خاص مہارت نہیں ہے، البتہ یہ میری انگلیاں پہچانتا ہے ... اشارے سمجھتا ہے۔"

"واہ، کیا خوب صورت انداز میں واقعہ بیان کیا ہے۔ ... ہندوستانی، کیا انگریز ... مجھے آج تک کسی نے ... متاثر نہیں کیا۔ میرا ... نہیں ... کہ زندگی میں کبھی تم سے رخصت ہوں۔" اُس کے لہجے عقیدت کا شیرہ ٹپکا رہا تھا، حالاں کہ مجھے اُس کا عقیدت مند ہونا چاہیے تھا۔

"سڑک کتنی دُوری پر ہے؟" میں نے سانس قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

"ہم برلبِ سڑک ہی بیٹھے ہیں۔ اُن جھاڑیوں کے دوسری جانب سڑک ہے۔ تمھیں یہاں تک بہ مشکل لا سکا تھا۔ یہ خود رو راستہ ہے۔ اب تک یہاں سے کوئی نہیں گزرا۔" لیونارڈ نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

آمد و رفت نہ ہونے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ راستہ صرف یاروشیہ کے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ یہ شاہراہِ عام نہیں تھی۔ اس اعتبار سے ہم یاروشیہ کے ٹھکانے کے قریب تھے۔ لیونارڈ نے میری سوچ پڑھ لی تھی۔ بولا۔ "مجھے بھی یہ

شاہراہِ عام نہیں لگتی، البتہ اس کے ساتھ چلتے چلتے ہم کسی شاہراہِ عام تک پہنچ سکیں گے۔"

"وقت کافی گزر چکا ہے۔ اُن کے مطابق ہمیں اس علاقے سے نکل جانا چاہیے تھا۔ وہ ہمیں اس علاقے میں تلاش نہیں کریں گے۔" لیونارڈ نے مجھے خاموش دیکھ کے کہا۔

"میرا قیاس مختلف ہے دوست! اُنھوں نے رکی تلاش کا کام مکمل کر لیا ہوگا۔ دو افراد کی کمی اُن کے مقصد کے لیے بے ضرر ہے۔ جیسا کہ تم بتا رہے ہو، ہم برلبِ سڑک ہی پڑے ہیں تو ہمیں کھوجنا نہایت ہی آسان کام تھا۔ غالباً اُنھوں نے ایسا کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"مطلب... نزدیکی بستیوں میں ہمارے لیے خطرہ نہیں ہوگا؟" لیونارڈ نے چونکتے ہوئے کہا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"یہ مختلف قیاس ہیں جو باہم مشروط نہیں ہیں۔ تلاش کے جوکھم سے گریز کرنا اور از خود ہی مطلوب کا حاصل ہو جانا دو مختلف باتیں ہیں۔" میں نے تنے سے سر لگاتے ہوئے کہا۔

"تم حیرت انگیز ہو... بے پناہ ذہین... ہندوستانی قطعاً پسماندہ نہیں ہیں۔ تم نے میری رائے تبدیل کر دی ہے۔"

لیونارڈ کے چہرے پر شوق دیدنی اور بے جا تھا۔ یہ بہت سامنے کی بات تھی۔

ہم بہت دیر تک مختلف تجزیے اور اندازے لگاتے رہے۔ بین اسطور ہم دونوں ہی وقت گزاری کر رہے تھے۔ لیونارڈ کو یقین تھا کہ باروبیہ کی سرکوبی کے لیے بڑے پیمانے پر فوجی کارروائی کی جائے گی۔ وہ مجھے بار بار تسلی دے رہا تھا کہ میرے ساتھیوں کا بال بیکا نہیں ہوگا اور یہ کہ حکومتِ برطانیہ انسانی اقدار کی پامالی کو قطعاً برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ ہندستان میں انگریز حکومت کے کارہائے عظیم گنواتا رہا۔ اُس کا کہنا تھا کہ انگریزوں نے پورے جہاں میں انسانیت کا سربلند کرنے اور انصاف پھیلانے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور اُسے فخر ہے کہ انسانی تاریخ کے عظیم دور میں اُس کی خدمات بلاواسطہ شامل ہیں۔ مستقبل کا مؤرخ جہاں انگریزوں کی عظمت سنہرے حروف سے رقم کرے گا وہیں کہیں اُس کا نام بھی شامل تحریر ہوگا۔ خواہ بین السطور ہی سہی۔ وہ کہنے لگا کہ ہندستان کے بوسیدہ فرسودہ نظام کو ہم نے یکسر ترقی سے مربوط کر دیا ہے۔ ہم نے یہاں تعلیم، صحت، قانون، آمدورفت، آسائشات کا صرف فلسفہ ہی نہیں دیا، بل کہ عین وہی نظام یہاں کے لوگوں کو دیا ہے جو مملکت انگلستان میں رائج ہے۔ جو نظام انگریزوں کے طویل تجربات اور عظیم اذہان کا نتیجہ ہے۔ ہم نے تعلیم کو نوابوں اور راجوں کے محلات سے نکال کے عوام الناس کی دہلیز تک پہنچایا ہے۔ ہم نے وہ تجربات جن کی قیمت صدیاں نہیں چکا سکتیں یہاں خدمت خلق میں فراواں کر دیے ہیں۔ وہ نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا، میں بس خاموشی سے سنا کیا۔ میرے دل نے شمار باشمار کروٹیں بدلیں کہ ہندستانیوں کا موقف بھی اس من چلے انگریز کے روبہ رو رکھا جائے، لیکن نہ جانے کیوں لیونارڈ کی خوش گمانی اور حماقت چھیننا، سفا کی محسوس ہوئی... کیا برا تھا جو یہ عمر بھر یوں ہی خوش اور مطمئن رہے۔

دوپہر کے وقت وہ ندی پر نہا آیا تھا اور مزید کچھ پھل توڑ لایا تھا۔ اُس نے شیشم کی سڈول شاخ کو توڑ کے تراش لیا تھا، یوں لکڑی کا ایک بہترین نیزہ تیار ہو گیا تھا۔ چاقو بہت کارآمد رہا۔ تیسرے پہر وہ ایک تڑپتا ہوا خرگوش اٹھا لایا۔ کہنے لگا کہ میں اسے نیزہ گھونپ کے وہیں مار دیتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ مسلمان اسے مخصوص طریقے سے ہلاک کرتے ہیں، بہ صورتِ دیگر گوشت کو ناپاک تصور کرتے ہیں۔ میں نے خرگوش ذبح کر دیا، حالاں کہ پھلوں سے عمدہ گزارا ہو رہا تھا۔ دیاسلائی اُس کے لباس میں موجود تھی۔ وہ سگار کا شوقین تھا۔ لیونارڈ نے بتایا تھا کہ انگلستان میں سگار پینے والے مردوں پر خواتین ملتفت رہتی ہیں۔ کچھ ہی دیر میں اُس نے گوشت بھون لیا۔

"ہمیں جنگی میدانوں میں کھانا پکانے کی خاص تربیت دی جاتی... ویسے تمھارا چاقو خوب ہے۔ ذرا سوچو، اگر یہ نہ ہوتا تو شاید تم سے ملاقات نہ ہوتی۔" اُس نے چاقو صاف کر کے میری طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

بھنے ہوئے گوشت میں، گرچہ نمک مسالا استعمال نہیں کیا گیا تھا، تاہم بہت لذت آور تھا۔ گوشت کی تکلیف حسّی کم محسوس ہو رہی تھی۔ شکم سیری اور نیند جنم جنم کی سہیلیاں ہیں۔ مجھ پر بھی غنودگی غلبہ پا رہی تھی اور لیونارڈ تو گوشت چباتے وقت ہی جھوم رہا تھا۔ اُسے نیند میں مگن دیکھ کے میری بھی آنکھ لگ گئی۔ گھور اندھیرا تھا! اتنی تاریکی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ آنکھ کا کھلنا بے وجہ نہیں تھا، لیکن وہاں سوائے سرسراتی ہوا کے شور کے اور کچھ نہیں تھا۔ لیونارڈ میرے برابر پڑا سو رہا تھا۔ میں نے گھور گھور کے چاروں اطراف کا جائزہ لیا، مگر خطرے کی کوئی بات محسوس نہ ہوئی۔ چھٹی حس بھی صاحبانِ قلم نے خوب ایجاد کی ہے، بندے کو پیغمبر بنا دیتی ہے۔ دفعتاً عین سامنے پتوں میں غیر معمولی سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ جھاڑیوں کے بیچ سے دو سرخ دہکتے ہوئے انگارے اِدھر ہی تکے ہوئے تھے۔ میری آنکھ عین موقع پر کھلی تھی، وہ کوئی درندہ تھا جو حملے کے لیے اپنے قدم جما چکا تھا۔ میرے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ ایسے ظلمات میں اِس آفت ناگہانی سے بچاؤ ناممکن تھا۔ میں نے فوراً غیر محسوس انداز میں جیب ٹٹولی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ چاقو میری جیب میں نہیں تھا۔ وہ میرے قریب ہی زمین پر کہیں موجود تھا۔ میں نے دائیں بائیں جگہ ٹٹولی مگر چاقو پر ہاتھ نہیں پڑا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ درندہ گھات لگانے کے بعد شکار کی حرکت کا انتظار کرتا ہے اور ساکت شکار پر عموماً حملہ نہیں کرتا۔ اس وقت لیونارڈ کو بیدار کرنا آ بیل مجھے مار کے مترادف تھا۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ لیونارڈ نے کروٹ لی۔ اُس کے ساتھ ہی ہیبت ناک غراہٹ بلند ہوئی۔ جیسے برق لپکتی ہے ایسے بلائے بے اماں جھاڑیوں میں سے نکلی اور سیدھی لیونارڈ پر آ پڑی۔ جیسے خواب میں ڈر کے بچہ چیختا ہے، لیونارڈ نے بھی ویسی ہی مادر سوز چیخ ماری۔ کچھ ہٹ اور اچک کر ایک انچ دے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اندھیرے میں مجھے صرف دو دہکتے ہوئے انگارے نظر آ رہے تھے۔ میں نے بے قرار ہو کر اپنے زانو کی طرف ہاتھ مارا تو چاقو ہاتھ لگ گیا۔ اسی ثنا میں لیونارڈ کٹتے ہوئے بکرے کی طرح غرغرایا تھا۔ میرے پاس ایک لمحے کا بھی وقت نہیں تھا۔ دفعتاً جھاڑیوں کی طرف سے غراہٹوں کا طوفان سنائی دیا اور اَن گنت دائروں میں تیرتے ہوئے انگارے دکھائی دیے۔ اُس لمحے مجھے معلوم ہوا کہ درد بھی انسان کی اختراع ہے۔ میں اِس طرح کھڑا ہو گیا جیسے میرے پاؤں میں زخم کبھی تھا ہی نہیں۔ اگلے ہی لمحے میرا چاقو درندے کی انگارہ صفت آنکھوں میں دستے تک اتر گیا تھا۔ اندھیرے میں اِس سے بہتر ہدف ممکن نہیں تھا۔ میں نے دیر نہیں لگائی۔ اندازے سے ہاتھ مارا اور چاقو کھینچ کے دوسری آنکھ میں گھونپ دیا۔ میں سینے کے بل اُس درندے پر پڑا تھا جو میرے اندازے کے مطابق ایک قوی الجثہ شیر تھا۔ اُس نے ایک وحشیانہ دھاڑ بلند کی اور لیونارڈ کو چھوڑ کے پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ وہ ایسی زور سے دھاڑ رہا تھا کہ زمین دھمکنے لگی تھی۔ میں نے بے تابی سے لیونارڈ کو ٹٹولا، اُس کا بدن بری طرح لرز رہا تھا اور وقفے وقفے سے خرخر کی آواز اُس کے منھ سے نکل رہی تھی۔ اُس کی گردن اور کاندھا تر بہ تر تھا۔ اِس گیلے پن کا موجب یقیناً خون تھا۔ میں نے لیونارڈ کو جھنجھوڑ کے پکارا، لیکن جواب ندارد تھا۔ اُس پر غشی طاری تھی۔ اس وقت سب سے بڑی مصیبت اندھیرا تھا۔ اندھیرے کا خیال آتے ہی میں نے ٹٹول کے لیونارڈ کی پتلون سے دیاسلائی نکالی۔ اُس نے خشک لکڑیوں کا ایک ڈھیر جمع کر رکھا تھا۔ میں نے جلدی جلدی ان میں آگ بھڑکائی۔ یکایک روشنی سے سارا ماحول منور ہو گیا۔ لیونارڈ کے کندھے پر معمولی نوعیت کا زخم تھا۔ البتہ وہ بے ہوش تھا، جس کی وجہ بہ ظاہر بے انتہا اور غیر متوقع خوف ہو سکتا تھا۔ اگر اُس کی ہڈیاں صحیح سالم تھیں تو وہ بالکل صحیح تھا۔ اُس کے گلے سے "خرخر" کی آوازیں نکلنا بند ہو گئی تھیں۔ اب وہ متوازن انداز میں سانسیں لے رہا تھا۔ لیونارڈ کے پیروں سے چند ہاتھ آگے وہ عظیم الجثہ موذی بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ بہت بڑا اور ہیبت ناک تھا۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ببر شیر اتنا بڑا بھی ہو سکتا تھا۔ اُس کی دونوں آنکھوں سے بھل بھل کرتا خون متواتر بہہ رہا تھا۔ چاقو دماغ تک راستہ بنا گیا تھا۔ تبھی اُسے قدم بھرنے کی بھی مہلت نہیں مل سکی تھی۔ شکار میں حصہ بٹانے والے دوسرے شیر بھاگ نکلے تھے۔ وہ جان گئے تھے شکار ان سے زیادہ وحشی اور خطرناک ہے۔ میں نے فی الفور کرتا اتارا اور ایک دھجی پھاڑ کے لیونارڈ کے کندھے سے خون صاف کرنے لگا۔ وہ زخم نہیں تھا، معمولی نوعیت کی کھرونچ تھی، جس سے خون کا رساؤ اتنا ہی تھا جو میں اُس کے کندھے سے صاف کر چکا تھا۔ اُس کے شدید زخمی ہو جانے کے خوف سے میری روح فنا ہو رہی تھی۔ اُس کی بہتر حالت کو جانچ کے میرے اندر ٹھنڈک چشمے کی طرح اتر گئی۔ دراصل انسان اس شیر کا بھی

مرتبہ شکار بنا تھا، ورنہ وہ بس کی جسمانی ساخت سے ناواقف تھا، اسی لیے مطلوبہ نازک مقام تلاش کرنے میں اُسے دیر لگی تھی۔ بہ صورتِ دیگر ایک ضرب میں لیونارڈ کی گردن کی ہڈی توڑنا بہت ہی کم عرصے کا کام تھا۔ یہ چوٹ گہری تھی۔ کچھ دیر بعد وہاں روشنی کے لیے آگ کی ضرورت نہیں بچی تھی۔ لیونارڈ کے بدن میں ہل جل کے آثار بتا رہے تھے کہ وہ ہوش میں آنے والا ہے۔ چند لمحوں بعد وہ ایک جھٹکے سے کسمسا کے اُٹھ بیٹھا۔ عین سامنے گوشت پوست کا ہیبت ناک پہاڑ پڑا دیکھ کے اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کو ہوگئیں، پھر اُس نے نظریں گھما کے مجھے دیکھا اور خوابِ غفلت سے یکایک باہر آ گیا۔ کچھ دیر مبہوت دیکھا کیا۔ اس پر شادیِ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔ تشنج کے مریض کی طرح اُس کے بدن کی بوٹی بوٹی تمازت سے پھڑکنے لگی۔ وہ لرزتا ہوا اُٹھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ فرطِ عقیدت سے دیوانہ وار میرے چہرے، ہاتھوں، ور پیروں کے بوسے لینے لگا۔ میں نے اُسے روکنے کی بے حد کوشش کی، لیکن وہ تو پارہ صفت ہوا تھا، بجلی کی طرح مچل رہا تھا۔ "تم بہت عظیم نسان ہو۔ دیومالائی کردار کی طرح دکھتے ہو، ہرکولیس!۔ میں عمر بھر تمھاری غلامی میں رہنا پسند کروں گا... مجھے دو مرتبہ جنم دیا ہے تم نے..." اِسی طرح کے تعریفی کلمات اُس کی زباں سے خودرو پودے کی طرح پھوٹنے لگے۔ وہ بے طرح جزک رہا تھا۔ میں نے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔ آخرکار وہ میرے پیروں پر نزاکت سے سر رکھ کے رو پڑا۔ اُس کے سوتے بے تابی سے پھوٹے تھے۔ میں اُس کی کیفیت بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ کبیدگی کے باوجود میں نے اپنے پیر نہیں کھینچے۔ اسی لمحے میں نے یہاں سے فوری طور پر نکلنے کا فیصلہ کیا۔ جذباتی تھپیڑوں کی زد سے لیونارڈ جب ذرا باہر نکلا تو میں نے اُسے شیر کی آنکھ میں گھسا ہوا چاقو نکال لانے کو کہا۔ وہ لپک کر گیا اور چاقو نکال لایا۔ اِس حادثے نے موجودہ مقام کا تعین کر دیا تھا۔ یہ یقیناً ہندستان کا خطرناک گر جنگل تھا۔ میں نے شکالاجی کے ساتھ قیام کے دوران پڑھا تھا کہ افریقہ کے بعد گر کا جنگل دنیا میں وہ واحد مقام ہے جہاں ببر شیر پائے جاتے ہیں۔ گر کا جنگل سرسبز میدانوں اور مختلف النوع اشجار کے میلوں لمبے جھنڈ پر مشتمل تھا۔ ہم اس وقت یقیناً گر کے جنگل میں موجود تھے۔ یہ جنگل درند و پرند دونوں اقسام کے جان وروں سے اٹا پڑا تھا۔ ہمیں یہاں سے جلد از جلد نکلنا تھا، کیوں کہ جنگل میں جہاں لاش پڑی ہو وہاں میلا لگ جاتا ہے۔

"بلا وجہ متشکر ہو رہے ہو... تم نے اپنی زندگی خود بچائی ہے میں نے نہیں۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو... وہ میں ہی تھا جس نے ہول ناک تاریکی میں شیر کی آنکھوں کا اِس قدر سچا نشانہ لگایا تھا۔ بلاشبہ چاقو زنی میں تم نادرِ روزگار ہو۔"

"مدحت سرائی کی بجائے یہاں سے نکلنے کی فکر کی جائے تو بہتر ہوگا۔" اُس کا خلوص سر آنکھوں پر، لیکن [illegible] کا بوجھ بے جان لاشے سے کم نہیں ہوتا۔ میرے [illegible] اکتاہٹ ایک فطری امر تھا۔

"مقدس باپ کی قسم! چلو... میں تمھارے قدموں میں بچھ جاؤں گا۔" اُس کی آواز تپش آلود تھی۔ وہ بے چین ہو کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بن کے چل پڑے۔ چلتے چلتے اُس نے شیر کی کھال اتار لے چلنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جس پر میں بھڑک اٹھا تھا۔ مجھے غصّے میں دیکھ کے وہ چپ پڑ گیا تھا۔ میرے پانو میں درد کے ناقابلِ برداشت پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، لیکن اب قدم رُکنے کے لیے بھی تیار نہ ہوئے۔ ہم نے سڑک کے کنارے کنارے چلنا شروع کر دیا۔ چلنا بھی کیا تھا، ہم دھیرے دھیرے کھسک رہے تھے۔ جہاں دم ٹوٹتا وہاں پڑ جاتے۔ تحائفِ قدرت سے جو مل جاتا، شکم سیری کر لیتے۔ رات آتی تو باری باری نیند کر لیتے۔ قریباً چوتھے روز ہم ایک چوڑی اور بڑی سڑک تک جا پہنچے۔ سرخ اینٹوں سے بنائی گئی سڑک کی دوسری جانب باجرے کی نوخیز فصل ہلکورے

لے رہی تھی۔ صبح دم کا وقت تھا، سورج کا کاروبار ابھی ماند تھا۔ آثار قریب ہی آبادی کی نوید دے رہے تھے۔ ہم بدحالی و ناتوانی کا مجسم نمونہ بنے وہیں ڈھے گئے جہاں سے سڑک کے اُس پار کھیت نظر آتے تھے۔

"اب کیا ارادے ہیں دوست!" لیونارڈ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ خوشی اُس کے چہرے سے ابل رہی تھی۔ راہ چلتے گزشتہ تین دن اُس نے دنیا جہان کی باتوں میں گزارے تھے۔

"تقدیر پر منحصر ہے کہ ہمیں پہلا آدمی کس قماش کا ملتا ہے۔ البتہ مجھے قوی امید ہے کہ ہمیں خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔" میں نے اُسے تسلی دی، لیکن میرے لیے یہ سڑک کڑا امتحان بن کے کھڑی تھی۔ مجھے اُسی جانب جانا تھا جہاں سے ہم آئے تھے۔ اُس لاری کے اڈے پر... اس سے آگے کچھ سوچا نہ گیا۔ بہت دیر ہو چکی تھی، مولوی شفیق کے سراغ پر کئی دنوں کی مٹی پڑ چکی تھی۔ بس کا ڈرائیور اُس کے گماشتے ہفتہ بھر قبل کے کسی مسافر کا سراغ نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن نہیں، میں نے خود ہی اپنی رائے مسترد کی۔ وہ لاری اڈا ایک چھوٹے قصبے کا نظر آتا تھا۔ وہاں سے مولوی صاحب کا سراغ آسانی سے مل سکتا تھا۔ بہت ممکن تھا مولوی صاحب اِس قصبے میں قیام پذیر ہوں۔ وہ کسی کام سے نزدیکی شہر گئے ہوں اور واپس لوٹ آئے ہوں۔ گورا نے بھی ان کے ساتھ جانے پر اصرار باندھا ہوگا یا پھر مولوی صاحب کے لیے گورا سے متعلق قابلِ اعتماد کوئی نہ رہا ہوگا۔

ہم کچھ دیر ستا کے وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے مغربی سمت کچھ بھینی بھینی محسوس ہوئی۔ ہم نے اُسی جانب سڑک پکڑ لی۔ کچھ ہی دیر بعد سورج نے دھوپ بانٹنی شروع کر دی۔ کچھ وہ سخاوت پر مائل تھا اور کچھ اِس راستے پر سایہ مفقود تھا۔ تپش سے جسم پگھلنے لگا تھا۔ چند فرلانگ طے کرنے میں گھنٹوں لگ گئے، لیکن ہم قریب سو کے لگ بھگ مکانات پر مشتمل بستی میں پہنچ گئے۔ ہمارا حلیہ کسی کو متوجہ کرنے کے لیے کافی تھا، گرد اور میل سے اَٹے ہوئے بے ترتیب بال اور بدن کا بالائی حصہ ہم دونوں ہی کا برہنہ تھا۔ کرتا اور قمیص دھجیوں کی نذر ہو چکی تھی۔ اِس کے علاوہ ایک گورے انگریز کا دگرگوں حال میں نظر آنا چٹپٹی خبر تھی۔ جو ایک گلیارے میں قدم رکھتے ہی پوری بستی میں سنسنا گئی۔ چند ہی لمحوں میں متجسس نگاہوں سے گھورتے ننگ دھڑنگ بچوں نے ہمیں گھیر لیا۔ نہ جانے کیوں محسوس ہوا، پس دیوار مکانوں میں سرگوشیاں اور قیاس آرائیاں شروع ہوگئی ہیں۔ بستی کیا تھی سڑک کے کنارے دو تین سو گز تک بچھے گئے مکانوں کا سلسلہ تھا۔ سڑک پر اِکا دُکا دکانیں بھی تھیں۔ لیونارڈ کا خیال تھا کہ یہاں پولیس کی چوکی یا کم از کم ایک سپاہی ضرور تعینات ہوگا اور وہی فی الفور ہمارے کسی کام آ سکتا تھا۔ تھڑے پر چلک لگائے سرخ اور زرد سر ڈھپوں میں ملبوس ساتوں عورتیں، گورے انگریز کو دیکھنے کے لیے در و روزن پر جم گئی تھیں، اور چاروں طرف سے مرد نکل نکل کے ہماری طرف بڑھ آئے تھے۔ یہ جنگل سے قریب ترین بستی تھی۔ اگر جنگل میں باردیہ کا ٹھکانا تسلیم کر لیا جائے تو اِس بستی میں اُس کے گماشتوں اور مخبروں کی موجودگی لازم تھی، اور ہمارا سب سے زیادہ انتظار اِسی بستی میں کیا گیا ہوگا۔ ہم برگد کے ایک جسیم درخت کے سائے میں پہنچ کے ٹھہر گئے۔ درخت کا تنا بے حد تناور اور شاخیں لامکاں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ برگد کے تنے کے ساتھ کرسی میز رکھے حجام ایک بچے کے بال تراشنے میں مصروف تھا۔ گدلا اور دھندلایا ہوا شیشہ اُس نے تنے پر ٹانک رکھا تھا۔ وہ سیاہ فام اور مختی دیہاتی تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی سہم گیا۔ اُس کے ہاتھوں میں مشاقی سے مچلتی ہوئی قینچی دفعتاً سے رک گئی۔ اُس کی آنکھوں میں وحشت سی سمٹ آئی تھی۔ لیونارڈ اناڑی پن سے نلکے کی ہتھی کو ہلانے لگا، جو درخت کے ساتھ ہی لگا ہوا تھا۔ میں نے حجام سے پوچھا، "یہ کون سی بستی ہے؟" مجھے جواب دینے کے بجائے وہ سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ درخت کے چاروں اور دیہاتیوں نے گھیرا ڈال لیا تھا، اُن کی چہ میگوئیاں اور

پریشان نظریں ہمارا احاطہ کر رہی تھیں۔ لیونارڈ نے مجھ سے کہا: ”ان سے پولیس چوکی یا کسی سرکاری ملازم کے بارے میں استفسار کرو۔“ لیونارڈ سمجھ رہا تھا کہ یہ لوگ محض تجسس ہو کے ہمارے گرد جمع ہوئے، لیکن میں اُن کی سراسیمگی سے کچھ اور ہی اخذ کر رہا تھا۔ میں نے حجام سے پوچھا: ”یہاں کوئی پولیس والا ہے؟“ لیکن وہ میری پشت پر کچھ دیکھنے لگا۔

”گھنٹوں پولیس ہے۔ بدھوئی پولس ہے بالک!“

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ بھیڑ کو کھدیڑتا ہوا ایک لمبا تڑنگا، کالا بھجنگ میرے مقابل کھڑا تھا: اُس کا قد دو گز سے قدرے نکلتا تھا۔ چندیا پر سے بال اڑے ہوئے تھے۔ بچے کچھے بال تیل میں چپڑے اور سلیقے سے جمے تھے۔ آنکھیں کبوتر کی طرح سرخ تھیں۔ کلوں کا گوشت لٹکا ہوا تھا۔ اُس کی عمر چالیس سے پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ چہرے کے نشانات سے اُس کی قماش مترشح تھی۔ زرد کرتا، سفید پاجامہ پہن رکھا تھا، اور ماتھے پر سرخ رنگ کا بڑا سا تِلک چمک رہا تھا۔ اُس نے گہری نظروں سے ہمارا طواف کرتے ہوئے کہا، ”پولیس کے تھوپڑ جرور چڑھوائیں گے۔ ابھی ہم سے نیوج نجر کرنے کا ہے، گھنٹوں دتوں سے انتجار کرنے کا ہے۔ بڑھیا کرار گر سے نکل کے۔“ اُس نے گلے میں ڈالا ہوا رومال زور سے جھٹکا۔

چاقو نیفے میں اُڑسا ہوا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہ رہا تھا کہ وہ بارودیہ کا گماشتہ تھا۔ گر وہ بارودیہ کا گماشتہ تھا تو بارودیہ کے گروہ کی تصویر دوسری بن رہی تھی۔ میں پہلی نظر میں اُس کا تجبیل جان گیا تھا۔ یعنی بارودیہ علاقے کے داداؤں اور استادوں کے اکٹھ کو روایت کے برعکس استعمال کر رہا تھا، لیکن قیاس یہاں بھی اُلجھ رہا تھا۔ بارودیہ نے انتہائی منظم طریقے سے بحری جہاز اغوا کیا تھا اور نہایت آسانی سے مغویوں کی بڑی مقدار کو اپنے ٹھکانے تک پہنچانے میں بھی کامیاب ہوا تھا۔ یہ کام اڈّے پاڑے کے لوگوں کے بس کا روگ نہیں تھا اور نہ ہی اُس کے کارندوں میں کوئی شخص ایسا نظر آتا تھا جس پر اڈّے پاڑے سے وابستگی کا شبہ گزرتا، لیکن میرے سامنے تن کے کھڑا ہوا یہ ہر قسم کے شک و شبہے سے بالا تھا۔

”مسافر ہیں، راستہ بھٹک گئے ہیں۔“ میں نے اُسے رسانی سے جواب دیا۔ دفعتاً ہانپتے کانپتے چار مشٹنڈے اور آن وارد ہوئے۔ وہ کہیں دور سے دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ کالا بھجنگ جو یقیناً اُن کا استاد تھا کو دیکھتے ہی ٹھٹک گئے۔ انھیں دیکھ کے وہ بھڑک اُٹھا۔ ”ماں کا خصم دیکھے گئے تھے۔ پہنچے کہاں اِدھر سیر سپاٹے کرنے کا نہیں۔ اُس چھنال پر مرے ہو گے۔“ اُس نے آگے بڑھ کے ایک کو ڈھیلا ہاتھ بھی جڑ دیا۔ لیونارڈ نے مجھ سے صورتِ حال کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے اُسے تسلی رکھنے کا کہا۔ ابھی تک یہ واضح نہیں ہوا تھا کہ وہ ہم سے کیا چاہتا تھا۔ میں نے کرید لگائی۔ ”تمھیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کی غرض سے آیا تھا۔ ہماری جیپ حادثے کا شکار ہوگئی۔ رات کو ہمارے پڑاؤ پر شیروں نے ہلا بول دیا۔ ہم بہ مشکل جان بچا کے یہاں تک پہنچے ہیں۔ اگر آپ لوگ ہمیں نزدیکی شہر تک پہنچا دیں تو بے حد مہربانی ہوگی۔“

”چھلیا سے چھل کرنے کا ہے؟...“ وہ مست شرابی کی طرح جھوما۔ ”بڑا ابا بر جان!...“ میں اُس کے مُنہ سے اپنا نام سُن کے بری طرح اُچھل پڑا تھا۔ ”کیوں سند رہتا! کھڑا میلا کرنے کا نہیں ہے۔ بس نام کا چنا تھی، تُو نے ٹھپا لگا دیا۔“ وہ ڈولتے ہوئے میرے قریب ہو گیا تھا۔ اُس کے مُنہ سے اپنا نام سُن کے میرا پورا وجود سنسنا گیا تھا۔ اُس نے اب تک لیونارڈ پر ذرا بھی توجہ نہیں کی تھی۔ میں نے دو قدم پیچھے کھسک کے اُس کے اور اپنے درمیان فاصلہ بڑھا لیا۔ اپنا نام سُن کے میں اضطرار پوشیدہ نہیں رکھ سکا تھا۔ اب بات آگے بڑھانا بےکار تھا۔

”معاملہ کیا ہے استاد؟“ میں نے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔ چاروں مشٹنڈوں نے چاقو نکال لیے تھے۔

”پانچی دھرتی پھاڑنے کا ہے سوامی جی! گشت بھر دیا بستے میں۔ تیرے ساتھیوں نے بڑا اجلم کیا ہے۔“

ساتھیوں کے ذکر پر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ سر اسیمگی و وحشت سے میرا چہرہ یقیناً تاریک ہوا ہوگا، عجیب بے بضاعتی کا عالم در پے تھا۔ جھل میری گم شدگی سے بپھر گیا ہوگا۔ اُس نے یہ اعتبار تو کیا ہی نہ ہوگا کہ میں فرار ہو گیا ہوں۔ وہ یقیناً آتشِ نمرود میں کودا ہوگا۔ میرے پیروں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ ”کیا ہوا میرا ساتھیوں کو؟“ میں نے اٹکتے ہوئے اُس سے سوال کیا۔

”وہ ابھی ہونے کا ہے بجرووں کے ساتھ... کدھر جانے کا ہے پھر۔ اِدھر بستی بستی سور گباشی باپو کے ہیروں سے بھری ہے۔ گر کے چاروں اُور رکھوالی ہے۔ اُدھر ہی مرنے کا ہے یا پکڑنے کا ہے۔“ وہ شدید غصے میں جھنجھنا رہا تھا۔

”سور گباشی باپو؟“ میری زبان اٹکنے لگی۔

”جرا نشانہ نہیں چوکا۔ دل میں گھسا ہے جا کے چاقو، سیدھ... تیرے ساتھی نے بارودیہ باپو کی بتیا کر دی، ایک راکس مارا گیا، دو بھاگ لیے۔ گوری کنہیا کو لے کے۔ پورا چار جنے تھے نہ تم؟“

وہ اُچھل اُچھل کے چیخ رہا تھا اور میرا دل بند ہو رہا تھا، دھڑکنے سے انکاری تھا۔ ایک راکھس مارا گیا کا مطلب؟ زورا! جبروا یا جھل! یہ سوچ کر ہی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ نہ جانے کتنوں کا قتل میرے دامن پر تھا، موت بھی عجیب طور سے رسمِ عاشقی نبھا رہی تھی۔ بس میرے گرد ہی پروانہ وار رقص کر رہی تھی۔ مجھے اپنی دل بستگی کی خاطر تماشائے عالم کی خاطر زندہ رکھ لیا تھا۔ دوسروں کو گولیاں، خنجر، زخم اور بیماریاں کیوں لگ جاتی ہیں۔ یکا یک میرے ارد گرد کھڑے لوگ دھندلا گئے۔ میں لڑکھڑا کے گرنے لگا تو لیونارڈ نے بڑھ کے تھام لیا۔ ”یار... مجھے کچھ بتاؤ... یہ جاہل شخص کیا بکواس کر رہا ہے۔“

میں اُسے کیا بتاتا۔ یہی کہ میں اپنے پیاروں کے لیے موت کا پیامبر ہوں، دکھ اذیت اور مصیبت میری طرف سے تحفۂ عام ہے۔ جو چاہے گلے سے لگائے اور وصول لے۔ بارودیہ کو جھل ہی مار سکتا تھا، لیکن جھل نے ایسا کیوں کیا تھا، کیا اُس نے مجھے مردہ سمجھ لیا تھا۔ اگر واقعی ایسا تھا تو بارودیہ پر چاقو زنی معمولی کام تھا۔ کون سی گوری میم اُن کے ہم راہ نکلی تھی۔ کیا وہ مایا کو نکال لے گئے تھے۔

”ایک بھی انگریج نہیں چھوڑا سارے مار دیے۔ پانچ بچے ہیں جندہ، ایک تُو، یہ گوری چھنال اور دو تیرے ساتھی!“ چھلیا نے مجھے گردن سے پکڑ کے اُٹھایا۔ ”ابھی رندھاوا تیرے کو جندہ مانگتا ہے۔“

”میں تم سے اُلجھنا نہیں چاہتا۔ میرے راستے سے ہٹ جاؤ!“ میں نے اپنے ذہن پر چھائی اندھیاری کو جھٹکتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ مجھے اُس سے مکمل تفصیل کی حاجت تھی اور وہ اُس سمے حاکمِ وقت تھا۔

”سنتے ہو بستی والو! چھلیا کو راستے سے ہٹانے کا ہے چھورا۔ امّا کا دودھ مُکھ سے چپکا ہے چھن!“ بستی والوں نے قہقہہ لگانا اپنا فرض سمجھا۔ بستی میں اُس کی دہشت ٹھیک ٹھاک لگتی تھی۔

میں نے وقت ضائع کرنا غیر مناسب سمجھا۔ دو دو ہاتھ کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ میں نے نیفے سے چاقو نکال لیا، لیکن چاقو کھولنے سے گریز کیا۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ بند چاقو تولنے کا مطلب مقابل پر حملہ نہیں، بل کہ اُسے اپنا چاقو باہر نکالنے پر اکسانا تھا۔ یہ بات چھلیا بہت بہتر جانتا تھا۔ اُس کے گماشتوں نے یکا یک اپنے چاقو کھول لیے۔ لیونارڈ صورتِ حال کو کسی حد تک سمجھ رہا تھا، اُس کے چہرے پر ایک مرتبہ پھر موت کی زردی کھنڈ گئی۔ چھلیا کی آنکھوں میں استہزا اُمڈ آیا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے مشٹنڈوں کو روک دیا۔ کمال چابک دستی سے اُس کا ہاتھ جیب میں گیا تھا، پھر بڑے سبھاؤ سے اُس کی کلائی مچلی تھی۔ چاقو قبضے میں اچھلا اور دوسرے ہاتھ تک پہنچتے ہوئے فضا ہی میں کھٹکے سے کھل گیا تھا۔ یہ انتہائی مہارت کا مظاہرہ تھا۔

"چاقو کی نوک پر چھلیا نہ چاہیے تھا چھورے! رندھاوے نے تمھیں جندہ مانگا ہے، پر تجھے مار کے جا آئے گا۔" چاقو شرارے کی مانند اُس کے ایک ہاتھ سے دوسرے میں لپک رہا تھا۔ مجمع میں موت کی خاموشی طاری ہوگئی تھی۔

سارا کھیل ہی نظر کا ہے۔ میری نظریں اُس کے ہاتھ سے زیادہ متحرک تھیں۔

"حماقت نہ کرو بابر! وہ چاقو زنی کا بہت بڑا ماہر معلوم ہوتا ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی، اُس کے ہاتھ کس قدر چاقو شناس ہیں۔" لیونارڈ نے سہمی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

"بکواس بند رکھو۔ تمھاری وجہ سے میرا ارتکاز خراب ہوسکتا ہے۔" میں نے سفاکی سے اُسے جھڑک دیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو مستقل مضطر رہتا۔ میں بہ دستور ساکت کھڑا اُسے تول رہا تھا۔ میرا چاقو بند تھا۔ میں نے ایک اور نفسیاتی داؤ کھیلا۔ آنکھوں میں بھرپور تمسخر اور تحقیر بھر کے اپنا چاقو گرا دیا۔ یہ منظر دیکھ کے مجمع میں پھریری دوڑ گئی۔ سرگوشیاں بلند ہوگئیں۔ کسی منچلے نے سیٹی بھی ماردی۔ "چھورے تو گیا!"

چھیپا نے تلملا کے چاقو والا ہاتھ سیدھا کیا اور ایک قدم کا استعمال کرتے ہوئے عین سینے پر وار کیا۔ میں نے ساکت کھڑے کھڑے ٹھیک اُس سمے اپنی جگہ چھوڑی تھی کہ جھونک میں لپکتے ہوئے اُس کی کہنی میرے شانے کو چھوتی ہوئی نکلی تھی۔ اُسے میرے اندازے سے زیادہ خود پر قابو تھا۔ اگلا قدم زمین پر پڑتے ہی وہ ایڑی کے بل میری جانب گھوما تھا۔ چاقو والا ہاتھ نصف دائرہ مکمل کرتے ہوئے بالکل میرے پیٹ پر آیا تھا۔ میرے پاس الٹی جست لگانے کے سوا دوسرا داؤ نہیں تھا اور اُسی کو میں نے آزمایا۔ اُس کا چاقو والا ہاتھ جیسے ہی ہوا میں گھوم کے واپس ہوا، مجمع نے لمبی سانس بھری۔ گویا وہاں کھڑے تمام افراد کا دل ایک آواز میں دھڑکا تھا۔ میں نے چار قدم کے فاصلے پر برق رفتاری سے کھڑے ہوکے ایک استہزائی مسکراہٹ اُس کی طرف اچھال دی۔ وہ بھی گھاگ تھا۔ فوراً میرے حربے کو تاڑ گیا۔

چیخ پکار کے بجائے اُس نے پُر سوچ مسکراہٹ اپنے چہرے پر بکھیری۔

"ارے چھورے، ابھی سے بے، چاقو اٹھانے کا ہے۔ چھلیا نِہتا کو ختم کرنے کا نہیں ہے۔"

"چھلیا وار کر... بہانے سے وقت حاصل نہ کر۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ہر چند وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اُسے طیش دلوانا چاہتا ہوں، لیکن یہ روگ ہی ایسا ہے کہ انسان مرتے مرتے سے اِسے گلے لگاتا ہے۔ چھلیا کے نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔

"تیری ماں کا... سالے۔"

چھلیا نے لپکتے ہوئے دائیں طرف وار کرنے کا جھانسا دیا۔ میں بہت آرام سے اُس کے دام میں آگیا۔ اگلے ہی لمحے سرعت سے چاقو اُس کے بائیں ہاتھ میں تھا۔ اُس کے خیال میں میرے پاس پہلو بدلنے کی مہلت نہیں تھی۔ اُس کا خیال ٹھیک ہی تھا۔ اگر میں قبل از وقت اُس کا داؤ بھانپ نہ لیتا تو واقعتاً میرے پاس پہلو بدلنے کی مہلت نہ ہوتی، اور وہ اطمینان سے اوجھڑا نکال باہر کرتا۔ اُس نے اندازاً چاقو چلایا، لیکن میں بائیں طرف پہلو بچانے کے ساتھ ہی نیچے بیٹھ چکا تھا اور کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا۔ چھلیا سیدھا فضا میں اُٹھا اور منھ کے بل زمین پر آرہا تھا۔ اُس کا ایک گماشتہ صورتِ حال دیکھ کے تیزی سے میری جانب بڑھا۔ چھلیا نے نیچے گرے ہوئے ہی ٹانگ اڑائی اور اُسے گرا دیا۔

"میرے جیتے اُسے کوئی ہاتھ نہیں لگانے کا ہے۔ جندگی میں پہلی باری چھلیا کا چاقو کسی نے ہوا میں گھمایا۔ چھورا اگھٹ نہیں رکھنے کا ہے۔"

وہ بڑبڑ کرتا لپک کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے پینترے بدل بدل کے مجھ تابڑ توڑ حملے کیے۔ ہر ممکن داؤ آزمائے، لیکن میرے جسم پر ایک خراش ڈالنے میں بھی ناکام رہا تھا۔ میں نے محسوس کرلیا تھا، اُس کی آنکھوں میں دہکتے ہوئے الاؤ کی جگہ مچلتے ہوئے اشتیاق اور حیرانی نے لے لی تھی۔

بستی والوں کے لیے یہ لڑائی کسی دیومالائی قصّے سے کم نہیں تھی۔ وہ یوں محوِ تماشا تھے کہ پرندے سروں پر بیٹھ جائیں، پھر مجھے جیسے ہی موقع ملا میرا ایک ہاتھ اُس کی کلائی پر پڑا اور دوسرا کہنی پر۔ اگلے لمحے اُس کا چاقو میرے ہاتھ میں چمک رہا تھا۔ چھلیا کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ مبہوت مجھے دیکھا کیا۔ میں نے چاقو واپس اچھال دیا۔ اُس نے چاقو تھام لیا تھا، لیکن بہ دستور خالی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ مشٹنڈوں کے سر جھک گئے تھے۔ مجمع کی بھنبھناہٹ تیز ہوگئی تھی، پیچھے کھڑے ہوئے چلبلے سیٹیوں پر سیٹیاں بجا رہے تھے۔

دفعتاً چھلیا نے چاقو چوما، بند کیا اور میرے قدموں میں ڈال دیا۔ چند لمحوں قبل نفرت، کدورت اور بغض سے بھرا ہوا چھلیا اس وقت سراپائے عجز و محبت بنا میری سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی دیکھا دیکھی اُن چاروں نے بھی اپنے چاقو بند کیے اور میرے قدموں میں ڈال دیے۔

"ماتا پتا کی سوگند! چھلیا آج سے تیرا گلام لگنے کا ہے۔ ابھی تک کسی نے پلیٹ نہیں کیا۔ ایسا کبھی کبھی نہیں پڑا۔" چھیپا کی آواز رندھ گئی۔ اُس کا سینہ اُبلنے لگا، وہ وہ کھڑے کھڑے لرز رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کے چھلیا کو سینے سے لگالیا اور وہ بلک بلک کے رونے لگا۔ مجمع میں ہاہاکار مچ گئی۔ ایک نے پہل کی پھر سارا مجمع ہی ٹوٹ پڑا۔ لیونارڈ حیرت سے بار بار اپنی انگلی کاٹتا تھا۔ اُنھوں نے مجھے اور چھلیا کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ چھلیا لوگوں کی منت سماجت کرکے نیچے اتر آیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ کندھوں پر اٹھائے جانے کا حق صرف میرے لیے تھا۔ پھر چھلیا کی رہنمائی میں لوگ بستی کے وسط کی جانب چل پڑے۔ میرے بے حد اصرار کے باوجود اُنھوں نے مجھے نیچے نہیں اتارا۔ عجیب تماشا لگ گیا تھا؛ عورتیں اور لڑکیاں بالیاں دروازوں پر لدی ہوئی اِس نرالے جلوس کو دیکھ رہی تھیں۔ کچھ دیر چلنے کے بعد چھلیا کا ٹھکانا آگیا۔ وہ چھوٹا سا، مگر پختہ کمرا تھا۔ کمرے جتنا ہی مختصر صحن تھا، جسے باہر سے آئی ہوئی درخت کی شاخوں نے مکمل چھت دیا تھا۔ صحن کا فرش کچا تھا جسے یومیہ لیپا پوتی کے ذریعے ہموار اور سخت کیا گیا تھا۔ کمرے کے دروازے کے ایک طرف مٹی کا گھڑونچی رکھا تھا؛ جس پر پانی ٹھنڈا رکھنے کی غرض سے پٹ سن کی بوری لپٹی ہوئی تھی۔ گھڑونچے کا ڈھکن لکڑی کا تھا جس کے وسط میں میخ ٹھکی ہوئی تھی، جس پر سوتی ڈوری سے لکڑی ہی کا پیالہ باندھا گیا تھا۔ دروازے کے دوسری جانب چوکی رکھی ہوئی تھی جس پر زرد رنگ کا گاؤ تکیہ پڑا تھا۔ صحن میں اِتنی جگہ نہیں تھی کہ ہمارے مجمع کی سمائی ہوتی۔ چھلیا نے اپنے آدمیوں کو چیخ چیخ کے ہدایات دینی شروع کردیں۔ میں نے اُسے سختی سے منع کیا کہ وہ ہمارے لیے کسی قسم کا اہتمام نہ کرے، لیکن وہ تو گراں گوش ہو رہا تھا۔ ایک کو اُس نے باس کے لیے دوڑایا تو دوسرے کو بستی کے اکلوتے مولوی صاحب کے پاس روانہ کردیا کہ اصیل قسم کے دو چار مرغ بسمل کردے اور تاکید کردی کہ رتی بھر بھی تجن سے عمدہ دیسی مسالے میں بھنوایا جائے۔ اگر رتی دین دھرم کی بات کرے تو اُسے چھلیا کا نام لے کے ڈرایا جائے۔ ایک تیسرے کو مختلف انواع ضروریات طعام کا انتظام کرنے کا ذمے دار بنادیا۔ صحن میں بھ گم بھاگ ناریل کے پتوں سے

بنائی گئی چٹائی بچھادی گئی تھی۔ ایک جوان نے مجھے کندھے پر جھونزا اٹھا رکھا تھا۔ دس بارہ اُس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ لیونارڈ عضوِ معطل کی طرح حیرانی سے سب کچھ دیکھا کیا۔ آخر چوکی پر سفید چاندنی بچھادی گئی۔ دونوں سروں پر اگردان رکھ کے بتیاں آناً فاناً سلگادی گئیں۔ صحن کے کونوں کھدروں میں بھی جابجا اگربتیاں ٹھونس دی گئیں۔ ایک کارندہ دوڑا دوڑا کہیں سے سرخ مخملیں گاؤ تکیہ لے آیا۔ اُسے چوکی پر زرد تکیے کی جگہ رکھ دیا گیا۔ اب چھلیا کے اشارے پر مجھے کندھے سے اترنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ تانبے کی چھلکتی ہوئی دودھ سے لبالب گھڑیا کو تانبے ہی کے تھال میں رکھا گیا اور اُس تھال کو چوکی پر رکھ دیا گیا۔ چھلیا نے ہاتھ کے اشارے سے چوکی پر بیٹھنے کی مجھ سے بنتی کی۔

"چھیپو بھائی! مجھے چوکی پر بیٹھنے کا ارمان نہیں اور نہ ہی میرے پاس یہاں ٹھہرنے کے لیے وقت ہے۔ تمھاری اِس قدر عزت افزائی نے سچ مچ لو پانی پانی کر دیا ہے۔ اگر کچھ بھلا ہی چاہتے ہو تو تنہائی میں کچھ وقت دے دو۔" میں نے چھلیا سے صاف صاف بات کی۔ میں نے اب تک انتہائی تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں تحمل کے ساتھ پیش آنے والے حالات کی تفصیل جاننے کے لیے یہ کشٹ اٹھا رہا تھا۔ کوئی کیسے جان سکتا تھا کہ میرا سینہ تیزاب سے لبریز ہانڈی کی طرح ابل رہا تھا۔

"مائی باپ! کھوپڑیاں اتار کے جانے کا ہے۔ بدھوئی ہند کی یاترا کی ہے، ہن کا ٹھیاواڑ جھک جھک نمسکار کرنے کا ہے۔ تیس سال میں چاقو پہلی بار گرنے کا ہے۔ مانو تو ادھر رام اُترا ہے۔ ابھی جانے کا بات نہیں بولنے کا ہے۔ تیرے چاقو کا چمکار کھمری کیسے ہوئیں گا۔" چھلیا بھڑک کے پلٹا اور میرے پاؤں میں حلقہ ڈال دیا۔ اُس کی عمر سے شرم آتی تھی۔ میں ہزار انکار کرتا رہا اور وہ ہزاروں اصرار۔ آخر کار چوکی چڑھنے ہی میں نجات نظر آئی۔ میرے بیٹھتے ہی چھلیا نے اپنا چاقو نکالا اور دودھ سے لبریز گھڑیا میں ڈال دیا۔ چاقو سے بہ قدر دودھ چھلکا اور تھال میں جمع ہو گیا۔ اُس کے بعد بہت سے آئے اور باری باری اپنا چاقو گھڑیا میں ڈال گئے، پھر وہ سب میری طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے اپنا چاقو سختی سے مٹھی میں بھینچ لیا۔ آخر کار چھلیا سراپائے التجا بن کے کھڑا ہو گیا۔ "سوامی جی! ایک گھونٹ داس بھرنے کا ہے۔"

"چھلیا بھائی! میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرو... مجھے یہاں سے فوراً جانا ہو گا۔"

چھلیا کچھ دیر دل مسوس کے کھڑا رہا، پھر اچانک بگولے کی طرح اُٹھا اور اپنا منہ تھپڑانے لگا۔ دامن چیر کے دولخت کر دیا۔ "پاپی مورکھ کے بھاگ ابھی اور جلنے کا ہیں، سوامی جی اِمہ جن دیا ہو خان ہاتھ بکھیرے ہیں۔" وہ دیوانہ وار تڑپنے لگا۔ اُس کی دیکھا دیکھی وہاں کہرام مچ گیا، سبھی دامن چاک کر کے صف بستہ ہو گئے۔ چھلیا خواہ مخواہ مجھے دیوتاؤں اور اوتاروں کا رتبہ دینے پر تل گیا تھا۔ [illegible] میں ڈالنے کا مطلب اُن کے ساتھ دودھ سانجھا [illegible] میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں اُن کی مرضی [illegible] یہاں سے نکل سکوں۔ چھلیا کے اطوار سے [illegible] کہ وہ ہفتہ بھر سے پہلے مجھے نکلنے نہیں دے گا۔ آخر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے تیز آواز میں کہا، "ٹھہرو، میری بات سنو!..." میرے بار بار کہنے پر وہ بالآخر تھم گئے۔ میں نے اچانک اپنا چاقو چھلیا کے پیروں میں ڈال دیا۔ "چھلیا اب تم چاہو تو اپنے ہاتھوں سے گھڑیا میں ڈال دو! مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

چھلیا کے چہرے سے یک دم کسی نے خون نچوڑ لیا۔ پوری شکل پر زردی اور ویرانی کھنڈ گئی۔ وہ کچھ دیر سوچا کیا، پھر اُس نے لرزتے ہاتھوں سے چاقو اُٹھایا، کھٹکے سے کھولا، پھل کو بوسا دیا، آنکھوں سے مس کیا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا، پھر اچانک اُس نے چاقو کو دوبارہ بوسا دیا اور اُسی پھرتی سے کلائی پر لمبی لکیر کھینچ دی، پھر چاقو بند کر، ہتھیلی پر رکھ کے مجھے پیش کر دیا۔ "سوامی! آپ رکھنے کا مکھں ہے تو اپنے ساتھ لے جانے کا ہے۔"

میری زبان سے بے ساختہ جملہ پھسلتے پھسلتے رک گیا کہ چھلیا بھائی اِس سے بہتر ہے تم آتما بتیا کر لو۔ میرے چاروں اور موت گھومتی ہے اور ہر اُس شخص کو لپیٹ لیتی ہے جو میرے دائیں بائیں آگے پیچھے ہوتا ہے۔

"چھلیا بھائی! یہ بھی ممکن نہیں ہے، میں تو بنجارا ہوں، گلی گلی کی خاک چھانتا پھرتا۔ تم کہاں میرے ساتھ دھکے کھاؤ گے؟ شدید غلط فہمی ہوئی ہے چھلیا! وہ محض اتفاق تھا کہ میں تمھارا چاقو گراسکا، ورنہ تم مجھ سے زیادہ دست رس رکھتے ہو۔" میں نے اُس کے ہاتھ سے چاقو نہیں لیا۔ اُس نے میری ترکیب بھی پر آزمائی تھی۔

پھر وہ چھیپو بچوں کی طرح بلک بلک کے رو پڑا۔ فرش پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ باقی سب لوگ چپ سادھے کھڑے تھے۔ میں نے بہ مشکل چھیپو کو اُٹھا کے بٹھایا، پھر اُس نے مجھے ایک [illegible] قصہ سنایا۔

چھلیا نے اناتھ آشرم میں ہوش سنبھالا تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں وہ وہاں سے بھاگ نکلا۔ بمبئی کی سڑکوں پر آوارہ [illegible] اور وقت یا تیرہ پر سے جاگتے اُس کی عمر بیس کے سن جا پہنچی۔ وہ اب تک چھوٹی موٹی چوری چکاری اور چھینا جھپٹی کرتا آیا تھا۔ اُسے چاقو زنی میں مہارت حاصل کرنے کا جنون تھا۔ وہ شوق کی تکمیل میں استاد بدلنے کے لیے علاقے بدلتا رہا، لیکن جب بھی وہ فن کو آزماتا، ایک آنچ کی کمی پاتا، پھر کسی ہم دم کے مشورے پر وہ دلّی جا پہنچا۔ وہاں کلن خاں کا راج تھا۔ چھلیا نے کلن خاں کے اڈّے کی ٹھان لی۔ پورا دلّی کلن خاں کو حصہ پہنچاتا تھا۔ چھلیا نے حوض قاضی کے علاقے میں چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ یہ سلیم سنار کا علاقہ تھا۔ سلیم سنار کلن خاں کے منہ چڑھے کی شہرت رکھتا تھا۔ ایک دن چھلیا سلیم سنار کے اڈّے پر پہنچ گیا اور اُسے للکار بیٹھا۔ سلیم سنار کے ہاتھ میں بجلی چمکتی تھی، لیکن قسمت نے چھلیا کا ساتھ دیا، اور اُس نے سنار کا چاقو گرا دیا۔

اُس کے بعد سلیم سنار دلّی میں نظر نہ آیا۔ خدا جانے اُسے زمین نگل گئی یا آسمان نے کھایا۔ حوض قاضی میں دو چار نے اور چاقو اٹھایا، لیکن چھیپو سب پر بھاری رہا۔ استاد کلن خاں کے پاس متواتر عرضیاں جا رہی تھیں۔ اِس سے پہلے استاد کلن خاں کی طرف سے کوئی ردِعمل آتا چھیپو از خود حصہ لے کر استاد کے اڈّے پر پہنچ گیا۔ استاد کلن خاں نے حصہ لینے سے انکار کر دیا اور چاقو اٹھایا۔ چھلیا نے استاد کے قدموں میں چاقو پھینک دیا اور مافی الضمیر کہہ سنایا۔ پھر استاد نے چھلیا کو اپنے اڈّے پر جگہ دے دی اور سلیم سنار کی ڈھنڈوائی کروا دی۔ کہتے ہیں سلیم سنار دریا میں ڈوب مرا تھا۔ استاد کلن سلیم سنار کو بھلا نہیں پایا تھا، لیکن اِس پر اُس نے چھیپو کو کبھی مطعون نہیں کیا۔ چھلیا استاد کے پاس پانچ سال رہا۔ اُن پانچ سالوں میں اُس نے استاد سے سارا فن نچوڑ لیا تھا۔ استاد کلن کو غالب محلّے کے ایک جولاہے نے دودھ میں زہر دے دیا، جس سے استاد جانبر نہ ہو سکا۔ استاد کے بعد چھلیا دلّی میں نہیں ٹکا۔ واپس کاٹھیاواڑ آ گیا۔ یہاں اُس نے احمد آباد کو اپنا مستقر بنایا۔ مہینے بھر میں پورا احمد آباد اُس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ استاد کلن خاں کی محنت اُس پر خوب چمکی تھی۔ بڑے بڑے نامی گرامی استاد اُس کے سامنے پل بھر سے زیادہ نہیں ٹھہر سکے، لیکن چھلیا نے ہمیشہ اپنے اندر ایک کمی محسوس کی، جسے وہ محسوس ہی کر سکتا تھا، اُس کی نشان دہی پر قادر نہیں تھا۔ احمد آباد پر پورے دس سال کا راج تھا چھیپو کا۔ اُس کا ڈنکا ہر گلی، ہر محلّے میں بجتا تھا، لیکن چھیپو اب اکتا گیا تھا۔ کوئی زور آور اُس کے سامنے ٹک نہیں سکا تھا اور یہی بات اُس کی اکتاہٹ اور بے زاری میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ بھیس بدل بدل دوسرے شہروں کو نکل جاتا۔ ڈے کے استادوں کو للکارتا، اور اگلے ہی لمحے چوکی پر بیٹھ داد و بخشش وصول کر رہا ہوتا۔ وہ پچھاڑ کا متمنی تھا، اُسے جوڑ کی تلاش تھی، جو آج تک اُسے نہیں ملا تھا۔ چھلیا ایک نوعیت کا عجیب درد تھا کہ اُس نے

اپنی شکست کے ہزار حربے آزما لیے، لیکن وہ فاتح تھا اور فاتح ہی کہلایا۔ ایک مرتبہ وہ گرناتھ پہاڑی کی یاترا کر کے لوٹ رہا تھا، اُس کا گزر اِس بستی سے ہوا۔ یہاں اُس کی ملاقات ایک مہان گیانی سے ہوئی۔ اُنھوں نے چھلیا کے بتائے بغیر ہی اُس کا مسئلہ پڑھ لیا۔ گیانی نے چھلیا کو گیان دیا کہ اِس بستی سے ایک نوجوان کا گزر ہوگا اور وہ چھلیا کا چاقو آسانی سے گرا دے گا۔ وہی جوان چھلیا کا فن مکمل کرے گا۔

چھلیا تو ویسے ہی اڈے بازوں سے بےزار تھا۔ اُس نے اِس بستی میں کچھ زمین خریدی اور یہیں پڑ رہا۔ پہلے سال اُسے واپس لے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا، لیکن اُس نے سب سے ہاتھ جوڑ کے بنتی کر لی تھی۔ اِس بستی میں ٹھہرنے کی وجہ اُس نے آج سے پہلے کسی کو نہیں بتائی تھی۔ دو برس پہلے بارودیہ اُسے تلاش کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا۔ اُسے بارودیہ بھلا مانس لگا تھا۔ بارودیہ نے اُسے بتایا کہ وہ دیس کی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہے۔ کاٹھیاواڑ کے تمام دادا اُس کے مطیع رہے ہیں، اور آج بھی ذاتی طور پر اُس کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں، لہٰذا اُسے چھلیا کی وساطت سے کاٹھیاواڑ کے داداؤں کا تعاون درکار ہے۔ چھلیا نے اُسے بتایا کہ کاٹھیاواڑ کے داداؤں پر اُس کا زور نہیں چلتا، تاہم وہ اُن سب تک بارودیہ کا پیغام اپنے الفاظ میں پہنچا دے گا، کیوں کہ چھلیا بھی انگریزوں کی حکومت کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ سال بھر بعد اُسے اندازہ ہوا کہ بارودیہ اپنے مقصد سے ہٹ گیا۔ وہ اب آزادی کی آڑ میں لوٹ مار اور عیش و نشاط کشید کر رہا ہے، لیکن اب بارودیہ کا طوطی بول رہا تھا، اِس لیے چھلیا نے چپ رہنے ہی میں عافیت جانی۔ بارودیہ چھلیا کی بےپناہ عزت کرتا تھا۔ اُسے مضبوط کرنے میں چھلیا کا نام بےحد کارآمد ثابت ہوا تھا۔ دو روز قبل بارودیہ نے فتح کی خوشی میں ایک شان دار جشن کا سندیسہ بھجوایا تھا۔ اُس نے چھلیا پر بےحد اصرار باندھا تھا۔ گر جنگل کے بیچوں بیچ سرمئی پہاڑیاں ہیں، اُنھی پہاڑیوں کے غاروں میں بارودیہ نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ چھلیا نے بتایا کہ بارودیہ ایک تعلیم یافتہ جوان تھا، اُس نے راج کوٹ سے بارہ جماعتیں پاس کر رکھی تھیں۔ چھلیا اِس سے قبل کبھی بارودیہ کے ٹھکانے پر نہیں گیا تھا۔ بارودیہ نے اُس کے لیے خصوصی تانگا بھیجا تھا، جو خود اُس کے استھان میں بھی رہتا تھا۔ چھلیا نے انکشاف کیا کہ انگریزوں کو فریب دینے کے لیے ریاست کے نواب اور راجے بارودیہ کی سرکوبی کے لیے دستے روانہ کرتے رہتے تھے، لیکن حقیقتاً بارودیہ ریاستی سرپرستی میں پروان چڑھ رہا تھا۔ گھوڑا جب ایک دوڑ جیت جائے تو اُس کا بھاؤ بڑھ جاتا ہے اور وہ داؤ کے لیے پسندیدہ ترین ٹھہرتا ہے، اور بارودیہ نے بےشمار دوڑیں جیت کر دکھا دی تھیں، اِس لیے ریاستی حکام اُس پر داؤ کھیل رہے تھے۔ بارودیہ نے چھلیا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُسے ایک کشادہ غار میں لے جایا گیا۔ غار کا دہانہ تنگ تھا، لیکن وہ اندر سے کسی محل کی طرح کشادہ تھا۔ اُس میں ہوا کا گزر بہترین تھا۔ جگہ جگہ مشعلیں نصب تھیں، پورا غار بقعۂ نور بنا تھا۔ بارودیہ نے چھلیا کو اپنے برابر بٹھایا۔ دو نیم برہنہ انگریز لڑکیاں مورپنکھ جھل رہی تھیں۔ بارودیہ نے بتایا کہ اِس مرتبہ اُس نے وہ کام کر دکھایا ہے جس کا اُس نے برسوں سے خواب دیکھا تھا۔ اُس نے انگریز افسروں کی بہت بڑی تعداد اغوا کر لی ہے، ان کے ساتھ چند مقامی مخبر بھی پکڑے گئے ہیں۔ اُن کا ایک ساتھی انگریز افسر کے ساتھ فرار ہونے میں کام یاب ہوا ہے۔ اُس نے چھلیا کو بہت خاص کام کے لیے بلوایا تھا، تاہم بارودیہ نے وہ خاص کام اب تک اُسے نہیں بتایا تھا۔ البتہ گفتگو کے دوران چھلیا یہ جان چکا تھا کہ اغوا شدگان کے تاوان میں سرِفہرست مطالبہ بارودیہ کے بیٹے اور اُس کی انگریز بیوی کی حوالگی تھی۔ چھلیا کے آنے کے بعد سے احمد آباد میں اُس کا شاگردِ ارجمند تیتا چوکی سنبھالے ہوئے تھا۔ بارودیہ نے اشاروں کنایوں میں ذکر کر دیا تھا، اُسے تیتا سے ضروری مدد درکار تھی۔ چھلیا کو اُس کے مقاصد کرانتی کاری کی عظیم

جدوجہد سے ہٹ کے ذاتی محسوس ہوئے تھے۔ بارودیہ نے انگریز قیدیوں میں سے ایک دراز قد خاتون کو بلوایا۔ وہ بےحد حسین و جمیل اور باوقار تھی۔ بارودیہ نے بتایا کہ اِس کا شوہر فوجی کپتان ہے اور وہ بھی اُس کی قید میں ہے۔ انگریز عورت کا نام مایا تھا۔ بارودیہ نے رسیوں میں جکڑے ہوئے اُس کے شوہر کو بھی وہیں بلوایا۔ اِس کے بعد اُس نے بےہودہ حرکت کی، یعنی مایا کو بےلباس ہو کے برہنہ رقص کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ اُس کے شوہر کو خاص تماشائی بنا کے حظ اٹھا رہا تھا۔ بارودیہ کے ایما پر تینوں ہندُستانیوں کو بھی وہیں بلوایا گیا۔ بارودیہ سمجھتا تھا کہ اِن تینوں کا انگریز عورت سے کوئی تعلق ضرور ہے۔ اپنی شناسا عورت کی سرِعام برہنگی کوئی برداشت نہیں کرتا۔ ہندُستانیوں کو وہاں بلوانے کا ایک مقصد اَور بھی تھا، جس کا عقدہ مجھ پر بعد میں کھ[illegible] ہندُستانیوں کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ مایا [illegible] بےلباس رقص سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ انگریزی میں چیخ چلانے لگی۔ بارودیہ کے اشارے پر دو مسٹنڈے آ[illegible]ں سے نوچ کھسوٹ کرنے لگے۔ اُس عورت کے [illegible] کا چہرہ تاثرات سے عاری اور سپاٹ تھا، جب کہ بارودیہ اُسے تکلیف پہنچا کے ہی لذت کشید کرنا چاہتا تھا۔ اپنے مقصد میں ناکامی پر وہ بےچین ہو گیا۔ مسٹنڈوں نے مایا کا بالائی لباس تار تار کر دیا تھا۔ اُس کے شوہر کی نسبت ہندُستانی شدید بےچین دکھائی دیتے تھے۔ آخر اُن میں جو پختہ عمر اور سیانا تھا، اُس سے رہا نہ گیا؛ وہ شیر کی طرح گرج پڑا۔ اُس نے بارودیہ کو سخت لعنت ملامت کی، اُس کے فعل کو گھٹیا قرار دیا اور نامردی سے تشبیہ دی۔ بارودیہ بہت محظوظ ہوا۔ شاید یہی سب دیکھنے کے لیے اُس نے تماشا لگایا تھا۔ دفعتاً ایک مسلح پہرے دار تیز قدموں سے وہاں آیا، اور اُس نے باآوازِ بلند بارودیہ کو بتایا کہ فرار ہونے والا ہندُستانی مخبر بھاگتے ہوئے مارا گیا۔ اُس کے بعد نہ جانے کیا ہوا، چھلیا سمجھ نہیں سکا۔ یوں لگا تھا جیسے برق پارے کوندے ہوں اور بہت سے شیر مل کر دھاڑے ہوں۔ پختہ عمر ہندُستانی جسے اُس کے ساتھی بھَل کہہ کے پکار رہے تھے، اُس نے نہ جانے کیا عمل دہرا لیا کہ اُس کے ہاتھ رسیوں سے آزاد ہو گئے، اور وہ آن کی آن میں تڑپ کے بارودیہ کے سر پر آ موجود ہوا۔ اُس نے خنجر کی زد پر بارودیہ کو یرغمال بنا لیا اور اُس کی آڑ لے کر اپنے ساتھیوں اور انگریز خاتون مایا سمیت وہ نہ صرف غار سے نکلنے میں کام یاب ہوا، بل کہ کام یابی سے گر کے جنگل میں روپوش بھی ہو گیا، لیکن اِس سے قبل محافظوں نے اشتعال میں مبتلا ہو کے پیچھے سے گولیاں برسائیں تھیں، جن کی زد میں آ کے ایک ہندُستانی نوجوان جو اُن سب میں قوی الجثہ تھا، ہلاک ہو گیا۔ بھَل جنگل میں روپوش ہونے سے قبل بارودیہ کا نرخرہ کاٹ کے اُسے پھینک گیا تھا۔ بارودیہ کی موت پورے گروہ کی موت تھی، وہاں کہرام مچ گیا۔ سخت اشتعال میں آ کے کارندوں نے ایک ایک انگریز قیدی کو گولیوں سے بھون دیا تھا، اب کیا بارودیہ اور کیا اُس کا بیٹا اور کیا کرانتی کاروں کے مطالبات، سب کچھ بارودیہ کے ساتھ ہی مٹی میں مل گیا تھا۔ تب سے کرانتی کار اُن ہندُستانیوں کو باؤلے کتے کی طرح تلاش کر رہے ہیں۔ اطلاع یہی ہے کہ اب تک وہ جنگل ہی میں روپوش ہیں، کیوں کہ جنگل کے گرد [illegible] بستیوں میں کرانتی کار کڑی نگرانی کر رہے تھے۔

چھلیا نے بتایا کہ وہ بارودیہ کی حقیقت سے واقف ہو چکا تھا، اِس لیے اُسے اتنا زیادہ دکھ نہیں ہوا، لیکن ریاستی عوام میں وہ ایک دیومالائی ہیرو کا درجہ رکھتا تھا۔ ریاستی عوام بارودیہ کے قاتلوں کے لیے شدید غصہ اور نفرت رکھتے ہیں۔ چھلیا اپنی داستان مکمل کر کے ٹھہر گیا۔ میرا دماغ تو اُس کے ایک جملے پر سائیں سائیں کر رہا تھا کہ ہندُستانیوں کا قوی الجثہ ساتھی ہلاک ہو گیا تو کیا جمرو؟... اِس سے آگے مزید سوچا نہیں گیا۔ آنکھوں میں دھندلکے چھا گئے۔ چھلیا کہہ رہا تھا، ”سوامی جی! ابھی تیرے کو جانا پڑ گیا ہوئے گا۔ اِدھر صرف تیرا انتجار کرنے کا ہے... چھلیا پر جیا تو پھیر کے چلے جاؤ سوامی جی!... یا چھلیا

کو ساتھ لے جاؤ۔"

چھلیا اپنی بپتا کو لے کے گڑگڑا رہا تھا۔ اِدھر میرا وجود آندھیوں کی زد میں تھا، اور خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ جمرو کی موت! اُس پر میرے مرنے کی اطلاع! جھل تو جنگل پر جنگل اکھاڑنے پر تُلا ہوگا۔ جمرو کی سچی دوستی کی یکتائی سے وابستہ ہے تو ہم اہلِ صدمت کے ہنر کا کیا بیاں ہو۔ آخر میں بھی یکتا ہے ہنر تھا، نہ دل پھٹا، نہ لہو اُگلا، بس شک بھر پانی اُمڈا، سو اُسے اندر ہی جذب کرلیا، یہی کمالِ ہنر ہے۔

"ٹھیک ہے چھلیا۔" میں نے اُس کے ہاتھوں سے چوتو اُٹھ کے چوم لیا، پھر تو جیسے درودیوار سے شور اُٹھ آیا۔ کان پھاڑ قیل مچ گیا۔ چھلیا قہقہے مار کے ہنسنے لگا، وہ ہنس ہنس کے دہرا ہو رہا تھا۔ کسی نے لڈوؤں سے بھرا تشت اچھال دیا۔ میں کچھ دیر خاموشی سے اُنھیں دیکھا کیا۔ جھل کا ویران اور خاکستر سینہ مجھ سے اوجھل نہ تھا۔ وہ بارودیہ کا پورا گروہ پھونک دیتا یا پھر جل کے راکھ ہو جاتا، لیکن یہاں سے نہیں جاتا۔ میں نے ذرا سکوت کے بعد تیز آواز میں کہا، "چھیبا! مجھے تیری مدد درکار ہے... مجھے اپنے ساتھیوں کی تلاش اور خیریت و عافیت مطلوب ہے۔"

"پھکر کرنے کا نہیں ہے سوامی جی! چھلیا نے پاپ میں منہ کالا نہیں کرنے کا ہے۔ ابھی تیرا ساتھی اپنا ماتا پتا ہے... بس اِچھا کرو... او جدھر ہوئیں گا سوامی جی! تیرا آنکھ چھلیا ٹھنڈا کرنے کا ہے۔" چھلیا ایک دم سینہ ٹھونک کے کھڑا ہوگیا۔

"تمھارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا... وہ میرے ساتھی نہیں۔ اُن میں ایک میرا باپ ہے۔" اس کے بعد ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ آنسوؤں کا چوکی سے کیا علاقہ؟ میں تڑپ کے نیچے گر پڑا۔ جمرو ہنستا مسکراتا میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے خبر نہیں ہوئی کہ کب تک بے سدھ پڑا رہا، اور نادان چھلیا مداوائے آرام کے لیے جانے کیا کچھ کرتا رہا۔ اُنھوں نے کھانے کا انتظام کرلیا تھا۔ چاندنی کا ٹکڑا صحن میں کھینچ دیا گیا۔ اس اثنا میں ہمارے لیے لباس بھی آ گیا تھا۔ سفید کُرتے پاجامے تھے۔ چھلیا نے منت سماجت کرکے غسل خانے کی راہ دکھائی۔ لیونارڈ غسل کر آیا تھا۔ وہ سفید کُرتے پاجامے میں خوب وجیہ دِکھتا تھا۔ میں نے تلوے پر لپٹا ہوا کپڑا کھولا، زخم تقریباً صحیح ہو چکا تھا۔ میں غسل کرکے آیا تو چھیبا نے پکڑ کے صحن کے بیچ بٹھا دیا، پھر چاندنی کے اوپر دسترخوان چن دیا گیا۔ قابیں چن دی گئیں۔ بھُنے ہوئے مرغ سے بھرا تھال عین میرے سامنے رکھا گیا۔ ایک کارندہ چھیبا کو بتا رہا تھا کہ بھیڑ بھونجن نے مہمان کے لیے مونگ پھلی کے تیل اور تِل لگا کے روٹیاں بنا بھیجی ہیں۔ دسترخوان پر دُور تک قابیں اور کھانوں سے بھرے تھال نظر آتے تھے، جن میں ترکاریاں اور مختلف دالیں تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ سفید چاولوں سے بھرے تھال بھی تھے۔ بالوشاہی، امرتی اور گلاب جامن بھری ٹوکریاں بھی آ گئی تھیں۔ چھیلا نے [illegible] ایک بھرپور دعوت کا انتظام کرلیا تھا۔ میں نے [illegible] رکھنے کے لیے دوچار لقمے زہر مار کرلیے، البتہ [illegible] دل چسپی اور سیری سے کھانا کھایا تھا۔ میں نے اُسے اب تک نہیں بتایا تھا کہ اغوا ہونے والے تمام [illegible] کردیا گیا ہے۔ لیونارڈ کے بھی کچھ قریبی دوست اغوا شدگان میں شامل تھے۔ کھانے کے بعد بھاپ اُگلتا سماوار لایا گیا۔ میرا دل چاہا کہ اُسے چھلیا کے سر پر اُلٹ دوں، لیکن میں نے خاموشی سے قہوے کی پیالی پیٹ میں انڈیل لی۔ اُس کے بعد دو لڑکیاں لجاتی ہوئی وہاں پہنچیں۔ وہ سرو قد تھیں، اور اُن کے رنگ دھوپ نے تپائے تھے۔ پستہ قد سازندہ اُن کے ساتھ کھڑا تھرک رہا تھا، اور وہ دروازے پر کھڑی کھڑی لچک رہی تھیں۔ اُنھیں دیکھ کے یہ گمان ہوتا تھا کہ قدرت نے اُن کے جسم میں خون کے بجائے رسیلا شہد دوڑا دیا ہے۔

"سوامی جی! اِچھا کی مانگ رکھنے کا ہے۔" چھلیا اُنھیں دیکھ کے میری طرف لپکا اور کان میں سرگوشی کی۔ میں نے اُسے وہ شعلہ بار نظروں سے گھورا کہ اُس نے ذرا

چوں چراں نہیں کی۔ اُن لڑکیوں کو دروازے ہی سے لوٹا دیا۔ البتہ سازندے کی جیب میں وہ نوٹ ٹھونسنا نہیں بھولا تھا۔ دل کی کارستانیاں بھی عجیب متلوّن ہیں۔ جب جھل بھول گیا تھا اور اب کورا بھول رہی تھی۔ ہر آہٹ پر دل اُچھل اُچھل کے حلق میں آتا تھا۔ میری شکل نوشتۂ سیاہ بن گئی تھی۔ لیونارڈ نے بارہا مجھ سے حالات جاننے کی کوشش کی، لیکن میں نے اُسے جھڑک دیا تھا۔ میں اِس وقت اپنے گرداب میں مبتلا تھا، کسی اور کی دل جوئی کیسے کرتا۔ آخر چھلیا سب نمٹا کے میرے پاس آیا۔ اُس نے گھڑیا سے چھلکا دودھ پیالے میں بھرلیا تھا۔ وہ پیالہ لے کے میرے پاس آ گیا۔ میں نے حجت بے کار سمجھی یوں ہی وقت کا ضیاع تھا۔ وہ پھر بِنیلا ہو جاتا اور لوٹیں لگاتا، ایک ہی سانس میں جتنا دودھ پی سکتا تھا پی لیا۔ بقیہ چھلیا کو دے دیا۔ اُس نے غٹاغٹ پیالہ خالی کر[illegible]۔ اُس کے بعد وہ عرض پرداز ہوا۔ "سوامی جی بدھائی دینے کا ہے! ابھی تیرے ساتھیوں کی کھوج لگا کے پلٹنے کا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمھارا؟ کیا میں یہاں بیٹھا رہوں گا۔"

[illegible] میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ابھی کھبر نہیں ہے کہ وہ پورب میں ملے یا پچھم میں... ابھی وہ مل گیا، پھر تیرے کو کھوجنا پڑے گا سوامی جی! تم اِدھر ہی رہنے کا ہے۔ تیرا ساتھی جدھر بھی ہونے کا ہے۔ دو تین دن ماں تیرے پاس لے آنے کا۔"

چھلیا کی بات درست تھی۔ گر جنگل سے کسی بھی سمت نکلا جا سکتا تھا، جب کہ مجھے توقع نہیں تھی کہ جھل گر کے جنگل سے باہر نکلے گا۔ اگر میں جھل کو تلاش کرتا ہوا مشرق کی جانب نکل جاتا اور جھل مغرب میں مل جاتا تو پھر لامحالہ میری تلاش شروع ہو جاتی۔ مناسب یہی تھا کہ میں دو تین دن یہیں بیٹھ کے چھلیا کا انتظار کروں۔ ہم اِس وقت ساسن گیر کے قرب و جوار میں تھے۔ چھلیا نے فی الفور اپنے کارندے دھری، کنڈلا، راجولا، دلواڑا، پالیتانا، بھسان، واساوور اور پراچی کے علاقوں میں روانہ کردیے تھے۔ ان کے ہاتھ مختلف لوگوں کے لیے مختلف پیغامات بھجوائے تھے، اور خود وہ اپنے دستِ خاص شریان کے ہم راہ گر جنگل کے وسط کی جانب روانہ ہوگیا۔ اُن کے گھوڑے تازہ دَم اور چوکس دکھائی دیتے تھے۔ اب مجھے تین دن انتظار کرنا تھا، سولی پر لٹکا ہوا جان لیوا انتظار۔ چھلیا کے نکلتے ہی لیونارڈ میرے سر ہوگیا۔ یہاں جو کچھ ہوا تھا اُسے اِن معاملات کی ذرا سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ بس اِتنا سمجھا تھا کہ چھلیا لڑائی میں مغلوب ہونے کے بعد میرا دوست بن گیا، اور خوب دل و جاں سے مجھ پر فدا ہوا تھا۔ اُسے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ چھلیا کہاں گیا ہے۔ میں کمرے میں گھس کے چارپائی پر پڑ گیا۔ مجھے اِس وقت صرف تنہائی درکار تھی۔ لیونارڈ میرے پیچھے پیچھے آ گیا۔

"یار برائے خدا مجھے بتاؤ! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"تھکے ہوئے ہو آرام کرلو... کل صبح بات کریں گے۔" میں نے بےزاری سے اُسے جواب دیا۔

"مجھ سے ایسا برتاؤ کیوں کر رہے ہو؟" اُس نے کندھے سے پکڑ کے مجھے سیدھا کیا۔

"یہاں سے قریب واساوور کا قصبہ ہے۔ وہاں ریاست کے دفتر بھی ہیں، تم چاہو تو تمھیں وہاں روانہ کروا سکتا ہوں۔"

"میں تمھارے حالات جاننا چاہتا ہوں، تمھارا چہرہ کیوں سیاہ پڑ گیا ہے۔ تم روئے کیوں تھے... اور تم مجھے تھپڑ مار رہے ہو؟" لیونارڈ نے مجھے جھنجھوڑا۔

"تمھیں بتانے کے لیے میرے پاس کوئی نئی بات نہیں ہے۔" میں نے نظریں چرائیں۔ میں اُسے کیا بتاتا، وہ جہاز میں اپنے چار انتہائی قریبی دوستوں کے ہم راہ سفر کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے تفصیل سے اپنے دوستوں اور دوستی کے بارے میں آگاہ کیا تھا۔ میں اُسے کیسے بتاتا کہ میرے پاس تمام انگریز قیدیوں کے مارے جانے کی اطلاع ہے، پھر اُسے کون سنبھالتا۔ اِدھر جمرو کا خیال میرے سینے میں

آنچل رہا تھا۔ بچھل سے متعلق طرح طرح کے وسوسے ڈنک مار رہے تھے۔ ایسے میں لیونارڈ کی دل جوئی کون کرتا۔
"بابر میں معذرت سے کہنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے انسانیت سے گرا ہوا سمجھ رہے ہو۔"
"خدا کے واسطے لیونارڈ مجھے تنہا چھوڑ دو۔" آخر مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں پھٹ پڑا۔
لیونارڈ چند ثانیے مجھے دیکھتا رہا؛ گم صم ساکت، پھر تڑپ کے مجھ سے لپٹ گیا، یا شاید مجھے لپٹا لیا۔ انسان فطرتاً تماش بین ہے۔ اس نے اپنا معاشرتی ڈھانچہ تماشے کے خمیر سے اٹھایا ہے، اور ان تماشوں کو کمالِ خوش سلیقگی سے اجتماعیت کا نام دیتا ہے۔ انسانوں میں غم بانٹنے کا تماشا بھی خوب سجتا ہے کہ غمگین چھوت کا مریض اور غم گسار سماج میں غم کی ترسیل کا ذریعہ۔ مجھے بھی غم گسار فراواں تھے اور غم فزوں تر... میں لیونارڈ کو کمرے ہی میں چھوڑ کے باہر نکل آیا۔ مٹکے سے پیالہ بھر بھر پانی پیا۔ آگ مدھم ہوئی تو پیالہ سر پر انڈیل لیا۔ غنیمت تھا صحن میں کوئی نہیں تھا۔ میں ناریل کی چٹائی پر پڑ گیا۔ نہ جانے کتنی دیر یوں ہی بے سدھ پڑا رہا۔ کچھ لوگوں کے آنے جانے کو میں محسوس کرتا رہا لیکن اس بات کا ہوش نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور وہاں کیا کر رہے ہیں، پھر سیاہی جوبن پر آئی تو سناٹا ہو گیا، یعنی کہ بہت اچھا ہو گیا۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ سیاہی، تنہائی اور خاموشی عناصر ہیں تو ان کا مرکب آگہی و ادراک ہے، اور یہی ادراک عرفاں چاہی زی سے عرفانِ حقیقی تک لے جاتا ہے۔ گذشتنی کا طوفان ذرا تھما تو مجھ پر بھی یہ منکشف ہوا؛ یہ سب کچھ لاحاصل نہیں، کہیں کوئی ہے جو میری طرف متوجہ ہے۔ رنج و الم، یہ آفت و بلا ہے ناگہاں منظورِ نظر ہی کے لیے تو ہیں۔ یہ ناظر کا استحقاق ہے کہ نظر شگفتہ رکھے یا آشفتہ۔ ٹھہرے پانی میں ناؤ کھینچی پڑتی ہے اور بہتا پانی ناؤ کو اُڑا لے جاتا ہے۔ خود کو دھارے پر چھوڑ کے مجھے بھی ڈھارس بندھ گئی۔ میں اُٹھ بیٹھا۔

وہ دو بالشت کے فاصلے پر سر نیہوڑائے بیٹھی تھی۔ پھول کی طرح لرزیدہ اور مورتی سی تراشیدہ۔ میں اس افتاد پر چونک گیا۔ وہ شاید بہت دیر سے مستغرق بیٹھی تھی۔ مجھے اچانک اُٹھتا دیکھ کے دہل گئی۔ "ہائے رام جی!" وہ بدکی ہوئی ہرنی کی طرح اچھل کھڑی ہوئی اور جھٹ لمبا سا گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ "بستی میں آپ کی دھوم مچی ہے۔ درشن بنا رہ نہ سکی۔" اُس کی آواز میں شیرینی، سلیقہ اور لہجے میں تعلیم کی کھنک تھی۔ "آپ دیوتاؤں سمان دِکھتے ہو!" اُس نے ذرا سا گھونگھٹ سرکا کے میری طرف دیکھا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں بیضوی اور شفاف، پلکیں لانبی اور گھنی تھیں۔ عنابی رنگ کا گل دار گھاگھرا اور اسی رنگ کی چولی میں لپٹا اُس کا سراپا شمع دان کی روشنی اچھال رہا تھا۔ میں حقیقتاً سٹ پٹا گیا تھا۔ اندازاً نصف رات تو بیت چکی تھی۔ اس چھوٹی سی بستی میں جہاں ہر آدمی پوری آبادی کی نسلوں کو جانتا ہوگا، حسین دوشیزہ کا تنہا آدھے پاڑے جیسی جگہ پہ چلے آنا حیرت انگیز تھا۔ بازاری ہوتی تو بھی اچنبھا نہیں تھا ... بشرے سے معقول گھرانے کی لگتی تھی۔ چمکیلی شاخ کی طرح تن کے کھڑی تھی، خفیف جھونکے سے جھولتی ہوئی ... ہوئی۔ "آپ کنیاؤں سے نہیں بولتے کیا؟"
میں واقعتاً مبہوت رہ گیا تھا۔ اُس کے وجود نے ماحول کو طلسمی بنا دیا تھا۔ "کون ہو تم؟ اس وقت یہاں آنا کسی شریف لڑکی کے لیے مناسب نہیں۔" میں نے سنبھلتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ وہ تو گویا میرے بولنے کی منتظر تھی۔ میری آواز سُن کے جیسے اُس کے سارے وہم اور وسوسے دُور ہو گئے۔ اُس نے جس تیزی سے گھونگھٹ کھینچا تھا، اُسی تیزی سے گرا دیا اور چھپاک سے میرے سامنے دوزانو بیٹھ گئی؛ جیسے مینا سے ساغر میں آخری بوند ٹپکی ہو۔ وہ بلا شبہ بے حد حسین تھی۔ دودھ، شہد، صندلیں شربت کے آمیزے سے اٹھتی ہوئی اُس کی رنگت، اُس پہ طرّہ اُس کی تراشیدہ صورت، تیکھے نقش ایسے جیسے چن چن کے ہیرے موتی جڑ دیے ہوں۔

اُس کا لب و لہجہ اور شکل و صورت غیر متوقع تھی۔ میں واقعتاً شدید اُلجھن میں مبتلا ہو گیا تھا کہ وہ کون تھی اور یوں آدھی رات کو یہاں کیا کرنے آ گئی تھی۔ بچھل پائی کا خیال آنے پر میں خود سے جھینپا تھا، لیکن جب وہ کھڑی تھی تو اضطراری طور پر میری نظریں اُس کے پیروں کا جائزہ لے چکی تھیں، اُس کے پاؤں سیدھے تھے۔
"بنوئی ہوں کنہیا جی! دلواڑا شہر سے رکنی کے گھر ٹھہری ہوں۔ بستی میں اودھم پڑا ہے کہ آپ کو مہاتما گیانی نربیندر جی نے گیان دے کے چھلیا کے لیے بھیجا ہے۔" اُس نے جھجکی جھجکی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اس طرح گویا ہوئی تھی، جیسے برسوں کی شناسا ہو۔
بستی والے مجھے مہان اوتار سمجھ رہے تھے۔ یہ میں ہی جانتا تھا کہ چھلیا کا چاقو گرانے میں کس گیانی کا عمل دخل تھا۔ سرگوشی بھی بیج کی طرح ہوتی ہے اور ہر گوش زمین کی طرح ... بیج گرا وہاں پودا نکل آیا، ایک پودے میں ... پھل اور ہر پھل میں ہزاروں بیج۔ چھلیا جس وقت ... پٹا سنا رہا تھا اُس وقت صحن لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ... وہاں سے نکل کے یہ قصہ چوپال میں پہنچا ہوگا۔ جہاں حیرت انگیز اور ماورا العقل داستان کے متلاشی قصہ گو اس پہ مصروفِ کار ہوئے ہوں گے۔ اب جہاں چھلیا ہوگا اور جہاں اُس کا نام لیا جائے گا، وہاں یہ داستان ضرور دہرائی جائے گی اور ہر مرتبہ جدتِ فسوں کے ساتھ۔ وہ جتنی دیر یہاں رہتی، کسی نئی مصیبت کے نزول کا خطرہ بڑھتا جاتا۔ اگرچہ وہ کچھ دیر بیٹھی رہتی تو کوئی حرج نہ تھا، تاہم میں نے لہجے میں سختی لاتے ہوئے کہا، "تمھیں اور بستی والوں کو بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں گیانی یا اوتار نہیں ہوں... تم بے شک دن میں آ جانا، لیکن اب جاؤ۔"
"ہائے رام جی، بدھائی ہو! اجالے میں آ سکتی تو اتنا کشٹ نہ اُٹھاتی۔ کنیائیں اِدھر نہیں آتیں۔ میری آپ سے بنتی ہے، کچھ دیر کی آگیا دیجیے۔ بڑی آس لے کے آئی ہوں۔

"ٹوپر رنگ"
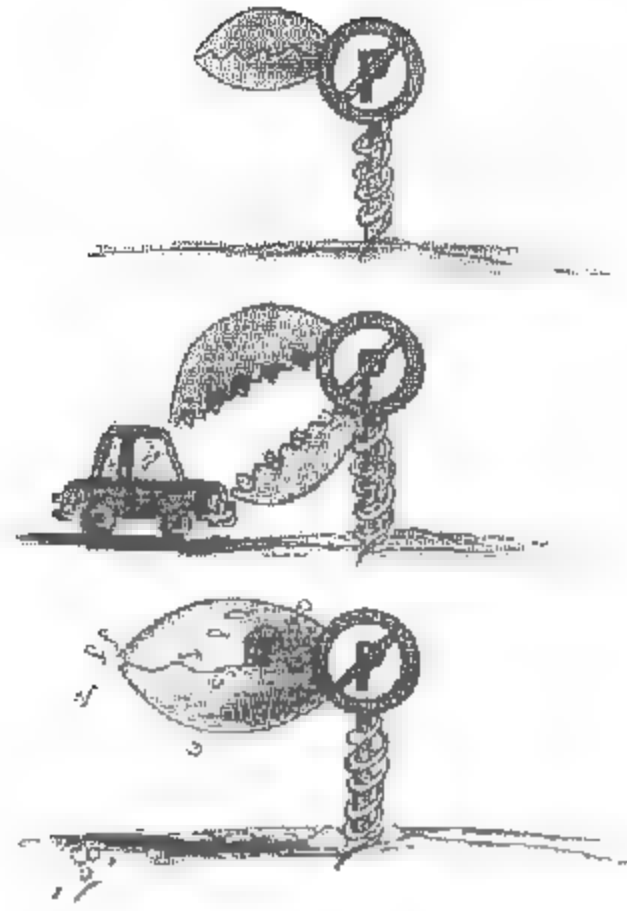
میرا کشٹ آپ کا دُور کر سکتے ہیں۔" اُس نے ہاتھ جوڑے اور جبڑے سختی سے بھینچ لیے کہ وہ کسی صورت نہیں جائے گی۔ مجھے گمان ہوا کہ مجھ سے دعا وغیرہ کروانے آئی ہے۔ چھلیا اپنے ساتھ تمام کارندوں کو لے گیا تھا۔ اڈّے پر اس وقت میرے اور لیونارڈ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اُس نے جوڑے ہوئے ہاتھ میرے گھٹنوں پر رکھ دیے اور ملتجی ہوئی۔ "بھگوان کے لیے میری بات سُن لیں، پھر میں چلی جاؤں گی۔"
میں دھیرے سے پیچھے کھسکا، لیکن وہ بہ دستور میرے گھٹنے پکڑے رہی۔ میں نے اُس کے ہاتھ اُٹھانے چاہے تو اُس نے میرے ہاتھ ہی تھام لیے۔ "بھگوان نے تمھاری صورت بہت سندر بنائی ہے۔ بھگوان جس کا مکھڑا اچھا بنا دے، اُس کے لیے سنسار میں سب کچھ اچھا بنا دیتا ہے۔ تمھارا دل بھی خوب صورت ہی بنایا ہوگا۔" وہ ایک ہی جست میں آپ سے تم تک آ گئی تھی، لیکن ایسے جیسے بہت سلیقے سے اور قدم بہ قدم یہ سفر اُس نے طے کیا ہو۔ اُس کی

آواز اور آنکھیں اوّل ساعت ہی سے خمار آلود لگی تھیں۔

میں نے آرام سے ہاتھ چھڑائے اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تم بہت اچھی اور خوب صورت لڑکی ہو! اب چلی جاؤ، اگر میں تمھاری کوئی مدد کرسکتا ہوں تو دن میں ملنے کی سبیل کروا۔" میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر اب اُس نے مزید ضد کی تو بھاگ کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلوں گا۔

میری بات سُن کے وہ آب دیدہ ہوگئی، اور گریبان سے ایک پوٹلی نکال کے میرے قدموں میں پھینک دی۔

"اِس میں گہنے موتی ہیں۔ اتنے ہی اور ہیں میرے پاس... پتا جی دھن مان ہیں۔ دَھن سے تمھاری جھولی بھر دیں گے، میری بات سُن لو، پھر ادھیکار ہے چتا کرو یا نہ کرو۔"

شدید غصّے نے میرے پیروں میں بیڑی ڈال دی۔ اُس نے ایک دَم اوتار کے رتبے پر بٹھا کے لات ماردی تھی۔ میرا بھی دل چاہا کہ پوٹلی پر لات ماروں اور اُسے بھی دفعان کروں، لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی میں بیٹھ گیا، اور پوٹلی اُٹھا کے اُس کی جھولی میں پھینک دی، پھر بھڑکتے ہوئے کہا، "ادھیکار تو... تم نے اپنے پاس رکھے ہیں۔ اپنی مرضی سے یہاں چلی آئیں۔ یہ بھی نہ سوچا کہ کوئی اِس وقت تم سے ملنا چاہتا بھی ہے یا نہیں، اپنی مرضی سے اوتار بنادیا کہ کوئی اوتار ہے بھی یا نہیں، اور اب اپنی مرضی سے سوداگر بنادیا کہ کوئی سوداگر ہے بھی یا نہیں۔ میرے پاس تو اِتنا بھی ادھیکار نہیں چھوڑا کہ میں یہاں سے تمھیں روانہ کرسکوں۔"

اُس نے مسکراتے ہوئے پوٹلی اٹھا کے گریبان میں ڈالی، جیسے سیّا دوام سمیت کے گھر لوٹتا ہے۔ اُس نے مجھے واقعی بٹھا دیا تھا۔ "سوداگر نہ بناتی تو میری بات کون سنتا۔ اگر تم گہنے اٹھانے والے ہوتے موہن جی تو مجھ سی کنیا کو چھوڑ کے نہ اُٹھتے..." اُس کی آنکھوں میں محض تیزی کے علاوہ اور بھی بہت کچھ اُتر آیا تھا۔ قدرت نے صورت کے ساتھ ساتھ اُسے سبک ذہن بھی بنایا تھا۔ "میری مدد کرنے میں آپ کا ایمان نہیں ہوگا۔" اُسے بے تکلف ہونے کا ہنر خوب آتا تھا۔ وہ واقعی من موہنی تھی۔

"میں تمھارے مجبور کرنے پر تمھارا مسئلہ سُن سکتا ہوں، لیکن اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں تمھاری مدد کرنے پر قدرت بھی رکھتا ہوں۔" میں نے پیش بندی کرتے ہوئے کہا، کیوں کہ میں اِتنا سمجھ گیا تھا کہ اُسے دعا کے علاوہ کسی اور قسم کی مدد درکار ہے۔ جس قسم کی مدد عموماً شرفا کو اڈّے پاڑے والوں سے درکار ہوا کرتی ہے۔ ظاہر ہے میں اِس وقت چھلیا سے بڑا اداتھا۔ میں یہاں دو ایک دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

"بدھائی ہو موہن جی! میرا گیان کہتا ہے کہ آپ کی یہ اِچھا ہی میرے جیون کو سورگ بنا سکتی۔ نرک میں سے پکار رہی ہوں۔ ایک راکھشس جان کو آیا ہے موہن جی۔"

"کون راکھشس؟ اور بھلا میں تمھاری مدد کیوں اور کیسے کرسکتا ہوں۔"

"کیوں کا جواب تو بھگوان ہی دیں گے، پرنتو آپ میں شکتی ہے کہ آپ اِس مورکھ کا سروناش کرسکیں۔"

اُس نے رات کا ایک پہر وہاں گزارا، اور تفصیل سے اپنی کتھا سنائی۔ اُس کا نام لکشمی تھا اور وہ واقعی لکشمی تھی۔ وہ ایک مِل مزدور راج پٹیل کے گھر میں پانچ بھائیوں پہ پیدا ہوئی۔ صورت دیکھ کے ہی دادی نے کہہ دیا تھا کہ راج پٹیل پر لکشمی برسے گی، چناں چہ اُس کا نام لکشمی رکھ دیا گیا۔ یہ بستی کاٹھیاواڑ کے صنعتی شہر دلواڑا کے مضافات میں آباد تھی۔ راج پٹیل دلواڑا میں تیل کی مِل میں نصب مشینوں کی دیکھ بھال پر معمور تھا۔ ماہ وار اچھے پیسے مل جاتے تھے، اِس لیے وہ بستی کے خوش حال افراد میں شمار ہوتا تھا۔ لکشمی جب دو سال کی تھی تب راج پٹیل نے فصل پر بیج خرید کے ذخیرہ کرنے کا کام شروع کیا۔ اُس کا تعلق زمیں دار خاندان سے تھا۔ اِس کے علاوہ بستی والوں سے راہ و رسم مضبوط تھی، اِس لیے اپنی پونجی کے بقدر اُس نے مناسب دام پر مونگ پھلی خرید لی، اور چند ماہ بعد ایک تہائی منافع پر فروخت کردی، پھر اُس نے

مِل خریدے اور چند ماہ بعد چار پیسے منافع پر اُسی مِل کو فروخت کردیے جہاں وہ ملازمت کررہا تھا۔ لکشمی جب چھ سال کی ہوئی تو راج پٹیل نے ملازمت چھوڑ کے دلواڑا میں بروکری کا دفتر بنالیا۔ تب تک وہ چھوٹا موٹا سرمایہ دار بن چکا تھا۔ لکشمی آٹھ سال کی ہوئی تو راج پٹیل نے دلواڑا میں تیل نکالنے والی فیکٹری لگالی، اور وہ باپوناتھ بستی سے اُٹھ کے دلواڑا جابسا۔ وہاں اُس نے عالی شان کوٹھی بنائی تھی، جس میں موٹر کھڑی کرنے کا کمرا علیحدہ بنایا گیا تھا، اور ہر کام کے لیے ملازم جدا جدا تھے: مالی، خانساماں، چوکی دار، ڈرائیور، نوکر چاکر۔ بچوں کو رامائن پڑھانے کے لیے استاد الگ آتا اور اسکول کا سبق یاد کروانے کے لیے الگ۔ راج پٹیل نے فیکٹری کا نام بھی لکشمی آئل مِل رکھا تھا۔ راج پٹیل پر دھن چھپّر پھاڑ کے برسا تھا۔ لکشمی اپنے باپ کی اِس قدر منظورِ نظر تھی کہ خواہش زبان پر آتی بعد میں اور پوری پہلے ہوجاتی تھی۔

بمبئی کے پریم بابو نے دلواڑا میں منڈوا کھولا۔ پھر لکشمی منڈوے کی ہو کے رہ گئی۔ ایک فلم دس بار دیکھتی۔ جب وہ جوانی کو پہنچی تو راج پٹیل نے بیٹی کو غور سے دیکھا اور بیاہنے کی فکر کی، مگر بہت دیر ہوچکی تھی۔ لکشمی فیکٹری کے دروازے پر تعینات منشی قاسم میمن سے دل ہار بیٹھی۔ اُسے اِس بات سے مسرت ہوئی کہ اُس کا پریم فلموں سے کم تہلکہ خیز ثابت نہیں ہوگا۔ اُس کا خیال تھا کہ پتا جی کو خود ہی قاسم میمن سے اُس کے پریم کا پتا چل جائے گا، لیکن باپ کی طرف سے مسلسل خاموشی نے اُس کے فلمی پریم کا رنگ پھیکا کررکھا تھا۔ وہ روزانہ فیکٹری پہنچ جاتی اور کافی دیر دروازے پر رک کے قاسم میمن سے باتیں کرنے لگی۔ اِس سے قبل وہ چھپ چھپا کے ملاقاتیں کرتے تھے۔ البتہ نظروں کا بے باک جادلہ وہ شروع دن ہی سے علی الاعلان کرتی تھی۔ پھر ایک دن اُس نے سب کے سامنے قاسم میمن کے ہاتھ میں چٹھی پکڑائی، اور اُسی رات وہی چٹھی راج پٹیل نے بیٹی کے سامنے کردی، اور پہلی مرتبہ اُس سے سخت لہجے میں بات کی۔

لکشمی کی کہانی تو شروع ہی اب ہوئی تھی۔ اُس نے باپ سے بغاوت کا اعلان کردیا۔ قاسم میمن کو فیکٹری سے نکال دیا گیا۔ لکشمی اُسے پیسے پہنچانے لگی۔ اُس نے قاسم میمن کے ساتھ جا کے بمبئی بسنے کا منصوبہ بنالیا تھا، جہاں وہ مدھوبالا کو مات دے سکتی تھی، لیکن کہانی اپنی مرضی سے آگے بڑھی۔ راج پٹیل نے دلواڑا کے نام وَر دادا رگھو بوری والا کو لکشمی اور قاسم میمن کے بیچ کھڑا کیا۔ رگھو بوری والا نے قاسم میمن کو دو چار مرتبہ پٹوایا تو قاسم میمن نے راج پٹیل سے دلواڑا چھوڑنے کے لیے تگڑی رقم مانگ لی۔ راج پٹیل نے قاسم میمن کو رقم لکشمی کے ہاتھ ہی سے دلوائی۔ لکشمی کو اِس بے وفائی کا ذرا ملال نہ ہوا، کیوں کہ اِس طرح کہانی کا انجام دل چسپ اور عام ڈگر سے ہٹ کے ہوا تھا، لیکن یہیں سے ایک نئی کہانی نے جنم لیا، جس نے راج پٹیل سمیت لکشمی کو بھی ہلا کے رکھ دیا تھا۔ رگھو بوری والا دل و جاں سے لکشمی پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ وہ اِس قضیے کے دوران کئی مرتبہ لکشمی سے بالمشافہ ملا تھا۔ اُس نے راج پٹیل سے لکشمی کا ہاتھ مانگنے میں دیر نہ لگائی۔ راج پٹیل نے ہر قسم کے خوف کو بالائے طاق رکھ کے صاف انکار کردیا۔ لکشمی نے بھی یہ کہہ دیا تھا کہ اگر زندگی میں ایسی نوبت آئی جو اُسے رگھو بوری والا کے ساتھ پھیرے لینے پڑے تو زہر کھانے کو ترجیح دے گی۔ اُدھر رگھو پر عشق سات رنگ چڑھ گیا تھا۔ اُس نے اعلان کردیا کہ راج پٹیل کو تیل کی فیکٹری کا گھمنڈ ہے تو وہ بھی فیکٹری لگائے گا۔ اِس کے بعد رگھو دلواڑے سے غائب ہوگیا۔ ٹھیک ایک ماہ بعد وہ دوبارہ دلواڑے میں نظر آیا، جب اُس نے فیکٹری کے لیے زمین خریدی تھی۔ اُس نے فیکٹری کی تعمیر کا کام شروع کروادیا۔ وہ احمد آباد سے کام جاننے والے کچھ لوگوں کو بھی لے آیا تھا۔ رگھو کی فیکٹری بنتی دیکھ کے راج پٹیل کا فیصلہ ڈانواں ڈول ہورہا تھا، لیکن لکشمی زہر خوری کے فیصلے پر مزید پختہ ہوگئی۔ رگھو بوری والا کی فیکٹری تکمیل کے آخری مراحل میں تھی۔ اچانک سورت اور بمبئی کی پولیس رگھو کے وارنٹ

لے کے دلواڑا پہنچ گئی۔ رگھو نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے وہاں کئی ڈاکے مارے تھے اور کئی امرا کو مفلس کر آیا تھا۔ پولیس رگھو کو لے گئی، اور لکشمی نے ماتا جی کے بھجن گائے، دیوی ماتا کی سکھ چین کا سانس لیا۔ راج پٹیل نے لکشمی کے لیے جوڑ کا رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیے۔ آخر اُس کی نظر اپنے بھائی کے چھوٹے بیٹے وشنو پٹیل پر ٹھہر گئی۔ لڑکا قد کاٹھ، نین نقش کا بھی اچھا تھا، جب کہ راج پٹیل کی کاروباری اٹھان کا اُس کے پورے خاندان نے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ اُس کا بھائی برابر کا نہیں تھا، لیکن پھر بھی شہر کے متمول لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ سونے پر سہاگہ ہوا، لکشمی اور وشنو کو سن گن ملی تو تبھی اسی وقت اُن پر انکشاف ہوا کہ وہ تو بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، تاہم اور کچھ ابھی ہوا تھا۔ گھر کی بات تھی فوراً چوبارے چڑھ گئی۔ پجاری سے دن تاریخ نکلوا لی گئی تھی کہ رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ پولیس کا پرچہ کچا تھا۔ برآمدگی بالکل نہیں تھی۔ رگھو بوری والا جیل سے چھوٹ کے سیدھا راج پٹیل کے پاس آیا اور صاف بول دیا کہ لکشمی اُس کی نہ ہو کوئی غم نہیں، لیکن اگر لکشمی کسی اور کی ہوئی تو رگھو پھانسی چڑھ جائے گا۔ شادی روک دی گئی۔ راج پٹیل تو کیا سارا شہر جانتا تھا کہ رگھو نے ایسا بولا ہے تو وہ کر گزرے گا۔ رگھو نے فیکٹری کی تعمیر دوبارہ شروع کروا دی تھی۔ راج پٹیل کے کاروباری حریف نواب کریم جی نے رگھو سے پٹی ملا لی۔ اُدھر وشنو پٹیل کی ماں نے دوسری لڑکی دیکھنی شروع کر دی تھی۔ لکشمی کی ایک بوا بستی ہی میں آباد تھی۔ بوا کی ایک لڑکی رکمنی لکشمی کی سکھی تھی، جس سے راز و نیاز کیا کرتی تھی، اور ساتویں، پندرھویں دن لکشمی بستی کا پھیرا لگایا کرتی تھی۔ جب اُس نے سنا کہ ایک چھیل چھبیلے جوان نے چھیا کو پچھاڑ دیا ہے، اور چھلیا اُس کے پیروں کو چاٹتا پھر رہا ہے تو اُسے لگا کہ اُس کی مراد بر آئی ہے۔ دراصل رگھو بوری والا کو دلواڑ کی چوکی پر چھلیا ہی نے بٹھایا تھا، اور وہ چھلیا کو باپ برابر مانتا تھا۔ راج پٹیل نے

چھلیا کے آگے بھی ہاتھ جوڑے، لیکن چھلیا نے رگھو کے معاملے میں ہاتھ ڈالنے سے معذرت کر لی تھی۔ چھلیا نے کہا تھا کہ وہ رگھو کا گلا اپنے ہاتھ سے کاٹ سکتا ہے، لیکن اُسے پیچھے ہٹنے کو نہیں بول سکتا۔

"تو تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" اُس نے اپنی داستان ختم کی تو میں نے اُس سے پوچھا۔

وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھے گئی، پھر ٹھہر ٹھہر کے بولی، "میری اچھا، چھلیا سے سہایتا لینے کی نہیں ہے۔"

"کیا اچھا ہے تمھاری؟"

"کوئی میرے لیے رگھو دادا کے سامنے تن کے کھڑا ہو جائے۔" اُس نے اِک ادا سے پلکیں جھپکائیں اور اِٹھلا کے بولی تھی۔

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ "اور تمھارا خیال ہے کہ یہ کام میں کر سکتا ہوں۔"

"ہاں، تم شکتی مان ہو، دکھ اِسی بات کا ہے کہ رگھو کو للکارنے والا کوئی نہیں۔"

"رگھو میں کیا برائی ہے۔"

"مہیلائیں اپنے پریمیوں کو برا نہیں جانتیں [illegible] کے من نے یہ ادھیکار نہیں دیا۔ رگھو مجھے برا نہیں لگتا، بس وہ سندر نہیں ہے۔ میری سندرتا پر نہیں جچتا۔"

"سندرتا عارضی چیز ہے لکشمی! آج ہے تو کل نہیں، اِس پر گھمنڈ مہنگا پڑتا ہے۔"

"وہ چور، ڈاکو، ہتیارا اور اپرادھی ہے۔ اڈے کا دادا ہے، بھتا کھاتا ہے۔"

"وہ تمھارا پریمی بھی ہے۔ تمھارے بتانے کے مطابق وہ سچا پریم کرتا ہے تم سے۔"

"سچے پریمی اپنی پریمیکا کو کھشی دیکھنا چاہتے ہیں۔ پریمیکا کھشی ہے تو اُن کا پریم شانت ہے، مگر... مگر اِس پریمی نے میرے جیون سے ہر سکھ چھین لیا ہے۔ بچے بچے کی زبان پر میرا نام ہے، گلی گلی رسوا کیا ہے۔ اُسے اپنی کھشی،

اپنی جیت کا دھیان ہے۔ پریمیکا مندر کی مٹی مورت ہے، شیشے کے استھان میں رکھنے والی مورت، جس کے پاس نہ من ہو، نہ اِچھا ہو اور نہ ادھیکار۔" لکشمی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"تم وشنو سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

"نہیں، وشنو سے اچھا ہے میں رگھو سے بول پڑھوا لوں۔ وہ ڈرپوک، بزدل، کمینہ! میرے لیے بلیدان دینے والا، مجھے دیکھ کے آنکھیں اور راستے بدل لیتا ہے۔"

"تم کیا چاہتی ہو مجھ سے۔ بالفرض میری وجہ سے رگھو پیچھے ہٹ بھی گیا تو پھر کیا ہوگا۔ میں چند دن سے زیادہ ٹھہر نہیں سکتا۔ رگھو پھر آ جائے گا۔ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔"

"بس یہ کہ جھوٹ موٹ ہی سہی، مگر تم میرے لیے رگھو کے سامنے کھڑے ہو جاؤ۔ ایک بار لکشمی کے نام پر رگھو کا ہاتھ گرا دو، اُس کے بعد [illegible] اس کے بعد موہن" وہ بولتے [illegible] ایک دم کھو سی گئی۔ کچھ توقف سے دھیرے دھیرے [illegible] اس کے بعد مجھے رگھو بوری والا بھی منظور ہے۔ تم اُس کا پانی اتروا دو، اس کے بعد رگھو [illegible] ہے، میں اُس کے ساتھ پھیرے ڈلوا لوں گی۔"

میں چونک پڑا۔ اُس نے عجیب بات کی تھی۔ "کیا مطلب؟"

"رگھو کو اپنی طاقت پر گھمنڈ ہے اور مجھے اپنی سندرتا پر مان ہے موہن جی! یہی اچھا ہے اُس کے پیروں میں پڑ جاؤں تو دکھ نہیں، بیکری پر زہر کھا مروں گی۔ میری سندرتا کوئی زور نہیں موہن جی!"

"میرا نام بابر ہے۔" شاید وہ مجھے ہندو سمجھ رہی تھی۔

"میرے لیے تو موہن ہو۔ بھگوان نے بہت سندرتا دی ہے تمھیں۔" اُس کی آنکھیں بارِ خمار سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

"میرے بارے میں تمھارے تمام اندازے غلط ہیں۔ اب تم جاؤ... مجھ سے بن پڑا تو تمھارے لیے ضرور کچھ کروں گا۔" میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ رات کسی بھی لمحے جانے والی تھی۔ وہ واقعی دل بر لڑکی تھی، یوں تن تنہا اندھیارے میں اڈے پر چلی آئی تھی۔ یہ کوئی باقاعدہ اڈا

پاڑا تو نہیں تھا، لیکن ایک کمرے کے اِس مکان کی بستی میں اڈے ہی کی حیثیت تھی۔ وہ وارفتگی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اُس کا یہاں سے چلے جانا بہت ضروری ہو چلا تھا۔

"موہن جی میں ایسے نہیں جاؤں گی... تم مجھے وچن دو، میری مدد کرو گے!" وہ یک دم بپھر گئی اور مجھ سے لپٹ گئی، پھر شمع کی طرح جلنے لگی۔ میں نے بہ مشکل اُسے خود سے علیحدہ کیا۔

"موہن تم میری آخری آس ہو... تم وچن نہ دو، لیکن لکشمی کا وچن ہے، تم میری اِچھا کے بغیر جس دن یہاں سے جاؤ گے میں پتھر باندھ کے ندی میں کود جاؤں گی۔"

مجھ سے وعدہ لینے کے بعد ہی وہ وہاں سے گئی۔

میں نے سوچا تھا، چھیا سے اِس سلسلے میں بات کروں گا، وہی اِس بارے میں درست مشورہ دے سکتا تھا۔ سپیدی نے سیاہی کے شکم سے باہر آنا شروع کر دیا تھا۔ بیونارڈ نے خوب نیند کر لی تھی۔ مجھے امید تھی کہ صبح تک چھیا کی طرف سے کوئی نہ کوئی خبر ضرور آ جائے گی۔ باروتیہ کا کردار مجھے بالکل سمجھ نہیں آیا تھا۔ اُس کی کارگزاریوں سے لگتا تھا کہ وہ حادثاتی طور پر کرائم کا رہنما ہے۔ اُس کی چھب ڈھب، خو بو کچھ اور ہی تھی۔ اُس نے انتہائی منظم طریقے سے بحری جہاز اغوا کیا تھا۔ اِس درجے کی کارروائی ریاستی سپاہ کے لیے بھی کارِ محال تھی۔ اِتنی بڑی کارروائی کا مقصد محض بیٹے کا حصول نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا تھا کہ جہاز کا اغوا اور تاوان کا مطالبہ دو مختلف اذہان کی عکاسی کرتے ہیں، کارروائی قوم کے لیے تن من دھن قربان کرنے کی بنیاد پر، جب کہ مطالبہ خود غرضی کی بین مثال۔ بھٹل کے ہاتھوں باروتیہ کا قتل اُس کی حیثیت کے منافی تھا۔ بھٹل کی لیاقت، شجاعت، معاملہ فہمی اور طاقت میں کلام نہیں، لیکن باروتیہ کا قتل اتنا آسان نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اُس نے جہاز کے اغوا سے لے کر اپنے ٹھکانے تک مغویوں کی ترسیل کے بے پناہ منظم انتظامات کیے تھے۔ ایسا آدمی جو تاج برطانیہ

سے ٹکرانے چلا تھا اُس کا اپنے ہی ٹھکانے پر یوں آسانی سے قتل ہو جانا مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ ان تمام معاملات میں کہیں نہ کہیں خلا موجود تھا، جو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ چھلیا کے مطابق تمام انگریز قیدیوں کو شدتِ انتقام میں ہلاک کر دیا گیا ہے۔ یہ بات بھی خلافِ عقل تھی۔ کرائتی کار ہوں یا ڈاکو دونوں ہی صورتوں میں مغوی ان کے لیے انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ وہ جس کارِ شوق میں مبتلا تھے وہاں زندگی اور موت معمول کا حصہ ہوتی ہیں۔ اپنے سردار کے قتل پر یہ بیچ پائی خلافِ معمول تھی۔ مانا کہ جذبات اپنے حکم ران خود ہوا کرتے ہیں، تاہم یہ حکم ران نہیں ہوتے۔ میرے دل میں خوف لکیریں بڑھا رہا تھا۔ جو لوگ اپنے سردار کے غم میں انگریز قیدیوں کو بے دریغ قتل کر سکتے ہوں، اُن کی دسترس سے چھلیا کیسے نکل آئے گا، جب کہ اِس علاقے کا چپہ چپہ اُن کا دست نگر ہے۔ مجھے چھلیا میں ذرا بھی کھوٹ محسوس نہیں ہوئی تھی، لیکن وہ کس بل پر میرے ساتھیوں کی حفاظت کا ذمّہ لے گیا تھا۔ بارودیہ نے اڈّے کے لوگوں سے تعاون یہ ہوگا، لیکن اِتنے بڑے گروہ کا سردار اُن کا محتاج نہیں ہو سکتا تھا۔ پورے کاٹھیاواڑ کے اڈّے پاڑے کے لوگ یک جان ہو کے بھی بارودیہ کو منہ نہیں دے سکتے تھے۔ رندھاوے نے اپنے سردار کے غم میں انگریزوں کو چھلنی کروا دیا تھا۔ وہ ہمیں کچلنے کے لیے یقیناً بپھر رہا ہوگا، اور ہماری کھوج کے لیے تمام تر وسائل بروئے کار لائے گا۔ اِس ہنگامہ خیزی میں ریاست کا کردار سب سے پیچیدہ رہا تھا۔ کاٹھیاواڑ کی تمام ریاستیں انگریزوں کی باج گزار تھیں۔ دلّی سے فوج آتی جب آتی، لیکن ریاست بھی تو پاسِ وفا کرتی ہے۔ اب تک یہ اور اس جیسی دیگر مضافاتی بستیاں چھاؤنیاں بن جانی چاہیے تھیں، لیکن ہم نے جنگل کا اِتنا بڑا حصہ سڑک کے ساتھ چلتے چلتے گزارا، بستی میں ایک دن گزر گیا۔ سرکار کے نام پر چڑیا کا بچہ بھی نظر نہ آیا تھا۔

میں جوں جوں سوچ رہا تھا، معاملہ اُلجھتا جا رہا تھا۔ تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھنا چاہیے۔ بہت ممکن ہے بڑے پیمانے پر سرکار حرکت میں آ چکی ہو۔ جنگل کی دوسری اطراف سے گھیرا ڈال دیا گیا ہو۔ یہ ہر جا میری معلومات کا ماخذ چھلیا تھا۔ اِس کے علاوہ تھا۔ مجھے چھلیا پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے۔ دن نکلنے کے میں نے بستی سے سُن گُن لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ بستی سے مختلف باتیں مل سکتی تھیں۔ میں کمرے میں چلا آیا۔ لیونارڈ اوندھا پڑا تھا، آہٹ پر سیدھا ہو گیا۔

"یار، کچھ دیر نیند کر لو!" اُس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"میں نیند کر چکا ہوں۔" میں نے لاتعلقی سے کہا۔

"وہ نیند نہیں، یہ نیند کر لو۔" اُس نے آنکھیں میچ کے دکھاتے ہوئے کہا۔

"نیند ایک ہی طرح کی ہوتی ہے۔" شاید اُس نے مجھے لکشمی سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اُس ملاقات کو الگ رنگ دے رہا تھا۔

"ہندستان کی خوب صورتی فاتحِ عالم ہے۔ یہ شاید سے ہیں یہاں چل کے آتی ہے۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"شاید تم غلط بول گئے ہو، اصل لفظ ہے مفتوحِ عالم!" میں نے کچھ ترشی سے کہا۔ اُس نے عذر خوب تراشا تھا۔

"وہ لڑکی بہت خوب صورت تھی بابر! کون تھی؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"رات بھر صرف اُس کی صورت تکتے رہے ہو۔ پوچھنے کی مہلت کیا ملی ہوگی۔" اُس نے زبردستی قہقہہ لگایا۔ بھلا ایسی آساں ہیں خوش کاریاں۔

"میں بستی میں جا رہا ہوں، تم تازہ دم ہو جاؤ۔ یہاں سے باہر مت نکلنا۔" اُسے غلط فہمی تھی تو رہے۔

"ایک ہی رات میں دل اِتنا بھر گیا ہے۔ نام تک نہیں بتاتے۔" لیونارڈ نے دیدے پھیلاتے ہوئے کہا۔

"لکشمی نام تھا اُس کا... اور وہ میری محبوبہ تھی... اب خوش ہو۔" مجھے غصہ آ گیا تھا۔

لیونارڈ مچل کے آگے بڑھا اور مجھے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ "تم غصے میں اور اچھے لگتے ہو۔ تمھیں دیکھ کے لڑکی دل ہار جائے تو اُس کا دوش نہیں۔ تمھیں خدا نے ہمہ اوصاف و کمال بنایا ہے۔"

صحن میں کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں تو میں باہر نکل آیا۔ چٹائی لپیٹ کے ایک طرف رکھ دی تھی۔ کچے فرش پر ایک ستّہ چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کے اُس نے میلے چکٹ کرتے سے ہاتھ پونچھے اور نمسکار کیا۔ چلتا پرزہ لگتا تھا۔ دوڑتے قدموں سے اُس نے مٹکے کا پانی کیاری میں اُلٹ کے تازہ پانی بھر دیا۔ پھر مٹکے کا بچا ہوا پانی پھرتی سے دیواروں پر اچھالا اور یہ جا وہ جا۔ حالاں کہ میں اُس سے بات کرنے کا سوچ ہی رہا تھا۔ لیکن وہ مچھلی کی طرح پھسل گیا تھا۔ ہر انسان پر ایک نوشتہ ضرور چسپاں ہوتا ہے۔ اُسے پڑھنا قاری کی استعداد پر منحصر ہے۔ بعض کے چہرے چغلی کھاتے ہیں تو کسی کی زبان عرضِ حال کرتی ہے، تو کسی کا بے ڈھنگی کہا جاتا ہے۔ کسی کی چال نوشتہ تو کسی کا لباس نوشتہ دور کوں سراپا نوشتہ۔ بالکل اسی طرح ستّے کے بارے میں گمان گزرا تھا کہ یہ خبردار آدمی ہے۔ اُس کے جاتے ہی دو آدمی صحن چڑھ آئے۔ یہ دونوں کل تمام کاموں میں نمایاں نمایاں تھے۔ ان میں سے ایک وہ تھا جو مرغ بسمل کروا آیا تھا، اور دوسرا لپکا پھرتا تھا۔ وہ دیکھتے ہی بچھ سے گئے۔ ان میں سے ایک کا نام دھیارا اور دوسرے کا نام لنگ چند تھا۔ اُسے لنگو کے نام سے بلایا جاتا تھا۔ یہ دونوں آج کل چھلیا کے آگے پیچھے پھر رہے تھے، پر چھلیا نے اب تک اِن پر ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ دھیارا ابھی جا کے قسمت آزمانا چاہتا تھا اور لنگو کاٹھیاواڑ کے کسی بڑے شہر میں بسنے کا آرزومند تھا۔ میں کافی دیر اُن سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ وہ اُتنا ہی جانتے تھے کہ جتنا چھلیا مجھے بتا گیا تھا۔ بھوک قطعاً نہیں تھی، لیکن لنگو چکما دے کے نکل گیا۔ وہ باتیں کرتے کرتے ابھی آیا، کہہ کے گیا اور واپسی پر پیتل کی دمکتی ہوئی پیالیوں سے بھرا خوان لا دے چل آیا۔ پراٹھے، باجرے کی روٹی، سرسوں کی ترکاری، دہی کا سالن اور نہ جانے کیا کیا اُس خوان میں بھرا تھا۔ لیونارڈ بھی آ گیا۔ ضروریات سے فراغت کے بعد تھوڑا بہت میں نے بھی کھا لیا، لیکن لیونارڈ آخری لقمے تک جتا رہا۔ اُسے ہندستانی کھانا بے حد پسند آیا تھا۔

ناشتے کے بعد میں باہر نکل آیا۔ لنگو اور دھیارا میرے دائیں بائیں ہو گئے۔ میں نے اُنھیں واپس کرنا چاہا، لیکن وہ بضد رہے۔ اُن سے ماری کے متعلق دریافت کیا تو اُنھوں نے بتایا کہ یہاں سے تانگے کے ذریعے دلواڑا جایا جاتا ہے۔ دلواڑا سے ہندستان بھر کے لیے ریل بھی مل جاتی ہے اور لاریاں بھی۔ کچھ ہی دور تانگے نظر آئے جو قطار میں کھڑے تھے۔ جن پر سواریاں لپک رہی تھیں۔ ایک کے پیچھے ایک تانگا روانہ ہو رہا تھا۔ وہیں ساتھ ہی پنساری کی بہت بڑی دکان تھی جس پر خوب ریل پیل تھی۔ لنگو نے بتایا کہ جو سودا دلواڑا سے نہیں مل سکتا وہ بھوّا مہاجن کی دکان میں بھرا پڑا ہے۔ میں وہاں قریب پہنچا تو بھوّا مہاجن مجھے دیکھ کے تھرکتا ہوا دوڑا چلا آیا۔

"رام رام، دھنّے وادہ ہے ہو سری رام جی...! سواگت ہے سرکار... ایں دِس کو بھوّا بولنے کا ہے، بھوّا مہاجن۔" اُس نے ہاتھ جوڑ کے پرنام کیا۔ کاروباری مسکراہٹ تو گویا اُس کے چہرے پر ثبت تھی۔

میں نے جوابا ہاتھ جوڑنے پر اکتفا کیا، اور آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا، لیکن وہ آڑے آ گیا اور منت سماجت کرنے لگا کہ میں اُس کی دکان پر کچھ دیر کے لیے بیٹھوں، اُسے خدمت کا موقع دوں۔ اُسے دیکھ کے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ بستی میں میری متعلق کیا چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ وہ کھینچ تان کر کے مجھے دکان میں لے گیا، اور ملازم کو بادام کے شربت کے لیے دوڑایا۔ شربت منگواتے وقت اُس نے بتانا ضرور سمجھا کہ اُس کے ہاں دلواڑے سے روزانہ برف

آتی ہے۔ وہ بستی کا اکلوتا خوش قسمت صاحب عیال ہے جو
برف سے پنجابی کشید کرتا ہے۔ اُس کی دکان خاصی کشادہ
تھی اور اسباب سے لدی پھدی نظر آتی تھی۔ ایک طرف
پٹ سن کی بوریوں کے ڈھیر تھے، جن کے منہ کھلے ہوئے
اور گلے گولائی میں مڑے ہوئے تھے۔ اناج، دالیں، چاول،
شکر، گھی، تیل کے پیپے، خوش بودار صابن، دھوبی صابن،
پوجا کا سامان۔ ایک طرف رنگا رنگ کپڑوں کے تھان، لٹھا،
بوسکی، سوتی، ریشمی ہر قسم کا کپڑا۔ دوسری طرف شیشے کا
صندوق، چاندی سونے کے زیورات، انگوٹھیاں، گلوبند،
کنٹھے، کڑے، [illegible]، پٹی، سربند، جھمکیاں، چوٹی بند، جوڑے،
جڑاؤ ہار اور نہ جانے کیا کچھ اس میں بھرا پڑا تھا۔ ایک طرف
چھریاں، قسم قسم کے چاقو، تلواریں، ترشول، زنجیریں،
درانتیاں، ہتھوڑیاں، چھینیاں اور دوسرا زرعی سامان بھرا ہوا
تھا، تو ایک طرف خوش بویات، عطریات [illegible]
سامان، رام، کرشن، ماتا اور دیگر کی مورتیاں [illegible]
لوبان کی سلگن دکان میں خوب رچی ہوئی تھی۔ [illegible]
کا شربت لے آیا۔ وہ سفید چاندی کا [illegible]
شربت انتہائی ٹھنڈا، شیریں اور گاڑھا تھا۔ شربت میں ایک
قسم کا بادام کا چورا پڑا تھا۔ بادام کو چاندی کے ورق کے
ساتھ چورا کیا جاتا ہے، اس طرح بادام کا چورا سنہری رنگ
پکڑ لیتا ہے۔ پھر اُسے شربت بادام کے پیالے میں اوپر
سے چھڑک دیا جاتا ہے۔ یہ امرا کا مرغوب شربت تھا۔ مجھے
خیال آیا، لیونارڈ یہ شربت پی لیتا تو خوب خوش ہوتا۔ مہا
مہاجن نے دھیارا اور لنگو کے لیے شربت نہیں منگوایا تھا۔
"مہاراجی! میرے ساتھ دو مہمان اور بھی ہیں۔" مجھے کہنا

نہیں لگا تھا۔ مہاجن کو یاد دہانی کروائی۔
اُس نے ایک لمحے کو کڑوا سا منہ بنایا، پھر وہی
کاروباری مسکراہٹ بکھیری۔ "ایں اے تو، بنا دھیارا اور
لنگو ہونے کا ہیں۔ ایں اپنا بالک ہیں مہمان کا کیں کو۔"
لیکن اُس نے ان دونوں کے لیے بھی شربت منگوا دیا، البتہ
مٹی کے پیالوں میں۔ پھر وہ مجھے ہاتھ پکڑ کے زیورات کے
صندوق پر لے گیا اور بولا: "ایں بس پہ ہاتھ رکھنے کا وہ اپنا
تیرے کو تجر کرنے کا ہے۔ سرمانے کا نہیں اے۔ بس اسارہ
کرنے کا ہے۔"
میں نے عذر تراشا کہ ابھی جلدی ہے پھر آ کے لے
لوں گا، لیکن وہ بٹیل ہو گیا۔ آخر تنگ آمد بہ جنگ آمد، میں
میں نے زیورات کے اوپر نظر ڈالی۔ میری آنکھوں کے
سامنے اندھیرا سا آ کے گزر گیا۔ میں پتھر کا ہو گیا تھا۔
مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے بے اختیار گلے پر
ہاتھ [illegible] کورا کی مالا وہاں موجود تھی۔ مہاجن مجھے بغور
[illegible] میرے جسم کی لرزش تو اندھے کو بھی نظر آ جاتی۔
[illegible] کے بیچوں بیچ ایک سنگِ سفید میں پیوست وہی موتی
[illegible] تھا، جو میری مالا میں پروئے موتیوں جیسا۔ میں
اُسے ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ میری سانس یک دم تیز
ہو گئی۔ یہ تو بیان کی گئی مالا کا موتی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا کورا
کے پاس بھی ایسی [illegible] تھی؟ وہ مجھے ابھی [illegible] میں نظر آئی تھی۔
یہ سوچ کے میرے جسم کا رواں رواں لرزنے لگا کہ یہ موتی
مولوی صاحب نے فروخت کیا ہوگا۔ تو کیا وہ اس بستی میں
آئے تھے۔ اگر وہ اس بستی میں آئے تھے تو پھر وہ یہاں ممتاز
تھے، پوری بستی کے دل و دماغ میں یقیناً موجود ہوں گے۔

ساتھ ایک انگریز تھا تو وہ یہ وہ اُس کا ایک ساتھی ہے، جب کہ جمرو ہلاک ہو چکا ہے۔ تمام انگریز جنگجو ہلاک کر دیے گئے ہیں۔ بھلا شخص کی کھوج میں نکل پڑا۔ بابر نے بستی ہی میں ٹھہرنا مناسب سمجھا۔ رات کے پچھلے پہر بابر کی آنکھ کھلی تو اُس نے ایک خوب رُو دوشیزہ لکشمی کو سرہانے بیٹھے پایا۔ وہ نزدیکی شہر دیواڑ کے امیر کبیر شخص کی لاڈلی بیٹی تھی وہ بابر سے متاثر ہوگئی کہ رگھو بوری والا نامی داوا سے آئے بیچ دے۔ رگھو بوری والا لکشمی پر دل و جان سے فریفتہ ہو چکا۔ بابر کو وہ کرنے پر ہی بن پڑی۔ تب وہ آفت جاں دوشیزہ اڈّے سے نکلی۔ اگلی صبح بابر لنگو و دھیرا کے ہمراہ بستی کا جائزہ لینے نکلا۔ بھوّا مہاجن نامی ایک ساہوکار نے اُسے اپنی دکان میں بصد اصرار بلا لیا۔ اُس کی دکان ہر قسم کے ساز و سامان سے بھری پڑی تھی۔ وہاں بابر کو شیشے کے ایک نمائشی صندوق میں نادر و نایاب موتی نظر آیا۔ یہ موتی ہو بہو کورا کی دی ہوئی مالا میں پروئے موتیوں جیسا تھا۔

"وہ تمھیں کہاں ملے تھے؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

بھوّا مہاجن نے موتی سے میری جذباتی وابستگی اُچک لی اور محتاط انداز میں بولا۔ "ایں موتی بڑے کھان جی کو پیش کرنے کا ہے۔ ابھی آپ کی اِچھا ہے تو...!"

"تم غلط سمجھتے ہو۔ مجھے موتی نہیں چاہیے۔ براہِ مہربانی جن سے موتی خریدا ہے اُن کا آتا پتا بتا دو۔ وہ سیکڑوں موتیوں سے بڑھ کے ہیں۔" مجھ سے کہاں صبر ہوتا... میں نے اُس کی بات کاٹ کر فوراً غلط فہمی دُور کرنے کی کوشش کی۔ مجھے تو چکو بنگ رہے تھے کہ ابھی بھوّا مہاجن پتا بتائے گا اور ابھی میں اُس کی چوکھٹ پہ جا موجود ہوں گا۔ میں اُس کی لب کشائی کا منتظر تھا اور بھوّا کا چہرہ گھٹ بڑھ رہا تھا۔ اُس نے کھوجتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اپنے کو بھی پورا وسواس ہے اس کے پاس کھنڑیں موتی ہیں، مگر ابھی وہ ملنے کا نہیں ہے۔ سوامی جی! اگر تیرے کو کچھ کھبر ہوئے تو اپنے کو بتانے کا ہے۔ اے انوکھا موتی ہے ایک دم تھوڑا۔"

بھوّا مہاجن نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا تھا، اور کچھ چھپا گیا تھا۔ یقیناً اُس نے آم گٹھلی کے دام خریدا تھا، اور اب پوری فصل خریدنے کا خواہاں تھا۔ اِس کا مطلب تھا کہ وہ دل ربا مولوی کے پتے سے واقف تھا اور مجھ میں اب صبر کی تاب نہیں تھی۔ میں نے بھڑک کے اُس کا گریبان پکڑا اور پوری وحشت سے جھٹک دیا۔ وہ ہڑبڑا کے تاج کی بوریوں پہ جا پڑا۔ دھیارا اور لنگو شاید شارے کے منتظر تھے۔ چاقو سوت کے لپکنے لگے، لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کے اُنھیں روک دیا۔ یہ بچکانہ پن کی حرکت تھی۔ بھٹل ہوتا تو بھوّا کو چھوڑ کے دھیارا اور لنگو کے جھاتا، نہ میں بھٹل تھا اور نہ میرے پاس اِتنی فرصت تھی۔ بھوّا ڈگمگاتا ہوا اٹھ رہا تھا کہ میں نے بڑھ کر گھٹنا اُس کے پیٹ میں مارا۔ وہ ڈکراتا ہوا پلٹ [illegible] گرا۔ وہاں میرے دوسرے پیر کی ٹھوکر نے اُس کی پشت کا استقبال کیا۔ بھوّا کی لرزہ خیز چیخوں سے دکان [illegible] تھی۔ کاش کہ میری وحشت کو زبان مل جاتی تو شاید بھوّا کو یہ تشدد نہ سہنا پڑتا۔ آخر بھوّا میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"دیا کرو سوامی جی... چھما کرو... چھما کرو۔"

دکان سے باہر آناً فاناً بھنبھناتا ہوا ہجوم جمع ہو چکا تھا۔ میں نے گدّی سے پکڑ کے بھوّا کو اٹھایا اور اپنے تئیں انتہائی سفّاک لہجے میں کہا۔ "بھّوا سیٹھ! دوسری بات نہیں سنوں گا۔ مجھے فی الفور اُن کا پتا بتاؤ، ورنہ تمھاری نسلیں یاد رکھیں گی!"

بھوّا کی حالت دگرگوں تھی۔ اُس کے ساتھ میرا یہ سلوک انتہائی غیر مناسب تھا۔ مروّت بھی کسی شے کا نام ہے۔ بھوّا بے چارے نے بلا کے عزت سے بٹھایا کہ آ بیل مجھے مار۔ اب میرے پاس یہ سب سوچنے سمجھنے کی فرصت کہاں تھی۔ اگر میں یہ کچھ نہ کرتا تو وہ یوں تیر کی طرح نہ سیدھا کھڑا ہوتا۔ وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا تھا، لیکن اُس کی سوچ چہرے پر آ کے صاف بیان کر رہی تھی کہ گویائی کی قیمت جان سے کچھ کم بھی نہیں۔ "اُدھر دلواڑے میں سا کر بھائی کی گلی مسجد تھی۔ وہ اُدھر سا کر بھائی کے گھر میں رہنے کا ہے، یہ..." بھّوا نے ڈوبتی آواز نکالی۔ "سا کر بھائی کو لاکھ پورا اور آدھا دینے کا ہے۔" وہ نڈھال ہو کے فرش پہ پسر گیا۔ لمحوں میں اُس کا رنگ پیلا زرد پڑ گیا تھا۔

دکان کے اندر کوئی نہیں آیا تھا، لیکن باہر پوری بستی جمع ہوگئی تھی۔ چھوٹے علاقے اِس اعتبار سے بڑے ہوتے ہیں کہ وہاں کوئی بات چھوٹی نہیں ہوتی۔ شہروں کی بڑی بڑی اور امیر و کبیر باتیں ان بستیوں میں سرے سے موجود ہی نہیں ہوتیں اور یہ بھی خوب ہے کہ ان بستیوں کی چھوٹی چھوٹی اور نادر باتیں شہروں میں نہیں ہوتیں، لیکن پھر بھی شہر بستیوں سے قائم ہیں اور بستیاں شہروں سے۔ بھوّا مہاجن کی دکان پر اس ہڑبونگ کو کچھ شخص چند لمحے ہوئے تھے، گویا بستی والوں کو گھنٹوں پہلے علم ہو گیا تھا، بس انھیں انتظار تھا کہ کس دم یہاں پہنچ گئے۔ میں بھّوا کے ساتھ مشغول تھا تو دھیارا اور لنگو باہر نکل گئے تھے۔ وہ تنک دھڑنگ مغلظات سے بستی [illegible] والوں کو منتشر کرنے میں مصروف تھے۔

"وہ اِس وقت شاکر بھائی کے گھر ہی میں ہے؟" میں نے [illegible] چنگی سے پوچھا۔ مجھے یقین کہاں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے، ورنہ اب وہاں کیا ٹھہرنا۔

"ابھی تم اندر چل کے میری بات سننے کا ہے۔" بھّوا کو پھر حال آ گیا۔ وہ پھر بھڑک کے میرے پیروں سے لپٹ گیا۔

دکان کے عقبی حصے میں دروازہ تھا، جس پر ٹاٹ کا میلا سا پردہ پڑا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ گودام قسم کی کوئی جگہ تھی۔ میرا دل کھولتے ہوئے شوربے کی طرح اُبل رہا تھا۔ میں نے بمشکل خود کو سنبھالا۔ جلد بازی ایک مرتبہ پھر منزل کو دُھندلا سکتی تھی۔ مجھے ایک مرتبہ پھر پوری شدت سے احساس ہوا کہ کوئی ہے جو مجھے کور سے مارنے کے درپے ہے، ورنہ بحری جہاز تو بمبئی جا رہا تھا، اور مجھے کیا پڑی تھی جو بھّوا مہاجن کی دکان پہ چڑھتا۔ میں نے جھٹک کے اپنے پیروں سے بھّوا کو الگ کیا اور کڑک کے کہا۔ "اندر کیا ہے؟"

"اُدھر یہ سب سننے کا ہے۔ ابھی سارا سچ بتائیں گا۔ یہ سب لوگ میرے کو ختم کرنے کا ہے سوامی جی۔ بڑی رنج کی بات ہے۔"

میرا دل ایک بار پھر دھڑک سا گیا۔ مجھے متواتر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میری توقع سے کہیں زیادہ یہ شخص کورا اور مولوی صاحب کے بارے میں جانتا ہے۔ میں نے گریبان پکڑ کے اُسے اٹھا لیا اور دروازے کی طرف دھکیلا۔ "چلو، ذرا ہوشیاری دکھائی تو تمھارے ٹکڑے کوئی شمار نہیں کر سکے گا۔"

میرا ذہن بہ سرعت گھوم رہا تھا۔ دروازے کے اُس طرف واقعتاً گودام ہی تھا۔ بھّوا نے ہوش رُبا تفصیل بتائی۔ اُس نے بتایا کہ قریباً ایک ماہ قبل وہ حسبِ معمول دلواڑہ خریداری کے سلسلے میں گیا۔ وہاں ایک جوہری اُس کا بے حد گہرا دوست ہے۔ وہ دلواڑا جاتا ہے۔ فارغ وقت اپنے جوہری دوست ہی کے پاس گزارتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ جوہری مسلمان تھا اور اُس کا نام حسین والا تھا۔ بھّوا نے دلواڑا سے میٹرک پاس کیا تھا، جب کہ حسین والا اُس کا ہم جماعت تھا۔ دونوں کا تعلق متمول خاندانوں سے تھا اور دونوں ہی کے خاندان مذہبی انتہاؤں پر اُستوار تھے۔ ایک کٹّر ہندو اور دوسرا کٹّر مسلمان۔ حسین والا سے بھّوا مہاجن کے خوب لمبے مباحث ہوا کرتے تھے۔ گزشتہ ایک سال سے تو ان کی ہر ملاقات اسی بحث کی نذر ہو رہی تھی، جب کہ ان فروعات سے جدا ان کی دوستی اٹوٹ تھی۔ اُس دن بھی بھّوا، حسین والا پر یہ ثابت کرنے میں مشغول تھا کہ ہندومت بے شمار دیوتاؤں کے بجائے ایک بھگوان کی وحدانیت کا پرچارک ہے۔ جب ایک باریش اور چمکتی ہوئی صورت کا مالک، نرم رُو بزرگ حسین والا کے پاس آیا تھا۔ اُس نے اپنا نام مولوی شفیق احمد بتایا اور حسین والا کو اس کے مربّی شاکر بھائی کا حوالہ دیا۔ ان کے پاس یہ موتی تھا جسے وہ فوری فروخت کرنا چاہتے تھے۔ حسین والا نے موتی کے دام اُن کی توقع سے کہیں کم لگائے۔ وہ پریشان اور گھبرائے گھبرائے سے لگتے تھے۔ اُنھوں نے معمولی سی جرح کے بعد بے بہا موتی حسین والا کو کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دیا اور شانِ بے نیازی سے چلتے بنے۔ حسین والا کی طویل رفاقت سے بھّوا کو بھی زر و جواہر کی اچھی خاصی پہچان ہو گئی تھی۔ موتی کی اہمیت اُس سے چھپی نہ رہ سکی۔ اُس نے اپنی دوستی کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے حسین والا پر اصرار باندھ لیا۔ آخر کار

حسین والا کو وہ موتی معقول منافع پر بھُوا کو فروخت کرنے پڑے تھے۔ مولوی شفیق کی بے اعتنائی سے بھُوا نے اندازہ لگایا تھا کہ ان کے پاس بے ذبان موتی بے بہا ہیں۔ شاکر بھائی سے وہ رسمی طور پر واقف تھا۔ شاکر دیسے تو علی مسجد کے متولّی تھے، لیکن در پردہ اُن کے بیاج کا وسیع بین دین تھا۔ دلواڑا کی کون سی بیٹھ اور کون سی دیوار تھی جو شاکر بھائی کے پیسے سے نہ لگی ہو۔ شاکر بھائی کے بزرگوں کی تیسری پشت علی پیر کے ہاتھوں مسلمان ہوئی تھی۔ بیاج کا بیوپار ان کا آبائی پیشہ تھا، جسے ترک کرنے پر وہ قادر نہ تھے، اور نہ ہی وہ ایسا کرنا چاہتے تھے، کیوں کہ ان کے ''کھاتا دفتر'' کی بہیاں پشتوں سے مقروض لوگوں کے ناموں سے بھری پڑی تھیں۔ تاہم وہ خود کو سُود خور کہلوانا سخت ناپسند کرتے تھے، اِس لیے پورا دلواڑا ان کے کاروبار سے مکمل واقفیت رکھنے کے باوجود کچھ نہیں جانتا تھا۔ شاکر بھائی کے آبا نے علی پیر کے مزار پر علی مسجد بھی بنوائی تھی، جہاں ہر گیارہویں کو بمبئی سے قوال آتے تھے۔ بھُوا اِس لیے حیران ہُوا کہ شاکر بھائی نے موتی خود کیوں نہیں خرید لیے، بہ زادہ حسین والا سے موتی لے کر سیدھا شاکر بھائی کی کوٹھی پر پہنچا۔ شاکر بھائی سے بوا کو ایک نسبت اور بھی تھی۔ شاکر بھائی بھُوا ہی کی ذات برادری کا تھا اور بھُوا کا خیال تھا کہ اُس کے اور شاکر بھائی کے پردادا دُور پرے کے رشتے سے بھائی تھے۔ شاکر کا پردادا جب مسلمان ہُوا تھا تو اُس کے رشتے ناتے تبدیل ہوگئے تھے۔ شاکر بھائی بھُوا کو اپنے در پر دیکھ کے متعجب ہُوا، تاہم اس سے بڑے تپاک سے ملا۔ بیٹھک کے بجائے مردان خانے میں بٹھایا۔ بھُوا نے باتوں ہی باتوں میں مولوی شفیق اور موتی کا تذکرہ کیا تو شاکر بھائی چونک گیا۔ وہ مولوی صاحب سے واقف تھا، تاہم نادر و نایاب موتیوں کے خزانے کا اُسے علم نہیں تھا۔ مولوی صاحب تقریباً ایک ماہ سے علی مسجد کے امام کے گھر میں مقیم تھے۔ اُن کے ہم راہ اکلوتی صاحب زادی تھی۔ وہ امام مسجد کے پرانے واقف کار تھے اور سیر و سیاحت کی غرض سے چلتے چلتے یہاں تک پہنچے تھے۔ شاکر بھائی روئی کا بیوپاری تھا۔ بھُوا کی اطلاع کے بعد ایک پل کی فروگذاشت ناممکن تھی۔ اس کے عین ناک تلے انمول خزانہ کوڑیوں کے بھاؤ بک رہا تھا اور اُسے خبر نہ تھی۔

اُس نے مولوی صاحب کو طلب کرنے کا خطرہ مول نہ لیا تھا، خود کانپتا لرزتا ہُوا امام صاحب کے دروازے پر پہنچ گیا۔ بھُوا ساتھ ساتھ تھا۔ وہ دستک دیا ہی چاہتے تھے کہ دروازہ عجلت میں کھُل گیا۔ مولوی شفیق گھبرائے ہوئے نکل رہے تھے کہ اُن سے اُلجھ کر ڈگمگا گئے۔ اُن کی صاحب زادی کی طبیعت اچانک خاصی ناساز ہوگئی تھی، وہ اُسے اسپتال لے جانے کے لیے سواری تلاش کرنے نکلے تھے۔ امام صاحب اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ بھُوا کے پاس شان دار موٹر تھی۔ اُس نے اپنی اور موٹر کی خدمات پیش کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ مولوی صاحب کے سہارے لڑکھڑاتی ہوئی ایک برقع پوش لڑکی بھُوا کی موٹر میں آن بیٹھی۔ ان کے ساتھ امام صاحب کی زوجہ بھی تھیں۔ بھُوا نے انھیں اسپتال تو پہنچایا تھا، تاہم وہ اس دوران اپنا سب کچھ ہار گیا تھا۔ اُس برقع پوش لڑکی کا دو ایک مرتبہ نقاب کیا اُلٹا تھا کہ بجلیاں تڑپ کے بھُوا کی آنکھیں خیرہ کر گئی تھیں، سیاہ بدلیوں کی اوٹ میں ایسا ماہ تاب تھا کہ ماہ تاب بھی شرمائے۔ بھُوا نے اتنا حسین چہرہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ ایسی صورت کا تصور تک نہیں کرسکتا تھا۔ بھُوا نے وہ موتی پایا تھا کہ جس کے سامنے ہیرے کی چمک ماند پڑ جائے۔ بھُوا نے اسپتال کی چوکی سنبھال لی۔ اس کی بے قرار نگی نہ رہی تھی۔ نہ شاکر بھائی سے اور نہ ہی مولوی صاحب سے۔ ان کی واپسی بھی بھُوا کی موٹر میں ہوئی اور مریضہ کو اسپتال سے افاقہ ہُوا تھا۔ مولوی صاحب بھُوا کی اس ناگہاں دست گیری پر بے حد مشکور ہوئے۔ ہر چند کہ بھُوا ہندو تھا، تاہم اُنھوں نے شاکر بھائی اور اُسے بہ صد اصرار کھانے کے لیے روکا۔ امام صاحب بھی آچکے تھے۔ وہ شاکر بھائی کے نمک خواروں میں سے تھے، اِس لیے خندہ روئی سے مسکرا رہے تھے۔ مولوی صاحب نے کھانے کا کہہ کر گویا بھُوا کے دل کی بات چرائی تھی، لیکن شاکر بھائی کی مداخلت پر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ وہ اسے گھسیٹ لے گئے۔ بھُوا کی زندگی میں وہ دن قیامت ڈھا گیا۔ اس کے لیے مولوی صاحب کی چوکھٹ چھوڑ کے باقی دنیا بے رنگ و بو ہو چکی تھی۔ اس نے من ہی من میں ہر قیمت پر مولوی صاحب کی صاحب زادی کو حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اسے رخصت کرتے وقت شاکر بھائی نے کہا تھا

کہ اِس وقت مولوی صاحب سے موتیوں کی بابت بات کرنا غیر مناسب تھا، تاہم بھُوا اب خود کو اس معاملے سے دُور سمجھے، لیکن بھُوا دوسرے دن براہِ راست مولوی صاحب کی طرف پہنچ گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ آج بھی اُسے کھانے کی دعوت دی جائے گی۔ مولوی صاحب نے اُس کی آرزوؤں پر خاک ڈال دی۔ اُسے گھر میں بٹھانے کے بجائے محلے کے چبوترے پر بٹھایا۔ امام صاحب کے مکان میں بیٹھک کی گنجائش نہیں تھی۔ پہلے پہل مولوی صاحب نے مزید موتیوں کی موجودگی سے انکار کیا، تاہم جب بھُوا نے فی موتی قیمت پچاس ہزار بتائی تو اُنھوں نے تھوڑی سی حیل حجت کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ اُنھوں نے بھُوا کو بتایا کہ اُن کے پاس چند موتی اور ہیں جنھیں وہ مناسب دام ملنے پر فروخت کرنا چاہتے تھے۔ بھُوا کی پیش کش معقول تھی، لہٰذا انھیں موتی فروخت کرنے میں کوئی عذر نہ تھا۔ ابھی اُن کے درمیان [illegible] طے پایا ہی تھا کہ قریب جسامت کا مالک شاکر بھائی [illegible] تین کارندوں کے ہم راہ چیختا ہُوا وہاں آن دھمکا۔ اُس نے بھُوا سے درشت لہجے میں اپنے ساتھ چلنے کا کہا، جب کہ اُس نے مولوی صاحب سے فدویانہ انداز اختیار [illegible] کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے لیے علاحدہ مکان کا انتظام کیا گیا ہے۔ پھر اُس نے اپنے ایک ملازم کو حکم دیا کہ وہ نئے مکان میں منتقلی کے لیے مولوی صاحب کی مدد کرے، اور اس نیک کام میں کسی تاخیر کی گنجائش نہیں ہے۔ مولوی صاحب متذبذب حالت میں کھڑے ہی رہ گئے، جب کہ بھُوا کو شاکر بھائی بازو سے پکڑ کے اپنے ساتھ لے گیا۔ بھُوا نے شاکر بھائی کے ساتھ جانے میں ہچکچاہٹ دکھائی، لیکن پھر شاکر بھائی اور اُس کے کارندوں کے کڑے تیور دیکھ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ شاکر بھائی نے اُسے مہمان خانے میں لے جا کے بٹھایا۔ اس کے ہم راہ کھانا کھایا ہے۔ اس کے بعد بھُوا کو مہمان خانے میں قید کر دیا گیا۔ شاکر بھائی نے اس دوران اُس سے موتیوں اور مولوی صاحب سے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ کئی گھنٹوں کے بعد شاکر بھائی تالا کھول کے مہمان خانے میں آیا اور اُس نے بھُوا سے کہا کہ وہ جاسکتا ہے اور اسے امید ہے کہ بھُوا زبان بندی کو محترم جانے گا۔ بھُوا نے اندازہ لگا لیا کہ شاکر بھائی مولوی صاحب سے موتی حاصل

کر چکا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اُس نے مولوی صاحب کو یہاں سے روزانہ بھی کر دیا ہو۔ عافیت کی بات تھی کہ بھُوا خاموشی سے نکل جاتا، لیکن کیا کرتا دل نادار کا جو بہاں خانے میں مچل رہا تھا۔ بھُوا کو گومگو کی کیفیت میں دیکھ کر شاکر بھائی بول پڑا۔ اُس نے کہا کہ وہ بھُوا کی حالت سے واقف ہے، لیکن بھُوا کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ برہمن ہے اور مسلمانوں کے مذہبی پیشوا کی دختر پر نظر مار رہا ہے، اور یہ ناممکنات میں سے ایک کام ہے۔ شاکر بھائی نے یہ کہہ کر بھُوا کے من میں جوت لگا دی کہ اگر بھُوا اسلام قبول کرلے تو وہ بہ نفسِ نفیس اپنی سرپرستی میں بھُوا کا نکاح اس برقع پوش لڑکی سے پڑھوا دے گا۔ بھُوا کا نیم اثباتی ردِعمل دیکھ کر شاکر بھائی نے کہا کہ ان کی جاتی کے کچھ سرکردہ افراد اسلام سے متاثر ہیں، لیکن ہچکچا رہے ہیں، اگر بھُوا مسلمان ہو جائے تو دوسروں کی راہ آسان ہو سکتی ہے۔ بھُوا نے اس سے سوچنے کا وقت لیا، اور چلا آیا۔ بھُوا کے زیرِ بند میں ڈیڑھ لاکھ روپے بند تھے، جو شاکر بھائی کے کارندوں نے کھول لیے تھے۔ بھُوا نے اُن کا تقاضا کیا تو شاکر بھائی نے اُن کی واپسی اُس کے جواب سے مشروط کر دی۔ بھُوا کے جی میں آئی کہ یہاں سے نکلتے ہی پولیس میں پرچہ دے دے، ایک پولیس افسر سے اُس کی جان پہچان تھی، لیکن اُسے محسوس ہُوا کہ ڈیڑھ لاکھ روپے کی اُسے اب کوئی خاص فکر نہیں رہی تھی۔ اتنی بڑی رقم ہاتھ سے نکل گئی تھی اور بھُوا اُس رخِ سرو ناز کے تصور میں غرق تھا۔ وہ اسلام قبول کرنے سے وابستہ خطرات کا احاطہ کر رہا تھا۔ اُسے صاف نظر آیا کہ اُس کا قبولِ اسلام بہت سوں کے لیے قابلِ تقلید مثال تھا اور شاکر بھائی کی مسلم تنہائی کو بھی خاصا فائدہ ہوسکتا تھا، لیکن دوسری طرف اُس کی جان کو لالے بھی پڑ سکتے تھے۔ اُس کا کاروبار تباہ و برباد ہونے کا قوی امکان تھا۔ وہ آج جن میں محترم تھا اُنھی میں اچھوت بن جاتا، لیکن وہ کیا کرتا۔ وہ خانہ برباد تو اُسی لمحے ہو چکا تھا جب اُس کی موٹر مولوی صاحب کے دروازے لگی تھی۔ ہفتے بھر کی سوچ بچار سے اُس نے جانا کہ عافیت مسلمان ہونے ہی میں تھی۔ وہ دوڑا دوڑا شاکر بھائی کے پاس گیا، اُسے مژدۂ جاں فزا سنایا، مگر شاکر بھائی نے اُس کے خواب چکنا چور کر دیے۔ مولوی صاحب گذشتہ

رات اپنی صاحب زادی کے ہم راہ وہاں سے جا چکے تھے۔ شاکر بھائی نے اُسے بتایا کہ صبح دستک دی گئی تو اُن کا دروازہ اندر سے کھلا تھا۔ کئی دستکوں کے بعد جب کوئی نہ آیا تو معلوم ہوا کہ مکان تو اندر سے سائیں سائیں کر رہا ہے۔ مولوی صاحب اپنی کلوتی صندوقچی اور صاحب زادی کے ہم راہ غائب ہیں۔ بھوا نے انھیں بے حد تلاش کیا، لیکن کوئی اتا پتہ نہیں مل سکا تھا۔ البتہ اُسے یہ سُن گُن مل گئی تھی کہ شاکر بھائی نے مولوی صاحب سے اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگا تھا۔ بھوا کو شک تھا کہ مولوی صاحب کہیں گئے نہیں ہیں، بل کہ شاکر بھائی نے انھیں غائب کروایا ہے، کیوں کہ جس مقام کو اُن کی قیام گاہ بتایا گیا تھا، بھوا کی اطلاع کے مطابق گذشتہ کئی ماہ سے مسلسل مقفّل تھا۔ بھوا کے استفسار پر شاکر بھائی تیخ پا ہو گیا اور بھوا پر لاتوں اور گھونسوں کے ہم راہ چل پڑا۔ اسی دن شاکر بھائی اور اُس کے کارندوں نے مار مار کے بھوا کو ادھ موا کر دیا۔ اُسے موٹر میں ڈالنے سے پہلے شاکر بھائی نے دھمکا دیا تھا کہ مولوی صاحب کی کھوج میں وہ پھر کبھی دلواڑا میں نظر آیا تو وہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ بھوا نے بتایا کہ قریباً بیس روز گزر چکے وہ دلواڑا نہیں گیا۔ مجھے دیکھ کے اُسے کچھ امید ہو چلی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ میں اگر اُس کی مدد پر آمادہ ہو جاؤں تو شاکر بھائی سے مولوی صاحب اور ان کی صاحب زادی کو برآمد کیا جا سکتا ہے، ورنہ دلواڑے کا کون سا بدمعاش تھا جس کا خرچہ شاکر بھائی نہ اٹھاتا ہے۔ اُس کے کاروبار میں شہروں کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ بھوا کے بقول موتی سے میری جذباتی وابستگی دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ بھوا نے یہ اندازہ لگانے میں تاخیر نہیں کی تھی کہ میں مولوی صاحب کے واقف کاروں میں سے تھا۔ شاکر بھائی میں کیا کم تھا کہ یک نہ شد دو شد۔

بھوا سے گزشتنی سن کر میں سناٹے میں آ گیا تھا۔ بھوا نے بیس روز قبل تک کے حالات سنائے تھے، جب کہ میں چار رات قبل مولوی صاحب اور کورا کو لاری میں سوار ہوتے دیکھ چکا تھا، تاہم مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ لاری اڈا کس قصبے یا شہر کا تھا۔ مولوی صاحب کے پاس وہ موتی کہاں سے آئے، جب کہ مجھے واثق یقین تھا کہ کورا کے پاس موتی یا جواہرات نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ اجنبی کی دی ہوئی مالا میرے پاس تھی۔ کورا کی ڈبیا کے جواہرات لالا جان کے پاس رہ گئے تھے۔ بھوا کا بیان سُن کر مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ مولوی صاحب کے پاس کئی موتی مالا ہی کی صورت میں تھے، اور کورا کی پلکوں کا ایک ایک بال مجھے ازبر تھا تو اتنی بڑی مالا کیسے پوشیدہ رہتی۔ موتیوں کا معمّا میری سمجھ سے بالا تھا۔ بھوا نے بجھتی ہوئی آواز میں یہ سب کچھ سنایا تھا۔ اس کا بیان اجڑا ہوا تھا۔ اُسے دیکھ کے میری وحشت خاکستر ہو رہی تھی۔ ”ابھی میری بہت ساری جائیداد بچی ہے۔ دکان میں لاکھوں کا مال ہے۔ باجار سے لاکھوں کی وصولی ہے۔ تجوری نوٹوں سے چکل بھرنے کا ہے۔ سب تیرے کو دینے کا۔ بس اُس مولوی کو ڈھونڈنے کا ہے۔“ بھوا ہاتھ جوڑ کر بڑبڑنے لگا۔ میرا دل چاہا کہ گریبان چاک کروں اور قہقہوں سے اپنی نسیں پھاڑ ڈالوں۔ طمانچہ بھوا نے مارا تھا، لیکن ہاتھ غیبی تھا۔ جنوں کا گھمنڈ ہی تو اہلِ جنوں کو سرفراز رکھتا ہے۔ زمانے میں یکتا ہونے کا احساس ہی تو ہے جو قربان پر قربان کیے جاتا ہے، جہاں نسرین ناز آفریں یکتائے چمن ہے تو وہاں بلبل خوش نوا کی مدحت سرائی بھی حسن آفریں ہے۔ نکہتِ بہاری نقوشِ آبلہ پائی ہی پر ہے ٹھٹک ٹھٹک کے گزرتی ہے۔ اس لطف کو کیا کہیے گا جو اُن ہوا کرنے سے سر اٹھاتا ہے اور ایک خمار آگیں پندار کو ختم دیتا ہے۔ بھوا نے ایک جملے سے میرا پندار خاک برد کر دیا تھا۔ اب کیا رہا تھا میرے پاس؟ یہ تو اپنا دھرم تک تیاگ رہا تھا۔

میں بھوا کو کیا جواب دیتا، میں تو جیسے زلزلوں کی زد میں تھا۔ اُس نے میری لب مہری کا نہ جانے کیا مفہوم اخذ کیا کہ میرے بے حد قریب ہو کے بولا، ”بھگوان نے ایسا خوب صورت مکھڑا دوسرا نہیں بنایا، ورنہ تیرے کو جورو دکھانے کا تھا۔ جندگی میں ایک بار اسے چومنے کی اِچھا ہے۔ اور بس!“

چناں چہ مجھے نہیں معلوم کہ میرے ہاتھ میں کتنی قوت تھی، لیکن میری انگلیوں نے بھوا کے رخسار کی کھال چھیل دی تھی اور ان نشانات پر گوشت پھٹ کے چیتھڑوں کی طرح اُمڈ پڑا تھا۔ اس میں بھوا کا کیا قصور۔ وہ تو نردوش تھا۔ وہ تھی ہی ایسی کہ فرزانوں کے غول دیوانے ہو جائیں۔ بھوا کو میں بری طرح پیٹ چکا تھا، مگر لگتا تھا کہ اس تھپڑ کی لذت اس کی پور پور میں رچ بس گئی ہے۔ اس کے قیم وادراک نے کچھ شناخت کیا تھا، وہ سہمی اور خالی نظروں سے کچھ دیر مجھے دیکھا کیا۔ اُس کی کہانی اس مسودے سے کہیں بڑی تھی جو اُس نے مجھے سنایا تھا۔ باہر شور بڑھتا جا رہا تھا، اب یہاں ٹھہرنا بیکار تھا۔ میں بھوا کو ساتھ لے دلواڑا جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس اثنا میں دھیارا ہڑبڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔

”پولیس، دلواڑا کا پولیس ہے، جیپوں میں...“

دھیارا کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی بھوا کی گھٹی گھٹی چیخ گونج گئی۔ دھیارا کے دوڑتے قدموں ہی نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کروائی تھی۔ مڑنے سے میری پشت بھوا کی طرف ہو گئی تھی۔ اس دوران اُس نے نہ جانے کہاں سے ایک بڑا چھرا برآمد کر کے اپنا پیٹ چیر لیا تھا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھرا اُس نے اپنے سینے میں اُتار لیا تھا۔ کچھ لوگ کتنے آسان ہوتے ہیں۔ آسانی سے [illegible] ہیں، آسانی سے مرجاتے ہیں۔ میں بے حال ہو کے [illegible] کی طرف لپکا۔ اُس کے جسم سے خون فوارے کی طرح [illegible] تھا۔ اُس کی مطمئن آنکھیں چڑھنی شروع ہو گئی تھیں۔ میں نے ہارے ہوئے جواری کی طرح اُسے جھنجوڑا۔ اُس کی آنکھوں نے آخری بار مجھے دیکھا اور اُس [illegible] زبان نے لڑکھڑاتے ہوئے، ڈگمگاتے ہوئے کہا، ”مولبی صاحب کا کھدا (خدا)، میرا کھدا۔ اُس کی ...مجبوری کا کھدا۔ میرا کھدا... میں ہندو دھرم چھوڑنے کا...“ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ اُس کے گلے سے ”کھر کھر“ کی تکلیف دہ آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ جاتے جاتے بھی مجھے گہری چوٹ لگا گیا تھا۔ صرف ایک جھلک کے عوض جان، مال اور دھرم سبھی کچھ دان کر گیا تھا۔ دھیارا یہ منظر دیکھ کے پتھر کا ہو گیا تھا۔ اُس کے پیچھے لنگو بھی ہوا کے مانند اندر داخل ہوا تھا۔ اندر کا منظر دیکھ کے اُس کی آنکھیں بھی پھٹ پڑی تھیں۔ کوئی دم تھا کہ ڈھیلے نکل پڑتے۔ بستی کے امیر ترین ساہوکار بھوا مہاجن کی خون میں تربتر لاش آخری ہچکیاں لے رہی تھی، اور میں اُس کے قریب بیٹھا ہوا نہ جانے کس کا ماتم کر رہا تھا۔ دھیارا نے بدحواسی سے مجھے جھنجوڑا۔ اس کی ناگہانی کا اُسے گمان بھی نہیں تھا۔ اُس نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا، ”یار بھائی جونا گڑھ کی پولس دکھنے کا ہے۔ ان لوگ کے ساتھ مگر بج بھی چار پانچ ہیں... ابھی یہ قتل...“

لنگو نے منتشر آواز میں اُس کی بات پوری کی۔

”اپنے کھاتے میں پڑنے کا ہے۔“

پولیس کی آمد میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی، لیکن یہ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ پولیس عین اس وقت آئے گی جب بھوا کی لاش میرے زانو پر پڑی ہوگی۔ مجھے اور لیونارڈ کو اس بستی میں آئے چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے اور کھوجیوں کے لیے یہ خاصا وقت تھا۔ اگر بھوا کی لاش کو منظر سے ہٹا دیا جائے تو پولیس کے لیے میں اور لیونارڈ انتہائی معزز مہمان تھے، لیکن یہ ناممکن تھا۔ دھیارا، جو اور اندر کی طرف دوڑ گیا تھا، سرگوشی میں چیخا، ”لنگو، اِدھر درواجہ۔“ اُس نے چوبیوں کی اوٹ سے ایک دروازہ کھوج نکالا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ پولیس اب تک نہیں پہنچی تھی، حالاں کہ

باہر سے یہاں تک بیس قدم کا فاصلہ تھا۔ لنگو نے مجھے شانوں سے پکڑ کے اٹھایا اور بالی پن پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "بابر بھائی! آپ دھیارا کے ساتھ نکلنے کا ہے۔ اپنے کو ویسے ہی جیل جانے کا تھا۔" اُس کی آواز سے تصنع مترشح تھا۔

دھیارا بھی دوڑا ہوا، آن پہنچا تھا۔ اُس نے میرا بازو پکڑ کے کھینچنا شروع کر دیا۔ میں نے بہ مشکل اپنے حواس مجتمع کر رکھے تھے۔ بازو چھڑوانے کے لیے میں نے دھیارا کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اُس کا جسم شکار چڑھے خرگوش کی طرح کانپ رہا تھا۔ ان دونوں کا پہلی مرتبہ اس قسم کی صورتِ حال سے سابقہ پڑا تھا۔ جسم نے ان کی توشقی کا بھانڈا ضرور پھوڑا تھا، تاہم دل اُن کی آنکھوں میں دلیری سے چمک رہا تھا۔ میں نے دھیارا سے بازو چھڑاتے ہوئے کہا "یہاں سے نکلنا ممکن ہے تو تم دونوں نکل جاؤ۔ میں یہاں دیکھ لوں گا؟"

"استاد گالی نہیں دینے کا..." لنگو نے بگڑ کے کہا۔ "ابھی چھیپ کو کیا منہ دکھانے کا ہے۔"

مجھے معلوم تھا یہ نہیں جائیں گے، تاہم میں نے آخری کوشش کی۔ "تمھارا پولیس کی پکڑ سے آزاد رہنا میرے لیے بے حد ضروری ہے۔ مجھے کچھ کام لینا ہے۔ میں آسانی سے چھٹ جاؤں گا۔"

"ابھی یہ چکر ایک ایک اپنے کو بھی مارنے کا ہے۔ ہم نہیں جائیں گا استاد۔" دھیارا نے، کڑتے ہوئے کہا۔ اُس کا لہجہ اٹل تھا۔ اچانک بھوا نے زوردار "کھر کھر" کی۔ میری دانست میں بھوا مر چکا تھا، لیکن نہ صرف وہ کھرکھرایا تھا، بل کہ اُس کی چڑھی ہوئی پتلیاں واپس آ گئی تھیں۔ خون خاصا بہہ چکا تھا۔

میں نے دھیارا سے پوچھا۔ "یہاں اسپتال ہے۔"

بھوا نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے اُسے میری ذہنی حالت پر شبہہ ہو۔ "ادھر ڈاکٹر بھی نہیں ہے۔ بستی والے وید سے دوا لینے کا ہے۔ جیادہ ہے تو وہ ڈرا۔"

"پولیس اب تک نہیں آئی" بھوا کو اسپتال پہنچانے کا پولیس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

"پہنچتا ہوئیں گا۔ ابھی دور تھا، پر بھیڑ دیکھ کر ادھر ہی آنے کا تھا۔ بابر بھائی بھگوان کے لیے ابھی نکلنے کا ہے۔"

"لنگو اور دھیارا۔ اگر ہم یہاں سے نکل بھی جائیں تو بھی پولیس سے نہیں بچ سکتے۔ ان کا سامنا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ تمھارے لیے مناسب یہی ہے کہ تم ادھر اُدھر ہو جاؤ۔"

"بابر بھائی! آپ برابر گالی دینے کا ہے۔ ماں قسم! اپن حرامی نہیں ہے۔" دھیارا نے دُکھی ہو کے کہا۔

"اچھا تو اسے کروٹ دینے میں میری مدد کرو۔" میں نے جھک کے بھوا کے بازوؤں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ تیز تیز سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے اب دھیان سے دیکھا تھا کہ خنجر ادل سے کہیں ہٹ کے سینے میں پیوست ہوا تھا۔ دھیارا اور بھوا دونوں ہی نے چوڑے کپڑے کے تہہ کیے ہوئے مفلر گلے میں ڈال رکھے تھے۔ میں ان کا مصرف سوچ چکا تھا۔ میں نے لنگو کا مفلر کھینچ لیا۔ سب سے پہلے چہرے پر رومال جما کے اُسے کھینچ لیا۔ بھوا نے ایک دردآمیز جھٹکا لیا تھا۔ یہ تسلی بخش بات تھی۔ میں نے خنجر کھینچا تو اس دوران دھیارا اپنے مفلر کو پھاڑ کے پھویا بنا چکا تھا۔ میں نے وہ پھویا اس کے سینے پر رکھ کے اوپر سے مفلر لپیٹ کے سختی سے گرہ دے دی۔ پیٹ کے زخم کا بھید ... بہت زیادہ تھا، تاہم وہاں سے خون کا رساؤ بہت کم تھا اور دھیارا کی بے چینی کم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

"اس سے پہلے کہ پولیس یہاں آئے، ہمیں اسے باہر لے چلنا چاہیے۔ اسے اٹھواؤ!"

"یہ بچنے کا نہیں ہے بابر بھائی!" دھیارا نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

میں نے بھوا کی بغلوں میں ہاتھ ڈالے تو دھیارا اور لنگو نے سہارا دے سے نچلا دھڑ اٹھا لیا۔

ہم اسے لے کے عقبی گودام سے دکان کے بیرونی حصے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ادھر سے چمکتی ہوئی وردی پہنے دو پولیس افسر، اجلے اُجلے سے سیاہ کوٹ پتلون میں ملبوس دو بلند قامت انگریز جنھوں نے سیاہ عینک لگائی ہوئی، ان کے عقب میں چار چھ سپاہی چوکنی حالت میں اندر داخل ہو رہے تھے۔ خون سے تربتر چار افراد سے سامنا ان کے لیے غیر متوقع تھا۔ ہڑبڑاہٹ میں ان کے قدم الٹے پڑ گئے۔ سپاہیوں نے فوراً ہماری طرف رُخ کر کے بندوقیں تان

لیں۔ پولیس افسروں کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے بھی طمنچے نکال لیے تھے۔ باہر کھڑا ہجوم تو کھڑا ہی اندر کا ایک ایک منظر حفظ کرنے کے لیے تھا۔ ہمیں دیکھ کے بہت سوں کی چیخیں نکل گئیں۔ "رام رام، ہائے کھون ہو گیا۔ بھوا کا کھون!" اکثریت نے وہاں سے نکلنے ہی میں عافیت جانی تھی۔ جتنی دیر میں پولیس والوں نے بندوقیں سیدھی کیں، اس عرصے میں تماشائی تختۂ سیاہ سے مٹائے گئے لفظوں کی طرح جھڑ چکے تھے۔

"وہیں ٹھہر جاؤ! ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے!" نوجوان پولیس افسر نے ہمیں طمنچے کی زد پر رکھتے اور چیختے ہوئے حکم دیا۔ وہ سب سے ایک قدم آگے آ رہا تھا۔ اُس کے کندھے پر تین پھول تھے، یعنی وہی تھانے دار تھا۔

میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ لہٰذا انگریزی میں کہا۔ "یہ شدید زخمی ہے۔ اسے فوری طور پر ہسپتال پہنچانا از حد ضروری ہے۔"

میری زبان سے شستہ انگریزی جملہ سُن کے دونوں انگریزوں نے بے یقینی سے بھویں سکوڑ کے مجھے دیکھا، جب کہ پولیس افسر نے کچھ لیے تولتی نظروں سے ہمارا جائزہ لیا۔ پھر قدرے نرم لہجے میں بولا۔ "اندر اور کون کون ہے؟ زخمی کو نیچے رکھ دو۔"

میرے جی میں آئی کہ اُسے تیکھا جواب دوں، لیکن اس طرح بات مزید الجھ سکتی تھی اور وقت کا ضیاع الگ ہوتا۔ میں نے تابع دار قسم کے لہجے میں کہا۔ "جناب! اندر کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ زخمی اس دکان کا مالک ہے۔ اس کی حالت انتہائی تشویش ناک ہے۔ فوری طبی امداد نہ دی گئی تو یہ مر جائے گا۔"

میری بات سُن کے دونوں انگریز آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ نوجوان پولیس افسر پر ناتجربہ کاری کا خوف قابض تھا۔ اُس کے چہرے پر چھانے والی الجھن سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اُس کا ذہن صورتِ حال کا فوری تجزیہ کرنے سے قاصر ہے۔

"جینٹلمین! کیا بار وتیہ ڈاکو کے چنگل سے فرار ہونے والے تمھی ہو؟" دائیں جانب کھڑے انگریز نے نرم لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے! میرے پاس آپ کے لیے بے حد مفید معلومات موجود ہیں، لیکن از راہِ مہربانی پہلے اس زخمی کو ہسپتال پہنچوا دیں۔" میں نے روئے سخن مکمل طور پر اُس انگریز کی طرف موڑ لیا۔ وہ چالیس سے پچاس کے پیٹے میں تھا، لیکن بے حد مضبوط اور بھاری تن و توش کا مالک تھا۔ اُس کی آنکھیں گہری نیلی اور چمکتی ہوئی تھیں۔

پولیس افسر کے چہرے پر خفیف سی ناگواری جھلک آئی، اُسے اپنے گورے رفیق کی مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔ اُس نے خشمگیں نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے کہا، "تمھارے پاس آتشیں یا غیر آتشیں جس قسم کا اسلحہ ہے، فوری پھینک دو۔"

میں نے ہلا پیں وپیش چاقو نکال کے اُس کی طرف پھینک دیا۔ میری تقلید میں دھیرا، اور لنگو کے چاقو بھی زمین پر آ رہے تھے۔

"ہاتھ اٹھا کے پیچھے مڑ جاؤ... سنتری! ان کی تلاشی لو۔"

مجھ سے رہا نہ گیا۔ "کیا آپ نابینا ہو گئے ہیں... اس انسان کی زندگی کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔"

"میں نے کہا ہے کہ ہاتھ اٹھا کے پیچھے مڑ جاؤ۔ پولیس اپنا کام بہتر جانتی ہے۔" اُس نے درشتی سے طمنچہ دوبارہ تانتے ہوئے کہا۔

میں نے ناچاری سے ہاتھ اٹھا کے منہ پھیر لیا۔ دو پولیس والے سرعت سے آگے بڑھے اور ہماری تلاشی لی۔ بھوا کی کھسر پھسر میں اضافہ ہو رہا تھا۔

"سر! کلیئر ہے۔"

"... تم ادھر رُخ کرو۔"

میں تذبذب سے مڑ کے دیکھا۔ وہ مجھی سے کہہ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میرے لیے شدید ناپسندی بھری ہوئی تھی۔ میں دوبارہ زد پذیر ہو گیا۔ مجھے دیکھ کے دھیارا اور لنگو بھی سامنے رُخ ہونے لگے۔ انسپکٹر انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ تلاشی لینے والے سپاہی ہمارے دائیں بائیں ہی کھڑے تھے۔ انھوں نے دھیرا اور لنگو کے ایک ایک ہاتھ جڑنے میں دیر نہیں کی۔

"مسٹر جیت! وقت ضائع نہ کریں۔ انھیں لے کر

پولیس اسٹیشن چلیں اور زخمی کو اسپتال بھیج دیں۔ ہمیں اس شخص سے تفتیش کرنی ہے۔" نیلی آنکھوں والے انگریز نے ناگواری سے نوجوان پولیس افسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

تو اس کا نام اجیت ہے۔

"مسٹر فرینکلن! یہ انگلینڈ نہیں ہے۔ ہمارا کام کرنے کا اپنا طریقہ ہے، جو یقیناً ہندستانی لوگوں کو قابو کرنے کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔" اجیت نے ناگواری سے فرینکلن کو جواب دیا۔ فرینکلن، وہ اس کا ساتھی دلّی سے آئے دکھائی دیتے تھے۔ "آپ نے دیکھا، ان تینوں کے پاس سے چاقو برآمد ہوئے ہیں، یعنی یہ عادی مجرم ہیں۔ جب انھوں نے فرار کا راستہ مسدود پایا تو جسے قتل کر رہے تھے اُسی کو ہاتھوں میں اُٹھا کے باہر نکل آئے۔ اب اُسے اسپتال لے جانے کا واویلا کر کے دائرۂ جرم سے باہر کرنے کی چالاک کوشش کر رہے ہیں۔"

"تو آپ کیا چاہتے ہیں مسٹر اجیت!" فرینکلن نے بھڑکتے ہوئے کہا۔

"قریب ترین اسپتال دو گھنٹے کی مسافت پر ہے، جب کہ زخمی کی حالت انتہائی..." انسپکٹر اجیت نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

مجھے سخت طیش آ رہا تھا، مگر کیا کیا جاتا۔ میں نے سلگ کر کہا، "آپ جس دوری پر کھڑے ہیں وہاں سے کسی کی زندگی اور موت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔"

اس دوران گودام سے ایک سپاہی چلایا۔ "آلۂ قتل مل گیا ہے جناب!"

انسپکٹر اجیت نے پُرخیال نظروں سے مجھے دیکھا اور بھّو کے قریب پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

جس کی "کھر کھر" پہلے سے کم ہو گئی تھی۔ "اناڑی پن سے چاقو چلایا ہے۔ پیٹ کی صرف کھال کٹی ہے آنت اوجھڑی سلامت ہے۔ دل کا نشانہ بھی چُوک گیا۔" اُس نے بھّوا کا خون آلود گرتا اوپر اُٹھایا تھا اور چھڑی سے زخموں کی نشان دہی کرنے لگا۔ "مجھے یہ بچتا نظر نہیں آتا مسٹر فرینکلن۔"

فرینکلن نے مجھ سے پوچھا، "ہماری اطلاع کے مطابق تمھارے ساتھ ایک انگریز بھی نکل آیا ہے؟"

"جی ہاں!"

"تو پھر وہ کہاں ہے؟" فرینکلن اور اُس کا ساتھی بے تابی سے میرے قریب آ گئے۔

میں نے کڑے تیوروں سے کہا، "میں آپ کو ایک ایک تفصیل بتا دوں گا، وَلی اس کا بندوبست کریں۔"

"فرینکلن! ازراہِ مہربانی زخمی کا معائنہ کرو!" اُس نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ پھر اجیت سے بولا، جو خون سے لتھڑے ہوئے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ "مسٹر فرینکلن ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔"

"ہاں ہاں شوق سے معائنہ کریں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے تم میں سے چھرا اس نے چلایا تھا؟"

"اس نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"کیا! خودکشی؟" فرینکلن اور اجیت بے ساختگی سے بیک وقت بولے۔ واقعی یہ حیرت ناک بات تھی۔

"تم اس طرح سے خود کو نہیں بچا سکتے مسٹر!... ہے؟" اجیت نے چھڑی میری تھوڑی سے لگاتے ہوئے کہا، اُس کی آنکھوں میں استہزائیہ مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ واقعتاً ایک تڑپتی ہوئی لاش ساتھ ہی تین قاتلوں کی گرفتاری، آلۂ قتل کی برآمدگی بہت بڑا کارنامہ تھا۔ محکمۂ پولیس میں اُس کی واہ واہ ہونے والی تھی۔

اس دوران سائمن اُٹھ کھڑا ہوا۔ "جناب! زخم تو کاری نظر نہیں آتے، تاہم خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔ فوری طور پر اسے خون نہ دیا گیا تو یہ مر سکتا ہے۔" سائمن نے مؤدبانہ انداز میں فرینکلن سے کہا۔ اُس کے لہجے سے ماتحتی کی بُو آ رہی تھی، پھر اُس نے ہونٹ بھینچ کے اشارتاً نفی میں گردن ہلائی۔ یعنی یہ زخمی مر جائے گا۔

"تم اس کے لیے فوری طور پر کچھ کر سکتے ہو سائمن؟" فرینکلن نے اجیت کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"اِس کے لیے جراحت گاہ تک رسائی لازم ہے جناب!"

"انسپکٹر اجیت! زخمی کو فوری اسپتال روانہ کرنا مناسب ہوگا۔ سائمن اِن کے ساتھ جا سکتا ہے۔" فرینکلن نے حکمیہ لہجے میں کہا۔ اُس کے چہرے سے برہمی نمایاں تھی۔

"اپنا کام میں زیادہ بہتر سمجھتا ہوں مسٹر فرینکلن!"

انسپکٹر اجیت نے ترش روئی سے کہا۔ انسپکٹر اجیت کے رویّے سے صاف ظاہر تھا اس کا اور فرینکلن کا ساتھ مجبوری کا نام تھا۔ "دلیر سنگھ! اسے کمیونٹی اسپتال پہنچانا تمھاری ذمّے داری ہے۔ ڈی ایچ نمبر کی جیپ لے جاؤ۔ اور ہاں... ضرورت پڑنے پر میرا انتظار مت کرنا۔ پوسٹ مارٹم کا بول دینا۔" انسپکٹر اجیت نے آخری جملہ چبا کے بولا تھا۔

اس دوران ہمیں ہتھ کڑیاں پہنائی جا چکی تھیں۔ میرے ساتھ کوئی تماشا گیری کر رہا تھا۔ کبھی کورا کو قریب کر دیا جاتا اور مجھے پیچھے گھسیٹ لیا جاتا اور کبھی مجھے آگے بڑھا کے کورا کو غائب کر دیا جاتا۔ اب انسپکٹر اجیت نے قتل کے الزام میں ہتھ کڑیاں ڈال دی تھیں۔ حالات، واقعات اور شواہد بھی کچھ تو میرے خلاف تھے۔ بھّوا کی حالت ایسی ہی تھی کہ ایک کم فہم آدمی بھی بتا سکتا تھا کہ وہ نہیں بچ سکے گا۔ شاید سانس کے دوا رے کوئی اس کے گلے میں اٹک گیا تھا۔ فرینکلن نے چپ سادھ لی تھی، تاہم خفگی سے اُس کا چہرہ تنا ہوا تھا۔ اجیت نے سائمن کو بھّوا کے ساتھ نہیں جانے دیا تھا۔ حالات سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ فرینکلن اور سائمن کو بھّوتی سے جان کاری لینے کے لیے بھیجا گیا تھا، جب کہ انسپکٹر اجیت کا لہجہ ہندستان بھر میں انگریزوں کے خلاف پھیلی نفرت کی نمائندگی کر رہا تھا، اور یہی وجہ تھی کہ اجیت نے پہلی نظر میں مجھ پر ناپسندیدگی کی ڈالی تھی، جب کہ اسی بات سے میرے اس خیال کو تقویت مل رہی تھی کہ باروٹیہ واقعی مر چکا ہے اور گر کے جنگل میں پیش آنے والے حالات سے وہ کسی نہ کسی حد تک ضرور واقف ہے، اور یہ کہ اس کی ہمدردیاں باروٹیہ کے ساتھ ہیں۔ فرینکلن اور سائمن ایک طرف کھڑے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ بھّوا کی دکان کے باہر کھڑے مجمع سے ایک فرد بھی نہ بچا تھا، سوائے پولیس کی جیپوں، سفید موٹر اور ان کے گرد کھڑے چوکس سپاہیوں کے۔ انسپکٹر اجیت، فرینکلن اور سائمن کے لیے کرسیاں ایک طرف رکھ دی گئیں تھیں۔ کچھ اہل کار موقع کی ضروری کارروائیوں میں معروف تھے۔ ہمیں ایک کونے میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ فرینکلن بار بار چمکتی نظروں سے مجھے دیکھتا تھا۔ میں یقیناً اُس کے لیے کارآمد تھا، لیکن انسپکٹر اجیت نے اُسے مجھ سے براہِ راست بات کرنے سے روک دیا تھا۔

"یہ کھانا بادشاہوں کے لیے بہت مناسب ہے"

اجیت خود بھی گاہے گاہے میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ دھیرا اور لنگو خاموش کھڑے تھے، تاہم ان کے چہروں پر سراسیمگی نہیں تھی۔ باہر سے بھی کچھ سپاہی آ آ کر انسپکٹر اجیت سے دبے لفظوں میں بات کر رہے تھے اور وہ انھیں مزید احکامات دے کر بھیج رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک حوالدار نے اسے جائے وقوع پر کی جانے والی ضروری کارروائی مکمل کرنے کا مژدہ سنایا تو اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا، "انھیں لے آؤ۔"

ہم تینوں کو اُس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔

"ہاں تو محترم بابر صاحب! شروع ہو جاؤ... بھّوا سے کیا تنازع تھا، اور ہاں دھیان رہے۔ میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔" انسپکٹر اجیت نے اس توقع سے کہا جیسے میں آتے سب کچھ فر فر سنانے کے لیے اشارے کا منتظر تھا۔ اُس نے انگریزی سے اجتناب کیا تھا۔

فرینکلن نے بے زاری سے پہلو بولا، "مسٹر اجیت، آپ کا ملزم شستہ انگریزی جانتا ہے۔"

اجیت نے اُس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

"چلو شروع ہو جاؤ۔ میں اس دکان کو تھانہ نہیں بنانا چاہتا۔" یہ سرزنش انگریزی میں تھی۔

"میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ بھّوا نے اپنے ہاتھوں سے خود کو زخمی کیا ہے، اور یہ محض اتفاق تھا کہ اس موقع پر میں اُس کے سامنے موجود تھا۔" میں نے معتدل مزاجی کو تھامتے ہوئے کہا۔

"تو پھر یہ بھی بتا دو کہ بھّوا نے ایسا کیوں کیا؟"

"یہ بھوا ہی بتا سکتا ہے... میں نہیں جانتا؟"

"تم سے لے کر عقبی گودام میں کیوں گئے تھے؟"

"وہ مجھے لے کے گیا تھا، میں نہیں۔"

"وہ تمھیں کیوں لے کے گیا تھا؟"

"یہ بھی وہی بتا سکتا ہے، میں نہیں جانتا۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ وہ تمھیں پھنسانے کے لیے اندر لے گیا اور اپنے قتل کا الزام تمھارے سر تھوپنے کے لیے آتما ہتیا کر لی۔"

"میں نے ایسا کوئی مطلب ظاہر نہیں کیا۔"

"وہی بتا دو جو تم ظاہر کرنا چاہتے ہو۔"

"میں بتا چکا ہوں!"

"بکواس بند کرو!" کرسی کی ہتھی پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے وہ اُٹھ گیا۔ اُس کا چہرہ غصّے سے لال بھبوکا ہو گیا۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ خاصا خوب صورت اور وجیہہ تھا۔ "تم پولیس کو احمق سمجھتے ہو۔"

"میں نے کب کہا کہ میں پولیس کو احمق سمجھتا ہوں، جو حقیقت ہے وہی بتا رہا ہوں۔"

"میں نے پوری زندگی میں خودکشی کا یہ طور نہ دیکھا نہ سنا، اور میں پولیس ہی میں پیدا ہوا ہوں۔"

"تو یہ آپ کی زندگی کا نیا تجربہ ہوا۔" میں نے اُسے اور سلگایا۔ یہ جھل کا ایک تیر بہ ہدف اصول تھا کہ اڈّے پر بل چلتا ہے اور تھانے میں دماغ۔ پولیس افسر جسے مجرم سمجھ لے، اُسے اپنے پاؤں میں گڑگڑاتا دیکھنا پسند کرتا ہے، اور جو نہ گڑگڑائے اُس سے نفسیاتی طور پر مرعوب ہو جاتا ہے۔ اُس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ خودداری منوانے کے بیے پیروں میں پڑ جانے والے کبھی نامراد نہیں ہوتے۔ مجھے آئندہ پیش آنے والے حالات کی سنگینی کا بہ خوبی ادراک تھا۔ معمولی سے گڑبڑ عمر بھر کے لیے جیل میں دھکیل سکتی تھی۔

"ہاں کچھ نئے تجربے دلواؤ آپ کے ضرور کروں گا... بھوا بھا جن سے تم کیا معلوم کر رہے تھے؟" انسپکٹر اجیت نے سفاک لہجے میں کہا۔

اس سوال کا جواب تو تھا ہی نہیں، میں اُسے کیا دیتا۔

"انسپکٹر صاحب آپ کو غلط فہمی..."

میرا فقرہ منہ ہی میں رہ گیا، وہ جھنجھلاتا ہوا پلٹا۔ اُس کی چھڑی نے میرے دایاں شانے میں مرچیں بھر دی تھیں۔

"غلط فہمی تمھیں ہے مسٹر بابر!" میرے چہرے پر کامل سکوت دیکھ کے اُسے پتنگے لگ گئے۔ "بڑے بڑے جغادری میرے ہاں پانی بھرتے ہیں۔"

"مسٹر اجیت، غیر اخلاقی رویّے سے گریز کریں۔" فرینکلن نے مجھے پُرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسٹر فرینکلن! مجھے مجبور نہ کریں کہ آپ کو یہاں سے جانا پڑے۔" اُس نے سلگتی ہوئی آواز کی آنچ ذرا دھیمی کرتے ہوئے کہا۔

سائمن دھیرے سے کسمسایا، تاہم فرینکلن مسکرا کے خاموش ہو گیا۔ انسپکٹر اجیت فتح مندی کی زہرخند مسکراہٹ لیے دھیارا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"نام بول؟" اُس نے ہندی میں کہا تھا۔

"دھیارا بولنے کا ہے۔" دھیارا نے سینہ پھُلاتے ہوئے کہا۔

"چھلیا کدھر ہے؟" انسپکٹر اجیت نے چھڑی سے اُس کا پیٹ دباتے ہوئے کہا۔

"چھلیا سے پوچھنے کا ہے۔"

"ابھی تو بول بھڑوے!" انسپکٹر اجیت نے برافروختگی سے دھیارا کا گریبان پکڑا اور طمانچہ جڑ دیا۔

"میا قسم... ابھی ایک بات بولنے کا نہیں ہے۔" دھیارا نے کھولتی ہوئی آواز میں کہا اور ہونٹ بھینچ لیے۔ انسپکٹر اجیت کو باؤلے کتے نے کاٹ لیا تھا۔ وہ وحشیوں کی طرح لاتوں اور گھونسوں سے دھیارا پر پل پڑا اور کچھ ہی دیر میں ہانپنے لگا۔ اُس کے ہٹتے ہی دو سپاہی کارِ خیر میں مصروف ہو گئے، مگر دھیارا نے ہونٹوں کو فولادی شکنجے میں کس لیا تھا۔ سپاہی لاتوں اور گھونسوں کے ساتھ ساتھ بندوق کا بٹ بھی آزما رہے تھے، مگر دھیارا کی سسکی نہ نکلنی تھی اور نہ نکلی۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر اجیت نے ہاتھ کھڑے کر لیے۔ "بس بس چھوڑ دو۔ حرام کی چربی ہے خنزر کی۔ اِسے گاڑی میں ڈالو... بتی بنا کے مرچیں چڑھاؤں گا..." پھر اُس نے لنگو کو گھورا۔ "اِسے بھی ڈالو۔ سوچا تھا سالوں کو اِدھر ہی نمٹا دوں گا... ابھی چالان کٹے گا۔"

دھیارا کو وہی سپاہی گھسیٹ کے باہر لے گئے، جنھوں نے بٹ مار مار کے اُس کی ہڈیاں تڑوا دی تھیں۔

"ابے چل!" ایک نے لنگو کو دھکیلا۔

"ابھی صاب سے کچھ بولنے کا ہے۔" لنگو نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، بول کیا بولنے کا ہے۔" انسپکٹر نے سپاہی کو رُکنے کا اشارہ کیا۔

لنگو نے چیچیاتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور سانس پھلا کے بولا، "دھیارا اور بابر استاد نردوش ہیں صاب! بھوا کے چھرا میں مارنے کا ہے۔ بھوا سے بیاج پر رُپیا لیا تھا صاب۔"

"تمھیں معلوم ہے کہ تم کیا بول رہے ہو؟" انسپکٹر اجیت کے لہجے میں تمسخر تھا۔ "میری اطلاعات کے مطابق تم مکھی نہیں مار سکتے لنگو استاد!" انسپکٹر اجیت کے اِس فقرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پوری بستی کو کھنگال چکا ہے۔

"پر ہم بھوا کو مارنے کا ہے صاب!" لنگو کی بات اٹل تھی۔

"شوق سے قبول کرو... لیکن یاد رکھو کہ پھانسی یقینی ہے۔ بھوا کی ذات برادری پھندے سے پہلے تمھیں نہیں چھوڑے گی۔"

"ابھی آپ دھیارا اور بابر استاد کو چھوڑنے کا ہے۔" لنگو سر لٹکائے ہوئے ناک کی سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔

"شریک جرم برابر کا مجرم ہے... اُسے گاڑی میں بٹھاؤ!" انسپکٹر اجیت نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا، "مفت کے قاتل بنے پھرتے ہیں بھڑوے۔"

سپاہی لنگو کو دھکیلتے ہوئے لے گئے اور وہ آخر تک چیختا چلّاتا رہا کہ صاب تم لفڑا نہیں کرنا کا ہے۔ بھوا کو میں مارنے کا ہے۔

"ہاں تو مسٹر بابر! اب تمھاری باری ہے۔ تم یقیناً نہیں چاہو گے کہ تمھارا حال دھیارا کی طرح کیا جائے۔" انسپکٹر اجیت نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ اُس کا غصّہ کسی حد تک ہَوا ہو چکا تھا۔ وہ مجھ سے انگریزی ہی میں بولا۔

"میں اتنی تصحیح کر سکتا ہوں کہ لنگو نے دوست داری نبھائی ہے۔ بھوا نے اپنے اوپر حملہ بھی خود ہی کیا تھا۔" میں نے اپنے لہجے میں منافقانہ رچاؤ لانے کی اچھی کوشش کی۔

"میں یہ بکواس نہیں سننا چاہتا۔ خودکشی کرنے والے دریا میں کودتے ہیں، راستے پر لٹک جاتے ہیں، پٹڑی پر لیٹ جاتے ہیں اور زہر خورانی کرتے ہیں۔ کو ٹھیوں پر چیرہ لگاتے۔ تیل چھڑک کے آگ لگا لیتے ہیں، مگر اپنا پیٹ چیر کے سینے میں خنجر گھونپنا... بہت انوکھا اور ایک دم ناممکن کام ہے۔ اِسے تھانے سے لے کر عدالت تک کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔" فرینکلن اور سائمن کی گردنیں خود بہ خود انسپکٹر جیت کی تائید میں ہلی تھیں۔

"اِسے میری بدقسمتی کہیے، لیکن حقیقی واقعہ یہی ہے۔" میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ انسپکٹر اجیت کی دلیل کو میرے دل نے بھی سو فی صد درست قرار دیا تھا۔

"نہیں، میں نہیں مانتا۔ یہ ناممکن ہے۔"

"دیکھیے انسپکٹر صاحب! ہمارے پاس یہاں سے فرار ہونے کا پورا موقع تھا۔ گودام میں ایک عقبی دروازہ بھی موجود ہے۔ ہم بہ آسانی وہاں سے نکل سکتے تھے، لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا، کیوں کہ ہم قاتل نہیں تھے۔" وہ اِس پہلو کو نظرانداز کر رہا تھا کہ بھوا کے سینے پر پٹّی ہم نے باندھی تھی۔

"میں اِس سوچ کو انتہائی شاطر دماغ کی کارستانی سمجھتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ دروازہ مقفل تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ پوری بستی تمھیں بھوا سے جھگڑتے دیکھ چکی تھی۔ تمھیں یہ اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا کہ بھاگ کر زیادہ دُور نہیں جا سکو گے۔" اُس نے کچھ توقف کے بعد کہا، "ہاں، البتہ میں یہ مان سکتا ہوں کہ بھوا پر قاتلانہ حملہ طے شدہ نہیں تھا۔ یہ ایک اتفاقی حادثہ ہو سکتا ہے۔ آخری بات سن کر تمھارا جواز یک دم زمین بوس ہو جائے گا، مشفق مان بابر صاحب!" پھر اُس نے مجھے دیکھ کر لذّت کشید کرتے ہوئے کہا، "وہ دروازہ تم سے کیا کھلتا، سپاہیوں نے بہ دقّت توڑا ہے، لیکن لطف کی بات ہے وہ دروازہ باہر کسی کھلیان میں نہیں کھلتا تھا، بل کہ گودام کے اندر ایک اور گودام تھا، ممکن ہے کہ تمھیں اِس بات کی خبر ہو کہ وہاں سے راستہ نہیں ہے۔"

"حالات غیر موافق ہیں، ورنہ میں نے ایک ایک لفظ سچ کہا ہے۔"

"تو پھر بھوا کی آتما ہتیا کا محرک بتاؤ۔ اگر تمھاری بات درست تسلیم کر لی جائے تو اس آتما ہتیا کا محرک تمھیں معلوم ہونا چاہیے۔ یہ قطعی بات ہے۔"

فرینکلن اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے انتہائی بے زاری سے کہا، "مسٹر اجیت! آپ کو جس مقصد کے لیے ہمارے ساتھ

بھیجا گیا تھا وہ انتہائی اہم ہے اور آپ اسے غیر اہم بنا رہے ہیں۔"

"آپ بہ صد شوق جا سکتے ہیں مسٹر فرینکلن! لیکن یہ بستی میرے تھانے کی حدود میں شامل ہے اور یہاں کا انتہائی معزز آدمی دن دہاڑے بھرے مجمع میں یقیناً قتل کر دیا گیا ہے۔ میں ایک فرض شناس پولیس افسر کی شہرت رکھتا ہوں۔ میں ملزمان سے متعلق گفتگو بستی میں رہتے ہوئے ہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں، تاکہ مجھے بہ وقتِ ضرورت گوناگوں مصروفیات چھوڑ کر یہاں کے چکر نہ لگانے پڑیں۔"

"واہیات بات ہے۔" فرینکلن کندھے اُچکا کے دوبارہ بیٹھ گیا۔ خفت سے اُس کی پیشانی سیاہ پڑ رہی تھی۔

اُس کی خودکشی کا محرک اتنا آسان کہاں تھا جو بیان ہوتا۔ میری زبان پر تالے پڑ گئے۔ "مجھے نہیں معلوم۔"

"تم کراچی سے بمبئی جا رہے تھے۔ بمبئی میں کہاں؟" انسپکٹر اجیت نے چبھتا ہوا سوال کیا۔ گویا وہ میرے بارے میں مکمل چھان بین رکھتا تھا۔

"میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہندوستان بھر کی سیر کو نکلا ہوں! کلکتہ سے تعلق ہے۔" بمبئی کا تذکرہ میں نے دانستہ گھمایا تھا۔ اباجان تک پہنچنا ان کے لیے مشکل نہ ہوتا۔

"ہونہہ... مسٹر بابر! تمھاری شخصیت میرے لیے ایک معما بن چکی ہے..." اُس نے ایک لمبا سانس بھرا، پھر اُس نے ہندی میں کہا، "تم ایک ایسے جہاز میں کراچی سے سوار ہوئے جسے انتہائی منظم انداز میں اغوا ہونا تھا۔ اسے اتفاق نہیں کہا جا سکتا کہ اغوا کاروں کی اکثریت بھی کراچی ہی سے سوار ہوئی تھی۔ تمھارے سفری ٹکٹ کے نمبر اسی تواتر کا حصہ ہیں جو ٹکٹ خرید کے اغوا کار جہاز میں سوار ہوئے تھے۔ تم انتہائی شستہ انگریزی بولتے ہو۔ تمھیں جہاز کے اس حصے میں بھی جاتے دیکھا گیا جہاں ہندوستانیوں کا داخلہ ناممکن ہے۔ مختلف انگریزوں سے تمھاری ملاقاتیں بھی دیکھی گئیں۔ کچھ مسافروں کا بیان ہے کہ ایک انگریز خاتون تمھاری واقف کار تھی، حالاں کہ وہ پہلی مرتبہ ہندوستان آ رہی تھی۔ اغوا کاروں نے جب جہاز پر قبضہ کیا، کس وقت تم ایک سنسان گوشے میں چار انگریزوں کے ہم راہ اُن کے ہتھے لگے۔ باروتیہ نے جہاز کے ہندوستانی مسافروں سے نہایت اچھا برتاؤ کیا، لیکن وہ تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو بوریوں میں بند کر کے لے گیا۔ حیرت انگیز بات ہے۔ انتہائی تربیت یافتہ فوج جہاں فرار نہ ہو سکے، وہاں تم باروتیہ کی قید سے فرار ہو گئے۔ پھر تمھیں اس بستی میں دیکھا گیا۔ یہاں تم نے چھلیا کو زیر کر لیا، حالاں کہ چھلیا کا سکہ پورے کاٹھیاواڑ میں چلتا ہے۔ اُس کا چاقو کوئی نہیں گرا سکا، لیکن تم نے بہ آسانی ایسا کر لیا، جب کہ ایک انگریز فوجی لیونارڈ تمھارے ساتھ تھا۔ بالکل تمھارے رفیقِ کار کی حیثیت سے۔ پھر تم بستی میں نکلے تو سیدھے بھوا مہاجن کی دکان میں دیکھے گئے، وہ بھی اس حالت میں کہ بھوا اپنی سانسیں گن رہا تھا، اور یہ وہی بھوا ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ باروتیہ کو تحفتاً دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم میری تفتیش کا رُخ سمجھ گئے ہو گے۔ میرا خیال ہے کہ بھوا کے قتل کا محرک بھی واضح ہوا ہو گا، لہٰذا اب تمھیں بتانا ہو گا... بھوا سے تمھیں کون سی معلومات درکار تھیں۔ یہاں تک میں جانتا ہوں کہ تم کس سے کوئی پتا دریافت کر رہے تھے۔ کس کا پتا چاہیے تمھیں؟"

اُس کا تفصیلی تجزیہ مجھے بدحواس کرنے کے لیے کافی تھا۔ اُس کی سوچ دریا کے دو کنارے اُستوار کر رہی تھی۔ ایک جانب وہ باروتیہ کے ساتھ کھڑا تھا اور مجھے اُس نے انگریزوں کے ساتھ دوسرے کنارے پر کھڑا کیا تھا، البتہ اُس کی بتائی ہوئی تفصیل میں باروتیہ کی موت، انگریزوں کی موت اور وہاں سے مایا سمیت مشعل کا بچ نکلنا ایسے اہم واقعات مفقود تھے۔ اِس قدر باخبر پولیس افسر سے، اِن اہم معاملات سے متعلق لاعلمی کی توقع مناسب نہیں تھی۔ اگر وہ یہ سب کچھ جانتا تھا تو اُس نے مجھ سے دانستہ پوشیدہ رکھا تھا۔ میرا دماغ بساط بھر سرعت سے ان باتوں کے اخفا کے پسِ پردہ مقاصد کھوجنے میں مصروف تھا۔ سرِ فہرست مجھے یہی سمجھ میں آیا کہ وہ فرینکلن سے یہ سب پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میری معلومات ناقص نکلتیں۔ ایسا کچھ سرے سے ہوا ہی نہ ہو، لیکن یہ خود یہ خود ہی رد ہوئی تھی، کیوں کہ چھلیا سے دروغ گوئی کی مجھے ایک فی صد بھی توقع نہیں تھی اور نہ ہی اُس کے پاس ایسا کرنے کا کوئی جواز تھا۔ ایک ممکنہ وجہ اور سمجھ آئی تھی۔ اُس نے چوں کہ مجھے انتہائی شاطر اور خطرناک شخص سمجھ لیا تھا، اِس لیے مجھے بے خبر رکھنے کا مقصد کسی نئی کہانی کے اختراع سے باز رکھنا بھی ہو سکتا تھا۔

وہ بھوا مہاجن کی دکان پر جم کے بیٹھا تھا۔ فی الحال اُس کا یہاں سے کوچ کا ارادہ نظر نہیں آتا تھا۔ فرینکلن کی بےزاری عروج پر تھی۔ سورج بڑی سخاوت سے آگ برسا رہا تھا۔ انسپکٹر اجیت کا یہاں ٹھہرنے کا مقصد کچھ اور ہی دکھتا تھا۔

"انسپکٹر صاحب! آپ کی معلومات اِس حد تک درست ہیں کہ ہم چار دوست کراچی سے بمبئی جانے کے لیے جہاز میں سوار ہوئے تھے، لیکن آپ نے بھی بے بنیاد مفروضوں سے ایک غلط رائے قائم کی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح خوامخواہ باروتیہ نے ہمیں انگریزوں کا رفیق سمجھ کر جہاز سے اتار لیا تھا۔ اُس کے بعد میں نے جو کچھ بھی کیا اپنے بچاؤ اور دفاع کے لیے کیا۔ رہی بات بھوا مہاجن کی تو پل پل کی خبروں کے ساتھ آپ کے علم میں یہ اضافہ ضرور کیا گیا ہو گا کہ بھوا مہاجن مجھے راہ چلتے کو بانہہ سے پکڑ کر از خود دکان پر لے گیا تھا، ورنہ میں اُسے جانتا تک نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ بھوا نے خودکشی کی ہے۔ اُس نے ایسا کیوں کیا؟ اِس بارے میں قطعاً کچھ نہیں جانتا۔ یہ میری آخری بات ہے۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے... تم مہمان خانے کے آدمی ہو... وہیں رہو گے... مسٹر فرینکلن، آپ ملزم سے پوچھ تاچھ کر سکتے ہیں، لیکن جلدی جلدی۔"

"ہاں یقیناً.. لیکن تنہائی ضروری ہے۔" فرینکلن نے چونکتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

انسپکٹر جیت نے اُسے مغائرت سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ انتہائی خطرناک مجرم ہے۔ اِسے میں آپ کے پاس تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"مسٹر اجیت، مجھے وائسرائے کے خصوصی ایلچی کے اختیارات حاصل ہیں۔ بمبئی چھاؤنی پوری حالت میں میرے اشارے کی منتظر ہے۔ لیکن مجھے گمان گزرتا ہے کہ آپ صورتِ حال کی سنگینی سے ناواقف ہیں۔" فرینکلن نے جھلکتے ہوئے لہجے میں کہا، "آپ کی ریاست پر فوج کشی کا امکان ہے۔ آپ جس کام سے آئے ہیں، اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔"

خلافِ توقع انسپکٹر اجیت اُٹھ کھڑا ہوا۔ "درست ہے مسٹر فرینکلن! آپ اس سے بات کریں۔ میں نے ادن دوڑائے ہوئے ہیں، جلد اچھی خبر ملنے کی توقع ہے۔" پھر اُس نے جاتے جاتے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "اگر انگریزوں کے جاسوس نہیں ہو تو ان باتوں سے احتراز کرنا جن سے فوج کشی یقینی ہوتی ہو۔"

انسپکٹر اجیت باہر جا کے جیپ میں بیٹھ گیا۔ ایک سپاہی نے سلور کے پیالے میں اُسے پانی پیش کیا تو

فرینکلن نے بھی پانی کا اشارہ کیا اور بولا، "ہندستان کی گرمی ناقابلِ برداشت ہے۔"

میرے منہ سے بے ساختہ نکلا، "تو آپ کو کس نے مجبور کیا ہے برداشت کرنے کے لیے۔ یہاں کے باسیوں کے لیے اس گرمی میں بھی ایک حُسن ہے۔"

"بہت خوب مسٹر بابر! انسپکٹر جیت نے آپ کو دِلّی کا جاسوس نامزد کیا ہے۔" اُس کے چہرے پر بشاشت بکھر گئی۔

"آپ مجھ سے کیا جاننا چاہتے ہیں؟" میرے ذہن میں واضح نہیں تھا کہ مجھے کن باتوں سے احتراز کرنے کا مشورہ انسپکٹر اجیت دے گیا تھا۔

"آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

"ضرورت محسوس ہوگا تو بیٹھ جاؤں گا۔"

"ہماری اطلاعات کے مطابق اس بستی میں تم ایک نوجوان انگریز کے ہم راہ دیکھے گئے ہو... وہ کون ہے اور کہاں ہے؟"

"وہ لیونارڈ ہے... میں صبح اُسے بستی کے ایک مکان میں چھوڑ کے آیا تھا۔"

"اوہ میرے خدا! لیونارڈ... وہ دبلا پتلا سا بھورے بالوں والا نوجوان؟" فرینکلن نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

"ہاں، وہ اسی حلیے کا مالک ہے۔"

"خداوند! وائسرائے کا معتمدِ خاص لیونارڈ کیا شاندار نوجوان ہے۔ براہِ مہربانی اُس مکان کی نشان دہی کیجیے مسٹر بابر!"

"وہ اس بستی کی مقبول ترین جگہ ہے، چھبیا کا اڈا۔"

"اوہ سائمن، دیکھا ہمارا اتنا وقت خراب کیا ہے اس ولیش جگت انسپکٹر نے... تم اجیت سے چند سپاہیوں کو اپنے ہم راہ لے لو اور لیونارڈ کو فوری طور پر لے کے آؤ۔"

سائمن اُس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل اُٹھ کے چل دیا تھا۔

"ڈاکوؤں کی کتنی تعداد ہو سکتی ہے؟" فرینکلن نے مجھ سے خاصے دوستانہ مزاج سے پوچھا۔

"اس بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا، کیوں کہ وہ ہمیں بوریوں میں بند کر کے مسلسل محوِ سفر رہے ہیں۔"

"اُن کا مستقر کہاں ہے؟"

"ہمیں چھکڑوں میں لاد کر غالباً مستقر ہی کی جانب لے جایا جا رہا تھا، تاہم میں اُس راستے میں سے بچ نکلا تھا مگر..."

"اوہ مسٹر بابر! آپ فکر نہ کریں۔ انسپکٹر اجیت آپ کو ایک دن بھی سلاخوں کے پیچھے نہیں رکھ سکتا۔ صرف دلواڑا پہنچنے دیں۔"

"وہ دلواڑا تک پہنچنے نہیں دے گا۔" آخر میں اس بدترین خدشے کا اظہار کر دیا جو بڑی دیر سے میرے دماغ میں کلبلا رہا تھا۔

اس دوران سائمن واپس آ گیا۔ "انسپکٹر اجیت کا کہنا ہے کہ وہ پہلے ہی بستی کا کونا کونا چھان چکا ہے، لیونارڈ کہیں نہیں ہے۔ انسپکٹر کا خیال ہے کہ وہ یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کے بجائے از خود سرکاری پناہ کی کھوج میں نکل گیا ہوگا۔"

انسپکٹر اجیت نے سراسر جھوٹ بولا تھا۔ لیونارڈ میرے بغیر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ میرے دل سے بے اختیار لیونارڈ کے لیے سلامتی کی دعا نکلی۔

"وہ..." فرینکلن کا چہرہ بجھ گیا، پھر اُس نے مجھے استفہامیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، "تم کئی دن سے لیونارڈ کے ساتھ ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ جا سکتا ہے۔"

"میں اس بارے میں واضح رائے نہیں دے سکتا، ہم وہ جلد از جلد یہاں سے نکل چلنے کا خواہاں تھا۔" میں نے گول مول جواب دیا، حالاں کہ مجھے یقین تھا کہ لیونارڈ یوں نہیں جا سکتا۔

فرینکلن نے مجھے گھور کے دیکھا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ "سائمن! ہمیں خود اُس مکان تک جانا چاہیے! انسپکٹر اجیت پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔"

انسپکٹر اجیت اندر آیا تھا "پیغام آ گیا ہے، مسٹر فرینکلن! بارودیہ مذاکرات کے لیے تیار ہے۔ کل اُس کا نمائندہ دلواڑا پہنچے گا۔"

بارودیہ زندہ نہیں تھا تو انسپکٹر اجیت بہت بڑا فن کار تھا۔ اُس کے چہرے نے جھوٹ کی چغلی نہیں کھائی تھی۔

"اوہ، یہ بھی اچھی خبر ہے۔ مسٹر اجیت، میں چھبیا کے مکان تک از خود جانا چاہتا ہوں۔" فرینکلن نے اجیت کی فراہم کردہ اطلاع پر مبہم سی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ وہ اجیت پر اعتماد کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

"نہیں مسٹر فرینکلن، آپ کی حفاظت میرے فرائض میں شامل ہے۔ اس بستی کا چپّا چپّا بارودیہ کا وفادار ہے۔"

"تو پھر میں آپ کی معیت میں وہاں جانا چاہوں گا۔"

"ہم واپس جا رہے ہیں۔ مجھے بارودیہ کی طرف سے جواب کا انتظار تھا۔"

انسپکٹر اجیت فرینکلن کی بات سُنے بغیر واپس مڑ گیا۔ اُس کے ساتھ آئے دو سپاہیوں نے مجھے بھی اُس کے پیچھے دھکیلا۔ "صرف اس ہندستانی افسر پر بھروسا کرنا چاہیے، جس کے ساتھ وقت بتایا ہو، ورنہ یہ سب ناقابلِ بھروسا ہیں۔"

میں نے اپنے عقب میں فرینکلن کی دبی دبی آواز سنی۔

چار جیپوں کے علاوہ باہر قیدیوں کو جیل سے عدالت لے جانے والی ویگن بھی کھڑی تھی۔ کلکتہ میں مقدمے کی شنوائی کے دوران مجھے جیل سے عدالت ایسی ہی ویگن میں لے جایا جاتا تھا۔ مجھے لات مار کے ویگن میں دھکیل دیا گیا۔ ویگن میں لنگو اور دھیارا کے علاوہ لیونارڈ بھی موجود تھا۔ ہتھ کڑیوں کے ساتھ ساتھ لیونارڈ کے مُنہ پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کے اُس کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی تھی۔ وہ لپک کے میرے ساتھ آ لگا تھا اور خوشی سے جھوم رہا تھا۔ میرے سوار ہوتے ہی ویگن چل پڑی۔ تاہم جیپیں وہیں کھڑی رہیں۔ اِس کا مطلب تھا کہ وہ فرینکلن کی لاعلمی میں ہمیں کہیں پہنچانا چاہتا تھا، گو کہ کلائیاں ہتھ کڑیوں میں جکڑی تھیں، تاہم میں نے بہ آسانی لیونارڈ کے مُنہ سے لپٹی پٹی کھول دی۔ کپڑے کا ایک گولا اُس کے مُنہ میں بھی ٹھسا ہوا تھا۔ لیونارڈ نے بتایا کہ میرے جانے کے کچھ دیر بعد ہی پولیس وہاں پہنچ گئی تھی، اور اس سے کچھ پوچھے بغیر ہی اُنھوں نے ہتھ کڑیاں ڈال دی تھیں۔ لیونارڈ کا خیال تھا کہ پولیس بارودیہ سے ملی ہوئی ہے اور ہمیں واپس اُس کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ ویگن موٹی فولادی چادر سے مکمل ڈھکی ہوئی تھی، اس کی چھت پر طمنچے کی گولیوں جتنے سوراخ ہوا کی آمد و رفت کے لیے موجود تھے، البتہ اطراف سے مکمل بند تھی۔ ہم باہر کے مناظر دیکھنے سے یک سر عاری تھے۔ لنگو بار بار کہہ رہا تھا کہ وہ جج صاحب کے سامنے انسپکٹر اجیت کی ساری بازی اُلٹ دے گا۔ جج صاحب لنگو کے علاوہ باقی سب کو رہا کر دیں گے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ویگن رک گئی۔ کچھ دیر بعد ہمیں اتارا گیا۔ وہ پولیس کی عمارت تھی۔ لیونارڈ کے مُنہ سے پٹی

غائب دیکھ کے ایک اہل کار نے بے دریغ اُس کی کمر پر گھٹی جڑ دی۔ "ان حرامیوں نے کھول ہو گی... ان کے۔"

"انھیں الگ الگ بند کرنے کا ہے۔" اندر سے ایک موٹے حوالدار نے برآمد ہوتے ہوئے کہا۔ اُس کے ہاتھ میں رجسٹر تھا۔

"نام بول۔" اُس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

میں بتا دیا۔ "بابر۔"

پھر اُس نے باری باری باقی تینوں کے نام وہیں کھڑے کھڑے درج کیے۔ اس کے بعد سپاہیوں کو ہدایت دی کہ انگریز کو "لین" میں ڈال دو اور باقی تین کو پچھلی کوٹھڑیوں میں الگ الگ بند کر دیا جائے۔ "لین" سے مراد غالباً پولیس والوں کی رہائشی کھولیاں تھیں۔ دو سپاہی لیونارڈ کو دائیں طرف جہاں عمارت کے ساتھ آگے تک گھروندے کی جھاڑیاں چلی گئی تھیں، لے گئے جب کہ ہمیں تھانے کا دالان عبور کر کے چھوٹی چھوٹی حوالاتی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ ہماری ہتھ کڑیاں کھول دی گئی تھیں۔ کوٹھڑی میں میرے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ مرے ہوئے چوہے اور پیشاب کی سیلن زدہ بساند سے قے مُنہ کو آ رہی تھی۔ میں دروازے ہی سے لگ کے بیٹھ گیا، اور مُنہ سلاخوں میں پھنسا لیا، یوں کچھ قابلِ تنفس ہوا پھیپھڑوں کو ملنے لگی۔ سامنے دو ہاتھ کی راہداری اور اس کے دوسرے سرے پر قدِ آدم دیوار تھی۔ اس دیوار کے سوا باہر کا کوئی منظر یہاں سے نظر نہیں آ سکتا تھا۔

انسپکٹر اجیت نہ جانے کیا کرنا چاہتا تھا۔ اِس امر میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اُس کی پشت پر ریاستی عمال موجود تھے۔ بارودیہ کا ڈراما ریاست ہی کی ہدایت کاری میں پیش کیا گیا تھا۔ البتہ ریاست اس معاملے میں براہِ راست ملوث ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ انسپکٹر اجیت کے مطابق بارودیہ زندہ تھا، جب کہ چھبیا کے بہ قول بارودیہ بجھل کے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا اور بارودیہ کے دستِ راست نے تمام معتوبوں کو طیش میں آ کے ہلاک کروا دیا تھا۔ دونوں طرف بے پناہ تضاد تھا۔ مجھے ان باتوں سے کیا سروکار تھا؟ بجھل نہ جانے کہاں سرگرداں ہوگا۔ ان الجھنوں میں میری جرو کی امید زندہ ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا وہ بے خبر ہوگا، مگر میرے مارے جانے کی اطلاع نے انھیں کہاں جیتا چھوڑا!

ہوگا۔ بھل مجھے دیکھ کے یوں نہال ہوجائے گا۔ بھل کا سوختہ چہرہ تصور میں آتے ہی نہ جانے کیا ہوا، آنکھیں بھل بھل بہنے لگیں، سینہ ہنڈی کی طرح اُبلنے لگا۔ نہ جانے وہ اس وقت کہاں تھے۔ کورا تبھی اسی شہر میں رہ رہی تھی۔ دو ہاتھ کے فاصلے سے پھر کہیں جا چھپی تھی۔ مجھے شاکر بھائی سے ضرور ملنا تھا۔ کیا خبر وہاں سے کوئی خبر ہی مل جائے۔ وہ بھی تو مولوی صاحب کی تلاش میں سرگرداں ہوگا، لیکن میں یہاں سے نکل سکوں گا!

مجھے جانے وثوق سے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا تھا۔ انسپکٹر اجیت خوب ٹھونک پیٹ کے چالان بنائے گا۔ کم سے کم سزا عمر قید تھی۔ چلو اچھا ہے، خس کم جہاں پاک۔ اس طرح ایک عالمِ سکوت میں آ جائے گا۔ نہ جانے کتنے ہیں جو میرے شوق میں اذیتوں کی مالائیں پہنے بیٹھے ہیں۔ مالائیں بھی کیا ہیں، طوق ہیں۔ موت کے طوق۔ ایک میرے ادھر اُدھر ہونے سے کیا قیامت آ جائے گی۔ بہت سوں کو دھیرے دھیرے صبر آ جائے گا۔ بھل کو زریں سنبھال لے گی، مگر کورا! اس نام پر میری سوچ کے تمام دروازے بند ہوئے تھے، کوئی چپکے سے کھٹکھنایا کہ میں مرتے دم تک تمہارا انتظار کروں گی بابر!

وہ پورا دن یونہی گزر گیا، پھر رات آئی، وہ بھی گزر گئی۔ انسان بھی پانی ہی کی طرح ہے، ہر رنگ قبول کر لیتا ہے۔ کوٹھڑی کے تعفّن سے جو اُس شام سے دوستی کر لی تھی۔ اب وہاں تعفّن محسوس نہیں ہوتا تھا، کوٹھڑی میں شاید وہ بھوں گئے تھے۔ اب تک وہاں سے کوئی پہرے دار بھی نہیں گزرا تھا۔ میں سر نہوڑائے بیٹھا تھا کہ کسی کے قدموں کی چاپ دروازے پر آ کے رکی۔

''او ہیرو ے۔ پیر ہٹا!''

میں نے سر اٹھا کے دیکھا۔ ایک سپاہی چنگیری لیے بیٹھا تھا، میں نے پیر کھسکا لیے۔ اُس نے دروازے کی نچلی درز سے چنگیری اندر کھسکا دی۔ پتلی سی روٹی میں چنے کی دال چپڑی ہوئی تھی۔ مٹی کے کٹورے میں دو گھونٹ پانی تھا۔ سپاہی جس طرح آیا تھا ویسے ہی چلا گیا۔ چنگیری اور پانی گھنٹوں یونہی پڑا رہا۔ پھر مجھے خبر نہ ہوئی کہ کب میں نے وہ روٹی زہر مار کی، مگر مجھے اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔ میں پہروں گھٹنوں میں سر دیے پڑا رہا۔ پہروں دیوار تکتا رہا۔ کوئی دیکھتا تو سنگی مجسمہ مان لیتا۔ میرے دل و دماغ بے خیالی کی آماج گاہ بنے رہے۔ میں دروازے سے لگا بیٹھا رہا۔ کتنے ہی اندھیرے دن اور کتنی ہی سیاہ راتیں گزر گئیں۔ مجھے پتا نہ چلا۔ کبھی امّی جان لاڈ سے کہتیں کہ یہ زردہ بابر کے لیے بنایا ہے۔ کبھی منّی کے کھنکھرو آنکھوں کو آ دبیز ڈالتے۔ کبھی کورا کی چیخیں کان پھاڑتیں، کبھی پیرو کی ارتھی سامنے رکھی نظر آتی۔ کبھی مارٹی کا چیختا لہجہ مجھے گرداب میں لے گھومتا تو کبھی کانتے مجھے کندھوں پر اٹھا کے جھومتا۔ کبھی سلطان خاموشی سے میرے سامنے کھڑے ہو جاتا۔ کبھی زریں اپنی پرچھائیں سے مجھ پر سایہ کرتی تو کبھی جولین سر جھکائے سراپائے انتظار نظر آتی۔ اس بے چہرہ دیوانگی نے کتنے دن اٹھا پٹخ کی، پتا نہ چلا۔ آخر ایک دن جب اجالا دیوار پر آئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھولا گیا۔ وہ دو سپاہی تھے ''چنی رام، اٹھو جی اٹھو، ابھی کلاص ہونے کا ہے۔''

میں نے اٹھنا چاہا، مگر گھٹنے تو پتھر میں ڈھل چکے تھے، بالکل ساکت، جامد!

سپاہی نے میری کسمپرسی محسوس کر لی تھی ''کچھ نہیں کھاؤ گے تو یہی حال ہوگا، اب اٹھا نہیں جاتا؟''

میں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ خدا ترس لگتے تھے، پھر اُن دونوں نے مجھے کندھوں سے پکڑ کے اٹھایا۔ زنگ آلود قبضوں کی طرح گھٹنے چرچرائے۔ سر بُری طرح چکرایا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ سپاہی پہلے ہی بساط سے بڑھ کے ہمدردی کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ تقریباً گھسیٹتے ہوئے مجھے لے چلے۔ تھانے کی عمارت اجلی اجلی اور دھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ دالان عبور کر کے پیچ سیڑھی آ گئی۔ گیروے رنگ کے بڑے بڑے گملے رو بہ قطار چاروں طرف رکھے تھے۔ پودوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ وہ سیڑھیوں پر بھی مجھے گھسیٹتے ہوئے اوپر لے گئے۔ جہاں ایک راہداری تھی جس میں دُور تک گہرے سرمئی دروازے چلے گئے تھے۔ ایک دروازے کے باہر سر پر دستار سجائے، بغل میں سنگین والی بندوق دبائے، چمکتی ہوئی وردی میں ملبوس ایک سنتری چاق و چوبند کھڑا تھا۔ مجھے اسی دروازے سے اندر لے جایا گیا۔ وہاں ایک عریض میز کے عقب میں پولیس افسر بیٹھا تھا، جب کہ اُس کے سامنے انسپکٹر اجیت اور

ایک دوسرا افسر مؤدب بیٹھا تھا۔

''اوہ! اجیت، تم نے تو نوجوان کا حلیہ بگاڑ رکھا ہے!''

ادھیڑ عمر پولیس افسر نے مجھے دیکھتے ہی کہا، تاہم اُس کا لہجہ سخی اور جذبات سے عاری تھا۔ کندھوں پر ایس پی کے عہدے کے پھول جگمگا رہے تھے۔

''سر! آپ جانتے ہی ہیں، گزشتہ پانچ روز کس قدر مصروفیت کے حامل رہے ہیں۔'' اجیت نے تولتی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ خاصا خوش نظر آ رہا تھا۔

''بے شک! تم نے تاریخی کام کر دکھایا۔ بے حد حیرت انگیز رہے ہو۔'' ایس پی کے چہرے سے بھی خوشی پھوٹ پڑ رہی تھی۔ ''ریاست بہت بڑے کشت و خون سے بچی ہے۔ اس میں اس جوان کا اور اس کے ساتھیوں کا بھی ہاتھ ہے۔'' پھر اس نے روئے سخن مکمل طور پر میری جانب کیا۔ مجھے چونکانے کی بھرپور سعی کرتے ہوئے اُس نے کہا، ''بابر صاحب! حکومتِ ہندوستان نے آپ کی رہائی کے لیے خصوصی سفارش کی ہے حالاں کہ ہمارے پاس آپ کی گرفتاری کا کوئی جواز بھی نہیں رہ گیا تھا۔''

ایس پی مجھے بغور دیکھ رہا تھا۔ شاید اُسے میرے چہرے پر خوشی کی کوئی رمق تلاش کرنے میں ناکامی ہوئی تھی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ مجھے تو ایک گوشۂ عافیت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ میں پتھر بنا کھڑا تھا۔ منہ میں چپتی ہوئی گھگھیاں ڈالے۔

''پے در پے ناگہانی مصائب حواس سلب کر لیتے ہیں۔ آپ کے ابتلا کا زمانہ ختم ہوا بابر صاحب... آپ کو رہا کیا جا رہا ہے۔''

''ناروا سلوک پر معذرت خواہ ہوں۔ پیشہ ورانہ تقاضے ہمیں مجبور رکھتے ہیں۔'' انسپکٹر اجیت بولا۔ بالکل ایسے جیسے زمین پر تھوک پھینکا ہو۔ اُس کے لہجے میں نفرت کا عنصر چھپائے نہیں چھپتا تھا، جب کہ ایس پی متوازن لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اُس نے اجیت کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش کی اور کھنکھار کے بولا ''بھوا مہاجن نے مرنے سے قبل ڈاکٹر کو بیان دیا تھا۔ اُس کے اعترافِ خودکشی سے آپ بالکل صاف ہو گئے ہیں۔''

میرے گھٹنوں میں چھڑ کنے والا درد ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ میں لڑکھڑا کے گر پڑا۔ ایس پی سپاہیوں کو مغلظات سے نوازتے ہوئے لپکا، اور مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ نقاہت سے میرا سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ بڑے افسر کو لپکتا دیکھ کے اجیت اور اُس کے ساتھی پولیس افسر بھی لپک کے اٹھ آئے تھے۔

''اجیت، تم نے بیلنا چلایا ہے؟'' ایس پی نے ناراضی سے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

''سر! اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ گرفتار کر کے بند کر دیا تھا۔ آج باہر نکالا ہے۔'' اجیت نے مستعدی سے جواب دیا۔

''کھانا پانی؟''

ایس پی کے سوال پر اجیت نے مجھے لانے والے سپاہیوں کو جواب دینے کا اشارہ کیا۔

''وہ سر! برابر تین وقت بھری پلیٹ کھلائی ہے'' سپاہی نے چور نظروں سے اجیت کو دیکھا۔ ''لیکن...''

''لیکن کیا؟'' ایس پی بولا۔

''اُس نے نہ کھانے کے برابر کھایا ہے'' سپاہی نے دُزدیدگی سے اجیت کی طرف دیکھا۔

''حرامی! تم پانچ دن تک رجسٹروں پر دستخط کرواتے رہے ہو!'' اجیت میز پر ہاتھ مارتے مارتے رہ گیا۔

''کھانا برابر آیا ہے سر!'' سپاہی سہم گیا۔

''بالکل برابر آیا ہوگا، مگر اس کنجری سے وہ تری کے لیے...''

"ساوتری!" سپاہی نرائن نے تھوک نگلا۔

"ہاں، وہ کالا چمڑا ساوتری۔ مجھے اپنے ماتحتوں کی مکمل خبر رہتی ہے۔ تم دیوالی سے اب تک جتنا چوبارہ چڑھ چکے، سب پتا ہے، سب جانتا ہوں۔"

"لیکن اپنے تھانے کی خبر نہیں۔ حوالات میں ملزمان کو بھوکا مارا جا رہا ہے، لیکن تمھیں اِس بات کی خبر ہے کہ نرائن کس رنڈی کے پاس جا رہا ہے۔ خوب اجیت! خوشی کی بات ہے۔" ایس پی نے کہا، جو کچھ دیر پہلے اجیت کی مدحت میں رطب اللسان تھا۔

"جی سر!" اجیت کے پاس شاید یہی جواب تھا۔

"جی سر سے بات نہیں بنے گی، جیت! ذرا اِس کا حال دیکھو! اگر دو ایک دن اور گزر جاتے تو ایک مردہ آدمی کی رہائی کے نتائج سے تم واقف ہو؟ پھر ایک یہ آدمی جس کے لیے وائسرائے کا رُقعہ آیا ہے!"

"جی سر۔"

"مجھے مکمل رپورٹ کرو! جس کی کوتاہی ہے، اُسے سزا ملنی چاہیے۔"

"جی سر۔"

سپاہی نرائن جو کہیں سے پیالے میں دودھ بھر لایا تھا، اُس نے وہ سلور کا پیالہ میرے منہ سے لگا دیا۔ میں نے خاموشی سے پی لیا۔

"بابر صاحب، میں معذرت خواہ ہوں! ورنہ آپ یقین جانیے ریاست کی پولیس انتہائی اعلیٰ اقدار کی حامل ہے۔"

"میں آپ سے انتہائی شرمندہ ہوں۔" اجیت نے انتہائی سپاٹ لہجے میں کہا۔

"بابر صاحب! دراصل میں نے آپ سے انتہائی اہم باتیں کرنی ہیں۔ ہمیں آپ کی مدد درکار ہے۔"

میں خاموشی سے اُسے دیکھا کیا۔ مجھ سا تہی داماں بھی کیا اُس نے دیکھا ہے۔

"ایس پی صاحب! مجھے رہا کرنا ہے تو کر دیں یا حوالات میں بند کر دیں، لیکن خدارا، مجھے تنہا چھوڑ دیں۔" میں سسک پڑا تھا۔ میرا بند بند ٹوٹ رہا تھا۔

"میں اپنی شرمساری بیان نہیں کر سکتا۔ ہندوستانی ہونے کے ناتے ہماری پوری ریاست کو آپ کی مدد درکار ہے۔ اور کوئی ایسا گراں بار کام بھی نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ آپ بہ آسانی کر سکیں گے!" ایس پی نے انتہائی متانت اور کمال سنجیدگی سے کہا۔ اُس کا لہجہ اپنائیت سے بھرا ہوا تھا۔

مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اُنھوں نے کسی خاص مقصد ہی کے لیے مجھے یہاں بلوایا ہے۔ اگر صرف رہا کرنا ہی مقصود ہوتا تو پکڑ کے دروازے کی راہ دکھا دیتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کام انسپکٹر اجیت سر انجام دے لیتا۔ دودھ سے نقاہت کو کافی افاقہ ہوا تھا۔ "مجھ سے متعلق یقیناً آپ کو کوئی شدید غلط فہمی ہوئی ہے، تاہم کہیے کہ میں ہندوستانی ہونے کے ناتے کیا کر سکتا ہوں۔" میں نے اٹکتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے آپ سے اسی جواب کی توقع تھی۔ میرا خیال ہے پہلے کھانا کھا لیا جائے۔" ایس پی نے دروازے سے داخل ہوتے سپاہی کو دیکھ کے کہا، جس کے ہاتھ میں کھانے کے سامان سے لدی پھندی تھال تھی۔ "بس یہیں رکھ دو۔" ایس پی از خود میرے سامنے سے میز پر رکھی فائلیں اور دفتری سامان ایک طرف رکھنے لگا۔

"ارے سر! آپ زحمت نہ کریں۔"

"اوہ نہیں اجیت! یہ بہت خاص مہمان ہیں۔"

سپاہی نے میرے سامنے تھال رکھ دی۔ مجھے بھوک کہاں تھی۔ جو ضرورت تھی وہ دودھ سے پوری ہو گئی۔

"کہیے! میں کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے اجیت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ میری پذیرائی سے ناخوش نظر آ رہا تھا۔ اُس کے کھچاؤ کا سبب واضح تھا۔ وہ مجھے انگریزوں کا گماشتہ سمجھتا تھا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ وہ کرانتی کاروں کے ازحد قریب تھا یا کرانتی کار تھا۔

"بابر صاحب! پہلے آپ کھانا کھائیں، مجھے مزید شرمندہ نہ کریں!" ایس پی بولا۔

"مزید کی حاجت نہیں، ورنہ بھوک کے ہاتھ کون بندھ سکتا ہے۔" میرے لہجے میں خود بہ خود اکتاہٹ بھر آئی تھی۔ اس وقت تنہائی سے بڑھ کر مرا چارہ گر کوئی نہ تھا۔ ایس پی اپنے ہی شوق میں مبتلا تھا۔

"میں آپ کے فولادی اعصاب کا قائل ہو گیا ہوں بابر صاحب! پانچ دن کا بھوکا آدمی ندیدوں کی طرح ٹوٹ پڑتا، جب کہ آپ نے دودھ بھی انتہائی متانت سے نوش

کیا، لیکن جسم کے تقاضے تو بہ ہر حال، موجود رہتے ہیں۔"

ایس پی کی آواز جذبات سے بوجھل ہو گئی۔

"میرے تقاضے میں جانتا ہوں، آپ کہیے، جو کہنا ہے!" میں نے بے زاری سے کہا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اٹھوں اور یہاں سے کسی بیاباں کی سیدھ میں دوڑتا چلا جاؤں۔

"ٹھیک ہے بابر صاحب! اگر آپ ہمارا کھانا پسند نہیں کر رہے... تو آپ سے مدد طلب کرنے کا ہمیں بھی کوئی حق نہیں۔" ایس پی کا لہجہ خلوص سے چھلکنے لگا۔

مقدر کا لکھا بھی مقدر ہی پڑھتی ہے۔ کل تک انھی لوگوں نے جانوروں کی طرح ایک کوٹھڑی میں مجھے ٹھونس رکھا تھا اور آج پلکوں پر بٹھا رہے تھے۔ میں نے بھی مقدر کا لکھا سمجھ کے دو چار لقمے زہر مار کر لیے اور خاموش ہو گیا۔

ایس پی کچھ دیر مجھے بہ غور دیکھتا رہا، پھر بولا۔ "بابر صاحب! اِس میں دو رائے نہیں ہیں کہ آپ دلّی سرکار کے خاص آدمی ہیں۔ آپ کے لیے وائسرائے کا ذاتی رُقعہ آیا ہے، جب کہ دیگر شواہد بھی یہ اشارہ کرتے ہیں کہ آپ انگریزوں سے انتہائی قریب ہیں۔"

"ایس پی صاحب! باروٹیہ کی بھی یہ شدید غلط فہمی تھی اور آپ کی بھی ہے۔ چند اتفاقات سے آپ نے افسانوی [illegible] لیا ہے۔"

"باروٹیہ کی یہی سب سے بڑی غلطی تھی کہ اُس نے غلط فہمی کو غلط فہمی میں سمجھا تھا، تبھی مارا گیا...!" ایس پی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن بابر صاحب، ہم اِس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ بس ایک ہندوستانی کے ناتے آپ سے درخواست ہے، یہ آپ پر منحصر ہے کہ اسے قبول کر لیں یا رد کر دیں۔"

"مجھے انگریزوں کا گماشتہ کہلوائے جانے سے انتہائی نفرت ہے۔ گالی مت دیں ایس پی صاحب۔" اچانک مجھے طیش آ گیا تھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں بابر صاحب! تاہم میں یہ سمجھتا ہوں کہ معاملہ آپ کے گوش گزار ضرور کروں..." مجھے خاموش دیکھ کے وہ گویا رہا۔ "بابر صاحب، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ باروٹیہ نے لندن سے بمبئی جاتے مسافر جہاز سے ایک سو دس انگریزوں کو اغوا کر کے ویرادل کی بندرگاہ پر اتار لیا تھا اور وہ انتہائی کام یابی سے مغویوں کو ویرادل سے گر کے جنگل تک لے جانے میں کام یاب ہو گیا تھا۔ دلّی کی سرکار کو ہماری ریاست سے سب سے بڑی شکایت یہ ہوئی کہ آخر باروٹیہ نے ریاست کی نظروں میں آئے بغیر اڑھائی سو میل کا یہ سفر کس طرح کیا، جب کہ کم و بیش ڈیڑھ سو چھکڑوں کا قافلہ ہو گا!... حالاں کہ حقیقتاً ایسا ہی ہوا تھا۔ ریاست کو بالکل علم نہ تھا، کیوں کہ اس راستے پر چھکڑوں کے قافلے معمول کی بات ہیں، جنگل سے بندرگاہ تک لکڑی، ناریل، اناج، جڑی بوٹیاں وغیرہ انھی چھکڑوں کے ذریعے لائی جاتی ہیں۔ باروٹیہ جس قافلے میں مغویوں کو لاد کے لے گیا تھا وہ بندرگاہ پر شیشم کی لکڑی ڈھو کے واپس ساسن گر کی طرف جا رہا تھا، جب کہ ڈاکوؤں سے بچاؤ کے لیے چند اجرتی گھڑ سواران چھکڑوں کے ساتھ ہمیشہ چلتے ہیں، جنھیں مقامی لوگ بندوقچے کہتے ہیں۔ بندوقچوں کو اُجرت بھی وہی دیتا ہے جس کا مال چھکڑوں پر لدا ہوتا ہے، لہٰذا بابر صاحب آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ باروٹیہ کے لیے وہ چھکڑے استعمال کرنا کتنا آسان تھا۔ ہمیں تو اس سانحے کی خبر تیسرے دن ہوئی جب دلّی سے تار آیا۔ بحری جہاز کو بچا کھچا عملہ بلا توقف بمبئی لے پہنچا تھا۔ ہمیں فی الفور اطلاع مل جاتی تو ہم باروٹیہ کو راستے میں جا لیتے، تاہم اس کے تعاقب میں گر کے جنگل میں گھسنا خودکشی تھا۔ گر جنگل کا چپا چپا باروٹیہ کا تابع دار ہے اور اس کا مخبر ہے۔ بہ ہر حال، ریاست نے مغویوں کی بازیابی کے لیے اپنی بھرپور کوششوں کا آغاز کر دیا، لیکن دلّی حکومت نے اپنے تاثرات سے مسلسل یہی پیغام دیا کہ یہ سانحہ ریاستی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے اور ریاست کو مختلف سفارتی انداز میں دھمکانا شروع کر دیا، لیکن اس کے برعکس ریاست نے اپنی فوج کو جنگل میں کارروائی کا حکم دے دیا۔ بابر صاحب، یہ خودکشی تھی، ہم خودکشی پر آمادہ ہو گئے، لیکن ہم نے باروٹیہ سے بات چیت کا راستہ بھی کھلا رکھا۔ باروٹیہ کے دو بڑے مطالبے تھے۔ ایک یہ تھا کہ باروٹیہ کا بیٹا اور اُس کی سابق بیوی حوالے کی جائے، جب کہ دوسرے مطالبے کے مطابق گر جنگل اور اس کے گرد و نواح کے علاقے کو اُس کی ملکیت تسلیم کرتے ہوئے ریاست دست بردار ہو جائے اور جیلوں میں قید اُس

کے تمام ساتھیوں کو رہا کیا جائے۔ پہلا مطالبہ انگریزوں سے متعلق تھا، جب کہ دوسرا ریاست سے تھا۔ انگریزوں نے بیٹا اس کے حوالے کرنے کی ہامی بھرلی، تاہم ان کا قانون باروتیہ کی سابقہ بیوی کی جبری سپردگی پر مجبور نہیں کرسکتا تھا، جس سے انھوں نے کلی معذوری ظاہر کردی اور ساتھ ہی ریاست پر دباؤ دیا کہ باروتیہ کا مطالبہ فوری طور پر تسلیم کرتے ہوئے گیر کا جنگل اُسے دے دیا جائے۔ قیدی رہا کردیے جائیں۔ ادھر خانجی نے باروتیہ کا مطالبہ اور انگریزوں کا دباؤ دونوں مسترد کردیے۔ ہماری سپاہ جنگل کا گھیراؤ کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھی کہ مخبروں نے باروتیہ کے ہندستانی منکوحہ کے ہاتھوں قتل ہونے کی اطلاع دی۔ اس سے قبل بابر صاحب آپ کے فرار ہونے کی اطلاع بھی ہمیں مل چکی تھی۔ اس کے بعد انسپکٹر اجیت نے انتہائی اہم کردار ادا کیا، چوں کہ باروتیہ کے گروہ میں ہمارے مخبر براہ راست انسپکٹر اجیت کی ماتحتی میں تھے، اور یہ ہمارے بے حد ذہین اور قابل افسر بھی ہیں، اس لیے محکمے نے باروتیہ کی موت سے فوائد حاصل کرنے کی ذمے داری انسپکٹر اجیت کو سونپ دی...'' ایس پی دم بھرنے کے لیے لحہ بھر رکا۔ میں نے دیکھا اُس لمحے اجیت کے چہرے پر ایک رنگ آ کے گزر گیا تھا۔

''بہ ہرحال، آپ کو چھپیا کے ٹھکانے پر دیکھا گیا۔ آپ کو بہ حفاظت دلوا ڑا لانے کے لیے سپاہی بھیجے گئے تو وہاں بہ ظاہر آپ کو ایک قتل میں ملوث پایا گیا۔ قانونی تقاضے کے تحت آپ کو گرفتار کرنا مجبوری تھی۔''

میں نے اجیت کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ سیاہ پڑ رہا تھا۔ اُس نے التجائیہ نظروں سے مجھے دیکھا، گویا اجیت سرکاری طور پر میری گرفتاری سے انکاری تھا۔ یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ اجیت کے مقاصد کچھ اور تھے۔ بہ ہرحال، میں خاموش ہی رہا۔

''اس دوران ایک اندوہ ناک خبر نے ریاست کی چولیں ہلا دیں۔ مشتعل گروہ کے ہاتھوں سَو سے زائد انگریزوں کی ہلاکت بہت بڑا واقعہ تھا، تاہم انسپکٹر اجیت اس اطلاع کے پس پردہ مقاصد کھوجنے میں کام یاب ہوگئے۔ یہ افواہ باروتیہ کے دست راست گلاّمی نے جنگل میں پتھر پھینک کے ردِعمل جاننے کے لیے پھیلائی تھی۔ میں اختصار سے یہ بتانا چاہتا ہوں بابر صاحب کہ انسپکٹر اجیت نے روز و شب کی دوڑ دھوپ سے اس پیچیدہ مسئلے کو سلجھا لیا۔ کثیر زرِ تاوان، اسلحے اور باروتیہ کے بیٹے کے عوض انگریز قیدیوں کو رہا کروا لیا گیا، تاہم ایک مطالبہ ہم بے پناہ کوششوں کے باوجود تاحال پورا نہیں کرسکے، جس کی ضمانت کے طور پر ریاست کے دس اہم پولیس افسر گلاّمی کے حوالے کیے گئے ہیں۔ گلاّمی نے آپ کے بھٹل نامی ساتھی کو زندہ یا مردہ مانگا ہے، لیکن اس کے لیے آپ چنداں فکر نہ کریں۔ آپ کے ساتھی کو ان کے حوالے کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے، یہ معاملہ ہم کسی نہ کسی طور سلجھا لیں گے، کیوں کہ گلاّمی مقامی پولیس افسروں کو بہ ہرحال، گزند نہیں پہنچائے گا۔''

بھٹل کے تذکرے پر میرے ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ بھٹل کے گرد منڈلاتے شدید خطرات معاً میرے سامنے وا ہوگئے۔ ایس پی فاش جھوٹ بول رہا تھا۔ یہ یقیناً اب تک بھٹل کو تلاش کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اس کا دلاسا طفلِ تسلی کے سوا کچھ نہ تھا، لیکن میں ایسا اہم کیسے ہوگیا کہ طفل تسلیاں دی جائیں۔ بھٹل کے تصور نے میرا سویا ہُوا دماغ جھنجوڑ جگایا تھا۔ وائسرائے کا میرے [illegible] سفارشی رُقعہ حیرت انگیز تھا۔ یہ لوازمات اخلاق اور یہ خاطر داری اس سے بڑھ کے حیرت انگیز تھیں۔

''بھٹل اور میرے دیگر ساتھی کہاں ہیں؟'' میرے زبان سے خود بہ خود چھلکتا ہُوا سوال نکلا۔

''بابر صاحب! یقین جانیے کہ ہم تاحال اُنھیں تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اُنھیں زمین نگل گئی یا آسمان نے اُچک لیا، کچھ خبر نہیں، لیکن ہمیں اس سے بڑھ کے مسئلہ درپیش ہے۔ اگر آپ وہ مسئلہ حل کروا دیں تو میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے ساتھی جہاں کہیں بھی ہوں گے، ہمیں جب بھی ملیں گے، بہ خیر و عافیت آپ تک پہنچ جائیں گے۔ تاہم میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ریاست ہی میں موجود ہیں۔ باہر نہیں نکل سکے۔'' میں نے غور سے دیکھا تو ایس پی کے چہرے سے مکروہ نقاب کھسکتا دکھائی دیا۔ اُس نے کسی مجبوری کے تحت اقرار نہیں کیا تھا، تاہم اُس نے مجھے باور کروا دیا تھا کہ بھٹل، زورا اور جمرو اُس کے پاس زیرِ حراست ہیں۔ انکار کی صورت میں ہمیشہ کے لیے لاپتا کیے

جا سکتے ہیں۔ جمرو کے خیال سے میرا ذہن پھر بھٹکنے لگا تھا۔

''بھٹل کے ساتھ کون کون غائب ہیں؟'' میں نے تسلی خاطر کو پوچھا اور دل میں ہزار دعائیں پڑھنے لگا کہ یہ جمرو سے متعلق کوئی اچھی خبر سنائے۔

''ایک انگریز خاتون ہیں، جب کہ بھٹل سمیت تین افراد اور ہیں، وہ تینوں آپس میں ساتھی بتائے جاتے ہیں۔''

میری سولی چڑھی سانس گویا پھر سے سینے میں لوٹ آئی۔ گویا چھلیا نے غلط بیانی کی تھی، مگر کیوں؟ اُس کے پاس ایسا کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' اب میرے پاس اس کی پوری بات توجہ سے سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

''ہاں میں اسی طرف آرہا ہوں۔ آپ بے حد عقل مند اور معاملہ فہم انسان ہیں بابر صاحب!'' ایس پی نے مسکرا کے میری طرف دیکھا، میرا خون کھول رہا تھا کہ چاقو سے یہ مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے اُس کے چہرے پر ثبت کردیتا۔

اس تمام قضیے کی براہِ راست نگرانی کے لیے دلی سے دو انگریز افسر بھیجے گئے تھے۔ مسٹر فرینکلن اور ان کے دست [illegible] لیکن ہماری بدقسمتی سے مسٹر فرینکلن اور ان کا دست راست موٹر کے حادثے میں جان گنوا بیٹھے۔ یہ حادثہ [illegible] جاتے ہوئے پیش آیا۔ جس پر دلی کی حکومت کافی برافروختہ ہے۔ انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے اُن کے سیکڑوں افراد صحیح سلامت پہنچا دیے۔ وہ ناگہاں موٹر حادثے میں ہلاک ہونے والے دو افراد کو لے بیٹھے ہیں۔''

میں نے بہ طورِ خاص اجیت کی طرف دیکھا۔ وہ زود دیدہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ گویا اجیت نے یہ سب بالا ہی بالا کیا تھا، مگر کیوں؟ یہ اندازہ میں نہیں لگا سکا تھا۔

''حکومتِ ہندستان نے بطور سزا، کاٹھیاواڑ تاجروں کے لیے پورے ہندستان کے دروازے بند کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جب کہ ہماری ریاست تمام کاٹھیاواڑ سے تجارت میں کئی قدم آگے ہے۔ بابر صاحب! ہم چاہتے ہیں کہ آپ وائسرائے تک اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں اور اُسے مجبور کریں کہ اس طرح ہمارا معاشی قتل نہ کیا جائے۔''

میں اور وائسرائے تک اثر و رسوخ! اِس گمبھیر تناؤ کی کیفیت میں بھی میرا قہقہے مارنے کو دل چاہا۔

''جی آپ بابر صاحب! وائسرائے کی ذاتی مہر لگا ہُوا آپ کے لیے سفارشی رُقعہ آیا ہے۔''

معاً مجھے یاد آیا کہ لیونارڈ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ وائسرائے کے معتمدِ خاص کا رتبہ رکھتا ہے۔

اوہ! وہ میرے ساتھ ایک انگریز؟

''ہاں ہاں، سر لیونارڈ نام تھا اُن کا۔ وہ بھی دلی پہنچ چکے ہیں۔ تمام مغویوں کی منزل گو کہ بمبئی تھا، مگر اُنھیں سرکار کے ایما پر دلی پہنچایا گیا ہے۔''

''تو گویا آپ نے لیونارڈ کو میرا اثر و رسوخ گروانا ہے؟''

"لیونارڈ کا ایک تار آپ کے نام بھی ہے۔" ایس پی نے اپنے سامنے رکھا کاغذ میرے طرف بڑھا دیا۔
اس نے لکھا تھا:

میرے پیارے دوست بابر!
تمھارے ساتھ گزرے چند دن سرمایۂ حیات ہیں۔ میری آئندہ زندگی کا ہر پل تمھارا ودیعت کردہ ہوگا۔ میں بہ عافیت اپنی منزل پہنچ گیا ہوں۔ میں نے وائسرائے سے متعلق تم سے ایک تذکرہ کیا تھا، وہ ادھورا تھا۔ بابر، وائسرائے ہندوستان میرے انتہائی قریبی رشتے دار بھی ہیں۔ میرا احوال سن کے تم سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ تم بے فکر رہو۔ جلد ملاقات ہوگی، جس کا اہتمام میری ذمے داری ہے۔
تمھارا احسان مند
لیونارڈ

تار پڑھ کے واقعی وائسرائے تک میری پہنچ کا بہ خوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ اب اُس سے کج بحثی بے کار تھی۔ "ٹھیک ہے۔ میں لیونارڈ سے بات کروں گا۔" میں نے بے دلی سے کہا۔
"بابر صاحب، صرف بات نہیں، بل کہ پوری تن دہی سے آپ کو ہمارا کام کرنا ہوگا۔" ایس پی نے کچھ توقف دے کر معنی خیزی سے کہا۔ "ہم آپ کے ساتھیوں کی تلاش کا کام پوری تن دہی سے کریں گے۔"
"لیکن یہ آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں اپنے ہم راہیوں کے بغیر یہاں سے چلا جاؤں گا؟"
"بابر صاحب! آپ تن تنہا ہیں، یہاں ریاست کی پوری مشینری پوری تن دہی سے انھیں تلاش کر رہی ہے۔ آپ بے کار وقت کا ضیاع کیوں کریں گے۔"
"لیکن میں اُن کے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔" میں نے حتمی اور دوٹوک لہجے میں کہا۔
ایس پی کچھ دیر ساکت مجھے دیکھا کیا، پھر کسی نتیجے پر پہنچ کے گویا ہوا۔ "اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے ساتھی ہماری حراست میں ہیں تو میں وضاحت کرنا چاہوں گا، بابر صاحب! ایسی کوئی بات نہیں ہے، تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ نہ صرف ریاست سے، بل کہ گڑھ کے گرد و نواح سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے آپ کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی، وہ حراست میں ہیں، تاہم وہ تاحال پُراسرار انداز میں غائب ہیں۔"
"ٹھیک ہے، ان کی تلاش کے بعد ہی میں آگے کا کچھ سوچ سکتا ہوں۔ ورنہ میری جان ہتھیلی پر ہے۔ ایس پی صاحب!" میں نے غرا کے کہا۔ ایس پی بے حد کائیاں اور چالاک تھا، وہ پینترے بدلنے پر مکمل قدرت رکھتا تھا۔
"ٹھیک ہے بابر صاحب! جیسے آپ کی مرضی! ہم بھی تلاش کر رہے ہیں، آپ بھی کیجیے! لیکن چھلیا کو بہ ہر صورت یہاں چھوڑ کے جانا ہوگا۔ تاوقتے کہ ہمارا کام نہ ہو جائے۔ آپ جا سکتے ہیں بابر صاحب! لیکن خیال رہے کہ آپ اپنی جائے قیام سے آگاہ رکھیں گے۔"
"فی الحال میری کوئی جائے قیام نہیں!"
"آپ کے خیر مقدم کے لیے آیا ہُوا ہے وہ... کیا نام ہے اُس غنڈے کا..." ایس پی نے استفہامیہ انداز سے اجیت کو دیکھا۔
"سر! چھلیا۔"
"ہاں چھلیا چھلیا! وہ آپ کے لیے باؤلا ہو رہا ہے۔ چکر پہ چکر لگا رہا ہے۔"
"انسپکٹر اجیت! چھلیا کو بابر صاحب کی رہائی کے متعلق اطلاع دے دی تھی۔"
"جی سر! بالکل، وہ تو صبح سے ہی دروازے سے لگا بیٹھا ہے۔"
"اور ہاں، مسٹر بابر! ایک اور اہم اطلاع آپ کو دینا میں بھول گیا، حالاں کہ خاصی اہم بات ہے۔ میرا دماغ آج کل غیر حاضر رہنے لگا ہے۔"
"جی کہیے! ایس پی صاحب!" مجھے شدید بے چینی محسوس ہونے لگی۔ نہ جانے یہ شعبدہ باز ایس پی اب کون سا پینترا بدلے گا۔
"بھُوا اسپتال پہنچ کے پورے ایک دن زندہ رہا۔ اُس نے وکیل اور گواہ تو اسپتال ہی میں بلوا لیے تھے۔" اُس نے بدمزگی سے گویا کڑوا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "بھُوا مہاجن مجرد زندگی گزار رہا تھا۔ ویسے بھی اُس کا کوئی اتنا قریبی عزیز نہیں تھا جو وارث بنتا، تاہم مسٹر بابر! بھُوا مہاجن اپنی تمام جائیداد، مال و متاع، نقدی وغیرہ سب تمھارے سپرد کر گیا ہے۔ وصیت میں اُس نے لکھا ہے کہ تم بھی جانتے ہو کہ اُس کا مال کس کے سپرد کرنا ہے۔"
ایس پی نے منوں وزنی گولا میرے سر پہ دے مارا تھا۔ بھُوا نے جان دے کے بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اشتعال تھا یا جنون یا کم مائیگی کا احساس۔ میرے اندر دہکتا ہُوا آتش فشاں یک دم پھٹ پڑا۔ کیا اوقات ہے اُس کی... وہ کیا سمجھتا تھا خود کو۔ میں تھوکتا بھی پسند نہیں کرتا اُس کی جائے داد پر۔ ایک بھُوا کیا میں اس جیسے ہزار خرید سکتا ہوں۔ نہ جانے وہ طوفان کہاں سے اُمڈ آیا تھا میں نے شعلے کی طرح لپک کے ایس پی کا گریبان پکڑ لیا۔ میری اس اچانک حرکت سے وہاں تھرتھری مچ گئی۔ ایک طرف سے اجیت مجھ پر آ رہا تو دوسری طرف سے وہاں کھڑے سپاہیوں نے مجھے دبوچ لیا۔ "میں تھوکتا ہوں بھُوا کی دولت پر اور وہ بھی تھوک دے گی۔" میں حالتِ جنوں میں چلا رہا تھا کہ ایس پی کے جملے سے مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔
اُس نے کہا: "کون تھوک دے گی بابر صاحب!" اُس نے مجھ سے متواتر یہ سوال کیا، مگر پھر مجھ سے کچھ بولا نہ گیا، بابر [illegible] مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میں نے سرِ بازار اُس کا [illegible] لیا تھا۔
[illegible] وہ مجھے پیار محبت سے سمجھاتے بجھاتے باہر دروازے تک لے آئے۔ وہاں چھلیا مجھے دیکھ کے آب دیدہ ہو گیا اور بھڑک کے لپٹ گیا۔ دھیارا اور لنگو اُس کے ہم راہ تھے۔ چند صورتیں بھی اُس کے ہم راہ تھیں۔ اُس نے جدا ہوتے ہی گلاب کی لڑیاں میرے گلے میں ڈال دیں۔ دھیارا کے ہاتھ میں مٹھائی کا ٹوکرا تھا۔ چھلیا نے لپکتے ہوئے ٹوکرے پر چڑھا چمک دار کاغذ پھاڑا اور لڈو نکال کے میرے منہ میں ٹھونس دیا اور دھیارا کو گویا وہ ٹوکرا وہیں انڈیلنے کا اشارہ کر دیا۔ میں اپنے ہی حال میں ساکت کھڑا تھا کھڑا ہی رہا۔ چھلیا نے اپنے پیچھے کھڑے ایک لمبے تڑنگے جوان کو بازو سے پکڑ کے آگے کر دیا۔ "سوامی جی! اسکا پنار گھو ہے، ایک دم رگھو بوری والا۔ ادھر دلواڑا کی چوکی پہ اِس حرامی کو بٹھانے کا ہے۔"
"رگھو بوری والا!" نام جانا پہچانا اور سنا ہُوا لگا۔ معاً مجھے لاشی یاد آ گئی، وہ اسی رگھو بوری والا کا چاقو اپنے قدموں میں دیکھنے کی خواہش مند تھی۔ میری نظریں بے ساختہ اُس کی طرف اٹھیں۔ لمبا سفید کُرتا، کالا پاجامہ، گلے پہ لپٹا ہُوا پیلا زرد رومال، کانوں میں ننھی ننھی سی بالیاں، گندمی مگر اُجلی رنگت، بغیر تیل کے سیدھے کنگھا کیے ہوئے بال، سرخ ڈوروں سے بھری ہوئی وحشی آنکھیں، چوڑا اور چوکور چہرہ۔ بالوں کے پیچھے میں چھپی ہوئی پیشانی، اُس کی کاٹھی لمبی چوڑی اور کسرتی تھی۔ اُس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے اور کہا: "ابھی ستاد تو تمھارا مال چیلا ہے اور میں استاد کا۔" اُس کی آواز نہ بھاری تھی اور نہ ہلکی، بل کہ متناسب تھی اور لہجہ صاف ستھرا۔ مجھے وہ پہلی نظر میں اچھا لگا، اُس کے اندر ایک غیر مرئی چیز ایسی تھی جو خواہ مخواہ اور بلاوجہ اچھی لگتی ہے۔
"چھلیا بھائی ہیں اِس قابل کے اُن کے نام کی مالا جپی جائے۔" میں نے جھینپے جھینپے لہجے میں کہا، اور وہ میں کہاں تھا، وہ تو ایک زندہ در گور لاش تھی۔ چھلیا اپنے ساتھ اچھا خاصا ہجوم اٹھا لایا تھا۔
"یہ دروازہ تمھارے باپ کا نہیں ہے۔ ہٹو یہاں سے۔ صاب آنے کا ہے۔" ایک توندل سپاہی بید گھماتے نہ جانے کہاں سے آن دھمکا۔
"اِسے کانے کو استاد استاد لگانے کا ہے۔ تیری ماں کا.. سالے۔ اڈے پہ کون جانے کا؟" چھلیا نے فوراً ہی رگھو بوری والا کی گدی پہ ہاتھ چھوڑ دیا۔
"ابھی یہ پریسان دکھنے کا ہے استادا" رگھو نے چھلیا کو خاطر میں لاتے ہوئے دھیمے سے کہا۔
"ابھی اپنا تو بڑا پنڈ کر۔ سوامی جی کا سارا پریسانی ادھر اڈے پہ ختم ہونے کا ہے۔ ابھی چل۔"
اس کے بعد رگھو کے آدمیوں نے نانا کرنے کے باوجود مجھے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ دھیرا اور لنگو بھی پیش پیش تھے۔ میں نے گردن گھما کے دیکھا۔ اجیت برآمدے میں کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ چھلیا کی سربراہی میں جلوس مجھے کندھوں پہ اٹھائے چل پڑا۔ وہ ڈھول اور کھلواڑ کرتے اور نعرے لگاتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ راہ گیر اشتیاق اور خوف کا آمیزہ آنکھوں میں سجائے ہمیں رک رک کے دیکھتے۔ کچھ فوراً ہی اپنی راہ لیتے اور کچھ اس وقت تک وہیں کھڑے اس جلوس کو دیکھتے رہتے، جب تک نظروں سے

اوجھل نہ ہو جاتا۔ جلوس سے الگ تھلگ اور غیر محسوس طریقے سے ساتھ چلنے والے دو سادہ لباس والے میری نظروں سے اوجھل نہ تھے۔ میرا دل چاہا کہ چھلیا سے چیخ کے کہوں بند کرے یہ تماشا گیری اور دفع ہو جائے مجھے تنہا چھوڑ کے۔ مگر لفظ تو ہمیشہ میری دست رس سے دُور ہی رہے تھے۔ سو خاموش رہا۔ کئی سڑکیں اور گلیاں عبور کر کے ایک گلی سے اور بہت سے لوگ منتظر ملے۔ ایک آواز میرے کانوں تک بھی پہنچی تھی کہ چھلیا کا استاد آیا ہے۔ پھر تو جیسے جادو کی چھڑی گلی سرے میں گھومی اور آخری سرے تک مکانوں میں پھریری سی دوڑ گئی تھی۔ دریچے کھل گئے اور مرد باہر نکل آئے۔ بعض دوڑ سے چلے آتے اور مٹھی بھر سکے میری اور اچھال کے ہم جلوس ہو جاتے۔ یہ رگھو اور چھپے سے لوگوں کی بے پایاں الفت تھی، جس کا اظہار وہ مجھ پر سکے بندوں کر رہے تھے۔ بالآخر ایک پھاٹک نما دروازے پر جلوس ٹھہر گیا۔

پھاٹک کھول دیا گیا تھا۔ یہ بالکل ویسا [illegible] علاقے میں ایک نہ ایک ضرور ہوتا ہے، جس [illegible] گزرتے ہوئے بہت سوں کے دل تیز ہو جا[illegible] بہت سوں کے دل مدھم پڑ جاتے ہیں۔ غیر متعلقہ [illegible] دروازے پر ہی روک دیے گئے۔ یہ خصوصی [illegible] ہی نے دیا ہوگا، ورنہ ریت کے خلاف تھا۔ [illegible] کے سامنے اتارا گیا۔ مجھے تکتا دیکھ کے چھلیا اچھلتا ہوا آگے آیا اور ہاتھ جوڑ کے بولا، "ابھی تیرے آگے کسی کا مجال تھا سو می جی ایر ابھی ادھر، جمانے کا استاد آنے کا ہے۔"

چھپے کے اس جملے نے مجھے برف کر دیا۔ میں نے بے تابی سے مڑ کے اس کا گریبان پکڑنا چاہا، مگر اس سے پہلے بھادوں کی گھٹاؤں کی طرح گرجتا اور شیر کی طرح دھاڑتا ہوا وہ مجھ پر آ پڑا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں جُھل تھا۔ ایسی ویران آنکھیں کہ موت بھی دہل جائے، ایسا اجاڑ چہرہ کہ شہرِ خموشاں آہ و بکا کرے۔ ایسی وارفتگی کہ بجلیاں کوندنا بھول جائیں۔ مجھ پر تو گویا شادیٔ مرگ کا لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ کسی ناامیدی کے وقت چلا آیا تھا، ہمیشہ کی طرح۔ اس نے پوری قوت سے میرا منہ تھپڑایا کہ طمانچے کے زور سے خود جھوم گیا۔

"بڑا ظالم ہے رے!" جُھل نے جھومتے ہوئے اُلٹا ہاتھ چھوڑ دیا۔ گال اندر سے پھٹ گیا تھا۔ پھر تو جنون طاری ہو گیا۔ تھپڑ، لاتیں، گھونسے، جو اُس کے آیا وہ اُس نے چلا یا۔ چھپا، رگھو اور دیگر گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ زورا اور جمرو بھی جگہ سے آگے نکل آئے تھے۔ اُن کی آنکھوں سے موسلا دھار بارش برس رہی تھی۔ اسے دیکھ کے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ میں لڑکھڑا کے گر پڑا۔ جُھل نے گریبان سے پکڑ کے اٹھایا، وہ تن کے کھڑا تھا۔ بھادو یمک زدہ پیڑ بھی کڑتے ہیں۔ نیلگانی آنکھوں سے اس نے مجھے گھورا اور بولا، "تیرے مرنے کے نہیں تھے، ے۔ موئے لونڈے کو زندہ ہیں۔"

اس کی آنکھیں اتنی سفاک نہیں تھیں، جتنا وہ خود تھا۔ گوشوں میں نمی کے نقش پڑے صاف دکھ رہے تھے۔ پھر اس نے جھپٹ کے مجھے بھینچ لیا۔ سارے بند ٹوٹ گئے۔ سبھی کچھ بہہ گیا۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ زورا اور جمرو بھی دائیں بائیں سے آ کے چمٹ گئے۔ پھر تو یوں لگا [illegible] کے در و دیوار بھی سسکیاں بھر رہے ہوں، پھر [illegible] دیوانہ وار قہقہے لگانے لگا۔ اس نے مجھے ہاتھوں [illegible] کے دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا۔ ہاتھ تھم گیا [illegible] ل پر چٹکیاں بھرنے لگا، پھر یکایک سبھی مسکرانے لگے۔ برسات میں بکھری بکھری، کھلی کھلی، کچی اور چمکیلی دھوپ نکل آئی تھی۔

"تو کیا بھوت بن گیا ہے رے۔ چھپا! اوچھل چھل چھلیا۔" جُھل نے انگلی سے میری ٹھوڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "حکم بول استاد!" چھپا صدقے واری ہو کے بولا۔

"تیرے پاس کال پڑ گیا ہے کیا؟ نکھٹو ہی لا بٹھائے ہیں یا انہیں دکھائی پڑتا ہے!"

"ابھی ادھر رگھو کا کاٹا اسے استاد۔"

"آنکھوں میں بٹن ٹنکے ہیں تو بولو۔ لاڈلا آیا ہے رے چھلیا، اپنا لاڈلا راجا۔" جُھل کے منہ سے پیاسی اور ترسی ہوئی آواز نکلی تھی۔

"ابھی ایسا کیسا ہونے کا ہے استاد۔ ابھی ایک دم کورا ٹھا لقانے میں بند رکھنے کا ہے۔ ابھی سوامی جی کو استاد بھارگ کرنے کا ہے تو چھلیا کا سیوا شروع ہونے کا ہے استاد۔" چھلیا کے اشارے پر ایک نے کونے میں دھرے

خاکی لفافوں میں سے ایک اٹھا کے بڑھا دیا۔ چھلیا نے وہ جھپٹ کے مجھے پیش کر دیا۔

میں غسل کر کے اور چھلیا کا دیا ہوا بوسکی کا کرتا پاجامہ پہن کے باہر آیا تو بٹھل چوکی پر جما بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ زورا، چھپیا اور جمرو اُس کے ساتھ جڑے بیٹھے تھے۔ اس کے علاوہ اڈے پر صرف چیدہ، فرد ہی موجود تھے۔ دروازہ سختی سے بند تھا۔ شور مچاتے جیش تر افراد کو باہر دھکیل دیا گیا تھا۔ چھپیا سے اِس فعل کی وجہ سمجھ آتی تھی۔ اُس نے بٹھل زورا اور جمرو کو یہاں چھپا رکھا تھا۔ یقیناً اڈے میں انہائی بھروسے ہی کے آدمی موجود تھے۔ مجھے دیکھ کے زورا اور جمرو ایک بار پھر بے تابی سے میری طرف اٹھ آئے اور بغل گیر ہو گئے۔ بٹھل میری موجودگی سے لاتعلق بیٹھا چھلیا سے کھلول کر رہا تھا۔ اُس کے شکستہ حال چہرے پر زندگی کی کچھ رمق پھر سے یوں لیٹی صاف دکھ رہی تھی۔ وجہیارا اور لنگلو بلی کے بٹھل کے پاؤں گھوٹ رہے تھے۔

”تیرے پیچھے استاد تو گیا تھا لاڈلے.. اب بچ گئے اُڑا رہا ہے۔“ جمرو نے میرا پیٹ گدگداتے ہوئے ہا۔“ خود بھی کھلا جا رہا تھا۔

”ماں قسم لاڈلے! اکھا زندگی میں کسی کا ایسا کتائی نہیں پڑا۔ ابھی کل تک میرے کا خبر تھی۔ ابھی سارا ایک دم چاند کا موافق تم ہمارے سامنے چمک رہا ہے۔ ایک دم سپنا ہے۔ لاڈلے ایک دم سپنا۔“ زورا نے باقاعدہ آنکھیں بھینچتا اپنی انگلی دانتوں چبائی۔

”تو نے کل کا تماشا نہیں دیکھا لاڈلے؟“ جمرو نے میرا شوق اُبھارتے ہوئے کہا۔ بٹھل نے تو میری طرف نہ دیکھنے کی گویا قسم کھا لی تھی۔ سدا کی طرح بے پروائی کی چادر اوڑھے بیٹھا تھا۔

”کیسا تماشا؟“

”چھلیا سے کل ہی پہلی میل ملاقات ہوئی تھی۔ چھلیا نے استاد کو بھی تمھارے بارے میں بتایا کہ تم زندہ ہو تو یقین کر لاڈلے استاد کو میں نے اپنی آنکھوں سے ناچتے ٹھمکے لگاتے دیکھا۔ چھلیا کو بچوں کی طرح ہاتھوں پر اٹھا کے استاد نے بڑی دیر تک پھرکی دیا۔ ابھی صبح تک بیٹھے بیٹھے ہنس رہا تھا۔“ جمرو نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”ابھی تیری جان پہچان سے مکر رہا ہے۔“

میں مسکرا کے چپ ہو رہا کیوں کہ مجھ سے زیادہ اُس کا واقفِ حال کوئی اور نہ تھا۔ میں انھی کے بیچ جا بیٹھا۔ چھلیا بٹھل کو میری چاقو زنی کے کرشمے بڑھا چڑھا کے بتا رہا تھا۔ بٹھل کلے بھر بھر کے دھواں کشید کرنے میں مگن دکھائی دیتا تھا۔ تاہم وہ ”ہوں ہاں“ باقاعدگی سے کر رہا تھا۔ اب تک مایا نظر نہیں آئی تھی۔ اطلاع کے بموجب اُسے ان کے ساتھ ہونا تھا۔ میں نے اس سے متعلق استفسار غیر مناسب سمجھا۔ میرے اندر خوب کھد بد مچی ہوئی تھی۔ میری طرح ہی زورا اور جمرو بھی کچھ جاننے کے لیے بے چین تھے، مگر یہ سب تنہائی کی دست یابی ہی پر منحصر تھا۔ میں نے اپنی گذشتہ میں سے مولوی شفیق اور کورا کا تذکرہ حذف کر دیا تھا۔ سینے سے باہر اچھلتے دل کو میں نے ہزار رسیوں میں جکڑ رکھا تھا اور یہ کوئی کار آسان نہیں تھا۔ انھیں بمبئی پہنچا کے چھپ چھپاتے نکلا جا سکتا تھا۔ ایس پی کے بقول ریاست کی حدود سے چڑیا کا بچہ بھی ان کی نظروں میں آئے بغیر نہیں نکل سکتا تھا۔ بٹھل کو یقین تھا کہ اجیت جیسا بدماغ پولیس افسر بھی زور و شور سے بٹھل کی تلاش میں مصروف ہوگا۔ رگھو بوری اور ٹھیلیا کا حسنِ انتظام ستائش آفریں تھا، ورنہ کون سی پولیس تھی جو اڈے پاڑوں کے شب و روز کے ایک ایک پل کی جان کاری نہ رکھتی ہو۔ میری نگرانی پر مامور سادہ لباس والے باہر یقینی طور پر موجود تھے۔ ان کے لیے یہ چونکنے کی بات ہی ہوگی کہ جلوں کے لیے اڈے کے دروازے بند کر دیے گئے تھے، ورنہ اس وقت وہ بھی کسی گوشے میں دبکے کھڑے ہوتے۔ ایک منچلا دوڑا ہوا آیا اور رگھو کے کان سے چپک گیا۔ اُس کی بات سن کے رگھو نے بٹھل اور ہمیں اندر چل کے کھانے کی دعوت دی، جہاں دسترخوان چن دیا گیا تھا۔ بٹھل کے اشارے پر ایک شوخے نے حقہ اٹھا لیا۔ اندر ایک کشادہ کمرے میں چاندنی بچھی تھی۔ اُس پر پیلے زرد ململ کا دسترخوان۔ رگھو بوری والے نے شاید پورا ولواڑا یہاں لا کے رکھ دیا تھا۔ نہ جانے کیا کیا الم غلم بھرا پڑا تھا۔ کھانے کے بعد ٹھرے کی بوتلیں کھل گئیں۔ میرے احتراز پر خوب قہقہے اڑے۔ بٹھل نے رسمِ محفل نبھائی تھی۔ اُس کے ہاتھ کا ایک پوا چسکیوں پر چسکیوں کے باوجود کم نہ ہوتا تھا۔ باقی سب کا

ہاتھ بھی کھچا کھچا تھا، سوائے رگھو بوری والا کے۔ وہ بوتل پر بوتل پانی کی طرح چڑھا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں چڑھتا نشہ کسی ورق سخت کا تھا۔ جلا جلا اور بجھا بجھا۔

میں باہر آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ جمرو یا زورا میں سے کوئی ایک میرے پیچھے ضرور آئے گا۔ وہ دونوں ہی چلے آئے۔ بھٹل تو ایسے بیٹھ گیا تھا جیسے اب ساری زندگی یہیں رہے گا۔ بات بے بات کے ٹھٹوں سے صحن میں بھی مفرنہ تھا۔ میں نے زورا اور جمرو کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، اور دائیں طرف سیڑھیاں چڑھ گیا۔ چھت پر کسی قسم کی تعمیر نہیں تھی، بس دو ہاتھ کی چار دیواری کر کے چھوڑ دی گئی تھی۔ اطراف کے مکانات زیادہ بلند تھے۔ دُور تک کہیں قندیلیں، کہیں قمقمے ٹمٹما رہے تھے۔ چھت کے وسط میں کھڑے ہو کے بھی گلیارا صاف نظر آتا تھا۔ ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی، میں پاؤں پسار کے بیٹھ گیا۔ نیچے کے شور وغل سے چھت دھمکتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں جمرو اور زورا سے تفصیل سننے کے لیے بے چین تھا۔ اُدھر بھی کچھ کم بے تابی نہ تھی، وہ لپکے چلے آئے تھے۔ ''قسم سے، چاند چھت پر اتر آیا ہے۔'' جمرو ناچتا ہُوا میری طرف آیا۔ وہ خوشی سے تھرک رہا تھا۔

زورا نے اُسے دھکیلتے ہوئے ہانک لگائی ''ابھی چندا وندا کے بول پرانا ہو گئے ہیں۔ اپنا راجا ایک دم ہیرو ہے۔'' زورا نے چھلانگ لگائی اور مجھ سے لپٹ کے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اوپر سے جمرو بھی آ پڑا۔ پھر تو بہت دیر تک دھما چوکڑی مچی۔ وہ مجھے گدگداتے رہے۔ آنکھیں مل مل کے دیکھتے رہے۔ حلق پھاڑ پھاڑ کے ٹھٹول کرتے رہے۔ آس پاس کی دریچے وا ہو گئے تھے۔ چھتوں سے جھانکے پڑنے لگے لیکن یہاں تو مدہوشی کا عالم تھا۔ آخر کافی دیر بعد جب پھیپھڑے پانی سے بھر گئے، زورا میری پیشانی چوم کے بولا ''تو اپن کے لیے مر گیا تھا لاڈلے۔ سالا سپنا لگتا ہے۔''

''تجھے جیتا دیکھ کے بھی بھروسا نہیں پڑتا۔'' جمرو کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

میری حالت بھی عجیب ہو رہی تھی۔ سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے لپک کے جمرو کو کھینچ لیا۔ ''جمرو بھائی! چھلیا نے مجھے آپ کے...'' میری آواز رُندھ گئی۔ میں جملہ پورا نہ کر سکا۔

''چھلیا بولا تھا، اُسے غلطی لگی تھی۔ وہ جمرو نہیں تھا لاڈلے۔'' جمرو نے مجھے اور زور سے بھینچا۔ اُس کی آواز بھرا رہی تھی۔

''جمرو بھائی! آپ کو دیکھنا نظروں کا دھوکا لگتا ہے۔ میری وجہ سے آپ لوگ مصیبت میں مبتلا ہیں۔''

''لاڈلے! جی کرتا ہے تیری زبان گدی سے کھینچ لوں۔'' جمرو نے ایک جھٹکے سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ ''ابھی سالہ باشیا ترازو کر دیتا۔ ایسا نہ بولتا۔ ہم تیرے کچھ نہیں لگتے؟'' وہ یک دم غصّے سے لال بھبوکا ہو گیا۔ میں کیا جواب دیتا۔ کیا اشک شوئی کرتا، میری بات اُنھیں کیسے سمجھ آتی۔ یہ بھی ٹھیک ہی کہتے تھے۔ میں خاموشی سے اُنھیں دیکھا کیا۔

''اپن تیری وجہ سے مشکل میں نہیں ہے راجا۔ اپنا زندگی تیرے سے زیادہ کوئی نہیں مانگا اور تُو ایسا بولتا ہے۔'' زورا نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔ پھر اُس نے چشم زدن میں ڈولتے ہوئے چاقو نکالا اور بائیں بازو ایک لکیر کھینچ دی۔ اس سے پہلے کہ میں اُسے روکتا، وہ چاقو بائیں ہاتھ کی طرف لوٹا چکا تھا، اور دائیں ہاتھ پر بھی لکیر کھینچ چکی تھی۔ دریچوں سے اُبھرتی ہوئی نسوانی سسکیاں واضح طور پر سنائی دی تھیں۔

''ابھی دوبارہ ایسا بولا تو کھر دنچا دل پر پڑے گا راجا! طعنہ سننے کو زندہ نہیں رہے گا اپن۔'' زورا کے دونوں بازو سرخ ہو گئے تھے اور انگلیوں سے خون ٹپاٹپ چھت پر گرنے لگا۔ چاقو وہ پہلے ہی گرا چکا تھا۔

پھر نہ جانے مجھے کیا ہُوا۔ میں نے مچل کے زورا کا گریبان پکڑ لیا۔ ''زورا بھائی! کیا سمجھتے ہو آپ لوگ مجھے! میں انسان نہیں ہوں؟ میرے سینے میں دل نہیں ہے، پتھر ہے؟ آپ کے ایسا کرنے سے میں بہت خوش ہو گیا ہوں؟ میری چھاتی فخر سے پھول گئی ہے کہ ایسے ایسے میرے جاں نثار ہیں! ایسا سمجھتے ہیں نا آپ؟ آپ لوگ مجھے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے، کیوں کہ آپ مجھے اپنا سمجھتے ہیں، مجھے بے پناہ چاہتے ہیں، میرے پسینے پر اپنا لہو نچھاور کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، اس لیے کہ آپ کے سینے میں ایک دل ہے۔ کبھی یہ بھی سوچ کے دیکھیں کہ میں بھی آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ کی تکلیف پر تڑپ سکتا ہوں۔ زورا بھائی! میں بھی اتنا ہی انسان ہوں جتنے آپ ہیں، جتنے جمرو بھائی ہیں۔ جتنا بھٹل ہے۔'' میں نے سسکتے ہوئے زورا کا گریبان بری طرح جھنجوڑ ڈالا تھا۔

''راجا!'' زورا کے ہونٹ بس لرز رہے تھے۔

جمرو نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اُس کی کپکپاہٹ میرے وجود میں اترنے لگی۔ کبھی کبھی سامنے کا دکھائی نہیں رہتا۔ ہم تینوں ایک بار پھر ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ گویا غم بھی مدغم ہو گئے۔

''ہائے دیا! کھون!'' کسی دریچے سے ایک کھنکھناتی ہوئی خوفزدہ آواز آئی۔

چاندنی کے اجالے میں سب اڑوس پڑوس چھت کے منظر کو آنکھیں پھاڑے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ کھڑکیوں کی آڑ سے، طاقچوں میں آنکھ لگائے، منڈیروں کے پیچھے دبکے ہوئے۔ مجال ہے کہ بغور دیکھنے پر بھی کوئی نظر آ جائے۔ معاً سیڑھیاں قدموں کی دھمک سے گونجنے لگیں۔ میں نے گھبرا کے دیکھا تو سب سے پہلے بھٹل چھت پر قدم رکھتا نظر آیا۔ اُس کے پیچھے چھلیا، رگھو اور بہت سارے لوگ۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ تاکا جھانکی کرنے والوں ہی کی کارستانی تھی۔ مرچ مسالے کے ساتھ اڈّے کے در و دیوار تک چھت کا احوال پہنچنا ہی تھا۔ ممکن تھا کہ خبر میں ایک آدھ قتل بھی نازل ہو گیا ہو۔ زورا کے بازو سے کافی خون بہہ گیا تھا۔ جمرو اور میری قمیص بھی سرخ دھبّوں سے پٹ گئی تھی۔ بھٹل کے لیے یہاں کی کارگزاری سمجھنا چنداں دشوار نہ تھا۔ اُس نے تو پہلی نظر میں منظر پی لیا ہوگا۔ وہ بھنبھناتا ہوا آیا۔ ''ادھری تو شکتی کا دھندا کرتو۔ بہت چلے گا رے۔ ایک توشہ وہ برائی۔'' بھٹل نے اردگرد سے جھانکتے ہوؤں کو یقیناً تاڑ لیا تھا۔

مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے غسل کرتے ہوئے پردہ کھینچ لیا ہو۔ پورا اڈّہ چھت پر اُمڈ آیا تھا۔

''ابھی سب کھیر ہے نا سوامی جی!'' چھلیا نے حیران پریشان ہوتے ہوئے کہا۔ ہم تینوں کے لباس خون آلود تھے۔ یہ اندازہ کرنا ممکن نہیں تھا کہ صرف زورا ہی زخمی ہے۔

''ہاں، سب خیریت ہے چھلیا! زورا نے میرے جتنے پر قسم اٹھائی تھی، وہ پوری کی ہے۔'' میں نے بھٹل سے نظریں لمکاتے ہوئے بات بنائی۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے

"تم اپنے آپ کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو ہے نا؟"

مجھے گھور رہا تھا۔

''اس کی ماں کا یار ملا دکھتا ہے حرامی! ٹھکانے سے پہنچ گئی تیری قسمیا۔ باہر پھولوں کے ہار لیے بیٹھے ہیں نہ وہ حرام کے جنے!'' بھٹل نے بپھرتے ہوئے زورا کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

میں نے تو چھلیا اور رگھو کے لیے بات بنائی تھی، ورنہ وہ اسے ہمارا باہمی جھگڑا گردانتے، لیکن بھرے میں بھٹل بھی آ گیا تھا۔

''تو بھی کندھے چڑھ جا۔ ادھری دم ہے دو چار کا اور بوجھا اٹھانے کا...'' بھٹل نے زورا کے بازو سے خون کا تیز رساؤ محسوس کر لیا تھا۔ ''اور تو نے مارنے کی قسم کھائی ہے۔ سور نے آج ہی پیٹ میں کچھ ٹھونسا تھا۔ کلیجے کو کچھ تو بتانے دیتا رے۔'' بھٹل نے بیک وقت مجھے اور زورا کو مخاطب کیا تھا۔

میرے حرکت میں آنے سے پہلے جمرو زورا کی قمیص کھینچ کر اتار چکا تھا۔

''چھلیا تیرے کھوٹے سے نہیں بندھے؟'' بھٹل اب چھلیا کی اور چپٹ پڑا تھا۔ وہ غصّے سے باؤلا ہو رہا تھا۔ چھلیا گڑبڑا گیا۔ بھٹل کا اشارہ وہ کچھ تاخیر سے سمجھا۔ رگھو فوراً چلا کے بولا ''بھڑ دوب تمھاری میا ناچ رہی ہے کیا۔ جاؤ اپنے ٹھکانے سے لگو۔ اوئجو، ادھر مرنے کا ہے۔''

''استاد! اُنچو بکسا لینے جانے کا ہے۔'' جاتے ہوؤں میں

سے کسی نے جواب دیا۔

رگھو کے چلانے پر سب بڑبڑا کے نیچے اتر گئے۔ اُس سمے ایک پستہ قد چھوٹی سی صندوقچی لیے دوڑتا چلا آیا۔ اُس کا جسم ٹھوس اور گٹھا ہوا تھا۔ اُس کی ناک چپٹی اور رنگت توے کی طرح سیاہ تھی، جب کہ سر پر زرد رنگ کا پھندنے دار رومال لپٹا ہوا تھا۔ اڈوں میں جراحت کے لیے کوئی ایک آدھ ضرور مخصوص ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ جراح زخم سینے کے ہنر میں بھی طاق ہوتے ہیں۔ زخم کے معاملے میں آخری حد تک ڈاکٹر کے پاس یا اسپتال جانے سے گریز کیا جاتا ہے۔ زورا نے کمال صفائی سے چاقو چلایا تھا۔ زخم کی دھار کندھے کے قریب سے سیدھی کلائی تک چلی آئی تھی۔ اُس نے دانستہ زخم گہرا لگانے سے گریز کیا تھا۔ بٹھل بھن بھن کرتا واپس چلا گیا تھا۔ جاتے جاتے چھلیے سے کہہ گیا تھا کہ ان کے بستر الگ الگ جگہ لگوانے ہیں، ورنہ یہ سونے کے نہیں۔ بجو اپنے فن میں طاق تھا۔ زخم کا معائنہ کرتے ہی بولا ”ابھی چاقو کس نے چلایا ہے؟ اس کو چومنے کا ہے۔“

”استاد! ابھی تم پٹی کر دو بس!“ جمرو بولا۔

”ایسا برابر لکیر پھنکا رکھ کے کھینچنے کا ہے... نہ کم نہ جیادہ، نہ اندر نہ باہر...“ بجو کی آنکھوں میں ستائش تھی۔ ”ماں قسم! پتھر پنچارا پھیرنے کا ہے۔“

اُسے کام کی شدبد خوب لگتی تھی۔ صندوقچی میں رکھی شیشیاں اور ڈبیاں سب انگریزی تھیں۔ میں حیران ہو رہا تھا۔ بجو نے قاعدے کے مطابق جراثیم کش پانی سے جب زخم صاف کیا تو میں چپ نہ رہ سکا۔ ”یہ کیا ہے؟“

”ابھی سپھائی کرنے کا ہے۔ استاد اپن کو کیڑے آج تک دکھائی نہیں دینے کا ہے۔ پر ڈاکٹر نے بولا کہ زخم کھلنے کا ساتھ ہی چھوٹا چھوٹا کیڑا اس میں بھرنے کا ہے۔ ابھی سب کیڑا مر گیا۔“ بجو نے اٹک اٹک کے وضاحت کی۔ ڈاکٹر کے تذکرے سے معاملہ سمجھ آ گیا تھا۔ بجو کے ہاتھ زبان کے برعکس خاصے تیز اور مہارت سے چل رہے تھے۔ اُس نے لال دوائی کا پھویا بھر بھر کے زخم پر رکھا۔ پٹی باندھنے کے مرحلے پر زورا نے پس و پیش سے کام لیا مگر میرے اور جمرو کے اصرار پر اُس نے پٹی لپٹوالی۔ لال دوائی کے لگاتے ہی خون کا رساؤ مکمل رک چکا تھا۔ میں نے بجو کو کچھ دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالے تو جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ میرا ہاتھ وہیں اٹک گیا۔ بجو اور جمرو نے بہ یک وقت معاملہ فہمی کا مظاہرہ کیا۔ جمرو نے پیسوں کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا اور بجو نے لجاجت سے آواز نکالی۔ ”اپنا ٹھکانا رگھو استاد کے ساتھ ہی ہے۔ ایسے بڑھیا زخم کی سیوا کا نجرانہ ابھی اپنی طرف بنتا ہے۔ شرمندہ نہ کرنے کا ہے استاد!“

مجھے ندامت محسوس ہوئی۔ بھلا یہاں کے نرالے طور طریقے مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔ جمرو کا ہاتھ بھی جیب سے خالی ہی لوٹا، مگر اس دوران چھلیا پلٹ آیا۔ اُس نے بجو کی کمر پر لات جماری۔ ”کنجری کی اولاد! حرام کھور! ادھر دہاڑی لگانے کا ہے۔“

”ارے نہیں نہیں چھلیا استاد! ہم ہی اِسے کچھ دینے کی کوشش کر رہے تھے اور یہ نہ لینے کے لیے ہماری منت سماجت کر رہا تھا۔“ میں نے مداخلت ضروری سمجھی تھی۔

چھلیا نے ناقابلِ یقین انداز سے میری طرف دیکھا پھر جیسے بادلِ ناخواستہ میرا بیان درست مان لیا۔ ”[illegible] جی! ابھی استاد بڑی گرمی کھانے کا ہے۔ آپ لوگوں کو [illegible] پر پہنچنے کا ہے۔“

ہم چھلیا کے ساتھ اتر آئے۔ بٹھل کسی خاص وجہ سے ہی ہمیں سونے پر مجبور کر رہا تھا۔ شاید اُس کا صبح دم یہاں سے کوچ کا ارادہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میں زورا اور جمرو سے پوری داستان سننے کے لیے اتاولا ہو رہا ہوں گا۔ اس خیال کاری میں رات آنکھوں میں کٹ جاتی تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

”من موہنا ہے“

”ہا! جیسیں چھبیلا۔“

”وہ جا رہے۔“

”ہائے۔“

پڑوس کے بائیں جانب والے بارے کی نسوانی سرگوشیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ہم نیچے اتر آئے۔ پیچھے مترنم اور شوخ ساز دھیرے سے مسکرائے تھے۔ بٹھل سامنے غصے میں بھرا پھونکیں مار رہا تھا۔ حقے کی گڑگڑ ضرورت سے زیادہ تیز تھی۔ اُسے دیکھ کر خود بہ خود میرا مسکرانے کو جی چاہا۔ اُس نے بھی میری شکل پڑھ لی تھی، مگر انجان بن گیا اور منہ دوسری

طرف پھیر لیا۔ چھلیا نے مجھے رگھو کے حوالے کیا اور خود دائیں طرف زورا اور جمرو کو لے کر بڑھ گیا۔ دالان سے کمروں کی طرف جاتے ہوئے میں نے بٹھل کی آواز سنی۔ وہ زورا کو بلا رہا تھا۔ بٹھل میں اب دم خم کہاں رہا تھا۔ بس ایک تصویر تھی، شکستہ حالی اور ویرانی کی۔

رگھو ترنگ میں سنسنایا ہوا اچھل رہا تھا۔ وہ زینے کے نیچے سے نکل کے ایک تنگ راہداری میں گھسا۔ وہ چھریرے اور تراشیدہ جسم کا مالک تھا۔ کسی لڑکی کی طرف سے اُسے مسترد کرنے کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی کہ وہ اڈے پاڑے کا آدمی تھا۔ اُس سے اب تک براہِ راست میری کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ میں خاموشی سے اُس کے پیچھے چلتا رہا۔ اڈے کی عمارت خاصی وسیع و عریض تھی۔ ایک دروازے پر رُک کر اُس نے جیب سے چابی نکالی! اور میری طرف مڑے بغیر بولا ”بابر بھائی! ابھی آپ میرے کمرے میں رہو۔ اُدھر ستھرائی نہیں ہوگی۔“ اُس نے تالا کنڈی سے نکال [illegible] رہ کھول دیا۔ وہ میرے لیے راستہ چھوڑ کے ایک [illegible] ہٹ گیا۔ کمرا دیکھ کے حیرت سے میری آنکھیں [illegible]۔ وہ اڈے کا کمرا نہیں تھا، بلکہ اُس کا تعلق تو کسی [illegible] سے تھا۔ دیواریں سرخ مخملیں پردوں سے ڈھکی [illegible]۔ ان پر اطلسی کام کے بیل بوٹے کڑھے تھے۔ فرش پر قالین ایسا کہ پاؤں دھنستے تھے۔ چھت کے انتہائی وسط میں ایک پنکھا ساکت تھا۔ چار پائی پر کم خواب کا گدا اور گلابی مخملیں غلاف چڑھا تکیہ تھا۔ دیواروں کے ساتھ بانس کی کھپچیوں سے بنے نازک نازک موڑھے جن کی گولائیوں پر شیشے کی گیندیں جھول رہی تھیں۔ رگھو نے ایک ڈوری کھینچی جو دروازے کے ساتھ ہی نیچے تک چلی آئی تھی۔ پنکھا ٹھمک ٹھمک کے چل پڑا۔ اڈے پاڑے میں بجلی کا پنکھا میں نے پہلی مرتبہ ہی دیکھا تھا۔ رگھو ڈوری کھینچتے ہی سیدھا اُلٹی دیوار کی جانب گیا۔ وہ سنگھاسن ہی تھا، جس پر ایک لجائی ہوئی حسینہ کی قد آدم مورتی رقص کر رہی تھی۔ رگھو نے اُسے جھک کے پرنام کیا۔ وہ یقیناً شبیہ آکاشی کی تھی۔ وہی نین نقش، وہی قد کاٹھ، وہی اٹکھیلیاں کرتی زلفیں۔ وہی شرتی رنگت، وہی بدن کے دل نشین نشیب و فراز۔ آکاشی کو سامنے بٹھائے بنا یہ مورتی تراشنا ناممکن تھا۔ رگھو بہت دیر تک ہاتھ جوڑے سر جھکائے کھڑا رہا۔ میں ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ چندن کی دھیمی دھیمی خوش بُو نے ماحول رومان پرور بنا رکھا تھا۔ میں نے ناقدانہ نظروں سے کئی بار جائزہ لیا، مگر کوئی عطردان یا خوش بُو کا منبع دکھائی نہیں دیا۔ رگھو آچاریوں کی طرح ہاتھ جوڑے کوئی پاٹھ پڑھتا رہا۔ کمرے کے تمام خدوخال مجھے ازبر ہو چلے تھے اور اب بےزاری سی ہونے لگی تھی۔ رگھو مجھے کمرے میں لا کے بھول گیا تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اُس کا استغراق مصنوعی معلوم نہیں ہوا۔ وہ آپے میں نہیں تھا۔ وہ دن بھر اڈے پر مصروف رہا، لیکن وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ مجھے آکاشی یاد آئی۔ واقعی وہ حسن و جمال میں یگانہ تھی۔ کسی بھی فرزانے کو دیوانہ کرنے کے کمال سے متصف۔

بہت دیر بعد رگھو کی پرارتھنا ختم ہوئی۔ وہ پلٹتے ہی بولا۔ اُس کا لہجہ صاف تھا۔ ”بابر بھائی! آکاشی دیوی کے بعد آپ پہلے آدمی اس پوتر استھان میں داخل ہوئے ہو۔“ رگھو کی آواز سوز سے بوجھل تھی۔ وہ بہت بڑی بات کہہ گیا تھا۔ ایسا فراخ دل بے حد تعلیم یافتہ ہندو ہی ہو سکتا تھا۔ وہ خاموش نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”رات ہی گزارنی ہے۔ کسی اور کمرے میں گزار لوں گا، صفائی ستھرائی کا تمہیں اندازہ ہونا چاہیے۔“ میری زبان من بھر کی ہو رہی تھی۔ خجالت سے جسم گڑا جاتا تھا۔

”نہیں نہیں، ایسی بات نہیں ہے بابر بھائی! میں اپنی چاہت سے آپ کو یہاں لے کر آیا ہوں۔“ وہ بےچین ہوتے میری راہ میں کھڑا ہو گیا۔

”لیکن مجھے اچھا نہیں لگا۔“ میں نے نظریں کچھ اور جھکاتے ہوئے کہا۔ اُس کی اس کمرے سے وابستگی، دھرم کے وچار، مورتی کا حجاب، اس کے آتشیں جذبات، سبھی کچھ تو مانع تھا میرے یہاں آنے میں مگر وہ پھر بھی لایا تھا۔ نہ جانے کیوں۔

”بابر بھائی! جب آپ پہلی مرتبہ دکھائی پڑے تھے، تبھی یہاں بڑی ہلچل مچی تھی۔“ رگھو نے دل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بابر بھائی! بہت اپنے اپنے لگتے ہو! معلوم نہیں کیوں لگتے ہو، پر سچ مانیں کچھ ہے جو مجھے آپ کی طرف دھکا دیتا ہے۔ استاد نے بول دیا، ورنہ میں خود موقع ڈھونڈ رہا تھا کہ

آپ سے کہوں، آپ کچھ وقت مجھے دیں۔"
"میرے لیے حیرت کی بات ہے، مگر یہ بتاؤ کہ تم پریشان کیوں لگتے ہو؟"
"ابھی آپ ادھر بیٹھیں، پھر سوال کریں۔" رگھو نے مجھے ہاتھ سے کھینچ کے چارپائی پر بٹھا دیا۔ خود چشم زدن میں نیچے بیٹھ گیا۔
"ارے نہیں نہیں۔ ادھر، اوپر بیٹھو۔ شرم سار نہ کرو۔"
میں جس طرح بیٹھا تھا، اسی طرح کھڑا ہو گیا۔
"ببر بھائی! آپ استاد ہیں۔ بڑے کلاکار ہیں۔ چھلیا استاد تو آپ کو دیوتاؤں کے سنگھاسن پر بٹھاتا ہے۔"
رگھو نے میرے پیر چھونے کی کوشش کی۔ مجھے اس منصب داری سے چڑ ہونے لگی تھی۔ کبھی تو ایسی عزت اور کبھی یہ حال کہ بول و براز کے ساتھ کال کوٹھریوں میں عزت سنتی۔ میں نے رگھو کی ایک نہ چلنے دی۔ اُس کے ساتھ قالین پر بیٹھ گیا۔
"یہ اچھی بات نہیں ہے۔" رگھو شاکی ہو کے بولا۔
"چھوڑو، اچھی یا بری بات کو۔ یہ سب کیا ہے، یہ کمرہ، اڈا اور تم؟"
"ببر بھائی! یہ اڈا میرا بدن ہے۔ یہ کمرا میرا دل۔ اور اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" رگھو نے دھیرے سے مسکرا کے کہا۔ میں اُس کے اس فلسفیانہ طرزِ تکلم پر حیران ہی رہ گیا۔ وہ تو ہر لمحے مجھے چونکا رہا تھا۔
"تمھاری تعلیم کتنی ہے؟"
"جونا گڑھ سے بی اے پاس کیا تھا۔"
"اوہ! پھر یہاں، یہ سب؟"
"یہ لمبی داستان ہے ببر بھائی! رات بہت چھوٹی، پھر کبھی۔" رگھو کی آنکھوں میں دیے جلنے بجھنے لگے تھے۔
"یہ مورتی لکشمی دیوی کی نہیں لگتی!" میں نے دانستہ اُس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔
"ستیا ماں کی قسم! یہ لکشمی ہی ہے، لکشمی دیوی!" رگھو یک دم طیش میں آ گیا۔
"کسی اچھے سنگ تراش کا کمال ہے۔"
"میں نے تراشی ہے" رگھو نے جواب دے کر مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔

میں بے اختیار ہو کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک غیر مرئی قوت مجھے سحر زدہ کیے مورتی کے قریب لے گیا۔ انگ انگ، خالق کی گواہی دے رہا تھا۔ میرے دل میں کہیں یہ خواہش جاگی کاش لکشمی ایک بار خود کو مجسم دیکھ لے۔ سبھی کچھ ہار جائے گی۔
"کتنا عرصہ لگا؟" میں نے رگھو سے پوچھا۔ میں واپس آ بیٹھا تھا۔
"چھ مہینے تو لگے ہی تھے۔" رگھو کے چہرے پر کچھ بشاشت نمودار ہو رہی تھی۔
"تم اعلا پائے کے سنگ تراش ہو۔ کیسے اور کس سے سیکھا؟"
"چھیل بابو سے۔ ہائی اسکول میں استاد تھے۔ اب بھی ہیں۔ ہمارے پڑوس میں رہتے تھے، وہ وہیں رہتے ہیں۔ پر ہمارا گھر وہاں نہیں ہے۔" رگھو کی آواز جیسے منجدھار میں ڈوبنے لگی تھی۔
میں نے خاموشی سے اُس کی طرف دیکھنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر کسی خود کار آلے کی طرح بولتا چلا گیا کہ میری ماں کا احمد آباد میں بڑا نام تھا۔ جتنا بڑا نام ہندستان میں کسی چیشو کا ہو سکتا تھا، اس سے بڑا نام میری ماں کا احمد آباد میں تھا۔ شوبھا بائی۔ وہ ساتویں دن گھنگرو باندھتی تھی۔ تب سب چوبارے بند ہو جاتے۔ بمبئی کے بہت بڑے صنعت کار مدن لال تک شوبھا بائی کے گھنگروؤں کی جھنکار پہنچی تو وہ احمد آباد دوڑا چلا آیا، اور جب شوبھا بائی کے اعضا کی شاعری دیکھی تو سبھی کچھ ہار بیٹھا۔ اُدھیڑ عمر کالے کلوٹے مدن لعل نے منہ مانگی بولی دے کر شوبھا بائی کو چھڑوا لیا۔ اُس کا دلواڑہ شہر میں آنا جانا رہتا تھا، کیوں کہ اُس کی ایک مِل وہاں بھی تھی۔ شوبھا بائی کو دلواڑہ میں مکان لے دیا۔ اپنے قابلِ اعتماد نوکروں کا جوڑا شوبھا بائی کی خدمت و نگرانی کے لیے وہاں چھوڑ دیا۔ شوبھا بائی کو اگرچہ مدن لعل پسند نہیں تھا، لیکن اُسے چار دیواری کی زندگی بھلی لگی۔ جب اُس کا پاؤں بھاری ہوا تو اُس نے مدن لعل کو نہیں بتایا۔ آخر کب تک! مدن لال کو معلوم ہوا اُس نے سر پیٹ لیا، مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ شوبھا بیٹا پا کر ساری دنیا سے بیگانی ہو گئی۔ اُدھر مدن لعل بھی بیٹے کو دیکھ کے پسیج گیا۔ کنڈلی بنوائی۔ جیون لعل نام تجویز ہوا۔ جیون لعل بہت بھاگوان ثابت ہوا۔ مدن لعل کا کاروبار اور پھیل گیا۔ آمدنی

دگنی ہو گئی۔ اُدھر مدن لعل کا دل بھی جیون لعل میں اٹکا رہتا۔ جیون لعل کی تعلیم کی خاطر شوبھا جونا گڑھ اٹھ آئی۔ سوامی اسکول میں داخلہ کروا دیا۔ جیون لعل نے جب دسویں پاس کی تو ایک اندوہناک خبر اُس کے پیچھے آئی۔ مدن لعل رات اچھا بھلا سویا تھا، مگر صبح اپنے بستر پر مردہ پایا گیا۔ مدن لعل کے مرنے کی اطلاع شوبھا کے پاس قریب مہینے بعد آئی تھی۔ وہ بولائی ہوئی بمبئی پہنچی۔ مدن لعل کے خاندان نے اُسے دھکے دے کر نکال دیا۔ اُس کے بیٹے اپنے باپ کی کسی دوسری بیوی سے واقف نہ تھے۔ جیون لعل کا نام سن کے تو وہ جھنجھلا سے اکھڑ گئے۔ شوبھا نے کچہری کر لی، مگر ان جھمیلوں سے واقف نہ تھی۔ وکیلوں کو پیسے وہ دیتی، مگر وکیل دم مدن لعل کے بیٹوں کا بھرتے۔ آخر تھک ہار کے جونا گڑھ جا بیٹھی۔ سال بھر جمع پونجی سے گزر بسر ہوتی رہی۔ مگر کب تک! جیون لعل کے تعلیمی اخراجات نوابوں سے کم نہ تھے۔ شوبھا چند دن ہی فاقت سے گزار سکی۔ وہ بیٹے پر اُٹھنے والے خرچ جات میں کسی طور کمی کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ ابھی آتش جوان تھا۔ اُس نے راتیں رنگین شروع کر دیں۔ امرا شرفا پچھلے پہر خاموشی سے آتے اور خاموشی سے چلے جاتے۔ مدن لعل سے پیچھے چھپا نہ رہا تھا۔ وہ چودھویں پاس کر کے اب گھر میں پتھروں کی تراش سے وقت گزاری کرتا۔ اُس نے کلرکی کے لیے درخواست دے دی تھی۔ جیون لعل ماں کے لچھن جانتا تو تھا، مگر سب کچھ واضح نہ تھا۔ وہ اسے بتاتی تھی کہ اُس کے باپ کا دیا سونا توڑ توڑ کے گاڑی چلا رہی ہے، لیکن ایک دن ہونی ہو کے رہ گئی۔ اُس نے ماں کو سیٹھ گردھاری چند کے ساتھ بستر پر پڑے دیکھ لیا تھا۔ شوبھا کو زخم کاری پڑا تھا۔ وہ وہیں مر گئی، البتہ گردھاری کو اسپتال والوں نے بچا لیا۔ جیون لعل بھاگ کے دلواڑا چلا آیا۔ یہاں اُسے چھلیا مل گیا۔ چھلیا نے اُسے پورے دو سال اڈے پر چھپائے رکھا۔ آخر پولیس بھی اُسے بھول بھال گئی۔ پرچہ داخلِ دفتر کر دیا گیا۔ ان دو سالوں میں چھلیا نے اپنا سارا فن اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیا تھا۔ ادھر جیون لعل پیدائشی فن کار تھا۔ استاد کو پیچھے چھوڑ گیا۔ چھلیا اُسے اولاد کی طرح رکھتا تھا۔ پھر ایک دن چھلیا اپنا چاقو چوکی پر رکھ کے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی برہمی کے باوجود جیون لعل نے چھلیا کا چاقو اٹھا لیا۔ دو ایک

شوخ طلطنا کے اٹھے تھے کہ کل کا چھوکرا ہے، لیکن جیون لعل نے اس تیزی سے اُنھیں بٹھایا کہ اُس کا نام ہی رگھو پڑ گیا، جب کہ شہر کی ایک مشہور شخصیت سیٹھ رگھو بوری والا سے رگھو کی عرفیت کیا گئی، لوگوں نے اُسے بھی رگھو بوری والا کہنا شروع کر دیا، حالاں کہ بوری والا خاندان سے اُس کا دُور دُور تک کوئی رشتہ نہیں تھا۔ چھلیا احمد آباد چلا گیا۔ وہاں سے بمبئی، پھر وہاں سے ماتا ورد۔ آخر گر کے مضافات میں گوشہ نشین ہو گیا۔ رگھو کا نام اُس وقت دور تک سنا گیا جب اُس نے دلواڑے کے تمام بالا خانے بند کروا دیے۔ شرفا میں کھلبلی مچ گئی۔ آخر چھلیا نے معاملہ نبٹایا۔ اُس کی مداخلت پر رگھو چپ کر گیا۔ اُس کی زندگی سیدھی سادی ڈگر پر چلنے لگی، پھر ایک دن سیٹھ راج پٹیل نے اپنی لڑکی کا معاملہ اُس کے سپرد کیا۔ لکشمی فیکٹری کے معمولی ملازم قاسم میمن پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ رگھو نے قاسم میمن کو دھمکایا تو اُس نے رقم کا تقاضا کر دیا۔ اس قضیے کے دوران رگھو کئی مرتبہ لکشمی سے بات کر چکا تھا۔ اس چھیل چھبیلی حسینہ کی کج ادائیاں اُسے گھائل کر رہی تھیں۔ رگھو بھی بات بے بات سیٹھ راج پٹیل کی کوٹھی کے چکر لگانے لگا۔ اُس نے لکشمی کو متنفر کرنے کے لیے بتایا کہ قاسم میمن دام مانگ رہا ہے تو لکشمی نے اِٹھلا کے کہا کہ وہ بھی دل بستگی کو کھیل تماشہ کر رہی تھی۔ اِٹھلانے کو تو وہ اِٹھلا گئی تھی، مگر رگھو کا قرار لوٹ لے گئی۔ رگھو نے براہ راست راج پٹیل سے لکشمی کا ہاتھ مانگ لیا، مگر راج پٹیل نے یہ کہہ کر جھٹک دیا کہ اس سے اچھا تو قاسم پٹیل تھا۔ راج

پٹیل کو پٹی مل کا گھمنڈ تھا۔ رگھو نے بھی مل لگانے کی ٹھان لی۔ چھیدیا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ رگھو ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے۔ اس کے لیے اُسے کثیر سرمایہ درکار تھا۔ اُس نے پہلی مرتبہ اپنے باپ کی جائیداد میں سے حصہ مانگنے کی سوچی۔ وہ سیدھا بمبئی پہنچ گیا۔ اُس کی ماں ایک اَن پڑھ اور کم زور عورت ہونے کے ناتے دُور ایک کے بیٹھ گئی تھی۔ رگھو نے کاغذ ٹٹولے تو بے شمار ثبوت اُس کے ہاتھ لگ گئے۔ تعلیم، طاقت، اور پیچ کی سہ آتشہ قوت نے اُس کے سوتیلے بیٹوں کو سر جھکانے پر مجبور کر دیا۔ اُس کے حصے میں چھتیس لاکھ کی خطیر رقم آئی۔ دینے کو رقم تو اُسے دے دی گئی تھی، مگر وہ سانپ کی طرح پھنکار رہے تھے۔ رگھو کا کام دھندا بھی اُن سے چھپا نہیں رہا تھا۔ وہ اصل سے کہیں کم حصہ لے گیا تھا۔ وہ دوبارہ پلٹ سکتا تھا۔ ادھر رگھو نے دولواڑے میں مل کی بنا ڈال دی تھی۔ فیکٹری بہت تیزی سے تکمیل کے مراحل میں تھی کہ ڈکیتی کے دو مختلف مقدمات میں سورت اور بمبئی کی پولیس اُس کے وارنٹ لے کر پہنچ گئی۔ دولواڑے میں مشہور ہو گیا کہ رگھو ڈاکا ڈال کے فیکٹری بنا رہا ہے۔ رگھو کے سوتیلے بھائیوں نے پولیس کی ملی بھگت سے یہ ڈرامہ رچایا تھا۔ سورت کی ڈکیتی کے ساتھ ایک قتل بھی تھا۔ پھانسی نہ سہی عمر قید ضرور ہوتی، مگر رگھو نے اپنے وکیل کے ساتھ مل کے جھوٹے مقدمے کے پرخچے اُڑا دیے۔ خوش قسمتی اُس کے ساتھ تھی۔ واردات کے اصل مجرم کلکتہ میں گرفتار ہو گئے۔ انھوں نے سورت کی ڈکیتی اور قتل بھی قبول کیا اور یوں رگھو صاف بچ گیا۔ دولواڑا میں سب تیار ہو چکا تھا۔ لکشمی کی سگائی تھی۔ رگھو اب زندگی سے بے زار ہو چکا تھا۔ اُس نے لکشمی کے متوقع پتی وشنو پٹیل کو علی الاعلان قتل کرنے کی بات کہہ دی۔ وشنو پٹیل پیچھے ہٹ گیا۔ حالات و واقعات سے جس قدر لکشمی سے دُور کرتے رہے، اسی قدر لکشمی اُس کے نزدیک ہوتی رہی۔ اُس کی مانگ شدید محبت اور پھر جنون میں ڈھل گئی۔ پھر ایک دن لکشمی نے بھرے بازار میں رگھو پر تھوک دیا اور چیخ چیخ کے کہا کہ وہ بھنگی چمار سے شادی کر لے گی، مگر رگھو سے نہیں۔ ایسا ہی ہوا تو زہر کھا مرے گی۔ تب سے رگھو روپوش ہو گیا تھا۔ تیل کی فیکٹری ادھوری اور اجاڑ پڑی تھی۔ لاکھوں روپے بینک میں پڑے گل سڑ رہے تھے، لیکن رگھو کو اب کسی چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ اڈے سے بھی بس دو دن وہ رسم نبھا رہا تھا۔

رگھو نے اپنی بات مکمل کی تو میں نے کہا، "تو لکشمی جس سے بیاہ کرے گی تم اُسے مار دو گے؟"

"ہاں۔" رگھو نے یک دم بھڑکتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، اس پر قائم رہنا۔" میں نے مختصر جواب دیا۔

میرا ذہن کہیں الجھا ہوا تھا، پھر میں نے کچھ سوچتے ہوئے بھی اُس سے پوچھ لیا۔ "تم کسی شاکر بھائی کو جانتے ہو؟"

"ہاں، اچھی طرح۔ اُس کا سارا کام ادھر ہی ہوتا ہے۔ آپ کیوں پوچھتے ہو؟"

"یوں ہی۔ گذشتہ دنوں اُس کا کوئی کام کیا تھا؟"

"ہاں۔ اُس کے مہمان تھے ایک مولوی صاحب۔ ادھر کسی لڑکی کو تلاش کرتا تھا، وہ گم گئے تھے۔"

میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا، "تو پھر؟"

"ادھر تو اُن کا پتا نہیں چلا، پھر شاکر بھائی..."

میری دھڑکن بے قابو ہو گئی۔ "شاکر بھائی؟"

"شاکر بھائی کو بمبئی میں اُن کا پتا ملا ہے۔"

رگھو میری طرف بہ غور دیکھ رہا تھا، اور میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ معاً دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ کسی نے دروازہ بے طرح پیٹنا شروع کر دیا۔

"استاد! پولیس اڈے پر گھس آئی ہے۔ پکا گھیرا ہے۔ بولتے ہیں وارنٹ ہے، تلاشی لینی ہے۔"

پولیس کی آمد میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی۔ مجھ
انہیں مطلوب تھا۔ مطلوب بھی ایسا کہ جس کے مول پر پوری
ریاست چڑھی ہو۔ اڈے والوں کی مقدور بھر احتیاط چور
دروازے بند نہیں کر سکتی۔ اڈے والے ہزار ہاتھ پاؤں
رکھتے ہیں۔ پولیس والے ہزاروں آنکھیں رکھتے ہیں۔ رگھو
کے اڈے پر بجھل کو اس رسائی سے دیکھ کے مجھے عجیب گمان
ہوا تھا۔ جسے میں نے اگلے ہی لمحے جھٹک دیا تھا۔ جو خیال
مجھے آ سکتا ہے وہ بجھل کو مجھ سے کہیں پہلے آ گیا ہوگا۔ اس
کے پاؤں کی زنجیر پولیس نہیں کوئی اور ہی چیز تھی۔ کوئی نہ
ایسا بھی رقم ہو جاتا ہے کہ 'الف' پر مقدم ٹھیرتا ہے۔ بجھل کا
بھی 'الف' پر ہمیشہ مقدم ہی ٹھیرا تھا۔ عجب نہیں تھا کہ
پولیس کی آمد شاکر بھائی کے تذکرے سے میرا ارتکاز منتشر
نہیں کر سکی۔ میں نے تسلسل میں کہا۔ اس طرح ڈوبتے
ابھرتے بے قابو دل سے۔" میں ابھی اور اسی وقت شاکر
بھائی سے ملنا چاہتا ہوں۔"
رگھو مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ کچھ
پولیس کی افتاد نے اُسے سٹپٹا دیا تھا۔ اُس نے لہجے میں ترشی
اور طنز کی آمیزش دانستہ نہیں سموئی تھی۔ "کمال کرتے ہو
بابر بھائی! ابھی استاد پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو واپسی نہیں
ہے۔ شاکر بھائی کو گولی مارو۔" رگھو نے طوفان کی طرح
بڑھ کے دروازہ کھول دیا۔ آنے والا بھی سیلاب بلا کی
طرح دروازہ پیٹ رہا تھا۔ دروازہ کیا کھلا بند ٹوٹ گئے اور
وہ منہ زور ایک ہی لہر میں اندر گھستا چلا آیا۔ "چھلیا استاد،
بجھل استاد، جورا استاد اور جمرو استاد کو لے کے باؤلی سے
نکلنے کا ہے۔ رگھو کو بولنے کا ہے بابر استاد پولیس بھگتا لے گا۔ تو
پھر انہیں کرنے کا۔ شانت رہنے کا ہے۔" بچے کی طرح

دبلے منحنی اور ایستادہ کارندے نے پھولے ہوئے سانسوں
سے جلدی جلدی اپنا مدعا اُگلا۔ "استاد چھاپا ہو گیا... سالا رگھو
ٹنائی نہیں ہے۔ پولیس کی ماں کا۔ چوکی پر آ گئے ہیں یا دروازے
پر کھڑے ہیں۔" رگھو چھلیا کا پیغام سن کے طیش میں آ گیا۔
مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ یہ پیغام
چھلیا کا نہیں، بجھل کا تھا۔ میں پولیس سے نمٹنے کی
صلاحیتوں سے مالا مال نہیں تھا۔ بجھل نے سیدھے سادے
الفاظ میں مجھے تنبیہ کی تھی کہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹانا
ہے۔ کسی طور پر بات بڑھنی نہیں چاہیے۔ بجھل جلد از جلد
یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ اور میرے سر میں شاکر بھائی کا سودا
سمایا ہوا تھا۔ راہ داری سے افراتفری کی سرگوشیاں یہاں تک آ رہی
تھیں۔ پولیس کے لیے ماحول یقیناً سازگار بنایا جا رہا تھا۔ رگھو نے
مجھے کمرے میں ٹھیرنے کو کہا اور خود باہر جانے لگا۔ میں اس سے
پہلے قدم اٹھا چکا تھا۔ نتیجتاً دونوں ٹکرا گئے۔
"بابر بھائی آپ یہیں ٹھیرو۔ مجھے کچھ سدھانے
دو... ہیں۔" رگھو نے ناگواری سے کہا۔ ہر چند کہ اُس نے
... تاثرات چھپانے کی کوشش کی تھی۔
لیکن میں نے اُس کی سنی نہیں اور باہر نکل آیا۔
... معمول کی کارروائی پر نہیں آئی تھی۔ ... دو گُرگوں
... رگھو بھی جھلایا ہوا میرے پیچھے لپک آیا۔ صحن کے
دوسرے حصے میں ایک دالان چھتا ہوا تھا۔ اُس کے پیچھے چوکی
تھی۔ چھت، کمروں اور نہ جانے کس کس کونے کھدرے
سے نکل کے اڈے کے مکین وہاں جمع ہو رہے تھے۔ سب
کے گرتے سیدھے تھے۔ کندھے شریفوں کی طرح ڈھلکے
ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں سے اضطراب جھلک رہا تھا۔
سب کے سب بیرونی چوکھٹ کی طرف رُخ کیے ہوئے
دست بستہ کھڑے تھے جیسے پولیس بھی جانتی تھی کہ یہ شرفا
کا ٹھکانا ہے، ویسے ہی وہ بھی شرفا ہی تھے۔ دروازہ بے طرح
سے پیٹا جا رہا تھا۔ دروازہ کیا تھا شیشم کے بڑے بڑے
جناور بلم تھے۔ جنھیں توڑنا پولیس کے لیے سردست ممکن نہ
تھا۔ ہمارے صحن میں پہنچتے ہی سب کی حکم طلب نظریں رگھو
کی طرف اُٹھ گئیں۔ رگھو نے میری طرف ایک نظر اٹھا مجھے
ان سب کا مرکز بنا دیا۔ میرے پاس سوچنے کی فرصت نہیں
تھی۔ میں کسی ہچکچاہٹ اور تردد کے بغیر چوکی پر جا کے بیٹھ
گیا۔ ایسی سرگرمی بھری، گویا سب نے ایک ہی منہ سے
سانس بھرا ہو۔ اس طرح اور اسی وقت چوکی پر بیٹھنے کا کوئی
جواز نہیں تھا۔
"رگھو دروازہ کھلواؤ!" میں نے سکون سے کہا۔
"ساؤ جڑی مار سنگل گرا دے۔" رگھو نے دروازے
کے پاس کھڑے دو تین میں سے ایک کو کہا۔
دروازہ کھلتے ہی پولیس کرائی پڑی اندر کی اور چڑھ
دوڑی۔ پہلے ہلے میں پندرہ کے قریب سپاہی اندر گھس
آئے، ان میں کوئی افسر شامل نہیں تھا۔ پولیس والے اپنی
جھونک میں لاٹھیاں سونتے سیدھے چوکی ہی کی طرف
آئے۔ گویا شدید ردعمل کی توقع تھی۔ اڈے میں اس وقت
کم و بیش بارہ سے پندرہ کارندے موجود تھے۔ اور وہ بھی
سب کے سب صحن میں۔ عموماً پولیس اڈوں میں اس طرح
داخل نہیں ہوتی۔ پولیس والے دو مقامات ہی سے متعلق
کار بند ضوابط ہوا کرتے ہیں۔ اول تھانا دوم اڈا۔ کامیاب
پولیس افراد اور اڈے کے درمیان خوب چھنتی ہے، مگر ادب
آداب کے ساتھ ہر لحاظ مراتب "وہ پٹی مال کو تجر خانے
چھوڑ گئے تھے۔" رگھو دانت پیستے ہوئے زیر لب بڑبڑایا۔ وہ
چوکی کے پہلو میں کھڑا تھا۔ میں نے تنبیہ کے طور پر تیکھی
نظر کی تو اُس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ میرا ذہن بہت
تیزی سے حالات کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھا۔ پولیس
بجھل کی برآمدگی کے لیے اڈے پر چڑھ دوڑی تھی۔ لامحالہ
وہ پکی مخبری کے ساتھ آئے تھے، آسانی سے ٹلنے والے
نہیں تھے۔ رگھو کی بڑائی بھی بچ تھی۔ اڈے کا بھرم ہی تو
سب کچھ ہوا کرتا ہے۔ بھرم نہ رہا تو پھر کیا رہا۔ تحفظ، رعب
اور طاقت ہی تو اڈے کی علامت ہے۔ یہ علامت نہ رہے تو
اڈا کہاں رہا کرتا ہے۔ پولیس آتی ہے اڈوں سے لوگوں کو
گرفتار بھی کر کے لے جاتی ہے مگر سج اور سبھاؤ سے۔ داخل
ہونے سے پہلے اجازت طلب کی جاتی ہے۔ شرافت سے
آئے اور شرافت سے چلے۔ ایسے نہیں کہ دھم دھم سے کے
چڑھ دوڑے چاچا کے چبوترے پر۔ اب کئی دن تک رگھو
کے گزرے پیچھے لوگ ان سو باتیں کریں گے۔ معنی خیز
مسکراہٹیں رگھو کے پیچھے دوڑائی جائیں گی، مگر مجال ہے کہ
اس کے مڑتے پر سوائے سناٹے اور جھکی ہوئی گردنوں کے
کچھ باقی ہو۔ بہرحال، اس موسم تک رگھو کا بھرم رخصت
ہو گیا تھا۔ پولیس کا بات چیت کا قطعاً کوئی ارادہ نظر نہیں
آ رہا تھا۔ سپاہیوں نے اندھا دھند لاٹھیاں چلانی شروع کر
دی تھیں۔ پھر تو جیسے چوکی کے گرد پروانے جمع ہو گئے۔

لٹھیوں سے جل جل کے گرنے والے۔ ان کے پیچھے مزید دس پندرہ سپاہی اور اندر گھس آئے۔ وہ سیدھے کمروں کی طرف دوڑ گئے۔ ان کی بھاگ دوڑ سے جھنجھل کی شدید طلب عیاں تھی۔ رگھو چٹان کی طرح منہ بھینچے ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اور میں بھی مضبوطی سے جما بیٹھا تھا۔ چوکی کے گرد شیدائیوں نے دو گھیرے ڈال رکھے تھے۔

پہلا گھیرا پانچ افراد کا تھا، جب کہ اس کے اوپر دس جنے جڑے کھڑے تھے۔ سپاہی وحشیانہ انداز میں لاٹھیاں گھما رہے تھے، مگر ادھر نہ کوئی آہ تھی نہ کراہ اور نہ کوئی شگاف۔ پولیس کا طرزِ عمل ناقابلِ سمجھ تھا۔ انھیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے اب اٹھ جانا چاہیے تھا۔ کسی بے وقوف نے اگر چاقو گھونپ لیا تو بات سنبھالنی مشکل ہو جائے گی۔ رگھو نے خود پر مکمل لاتعلقی ظاہر کر رکھی تھی۔ میرا ذہن خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ آخر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ادھر انسپکٹر اجیت اڈے کے دروازے پر نمودار ہوا۔ باروتیہ کے قاتل پکڑنے کے لیے وہ خاصی دل جمعی سے کام کر رہا تھا۔ انسپکٹر اجیت کی نظریں مجھ پر پیوست تھیں۔ شاید اُسے گدی سے زیادہ جھنجھل مطلوب تھا۔

"رُک جاؤ، رک جاؤ۔ یہ کیا کر رہے ہو!" اجیت سپاہیوں کی کھٹم کھٹی دیکھ کے چلایا۔ کچھ اس طرح جیسے کہہ رہا ہو اس سلسلے کو اور تیز کرو۔

حسبِ توقع لاٹھیوں کی گردش کچھ اور تیز ہو گئی۔ بہت سوں کی چمڑی لاٹھیاں اتار لائی تھیں، بازوؤں کی ہڈیاں بھی کچھ ضرور ٹوٹی ہوں گی۔ یہ دیکھ کے اڈے کے در و دیوار بھی حیران ہوں گے کہ کسی تختۂ مشق نے آہ تک نہیں کی۔ آخر کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ گالیاں اور لاٹھیاں دونوں تھم ہی گئیں تاوقتیکہ انسپکٹر مجھے دیکھ کر دو تین مرتبہ چلایا نہیں۔

"ابھی تھکنے کا نہیں ہے صاحب۔ جو رد کھانے کا ہے۔ دھر جو رد کھانے کا ہے۔" ایک بے ترتیب کھردرے سے کارندے نے بپھر کے کہا۔ میں جب اڈے میں آیا تھا وہ اس وقت بھی پیش پیش تھا۔ سے جھمیں کالو کے نام سے دو ایک مرتبہ بلایا تھا۔

اجیت نے اُسے کینہ توز نظروں سے گھورا اور کہا۔ "اسے گاڑی میں بٹھاؤ، اس کی سیوا کمرے میں ہوگی۔ حوالدار رشمار۔"

"جی سرکار!" چمکتی ہوئی وردی میں ملبوس ایک نوجوان پولیس والے نے مستعدی سے جواب دیا۔

"یہاں سے جھنجھل اور اس کے ساتھی کی ہر حال میں برآمدگی چاہیے۔ یہ سوچ کے تلاشی لینا کہ تم چیونٹیوں کو ڈھونڈ رہے ہو۔ وہ دیوار کی اینٹوں اور پتھروں کے پیچھے سے بھی برآمد ہو سکتی ہیں۔" اجیت نے میری طرف دو قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ میری آنکھوں سے انگارے نکلتے ہوئے اسے یقیناً نظر آ رہے ہوں۔ میں ابھی تک اپنی جگہ پر ساکت بیٹھا تھا۔ اجیت کے حکم کی تعمیل میں دو سپاہیوں نے کالو پر ہاتھ ڈالا۔

"ان سے کہو کہ کالو سے دور ہو جائیں۔" دفعتاً میں نے بھڑکتے ہوئے کہا۔ میں چوکی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"پولیس کے کام میں جو رکاوٹ ڈالے گا، وہ تھانے جائے گا۔" اجیت نے کہا۔

"پولیس کی آمد کا سبب جان سکتا ہوں میں انسپکٹر اجیت صاحب!" میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔

"مسٹر بابر آپ کو اس وقت بمبئی میں ہونا چاہیے تھا۔ آپ ابھی تک یہیں ہیں۔"

"میں وضاحت کر چکا ہوں اور میں اپنے ساتھیوں کے بنا یہاں سے نہیں جاؤں گا۔"

"وضاحت تو آپ کو پولیس نے بھی کر دی ہے کہ آپ کے ساتھی اجازت کے بنا یہاں سے نہیں جا سکتے۔"

"میرے ساتھی مجھے مل جاتے تو میں اب تک یہاں نہ ہوتا۔"

"ٹھیک ہے، کچھ دیر میں پتا چل جائے گا۔ ہمیں پکا بھید ملا ہے۔ باروتیہ کا قاتل یہاں آپ کے استقبال کے لیے موجود تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں بابر صاحب؟" انسپکٹر اجیت نے جس انداز میں باروتیہ کا قاتل کہا تھا یوں لگتا تھا جیسے اس نے کہا ہو کہ میرے "باپ کا قاتل"۔ باروتیہ سے اس کی وابستگی شدید تھی۔ اس سے قبل بھی کئی مرتبہ وہ اپنے طرزِ عمل سے اس کا اظہار کر چکا تھا۔

نوجوان حوالدار اندر سے آ کے اجیت کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگا۔

"میں بتا چکا ہوں وہ مجھے مل جاتے تو میں تمھیں یہاں نہ ملتا۔" میں نے لہجے میں ذرا نرمی پیدا کی۔

سپاہی لاٹھیاں جھٹک کے ایک طرف ہو گئے تھے۔ مضروب اور ضارب دونوں ایک دوسرے کو پیغام رساں نظروں میں تول رہے تھے کہ کبھی تو اکیلے ملو گے۔ میرا خیال تھا کہ انسپکٹر اجیت کا اڈے پر دھاوا اپنے افسروں سے بالا ہی بالا کوئی کام ہے۔ وہ خاصا خود اعتماد قسم کا پولیس افسر دکھتا تھا۔ اس نے حکومتِ برطانیہ کے دو اہم نمائندے خاموشی سے راہِ عدم پہنچا دیے تھے۔ وہ یہاں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ انگریزوں سے انتہائی نفرت کرنے والوں میں سے دکھتا تھا۔ شاید یہی نفرت اسے باروتیہ سے بہت قریب کرتی تھی۔ مجھے علم نہیں تھا جھنجھل کس طرف سے نکلا ہے اور کہاں گیا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آئندہ اس سے کہاں ملاقات ہوگی۔ میں تو اس پر گزری بھی نہ جان سکا تھا۔ موقع ہی نہیں ملا۔ وہ بھی اپنے مزاج کا آدمی ہے، مرضی سے بتائے تو بتا دے، ورنہ مجال ہے جو کوئی بات بانٹ لے۔ میں نے باروتیہ کے قتل سے متعلق جو کچھ سنا دوسروں سے سنا۔ اور اس میں سے نصف معلومات ناقص ثابت ہوئی اور نصف مبہم گڈمڈ تھی۔ میری تمام معلومات مبنی بر اندازہ ہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میرے پیچھے جھنجھل، زورا اور جمرو پر کیا بیتی۔ زورا اور جمرو سے ضرور مکمل احوال مل جاتا مگر [illegible] وہاں محبت پروان ہی نہ چڑھ سکی۔ میں دل میں [illegible] رہا تھا کہ خدایا، چھلیا جھنجھل کو لے کر جس راستے سے نکلا ہے وہ راستہ اس سرخ نظر پولیس والے کو دریافت [illegible] کچھ بھی ممکن تھا۔ اس شخص سے کچھ بعید نہیں [illegible] نے جس طرح رنگی چلوائی تھی اس سے اُس کے [illegible] عزائم مترشح تھے، ورنہ اسے یہاں ایسے طور کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

"مجھے تمھارے ساتھیوں کا پتا چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت" انسپکٹر اجیت نے حوالدار کی کھسر پھسر سن کے پھنکارتے ہوئے کہا۔ حوالدار نے اُسے سرخ جھنڈی دکھا دی تھی۔

"انسپکٹر صاحب تم اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔" میں نے اطمینان کی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"ایک ایک کی کھال کھنچوا کے گوبر بھروا دوں گا۔ کہاں چھپایا ہے ان حرامیوں کو" انسپکٹر اجیت نے روئے سخن اڈے کے دوسرے لوگوں کی طرف کر لیا۔ وہ سب تو منہ میں گھنگنیاں ڈال کے کھڑے تھے۔ "رگھو تو بول۔ چھپایا کدھر ہے... میری اطلاع کے مطابق وہ کچھ دیر پہلے ادھر ہی تھے۔"

"استاد بابر بھائی کو چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ کدھر گیا پتا نہیں ہے۔" رگھو نے اکڑے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ اُس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اُس کا بس نہیں چل رہا۔ انسپکٹر اجیت کو بیل کے بل میں گھسیڑ دے۔

"میں یہاں سے انھیں برآمد کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا اس عمارت کی۔" طیش میں اجیت کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے جو میرے لیے خوش آئند بات تھی۔

"رگھو تجھے شرم آنی چاہیے۔ دھرتی کے غداروں کو چھپا رہا ہے۔ انھیں کدھر چھپایا ہے وہ ادھر ہی ہیں۔ تجھے جیل پہنچنا نصیب نہیں ہوگا۔ بتا کدھر ہیں۔" اجیت غصے سے کانپتا ہوا رگھو کے قریب آ کے بولا۔

"جو کرنا ہے کر لے۔ بول دیا وہ ادھر نہیں ہے۔" رگھو نے اپنی ٹھوڑی پر سے اس کی چھڑی ہٹائی۔

"مسٹر بابر! تم میرے لیے انتہائی ناپسندیدہ شخصیت بن چکے ہو۔ تمھاری قسمت اچھی ہے جو بچ رہے ہو۔"

"پسند ناپسند ہر کسی کی اپنی صوابدید پر ہے۔" میں نے مختصر جواب دیا۔ مجھے معلوم تھا وہ مجھے یہاں سے تھانے نہیں لے جا سکتا۔ تحمل اور معتدل مزاج ہی سے وہ ٹل سکتا تھا۔

"میری صوابدید پر اور بہت کچھ ہے۔" اجیت نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا ہے کہ ہر آدمی اپنی صوابدید پر بااختیار ہوتا ہے۔"

"بھلائی اسی میں ہے کہ بتا دو جھنجھل کہاں ہے۔"

"ایسی بات ہے تو سنو! مجھے علم ہوتا میں تب بھی نہ بتاتا۔" میں نے آخرکار حتمی لہجہ اختیار کر لیا۔

"جانتے تو تم ہو۔ یہاں پر تم نے اور اس نے دھاچوکڑی مچائی ہے۔ پل پل کی خبر ہے۔"

"پل پل کی خبر ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو۔ اسی سے پوچھو جو تمھیں پل پل کی اطلاعات فراہم کر رہا ہے۔"

بس وہ ایک ساعت تھی، جس کا دورانیہ کم مائیگی کی بدولت ناپا نہیں جا سکتا تھا۔ اجیت کی نگاہیں ایک کارندے سے ٹکرائی تھیں۔ پھر دونوں کی نظریں ایسے جدا ہوئیں جیسے کبھی ملی ہی نہیں، مگر وہ میری نظر میں آ گیا تھا، وہ پستہ قد، گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اس کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ چہرے کی رنگت توے کی طرح سیاہ تھی۔ میں اس موقع پر انسپکٹر اجیت کو کسی بھی قسم کی معلومات نہیں فراہم کر سکتا تھا۔ ایک ہی راستہ تھا، مجھے گرفتار کر کے باہر لے جایا جاتا اس کے بعد ہی راہِ فرار ممکن تھا۔ وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ اجیت نے رگھو

سمیت دو چار کو تھانے لے جانے کا حکم دے دیا۔ یقیناً ان دو چار میں اہم ترین آدمی بھی تھے۔

"یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔ اجازت نامہ ہے گرفتاری اور تلاشی کا؟" میری کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ صورت حال اس سے کہیں زیادہ گمبھیر تھی جتنی نظر آتی تھی۔ بٹھل کو دیکھنے کے بعد وہ بات بعد میں کرتا گولی پہلے چلاتا۔ اس کی جذباتی کیفیت کچھ اسی طرح کی نظر آ رہی تھی۔

"یہ ہے نا میرے پاس!" اس نے طمنچہ نکال لیا۔ دیگر سپاہیوں نے اس کی دیکھا دیکھی لٹکائی ہوئی بندوقیں فوراً تان لیں۔

"تو پھر چلاؤ گولی۔ یہاں سے کوئی نہیں جائے گا۔" میں نے خواہ مخواہ مسکراتے ہوئے کہا۔ رگھو مٹھیاں سی بھینچ رہا تھا۔

"یہاں وائسرائے یا اس کا کوئی گماشتہ نہیں آئے گا۔" اجیت نے طمنچہ سیدھا میری طرف تان لیا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

"انگریزوں سے تعلق کی گالی مجھے بار بار مت دو۔ اس سے بہتر ہے گولی چلا دو!" میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھینتے ہوئے اعصاب سلب کرتے جا رہے تھے۔

"جذباتی داؤ پیچ مت آزماؤ بابر صاحب! وائسرائے کا رقعہ تمھاری جیب میں ہوگا۔"

آخر مجھے طیش آ گیا۔ بقول بٹھل کے شکست کی پہلی علامت غصہ اور جھنجھلاہٹ ہے۔ مجھے بہت آسان لگ رہا تھا کہ وہ ایک گولی چلائے جو سیدھی پیوست خاطر ہو۔ "تم کسی کرانتی اور آزادی کے بھگت ہو، تم نے اپنے آپ کو از خود قید کر رکھا ہے۔ تم نے ایک دانا اور تعلیم یافتہ شخص پر ایک عقل سے عاری اور متشدد شخص مسلط کر رکھا ہے۔ تمھارے نزدیک مجھے انگریزی آتی ہے، اس لیے میں انگریزوں کا گماشتہ ہوں۔ تم کیا ہو؟ کیا تمھیں انگریزی نہیں آتی۔ کیا تم انگریزی تعلیم کے بل بوتے پر یہ وردی زیب تن نہیں کیے ہوئے۔ کیا اس بنا پر تم انگریزوں کے گماشتے نہیں کہلا سکتے؟ تمھیں پہلی مرتبہ دو انگریزوں ہی کے ساتھ دیکھا تھا۔ کیا میں تمھیں صرف اس بنا پر انگریزوں کا گماشتہ مان لیتا کہ تم دو ذی وقار انگریز افسروں کے ہمراہ آتے تھے۔ انسپکٹر اجیت حالات کا تجزیہ کرنے کے لیے انسان کو عقل کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ باروشیہ، میں اور تم میں فرق ہونا چاہیے تھا۔" میں اپنی روانی میں بولتا چلا گیا۔ اجیت خاموشی سے طمنچہ تانے بس مجھے دیکھا کیا۔

"بولتے جاؤ۔ میں ہمیشہ سچ کے لیے لڑنا پسند کرتا ہوں۔" اس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔

"اجیت صاحب! سامنے کی بات ہے۔ باروشیہ کیا تھا؟ باروشیہ کیا ہے؟ ہم بالکل نہیں جانتے۔ وہ جہاز کہاں سے آ رہا تھا اور کہاں جا رہا تھا۔ اس میں سوار ہونے سے قبل ہم بالکل نہیں جانتے تھے۔ بالکل اس طرح جس طرح تم نہیں جانتے کہ تم کتنی بدگمانی میں مبتلا ہو۔"

"بابر صاحب! میں کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں، یہ مجھ پر رہنے دیں۔ اپنی بات پوری کریں۔"

"میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ میں بھی بالکل اسی طرح تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتا ہوں، جس طرح تم انگریزی جانتے ہو، ورنہ میرے ساتھی اپنا نام لکھنے کی سدھ بدھ بھی نہیں رکھتے۔ ہم جہاز میں بمبئی جانے کے لیے کراچی سے سوار ہوئے تھے۔ ایک انگریز محقق کو ایسے ہندوستانی کی تلاش تھی جو انگریزی جانتا ہو۔ ہماری اس سے عرشے پر ملاقات ہوئی۔ وہ میری باتوں سے بے حد متاثر ہوا۔ [illegible] کے ریستوران میں لے گیا، جو جانے ممنوعہ تھی [illegible] کے لیے۔ تمھیں جہاز میں کسی نے یہ بھی بتایا [illegible] ریستوران سے محض ہندوستانی ہونے کی وجہ سے [illegible]۔ انگریز محقق ہی نے میری ملاقات مایا سے کروائی تھی۔ ہمیں ریستوران سے باہر کرنے والا متعصب کپتان مایا کا شوہر تھا۔ وہاں ہماری مایا کے شوہر سے جھڑپ ہوئی، جو خالصتاً نسلی تعصب کی بنیاد پر تھی۔ اسی دوران باروشیہ جہاز پر چڑھ آیا۔ ہمیں فی الفور انگریزوں کا گماشتہ تصور کر لیا گیا۔ ہمیں بوریوں میں بھر دیا گیا۔ اس کے بعد ہماری ہر کوشش خود کو باروشیہ کے چنگل سے آزاد کروانے کی تھی، نہ کہ انگریزوں کے دفاع میں کیا جانے والا کوئی اقدام۔ میں وہاں سے بھاگا، اس لیے کہ اپنی جان بچانا میرا حق تھا۔ میرے ساتھ ایک انگریز قید تھا۔ اس کی حیثیت محض ایک شریک درد کی سی تھی۔ اس کی جگہ کوئی ہندوستانی، فرانسیسی، انگریز خواہ کوئی بھی ہوتا میری ہم دردی حاصل کرتا، لیکن لیونارڈ کو اپنے ساتھ فرار کروانے کی بنیادی وجہ کچھ اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ میں وہاں سے نکلنے میں لیونارڈ ہی کی بدولت کام یاب ہو سکا تھا۔ تنہا آدمی کے لیے ایسا ناممکن تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بٹھل کے ہاتھوں، باروشیہ ہلاک ہوا ابھی ہے یا نہیں، تاہم دو اور دو چار کی طرح یہ واضح بات ہے کہ بٹھل نے اگر کوئی ایسا قدم اٹھایا ہوگا تو محض اپنے دفاع کے لیے اور اسے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں بنتا کہ ہمارا تعلق انگریزوں سے ہے۔"

"تم کراچی کس لیے گئے تھے؟"

"ہمارا تعلق زمیں دار گھرانے سے ہے۔ گاؤں گاؤں، قصبے قصبے اور شہر در شہر ہم گھومتے پھرتے ہیں۔ بس شوقیہ!"

"بھوا مہاجن کا معاملہ کیا ہے؟ وہ اپنی ساری دولت تمھارے حوالے کیوں کر گیا ہے۔" انسپکٹر اجیت کا لب و لہجہ معقولیت کی شاہراہ پر لوٹ آیا تھا، لیکن طمنچے کی نال ذرا بھی ترچھی نہ ہوئی تھی۔

"مجھے تمھارے ذریعے ہی معلوم ہوا کہ بھوا مہاجن باروشیہ کی مالی معاونت کرتا تھا۔ ورنہ میں بھوا کا اس حادثے سے قبل محض چند ساعتوں کا شناسا ہوں۔"

"نہیں بابر صاحب! تمھاری پہلی [illegible] کی حامل تھی، جب کہ کراچی اور بھوا والا معاملہ تم آگے پیچھے کر رہے ہو۔ تمھاری حیثیت مشکوک ہے۔" وہ پھر مجھ سے اکھڑنے لگا۔

"تم گولی چلا سکتے ہو، مگر یہاں سے کوئی آدمی نہیں لے جا سکتے۔" اس سے مغز مارنا بے سود تھا۔ بھوا کے تذکرے نے میرے اضمحلال کو دو آتشہ کر دیا تھا۔

"میں باروشیہ کے قاتل کو کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اسے بھیانک انجام سے دوچار کر کے رہوں گا۔ دیکھو، رگھو بات یہیں ختم ہو سکتی ہے۔ تم جانتے ہی ہو کہ تھانے کی سیر سے بہت سے فرفر بول پڑتے ہیں۔" اس نے اچانک رگھو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی بابر بھائی نے بول دیا ہے گولی چلاؤ۔ ادھر سے کوئی نہیں جانے کا۔" رگھو نے سرد اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ اور ایک جھٹکے سے چاقو کھول لیا۔ رگھو کی دیکھا دیکھی کتنا کھٹ مچ گئی۔ سبھی کے چاقو ہاتھوں میں چمکنے لگے۔ اڈے یاروں سے وابستگی کی قدامت اپنی جگہ، مگر ایسی صورت حال سے پالا کبھی نہ پڑا تھا۔ ایک طرف وہ ضدی پولیس والا تھا جو دماغ استعمال کرنے کی سوچ بھی نہیں رہا تھا اور دوسری طرف میں تھا جس کا سب کچھ داؤ پر لگا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ جیسے بٹھل کے یہاں سے کوچ کے بارے میں کسی حد تک جانتا تھا، تاہم میں یہ فیصلہ کر چکا تھا۔ جیسے کسی طور یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔ چاقو اور گولی اگر چلتے ہیں تو صورت حال اس سے زیادہ گمبھیر ہو جاتی، لیکن اس کے سوا کوئی دوسری راہ بھی سامنے نہ تھی۔

"ٹھیک ہے انسپکٹر اجیت! رگھو تمھارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہے، مگر اور کوئی نہیں جائے گا۔" میں نے ایک نیا پانسہ پھینکا۔ رگھو کے چہرے پر ناگواری صاف مترشح ہوئی تھی۔

"نہیں رگھو نہیں، دو چار آدمی اور جائیں گے!" اجیت نے سوچتے ہوئے کہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ شاید میرے مقصد تک پہنچ رہا ہے۔

"ٹھیک ہے، چار نہیں تم پانچ آدمی لے جاؤ۔ کالو، پاٹلے، اور تم، اور تم اور تم۔" میں نے فوراً اس کا یہ تقاضا پورا کر دیا اور پانچ کی بجائے چھ آدمیوں کو اس کے ہمراہ جانے کا اشارہ بھی دے دیا۔

"نہیں، آدمی میں اپنی مرضی سے لے کر جاؤں گا۔"

انسپکٹر اجیت کی آنکھوں میں اُلجھن تیر گئی۔ اور چھیمے سے متعلق میرا شک پختہ ہو گیا۔ چھیمے جس قدر اخفا میں رہتا تھا ہی ہمارے لیے سود مند تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں رگھو اس معاملے کی تہہ تک نہ پہنچ جائے ورنہ ضبط نہ ہاتھ سے گنوا دے۔ چھیمے کی نظروں میں چوری چھپتی جا رہی تھی۔ یا شاید مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔

”ٹھیک ہے پھر یہاں سے کوئی نہیں جائے گا“ میں نے بھی زچ ہو کر کہا۔

رگھو اور سب کی شکلوں پر تناؤ سکڑا اور پھیل رہا تھا کہ اس اثنا میں باہر ہلکا سا غلغلہ بلند ہوا، اور دوڑتے قدم اندر کی طرف آئے۔ وہ چند اہلکار ہی تھے، سادہ لباس والے بھی اور باوردی بھی۔ ان کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ انھیں دیکھتے ہی میرا دل بے طرح سے دھڑکا۔ وسوسوں پر وسوسے اٹھنے لگے۔ اور وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا، انھیں دیکھتے ہی ہو۔ تھا۔ وہ بٹھل، چھبلیا، جمرو اور ذورا، دھیارا اور لنگو کی گرفتاری کی خبر لائے تھے۔ انھوں نے آتے ہی واشگاف انداز میں بتایا کہ اڈے سے ملحقہ مکان سے مطلوبہ افراد کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ملزمان اڈے میں موجود خفیہ راستے سے وہاں پہنچے تھے۔ اجیت یہ اطلاع سن کر کھل اٹھا تھا۔ میں خود ہی سوچ رہا تھا کہ انھیں اڈے پر لایا جائے حالاں کہ یہ احمقانہ سوچ تھی۔ اجیت باہر جانے کے لیے گھوما تو میں کسی خود کار آلے کی طرح حرکت میں آ گیا۔ وہ مجھ سے تین قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں نے نپی تلی چھلانگ لگائی۔ درمیانی فاصلے پر میرا پنجہ مجھے دوبارہ اچھالنے کے لیے زمین پر لگا۔ اور اسی لمحے میں اجیت کے اوپر تھا، مگر میں اُسے لے کر نیچے نہیں گرا۔ میں نے اپنی جھونک میں اُس کے دائیں کندھے پر اشارتاً ضرب لگائی وہ زور میں آ کے گھوما۔ اُس کی پشت میری جانب ہو گئی۔ اسی اثنا میں میں چاقو نکال چکا تھا۔ یہ وقوعہ پلک جھپکنے سا ہی تھا۔ جیت کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں تھی اور میرے چاقو کا تیز دھار پھلکا اس کے نرخرے سے لگا ہوا تھا۔ ایسے اقدام کی توقع وہاں کوئی خواب میں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ سپاہی بندوقیں تاننے کے تانے ہی رہ گئے۔ میں اجیت کو لے کر دیوار سے لگ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا میرے اس قدم سے کیا نتائج برآمد ہوں گے، لیکن مجھے اتنا اندازہ ضرور تھا کہ جیت بٹھل سے ”خون کا بدلہ خون“ سے کم پر سلوک نہیں کرے گا۔ مجھے بچاؤ کا دھندلا سا راستہ یہیں نظر آیا تھا۔ اجیت نے جوابی طور پر کوئی حرکت نہیں کی۔ پھلکا اُس کے نرخرے میں تقریباً گڑا ہوا ہی تھا۔

”اس سے تم کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔“ اجیت نے بھنچے بھنچے لہجے میں کہا۔

”سپاہیوں سے کہو بندوقیں گرا دیں۔“ میں نے چاقو کا دباؤ بڑھایا۔ سپاہی چند لمحوں کے لیے سٹپٹا گئے تھے۔ اڈے بازے کا کوئی شیدا اُن کے افسر کو پولیس کی بھاری جمعیت کے بیچوں بیچ یرغمال بنا سکتا تھا۔ یہ تو انھوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ جب تک وہ معاملے تک پہنچے اجیت میرے شکنجے میں کسا جا چکا تھا، تاہم غیر ارادی طور پر سب کی سب بندوقوں کا رُخ میری طرف ہو گیا تھا۔ اس قدر قریب سے میری کنپٹی کا نشانہ باندھنا خاص مہارت کا متقاضی نہیں تھا۔ بہت آسانی سے ایک گولی مجھے ٹھنڈا کر سکتی تھی۔ جس پر مجھے جیت کا نرخرہ کاٹنے کی مہلت قطعاً نہیں ملتی۔ اور میں آنے والی گولی کے لیے بالکل تیار تھا۔ سپاہیوں کی بندوقیں بدستور میری طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ انھیں اب تک سنگینیں سرنگوں کرنے کا نہیں کہا گیا تھا۔ اجیت سمجھ رہا تھا اُٹھی ہوئی بندوقیں بازی اُس کے حق میں کیے ہوئے تھیں۔ پلڑا اُس کا بھاری تھا، تاہم وہ زبان سے اپنے ماتحتوں کو گولی چلانے کا حکم نہیں دے سکتا تھا۔ زبان کے ساتھ ساتھ میرا چاقو بھی چل سکتا تھا۔ رگھو بھی ہکا بکا کھڑا تھا۔ میں نے اُسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی قسم کی حرکت نہ کرنے کی تنبیہ کر دی تھی۔ شکر ہے کہ اُس نے اشارہ سمجھ لیا تھا۔ اجیت کی زبان نے حرکت نہ کی۔ میں نے دھار کھال میں اتار دی بس آلو کے چھلکے کی بقدر۔ اجیت نے سسکاری بھری۔ نوجوان حوالدار سے رہا نہ گیا اُس نے بندوق زمین پر رکھ دی۔ پھر گویا جھڑی لگ گئی۔ آن کی آن میں سب بندوقیں زمین پر آ رہیں۔ کانو لپک کے بندوق اٹھانے کے لیے بڑھا۔

”کانو ٹھہر جاؤ! اڈے کا کوئی آدمی اس لفڑے میں نہیں لپھے گا۔“ میں نے اجیت کو لے کر باہر کھسکتے ہوئے کہا۔ مجھے کم از کم دروازے تک جانا تھا۔

”ابھی چوڑی پہنانے کا ہے استاد! قسم! اکھا جندگی میں کانو نے ایسا مائی کا لال نہیں دیکھا۔ ابھی استاد تیرے کو چومنے کا ہے۔ کلیجا کاٹنے کا ہے استاد۔“ کانو نے پھڑکتے ہوئے کہا۔ اُس کی آنکھیں پانی چھوڑ رہی تھیں۔

”بابر بھائی۔ ابھی زندگی بیکار ہے۔ جو کچھ ہے آپ کے قدموں میں ہے“ رگھو بھی بول پڑا۔ اُس کی آواز بھی ڈبڈبا رہی تھی۔ اُس نے آگے بڑھ کر ایک بندوق اٹھا لی۔ اُس کی دیکھا دیکھی پورا اڈا بندوق بردار بن گیا۔

میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ وہ شاید انجام سے واقف نہیں تھے۔ جو ہونا ہو وہ ہو کر ہی رہتا ہے، انسان کی سب تدبیریں بے کار ہی جاتی ہیں۔ رگھو نے سب سپاہیوں کو ایک قطار میں کھڑا کروا دیا تھا، تاہم میں نے جیت کو اپنی گرفت سے آزاد نہیں کیا تھا۔

”بٹھل کو اندر بلواؤ۔“ میں نے آئندہ کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔ ہمیں یہاں سے نکلنا تھا۔

”بابر صاحب! اس کے پیچھے نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔“ اجیت نے کسمساتے ہوئے کہا۔

”نتائج پہلے بھی اچھے نہیں تھے۔ انھیں بلواؤ فوراً۔“ میں نے درشتی سے کہا۔

”انسپکٹر اجیت نے اس نوجوان حوالدار کو اشارہ کیا اور وہ دوڑتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس موقع پر تنبیہ بے سود تھی۔

”اب بھی وقت ہے بابر صاحب! یہ بات یہیں پر دبائی جا سکتی ہے۔ پولیس بھول جائے گی کہ اڈے کے آدمیوں نے پولیس کو یرغمال بنایا تھا۔ یہ بات چھوٹی نہیں ہے، مگر میں اسے ختم کر سکتا ہوں۔“ جیت نے جھنجھناتے ہوئے کہا۔ چاقو اس کی گردن پر باریک لکیر بنا چکا تھا۔ میں نے اُسے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

”باہر پولیس کا کڑا پہرا ہے۔ یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔“

میں نے خاموشی ہی بہتر سمجھی۔ میں تو واقعی نہیں جانتا تھا۔ یہاں سے کیسے نکلا جا سکتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی میں گزری۔ سب ہونقوں کی طرح گھڑیاں گن رہے تھے۔ تھوڑی دیر گزری کہ وہ آ گئے۔ ان کے ساتھ صرف وہی نوجوان حوالدار تھا۔ اس نے اندر کی کارگزاری سنا دی ہوگی اور باہر والوں کو بتا دیا ہوگا کہ ان کا باہر رہنا ہی مناسب ہے۔ بٹھل ان میں سب سے آگے تھا۔ چھبیا، جمرو، ذورا، لنگو دھیارا سب آگے پیچھے آ رہے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ حوالدار کے ہاتھ میں ایک زنجیر تھی، جس میں ان سب کی زنجیریں پروئی ہوئی تھیں۔ بٹھل کو دیکھ کے گویا میرے سر سے فولاد کا پہاڑ سرک گیا تھا۔ جیسے ہی وہ صحن میں داخل ہوئے میں نے اجیت کی گردن چھوڑ دی۔ وہ گردن مسلتا ہوا سامنے کو ہو رہا۔ بٹھل ایک گرگ باراں دیدہ تھا۔ لمحوں میں اُس نے صورت حال بھانپ لی ہوگی۔ یکا یک اُس کی پیشانی پر گہری سلوٹیں در آئیں اور آنکھیں تمتما اُٹھیں۔ ”یہ کیا ہے باڑے؟“ وہ حلقہ زنجیر کو کھینچتے ہوئے میری طرف آیا۔ اس کے ساتھ بقیہ پانچوں بھی کھنچے چلے آئے۔ بٹھل برہم ہو رہا تھا۔ اُسے غصہ تھا۔

”انسپکٹر صاحب یہ ہتھکڑیاں کھلواؤ۔“ رگھو نے اب بندوق اجیت کی کنپٹی سے لگا دی تھی۔

بٹھل مجھے گھورتا ہوا شدید غصے میں پلٹا۔ وہ ایسے زور اور غصے میں تھا کہ زنجیریں بری طرح جھنجھنا گئیں... دھکے میں چھبلیا اور ذورا تو تقریباً گر ہی گئے تھے۔ بٹھل نے ہاتھ مار کے رگھو سے بندوق چھین لی اور اسی زور میں گھومتے ہوئے دیوار پر دے ماری۔ وہ پھر میری طرف پلٹا۔ میری سانس خشک ہونے لگی۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ وہ اجیت کو پولیس سمجھ رہا تھا۔ اجیت پولیس نہیں تھا اُس کا جانی دشمن تھا۔

”ادھری باغ میں چھوڑ آیا تھا... ٹھکانے کا تول پورا نہیں ہے رے، کچھ نہیں ہے۔“ بٹھل تپتی ہوئی آواز میں بولا۔ اُس کے منہ سے تپش کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ ”رشتے داری رکھنی تھی تو پوری کرتا... یوں بنا کے چھوڑ دیے۔ ادھری کھونٹے سے بھیا کھڑے ہیں نہ باجے لے کے۔ لاڈلے بھیا کا استقبال بولیں گے۔“ بٹھل چنگھاڑ رہا تھا۔ صحن میں سناٹا گونج رہا تھا۔ اجیت آنکھیں پھاڑے بٹھل کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بٹھل کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

”چھوڑ دو رے یہ بلمیاں۔ اُنھی کو بھائیں گی جن کی ہیں۔ پتا نہیں ڈالا ان حرام کے جنوں کو چھبلیا بھیا را!“ بٹھل آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ حوالدار نے زنجیر کا کنڈ چھوڑ دیا تھا، ارادی یا غیر ارادی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ رگھو کے اشارے پر بندوقیں وہیں پھینک دی گئی تھیں۔ باقی سب پیچھے کو سمٹ گئے تھے۔ رگھو اپنی جگہ پر ساکت نظروں سے زیر پا خاک کرید رہا تھا۔ بہت سارے استادوں کے درمیان وہ لکو بن رہا تھا۔ یہ اضطراب اس کے چہرے پر متواتر نمایاں تھا اور مسلسل بڑھ رہا تھا۔ چھبلیا نے کچھ نہیں کہا، وہ خاموش کھڑا دیکھ رہا تھا۔ شاید ایسی پیچیدہ صورت حال سے اُس کا واسطہ پہلی مرتبہ ہی پڑا ہوگا۔ کبھی یوں گمان پڑتا تھا کہ وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا ہے۔ اجیت حیرت سے آنکھیں پھیلائے بٹھل کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے

اُس کی حیرت سمجھ میں آ رہی تھی۔ عام صورتِ حال میں یہ حیرت کی نہیں تھی کوئی بھی شاطر اسی طرح اپنے لیے فضا ہموار کرتا ہے۔ جھلّن نے صحیح ہی تو کہا تھا۔ ہم اس طرح کیا کر سکتے زیادہ سے زیادہ اس گلی محلے ہی سے باہر نکل پاتے۔ پھر دھر لیے جاتے یا مارے جاتے، لیکن اب کوئی مناسب راہ بن سکتی تھی۔ اس پینترے کو معمولی سوجھ بوجھ والا بھی بہ آسانی سمجھ سکتا تھا۔ اس میں حیرانی کی بات نہیں تھی، لیکن اجیت کا معاملہ کچھ مختلف تھا۔ وہ جھلّن کے لیے جو کچھ سوچ چکا تھا۔ اس تناظر میں اس منظر حیرت کو دیکھ رہا تھا۔ لاشعوری طور پر وہ اس شخص کو ٹھیک یاد کیے ہوئے تھا جو اپنے سامنے قتل کے ہم نہ ہونے پر جھگڑ کر رہا تھا۔ یہ میرا قیاس تھا، ممکن ہے کچھ اور وجہ ہو۔ اجیت آنکھیں پھاڑے جھلّن کو تک رہا تھا۔ معاً اسے ہوش آ گیا۔ اُس نے چلّا کر کہا۔ ”بندوقیں اٹھانے کے لیے بھی اجازت چاہیے۔ شریف!“

سپاہی بھی خاموش تماشائی بنے کھڑے تھے۔ معاً صحن میں دونوں طرف بھنبھناہٹ شروع ہو گئی۔ اجیت کی آواز سن کر جیسے سپاہی چونک پڑے اور کھٹا کھٹ سب نے بندوقیں اٹھا کر کندھوں پر ٹانگ لیں۔

”ابھی صاحب آپ بولو! اِدھری بہت سا گند پورا نہیں ہے۔ حساب چکتا کرنے کا تھا، مگر اپنے لڑکے نے کچھ بچا نہیں چھوڑا جو ہم بولتے۔ ابھی آپ بولو صاحب!“ جھلّن نے درمیان میں کھڑے ہو کے کہا۔ عجیب ہی منظر بنا تھا۔ ایک طرف قطار میں پولیس کی جمعیت کھڑی تھی۔ دوسری طرف ہڑبڑاتے ہوئے سینوں کے ساتھ اڈّے کے آدمی چپ سادھے کھڑے تھے۔ ان سے کچھ آگے رگھو چبھتی نظروں سے چوروں اور رگھو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی چھلیا کھڑا تھا۔ چھلیا کی نظریں ایک بھاری ہو رہی تھیں جیسے منوں وزنی پتھروں سے لپیٹ دی گئی ہیں۔ وہ کچھ کر ہی نہ پا رہا تھا۔ وسط میں جھلّن کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے لنگر و رچھے کے پاس زورا، جمرو، لنگو اور دھنیارا۔ مجھ سے آگے انسپکٹر اجیت کھڑا تھا جو جھلّن کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”جھلّن صاحب! آپ کو تھانے جانا ہوگا۔ باقی سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ یہاں جو کچھ ہوا میں اسے فراموش کر کے جا رہا ہوں۔“ اجیت نے دھیمے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ شدت ہو چکا تھا۔ اس کے تاثرات یکسر تبدیل ہو چکے تھے۔ میں وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

”جھلّن تنہا نہیں جائے گا۔“ مجھے معلوم تھا کہ میرے جملے سے جھلّن تلملا جائے گا، مگر کیا کیا جائے۔

”جھلّن اپنی ماں کے ساتھ جائے گا۔ بول اور بول رے... کلیجے میں کچھ بچا نہیں ہے رے۔“ حسبِ توقع جھلّن تھک کے پڑا۔

”بابو صاحب! آپ بھی ان کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ آپ کے علاوہ جو آنا چاہے وہ تھانے آ سکتا ہے، مگر اپنی سواری پر۔“ اجیت کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ حیرت انگیز طور پر اس نے باہر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”جھلّن صاحب چلیں! حوالدار ان کی ہتھکڑی کی ضرورت نہیں، کھول دو۔“

حوالدار نے لرزتی ہوئی انگلیوں سے ہتھکڑی میں کنجی گھمائی اور کھٹاک کر کے ہتھکڑی کھل گئی۔ جھلّن میری طرف دیکھے بنا انسپکٹر اجیت کے پیچھے بڑھ گیا۔ حوالدار نے زورا، جمرو، چھلیا، دھنیارا اور لنگو کی ہتھکڑیاں بھی کھول دیں۔ رگھو وہیں سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ چھلیا اب بھی ویسے ہی کھڑا تھا، اسے اپنی سدھ بدھ نہیں تھی۔ پیسے کے آدمی بکھرے چلے گئے تھے۔ میں بھی فوراً جھلّن کے پیچھے لپک گیا۔ گو اس نے جان لیا تھا کہ میں اُس کے عقب میں آ رہا ہوں، مگر انجان بنا ہوا تھا۔ اڈّے کے دروازے سے بالکل سامنے پولیس کی جیپ کھڑی تھی۔ گلی کے دونوں سروں پر لوگوں کے ٹھٹھ کھڑے تھے۔ چھتوں سے جھانکنے والوں کی کوئی کمی نہ تھی، تاہم اڈّے کے سامنے کوئی نہیں تھا۔ وہاں پولیس کا سخت پہرہ تھا۔ اجیت جیپ میں آگے جا کے بیٹھ گیا۔ جھلّن پچھلی طرف چڑھ گیا۔ میں بھی دوسری طرف سے لپک کے جھلّن کے ہمراہ بیٹھ گیا۔ زورا اور جمرو بھی دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ جھلّن نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا، تاہم اُس نے مجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا، وہ میری موجودگی ہی سے انکاری تھا۔ یہ بھی خواہ مخواہ ہی جھنجھناتا رہتا ہے۔ اسے صحیح صورتِ حال کا علم نہیں تھا۔ میں نے درست قدم اٹھایا۔ سوائے اس کے کوئی اور چارہ جو نہ تھا۔ نہ جانے جھلّن کو دیکھ کے اجیت پر کیا جادو ہوا کہ وہ یک دم رام ہو گیا۔ اور پولیس پہ حملے، پولیس کو یرغمال بنانے جیسے سنگین مقدمات سے بہ آسانی دست بردار ہو گیا۔ جیپ کا انجن جیسے ہی غرغرایا گلی محلے کے لوگ سمٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ جیپ جب گلی سے موڑ کاٹ کے باہر نکل رہی تھی تو چھلیا اور رگھو بھی اڈّے سے باہر نکلتے نظر آئے تھے۔ لوگ بھاگ گھروں میں دبک گئے تھے، جب کہ بچے آخری دم تک جیپ کے پیچھے دوڑیں لگاتے ہوئے آئے تھے۔ بچپن خوب ہوتا ہے، ہر چیز کھلونا لگتی ہے۔ اس کی وجہ کسی نے درست ہی بتائی ہے کہ بچپن خود ہی کھلونا ہوتا ہے۔

راستے بھر کسی نے کوئی کلام نہیں کیا۔ حالاں کہ بیدرات کا کوئی پہر تھا، مگر لوگوں کی چہل پہل دن سے بڑھ کے تھی۔ خبر بڑی ہی تھی۔ رگھو استاد کے اڈّے کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا ہے۔ کون ہوگا جو یہ سن کر متجسس نہ ہوا ہو۔ اب تک اس واقعے کی ہزار داستانیں بن چکی ہوں گی۔ اور لوگ بڑھ چڑھ کے اپنی اختراع کو برحق ثابت کرنے کے لیے بحث و مباحثے سے لطف کشید کر رہے ہوں گے۔ اڈّے کے نام سے جہاں لوگ خوف زدہ ہوتے ہیں وہیں اس کے تذکرے میں بے پناہ طلسم بھی محسوس کرتے ہیں۔ اڈّے کو چھو کر گزر جانے والی ہوا بھی قصّہ پارینہ بن جاتی ہے۔

تھانے تک کا سفر خاموشی سے گزرا۔ جھلّن گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ یہ وہی عمارت تھی جہاں سے آج دن میں جھلّن رہائی پا کر نکلا تھا۔ عمارت کی کھڑکیوں سے ملگجی روشنی باہر آ رہی تھی۔ دروازے پر تعینات سنتری کھڑا اونگھ رہا تھا۔ پہلا روز گزر رہا تھا۔ کہیں کہیں کتّوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرے اندر پھر سے شاکر علی تک پہنچنے کی ہوک جاگ رہی تھی۔ سنتری کو سوتا دیکھ کے ڈرائیور نے جیپ کی رفتار کم زیادہ کرنے والے قدمچے پر پاؤں کچھ زیادہ ہی جوش و خروش سے رکھ دیا۔ انجن تیز آواز سے بول اٹھا۔ سنتری نے ہڑبڑا کے خراماں ابھرا اور جیپ کو سلام جھاڑ دیا۔ اس اثنا میں اجیت جیپ سے اتر کے اندر بڑھ چکا تھا۔ جھلّن اس کے پیچھے اور میں ان دونوں کے پیچھے پیچھے تھا۔ اجیت کے استغنا کا عالم میرے چودہ طبق روشن کیے دے رہا تھا۔ اُس نے پیچھے مڑ کے دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ مختلف راہ داریوں اور عمارتی تقاضوں سے گزر کے ہم اجیت کے کمرے میں پہنچے۔ اجیت اپنی کرسی پر جا کے بیٹھ گیا۔ جھلّن اُس کے سامنے جا کے کھڑا ہو گیا۔ جھلّن کی شکل سے صاف لگ رہا تھا کہ اس کے لیے بھی یا اچنبھے سے کم نہیں ہے۔

”بیٹھیں آپ! یہاں سامنے والی کرسی پر بیٹھیں!“ اُس نے جھلّن سے اپنے مقابل بیٹھنے کو کہا۔

”نہیں صاحب! اِدھری ٹھیک ہے۔ ابھی آپ بولو!“

جھلّن نے تنے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں جھلّن کے عقب میں دروازے کے ساتھ ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

”جھلّن بھائی آپ بیٹھیں! یہ ماحول دوستانہ ہے۔“ اجیت لپک کے اُٹھ آیا تھا اور جھلّن کے شانوں پر ہاتھ رکھ کے اُسے بیٹھنے کو کہا۔

جھلّن خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں وہیں دروازے کے ساتھ لگی ہوئی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اجیت کا رویہ ناقابلِ فہم تھا۔

”ابھی بھید بھاؤ بولو صاحب! سارا اسی اودیچ میں اندر باہر گزر رہا ہے۔ سیدھ نہیں پڑ رہی صاحب!“ جھلّن نے رسان سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں شدید الجھن تھی۔ اجیت کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

”جھلّن بھائی کلکتہ میں ایک علاقہ ہے اشوک نگر... اشوک نگر کے دو علاقے ہیں قاضی پاڑا اور صندل پاڑا...“ اجیت عجیب انداز سے کہتے ہوئے انداز میں جھلّن کی طرف دیکھنے لگا۔

جھلّن کی آنکھوں میں اندھیرا تھا۔ وہ خاموشی سے اجیت کو دیکھ رہا تھا۔ اشوک نگر کا علاقہ کلکتہ کے مضافات میں تھا۔ میں ایک دو بار ہی ادھر سے گزر ہوا تھا۔

”جھلّن بھائی! صندل پاڑا کا شرلی رام آپ کو یاد ہے، جس کی اشوک نگر چوک پر پان بیڑی کی دکان تھی۔“

معاً جھلّن کی آنکھوں کے دیے روشن ہو گئے۔ وہ زیرِ لب کچھ بڑبڑانے لگا۔ ”ہاں یاد ہے۔“

”میں اسی شرلی رام کا بیٹا ہوں۔ جیت رام۔“ اجیت نے مختصراً جملہ ادا کیا، مگر اس میں بھی اُس کی آواز رندھ گئی۔ وہ ہڑبڑنے لگا۔ جھلّن حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُس کے نقوش پڑھ رہا تھا۔ معاً جھلّن وارفتگی سے اٹھا۔ پھر تو گویا کمرے کی دیواریں لرز گئیں۔ جھلّن نے کچھ ایسے زور سے اجیت کو کرسی سے کھینچ کے بھینچا تھا کہ مجھے بھی جیت پر رشک آ گیا۔ میری آنکھوں کے کولے چرمرانے لگے۔ جیت بچوں کی طرح جھلّن سے چمٹا ہوا بلک رہا تھا۔ جھلّن

برف کی طرح چپ چاپ پگھل رہا تھا۔ کچھ دیر اُس نے اجیت کو یونہی پڑے رہنے دیا۔ اجیت کے باپ شرلی رام سے بٹھل کا کوئی خاص تعلق نہ تھا، تاہم میں شرلی رام سے متعلق نہیں جانتا تھا۔ یہ قصہ بٹھل سے میری ملاقات سے قبل کا لگتا تھا۔ کچھ ہی دیر میں ہم یوں بیٹھے تھے جیسے صدیوں سے ایک دوسرے سے واقف ہوں۔ بٹھل بس کی بل میں پیتا تھا، کھلتا تھا۔ بٹھل اس سے اس کے بارے میں پوچھتا رہا۔ وہ بٹھل سے سوالات کرتا۔ میں بھی بیچ میں گاہے گاہے ان کی گفتگو میں شریک ہو جاتا۔ گھنٹوں گزر گئے پتا ہی نہ چلا۔ ان کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ شرلی رام شیام بازار کا نامی گرامی دادا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب بٹھل ابھی استادوں کی بجا آوری میں مشغول تھا اور کلکتے میں دھیرے دھیرے اپنا نام بنا رہا تھا۔ شرلی کے ایک آدمی سے بٹھل کا تنازعہ ہو گیا۔ بٹھل نے اس کی ران کھول دی۔ بٹھل کا نام اس سے قبل کئی مرتبہ شرلی رام تک پہنچ چکا تھا۔ شرلی اس نورسیدہ شعلے سے ملاقات کا خواہش مند تھا، تاہم پہل کرنا خلافِ شان سمجھتا تھا۔ بٹھل نے جب اس کے آدمی کو لٹا دیا تھا، بٹھل سے جواب طلبی اب چوکی کا استحقاق بن گئی تھی۔ بٹھل تھا کہ چھلاوے کی طرح غائب تھا۔ شرلی رام کے آدمی بٹھل کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ ایک دن بٹھل خود شرلی رام کے پاس پہنچ گیا۔ بٹھل نے چاقو کھول لیا۔ شرلی رام کی شتی کا زمانہ معترف تھا، اور بٹھل گلی کا لونڈا تھا۔ شرلی رام کو چھوکرے کے تیور شاہانہ لگے تھے۔ وہ میدان میں اتر آیا۔ شیام بازار کے اڈے والوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، جب کلکتے کے نامی گرامی استاد کو بٹھل نے اپنے داؤ کی زد سے دانستہ رعایت دی تھی۔ ایک مرتبہ تو شرلی رام فرشِ خط کھا گیا تھا ورنہ جھونک میں آگے گزر گیا تھا۔ اس کی پشت بٹھل کی طرف تھی اور بٹھل کے پاس مہلت ہی مہلت تھی۔ بٹھل نے کمال بے نیازی سے چاقو فضا میں اچھال کے دوسرے ہاتھ میں دبوچ لیا تھا۔ چھوکرے کے ہاتھ برق کی طرح لپکتے تھے۔ جب شرلی رام پلٹا تو بٹھل نے اپنا چاقو اس کے قدموں میں پھینک دیا۔ بٹھل کے انداز ہی نہیں اطوار بھی شاہانہ تھے۔ بٹھل پلٹ کے جانے لگا تو شرلی رام ایک نعرۂ مستانہ مار کے اُس سے لپٹ گیا۔ اس جوان نے اُسے پچھاڑ دیا تھا، بس جیت لیا تھا۔ شرلی رام اُس وقت چوکی چھوڑنے پر مصر تھا، مگر بٹھل نے اُسے جتا دیا کہ اُس کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ استاد شرلی رام کی دل سے قدر کرتا تھا۔ استاد کا نیاز مند ہی رہنا چاہتا ہے۔ بٹھل کا مقصد بس یہ باور کرانا تھا کہ استاد کے آدمی کی غلطی تھی۔ ادھر استاد بٹھل کو نظروں سے دور کرنے پر آمادہ ہی نہ تھا۔ ایسے شاہکار قدرت کم کم ہی بناتی ہے۔ یوں بٹھل اور استاد شرلی رام کی واقفیت ہوئی۔ بہت تھوڑے ہی عرصے میں دونوں کے تعلقات گہری انسیت میں تبدیل ہو گئے۔ تجربے ساجھے ہونے لگے۔ اس دوران بٹھل کے علاقے بڑھتے چلے گئے۔ اس کی قلم رو علی پور سے لے کر سامن گھاٹ تک پھیل چکی تھی۔ اردگرد کا پورا علاقہ بٹھل کے نام سے لرزنے لگا۔ بٹھل کا شرلی رام سے میل ملن ذرا کم ہو گیا۔ ایک دن بٹھل کو اطلاع ملی کہ شرلی رام قاضی پاڑے کی ایک بیوہ استانی کو دل دے بیٹھا ہے۔ چوکی چھوڑ کے دن رات قاضی پاڑے کے پھیرے لگاتا رہتا ہے۔ قصہ کچھ یوں تھا، ایک دن شرلی حسبِ معمول اڈے کے باہر چارپائی لگا کے بیٹھا ہی تھا کہ سرخ و سپید رنگت، گداز بدن اس پر سپید ساڑی میں ملبوس ایک جوان خاتون طنطنے سے ہوئی وہاں وارد ہوئی۔ وہ غصے سے بھری ہوئی تھی۔ وہ سیدھی شرلی کے پاس آئی اور باوقار انداز میں اُسے لتاڑنا شروع کر دیا۔ کلکتے میں سرخ و سپید رنگت شاذ و نادر ہی نظر آتی تھی۔ وہ حسن و جمال کا باوقار پیکر ہی تھی، مگر اس کی اصل خوب صورتی جو شرلی کو بھائی تھی وہ اس کا طنطنہ تھا۔ غصے میں لال بھبوکا چہرہ، پیشانی پر خطاطی کا شاہکار باریک سلوٹیں۔ بھرے بھرے بدن پر کسی ہوئی ساڑھی۔ اُس نے بھری گلی میں شرلی رام کو ننگِ خاندان جیسے القابات سے نوازنا شروع کر رکھا تھا۔ وہ شیام بازار اپنے رشتے دار کے ہاں آئی تھی۔ ایک اچکا اُس کا بٹوا لے اڑا تھا۔ وہ پوچھتے پچھاتے یہاں تک پہنچی تھی۔ بٹوے میں نقدی، گہنے اور کچھ اہم کاغذات تھے۔ اُس نے سرِعام شرلی رام کو دھمکی دی کہ اگر اس کا بٹوا واپس نہ لوٹایا گیا تو یہیں آتما ہتیا کر لے گی۔ اڈے والوں کے نتھنے پھیلنے لگے تھے، مگر شرلی رام اُسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ شرلی رام کے کہنے پر پوچھ تاچھ شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خاتون اپنا نام پتا بتائے بغیر وہاں سے اپنا بٹوا لے کر جا رہی تھی، مگر اس کے ساتھ بٹوے کے علاوہ ایک قیمتی چیز شرلی رام کا دل بھی تھا جو اس کے قدموں سے لپٹا ہوا ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ شرلی رام نے اُس کے پیچھے ایک آدمی دوڑا دیا۔ جو شام کو واپس آیا۔ وہ اس خاتون کا نام پتا نکال لایا تھا۔ وہ قاضی پاڑے میں رہتی تھی، ایک جولاہے کی بیٹی تھی۔ منڈل پاڑے کے سرکاری اسکول میں پڑھاتی تھی۔ دو برس قبل اس کا بیاہ منڈل پاڑے کے رہائشی سریش کرور سے ہوا تھا جو صرف چھ مہینے بعد ہی چل بسا تھا۔ استانی کا نام روپا کرور تھا اور وہ قاضی پاڑے میں اپنے باپ کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ بہت سے اس سے بیاہ رچانے کے آرزومند تھے، مگر روپا کرور پکی دھرم واسی تھی۔ وہ اگلے جنم میں بھی سریش کرور کے ساتھ ہی جیون بتانے پر یقین رکھتی تھی۔ شرلی رام نے یہ کتھا سنی تو سلگتے ہوئے دل کو بجھانا چاہا، مگر دل تھا ہی نہیں۔ دہکتا آتش فشانی خلا تھا۔ شرلی رام نے وہاں کے پھیرے لگانے شروع کر دیے۔ روپا کرور نے اُسے بری طرح جھڑک دیا۔ وہ دوسرے بیاہ کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور وہ بھی ایک لچے لفنگے بدمعاش سے۔ ادھر شرلی رام کی آگ بھڑکتی چلی گئی۔ وہ دیوانہ ہو کے قاضی پاڑے اور منڈل پاڑے کے درمیان گھومنے لگا۔ اڈے کے آدمی اس کے پیچھے رہتے تھے، اس بنا پر اس سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا۔ اس نے اپنے کارندوں کو ہاتھ جوڑ جوڑ کے کہا وہ اس کے پیچھے نہ آیا کریں۔ اپنا کوئی اور استاد ڈھونڈ لیں۔ شرلی رام میں کوئی بات تو تھی، بٹھل نے یونہی اُس کے سامنے چاقو نہیں پھینک دیا تھا۔ اڈے والے اُس کے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے اور وہ روپا کرور کا دیوانہ ہو رہا تھا۔ آخر ایک دن روپا کرور کا دل پسیج گیا۔ وہ بھی جہاں دیدہ خاتون تھی۔ اس نے شرلی سے کہا کہ اگر وہ شرافت کا کوئی کاروبار کر دکھائے تو وہ اس کے بارے میں سوچ سکتی ہے۔ کاروبار سے مراد یہ ہے کہ اس میں اڈے پاڑے کی کمائی کا ایک دھیلا بھی نہیں ہونا چاہیے۔ خواہ وہ جھاڑو ہی کیوں نہ لگا لے۔ شرلی کی دیوانگی کا روپا کرور نے غلط اندازہ لگایا تھا۔ شرلی رام کے ہاتھ میں ماں کا دیا ہوا کڑا تھا۔ وہ اُس نے اونے پونے بیچا اور روپا کرور کے اسکول کے سامنے پان بیڑی کی دکان کھول لی۔ یہی وہ دور تھا جب بٹھل کو اس معاملے کی بھنک پڑی تھی۔ وہ دوڑا دوڑ منڈل پاڑے پہنچا۔ استاد شرلی رام کو گلوریاں بناتے دیکھ کر بٹھل آب دیدہ ہو گیا۔ کہاں وہ ذی شان، ذی وقار رعب دار استاد شرلی رام جس کے نام کی گونج سے پورا کلکتہ دھمکتا تھا اور کہاں یہ تانبے کی کٹوریوں میں شاخیں گھمانے والا شرلی پان بیڑی والا۔ بٹھل نے استاد شرلی رام کی صورت دیکھ کر ہی تمام حجتیں اپنے سینے میں دفن کر لی تھیں۔ استاد کے پاس کچھ دیر بیٹھ کے واپس آ گیا تھا۔ البتہ جب استاد نے بنارسی پان بنا کر اس کے گلے میں مشاقی سے ٹھونسا تو بٹھل سسک رہ گیا۔ بلک بلک کے رو پڑا۔ روپا کرور نے استاد سے بیاہ کر لیا اور وہ منڈل پاڑے میں شرلی کے ساتھ کرائے کے مکان میں اُٹھ آئی۔ بٹھل گاہے گاہے چکر لگایا کرتا تھا۔ استاد کے بیٹا پیدا ہوا تو بٹھل مٹھائی کے ٹوکروں سے لدا پھندا وہاں پہنچا تھا۔ روپا کرور نے وہ سارے ٹوکرے گلی میں پھنکوا دیے تھے۔ بٹھل استاد کو دیکھ کر چپکا ہو رہا۔ بٹھل بھی آتا جاتا رہا اور یوں کئی سال بیت گئے۔ شرلی رام اپنی دنیا میں مگن ہو گیا تھا۔ بٹھل کو شرلی رام کی یاد آئے دل ستانی خوب بھاتی تھی۔ استاد سے اس کا دل لگ گیا۔ استاد کا بیٹا اجیت بٹھل کو چاچا کہہ کر بلاتا تو بٹھل کو بھلا لگتا تھا۔ روپا کرور کو بٹھل اور اڈے کے دوسرے افراد کا استاد کی مزاج پرسی کو آنا سخت ناپسند تھا۔ ایک دن صبح استاد کی دکان جب نہیں کھلی تو لوگوں کو پتا چلا کہ شرلی رام پان بیڑی والا اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ دکان مکان چھوڑ کے نامعلوم منزل کی طرف نکل گیا ہے۔ اس کے بعد بٹھل کو شرلی رام کا پتا نہیں چلا کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اجیت نے بتایا کہ ولواڑا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس کے قریب ہی ایک شہر ہے اُنّاؤ، وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ وہیں مقیم ہے۔ اس کی ماں حال ہی میں پنشن پر آ گئی۔ یہ عشق بھی کیا کیا کام کروا دیتا ہے۔ شرلی رام نے گزارے لائق لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا اور ڈاکیے کی سرکاری نوکری کر رہا تھا۔ اجیت کا کہنا تھا کہ پہنچتے ہی وہ انھیں گھر لے چلے گا۔ جیپ میں گھنٹے بھر کا سفر بھی نہیں ہے۔ اس کا باپ بٹھل کو دیکھ کر باغ باغ ہو جائے گا، تاہم بٹھل نے جواب میں ہنکارا ہی بھرا تھا۔ بارودیہ کا قصہ چلا تو بٹھل نے بتایا کہ بارودیہ کو انھوں نے زندہ سلامت واپس کیا تھا، تاہم اجیت نے اس بات کی تصدیق کی کہ بارودیہ ہلاک ہو چکا ہے۔ اجیت نہ صرف بہ حیثیت پولیس آفیسر بارودیہ کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہے، بلکہ اجیت کی اخلاقی ہمدردیاں بارودیہ کے ساتھ ہیں۔ اجیت کا کہنا تھا کہ بدیشی لوگوں سے دھرتی کو آزاد کروانے کی جنگ میں وہ بارودیہ کے ساتھ ہے۔ اجیت نے اعتراف کیا کہ وہ بٹھل کو بال بال ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ گلاری کے

مطالبے والی کہانی اجیت کی بنی بنائی گھڑی ہوئی تھی۔ پولیس اور گلاکی کے درمیان رابطہ اجیت ہی تھا۔ اجیت نے اپنے افسران کو باور کروایا تھا کہ بھل کی گرفتاری ازحد ضروری ہے، جب کہ بابر کی رہائی سے بیٹے پر اور رنجیت دل سے دباؤ ڈالا گیا تھا۔ اس حوالے سے مزید گفتگو کرنے میں اجیت نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ہم نے بھی کریدنا مناسب نہ سمجھی۔ اس کی جانب سے ہم دلواڑہ میں آزادانہ نقل و حرکت کے دریعوں سے جانے کے لیے آزاد تھے، تاہم ہمیں دلواڑہ میں گلاکی کے لوگوں سے محتاط رہنا ہوگا۔

باتوں میں خبر بھی نہ ہوئی اور صبح ہوگئی۔ جیت بچھا جا رہا تھا۔ گفتگو کے دوران اس نے نہ جانے کیا کیا الم غلم منگوا لیا تھا۔ جو ہم ڈھیر سے ڈھیر سے ٹونگتے رہے تھے۔ جانا بھی بچیا نہیں تھا کہ جیت اٹھ کھڑا ہوا۔

"بھل چچا، اب باقی باتیں پتاجی کے ساتھ کریں گے۔ یقین جانیں وہ بہت آؤ بھگت کریں گے۔"

"نہیں رے۔ پھر کبھی آئیں گے تو ادھر بھی چکر لگا دیں گے۔ ابھی جانے دے۔" بھل نے جیت سے نظریں پھیرتے ہوئے کہا۔

"نہیں چچا یہ کیسے ممکن ہے۔" جیت اچھل پڑا۔ اس کے پاؤں میں جھنجھلاہٹ الجھ گئیں۔

"ممکن وہ بھی نہیں تھا جو شرلی استاد نے ٹھونک دیا رے۔" بھل نے دھیرے سے کہا اور باہر نکلنے کے لیے مڑ گیا۔ اجیت دوڑ کے سامنے آگیا۔ "پتاجی کو پتا چلے گا تو وہ مجھے گھر میں گھسنے نہیں دیں گے۔" اجیت مچل مچل رہا تھا۔

بھل نے شگفتگی سے راستہ بنایا اور پیچھے مڑے بنا کہا۔

"ہمیں تیری ماں نہیں گھسنے دے گی رے۔" بھل کے لہجے کا کرب تھا کہ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ عجیب دیوانگی سے اپنا سر جھٹکاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ اجیت کو سکتہ ہو گیا تھا۔ اس کی زبان کسی نے نوچ لی تھی۔ مجھ سے ٹھہرا نہ گیا کہ جیت کی دل جوئی کرتا۔ میں بھی بھل کے پیچھے آ گیا۔ منشی کے کمرے میں چھلیا، رکھو، بھرو اور رزورا بیٹھے تھے۔ ان کی شکلوں پر رتجگے کا نوشتہ سجا تھا۔ چھلیا لپک کے اٹھا اور بھل سے لپٹ گیا۔ بھل اسے لے کے خاموشی سے باہر نکل گیا۔ وہ بے جان مٹی کے پتلے کی طرح چل رہا تھا۔ بھل کے شانے کتنے ڈھلک گئے تھے۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا۔ شاید میرے کسی ادعا میں کوئی نقص تھا۔ میں اس سے کچھ نہیں پاتا تھا۔ سائلوں کی طرح یوں گلی کوچوں میں اس کی خواری مجھ پر بھی گراں بار ہے۔ ایک حد تک ہی آدمی آدمی کے ساتھ چل سکتا ہے۔ ایک حد تک ہی کسی کو دوسرے کے بوجھ میں شریک ہونا چاہیے۔ میں غلط ہی کیا سوچ رہا تھا۔ میں نے دیکھا تھا زریں کے پاس پہنچ کے بھل کے چہرے پر کیسا سکون چھا جاتا ہے۔ زریں تو واقعی کوئی شجر سایہ دار ہے۔ وہاں جا کے بھل زریں کے اشاروں کا منتظر رہتا تھا۔ آدمی کو جہاں تسکین قلب میں آسودگی ملے، بھل کے لیے زریں کی حویلی بھی ایسی ہی جگہ تھی۔ وہاں جا کے وہ کوئی دوسرا آدمی ہوتا۔ اس درخت میں ایک نئی کونپل پھوٹ جاتی۔ اس نے اڈا ترک کر دیا تھا۔ جہاں ایک عرصے سے اس کی حکومت قائم تھی۔ ایک نظر غلط پر پروانے فدا ہو جاتے تھے۔ اس نے اڈے کے ان ساتھیوں سے کنارہ کر لیا تھا جو غلاموں کی مانند اس کی جنبش ابرو کے اسیر تھے۔ اپنے ساتھ مجھے اس کی ہر وقت بے آرامی کا احساس رہتا تھا۔ مجھے بھی تو اس کا خیال کرنا تھا، اس کی خاطر داری میری لیے بھی مطلوب خاطر تھی۔ میں بھی کچھ اس سے کہنا چاہتا تھا، مگر لفظ کہیں کھو گئے تھے۔ شاید مجھے اس کی دل برداشتگی اور ناراضی کا خدشہ تھا۔ مجھ پر [illegible] واضح نہیں تھا کہ میری منشا کیا ہے؟ میں چاہتا کیا [illegible] میری امید میں اب پہلے سا اضطراب نہیں رہا تھا۔ [illegible] اب بہت سوں میں تقسیم ہو گیا تھا، مگر ایسا بھی نہیں تھا۔ یہ مولوی صاحب ہی تھے جو مجھ سے دامن کشا رہنا چاہتے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ جہاں جہاں ہم ان کے قریب ہوا چاہتے ہیں وہ ہم سے دور چلے جاتے ہیں۔ وہ کسی ایک جگہ کے ہو کر بھی نہیں رہتے۔ نہ جانے ان کے ساتھ کیا مسئلہ درپیش ہے جو ہر وقت اڑے اڑے پھرتے ہیں۔ ہاں، اس میں ان کا بھی کیا قصور۔ ان کے تو ہوائے بہار ہم رکاب تھی۔ جس کی خوش بو بھلا چمن سے چھپائے کہاں چھپتی ہے۔ یہ بھی نہیں تھا کہ ہم ناکام رہے ہوں۔ کئی جگہ بس آگے پیچھے کی بات ہو گئی۔ ہم ان کے گھروں تک پہنچ گئے تھے جہاں ان کا قیام رہا تھا۔ مراد آباد، نگریا سادات، صدر آباد اور اب یہ دلواڑا۔ انہیں دلواڑا جیسے الگ تھلگ مقام پر آنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ یہاں بھی نہیں تھا۔ پھر یہاں بھی بس نہیں کی کہیں اور نکل گئے۔ اب بمبئی کی خبر ہے۔ وہاں بھی کہاں ہوں گے، وہاں کی کھوج بھی نکل ہی جائے گی، وہ وہاں سے آگے نکل جائیں۔ بس وہ آگے آگے دوڑتے رہیں گے اور ہم ان کے پیچھے پیچھے۔ بھل کو میں کیسے بتاتا کہ ان کے ساتھ رہتے ہوئے بھی میں کیسا تہی رہتا ہوں۔ کیسی آگ میرے اندر بھڑکتی ہے۔ کیسے کیسے انگارے مجھے دہکاتے رہتے ہیں۔ میرے سینے میں مسلسل ہوک سی اٹھتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ دیواروں سے سر پھوڑ لوں۔ اپنا منہ نوچ لوں۔ کسی ویرانے میں گھر کر لوں۔ کوئی میری پرسش نہ کیا کرے۔ کوئی زخموں پر مرہم نہ رکھا کرے۔ میں کب چاہتا ہوں کہ کوئی میری آگ میں جلے۔ میں کوئی پاگل نہیں ہوں۔ میرے حواس میرے ساتھ ہیں جو میرے ساتھ دبا جائے۔ نہ پنگوڑے میں کھیلتا کوئی بچہ ہوں جسے بروقت تنبیہ سخت کی ضرورت ہو۔ میں مخبوط الحواس تو نہیں ہوں۔ مجھے اپنے اچھے برے کی خوب تمیز ہے۔ کالا پیلا رنگ پہچان لیتا ہوں۔ سچ دیکھتا ہوں۔ سچ سنتا ہوں، لیکن میں کیا کروں سب کچھ میری استعداد میں بھی تو نہیں ہے۔ میں خود کو بہت روکتا ہوں، خوب ٹوکتا ہوں، خود کو سمجھاتا ہوں۔ میری استطاعت بس اس قدر ہے۔ آدمی بہت محدود ہے۔ بس ایک دائرے میں سننے اور سمجھانے کی دنیا ختم ہے۔ یہ دنیا آدمی سے بہت بڑی ہے۔ ایک دنیا میں رہ کر مستزاد یہاں تو ہر چیز آدمی سے بڑی ہے۔ یہاں [illegible] کوئی شمار نہیں، کوئی حد و حساب نہیں۔ بے شمار اس کی سمتیں ہیں۔ بے پناہ اس کے فاصلے۔ کون ہے جو ان فاصلوں اور سمتوں کو عبور کر سکتا ہے۔ جنبش تو بقدر استطاعت ہی کی جا سکتی ہے۔ جیل سے آنے کے بعد میں نے کوئی لمحہ نہیں گنوایا۔ میں تو بھٹکتا ہی رہا۔ میں جو نظر آتا ہوں وہ بھلا کہاں ہوں۔ ایک آدمی کا اندرون کسی کو کیا نظر آ سکتا ہے۔ بھل کو جو نظر آتا ہے وہ اتنا نہیں جتنا میں خود سے نبرد آزما ہوں۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ بے شک زریں کا خیال میرے لیے لطف و راحت کا باعث بنتا ہے، لیکن جانے کیوں جب وہ سامنے آتی ہے تو کہیں سے گورا بھی چپکے سے اس کے پہلو میں آ کے کھڑی ہو جاتی ہے۔ پھر میری آنکھیں کہاں میری رہتی ہیں۔ انہیں کوئی انگاروں کے دام خرید لیتا ہے۔ میرا سینہ گھٹنے لگتا ہے۔ بھل سے میں کیا کہوں، فیض آباد میں زریں کی حویلی ہو یا بمبئی میں ابا جان کا عالی شان مکان۔ میں اس کے ساتھ ہلکورے لیتی کشتی میں سوار ہوں اور وہ دل نشین نہایت بلیغ، شائستہ اور تر آفریں پیرائے میں گفتگو کر رہی ہو۔ وہ جولین ہو جس کی معیت میں زریں جیسی ٹھنڈک اور جذب و کیف ہے، میں کسی سراپا عنایت لطف و کرم شخصیت کے سامنے ہوں یا کسی حقیر نظر اور خوش نما نظر کے سامنے میرا دل بہت جلد گھبرانے لگتا ہے۔ میں تو مسلسل اس کی آوازیں سنتا ہوں۔ جیسے وہ مجھے پکار رہی ہو۔ میری طرح سے وہ آزردہ ہو۔ کوچہ گردی کے اس کاروبار میں ایک طمانیت تو ہے۔ ایک امید پوشیدہ تو ہے کہ ایک نہ ایک دن میں اس کے پاس پہنچ سکتا ہوں، لیکن یہ بھل آخر کب تک اپنی جان جلائے گا۔ جیسے میں جل رہا ہوں، کیا یہ بھی جل رہا ہے؟ اسے کسی چیز کی جلن ہے۔ اسے اب کیسا ٹھکانا کرنا ہوگا۔ مجھے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب ہم منزلیں مارتے ہوئے اڈے پر پہنچ چکے ہیں۔ گلی محلے کے معززین اڈے کے دروازے پر ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ بھل پژمردگی سے بے حال ہوا جاتا تھا۔

لوگ اچھل اچھل کے مبارک بادیں دے رہے تھے۔ اچھا بھلا ہجوم امڈ آیا تھا۔ اڈے کے اثر و رسوخ کی دھاک سب کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی۔ پولیس کا تا بڑا چھاپا اور وہ بھی ناکام۔ لوگ خوش تھے، لوگ تب بھی خوش تھے جب ہمیں لے جایا جا رہا تھا۔ لوگ سب مسرت آگیں جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ لوگوں کا کام ہی خوش ہونا ہے۔ کسی کا غم ہو یا دکھ یہ اس میں سے مسرت کشید کرنا جانتے ہیں۔ ہمیں دروازے پر ہی روک لیا گیا تھا۔ کچھ شیخے ہار لے آئے تھے۔ کوئی پل تھا کہ میں برافروختہ ہو جاتا۔ بٹھل کو تنہائی درکار تھی اور کچھ مجھے بھی۔ دو پا کرور کے تذکرے پر سے چڑ کا خوب لگا تھا۔ گھر کی قدر و قیمت تو بے گھر ہی جانتے ہیں۔ جب اُس نے کہا تھا کہ تیری ماں تجھے گھر میں نہیں گھسنے دے گی تو کم مائیگی کا احساس کیسے چمکتے ہوئے زرد کی طرح چھلکا تھا۔ زبان سے کہا حقیر نہیں ہوتا۔ بادشاہ سے فقیر ملنے سے انکار کر دے تو بادشاہ دو کوڑی کا نہیں رہتا۔ خواہ وہ فقیر کے ٹکڑے چیل کوؤں کو کھلا دے، بادشاہ کم مائیگی کا احساس مٹا نہیں سکتا۔ بٹھل کو اس احساس نے توڑ دیا تھا۔ کیسی زردی سمٹ آئی تھی اس کے نقوش میں، اب اس کا سلگتا ہوا جنگل نظر آتا تھا۔

ہم بمشکل اندر پہنچے۔ بٹھل کے لیے دالان میں چارپائی کھینچ دی گئی۔ چھلیا نے اندر پہنچتے ہی چیخ و پکار شروع کر دی تھی۔ رگھو بہ دستور بجھا بجھا اور پژمردہ تھا۔ بٹھل چارپائی پر بس گر ہی گیا۔ دھیرا دوڑ دوڑا گیا اور حقہ سلگا دیا تھا۔ تازہ خمیر کی وہ مہک جس کا بٹھل شیدائی تھا خوب اٹھ رہی تھی۔ دھیرے نے مشفق نے بٹھل کی طرف بڑھا لی، مگر اُس نے بے دلی سے دھیرا کا ہاتھ جھٹک دیا۔ بٹھل کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تنہائی کا کوئی رفیق تو اُسے رکھنا تھا۔ اس وقت حقہ پی لینا چاہیے تھا، مگر وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ شاید اپنا گھر دیکھ رہا تھا۔ زریں کا گھر۔ جو اُس کے بازوؤں میں شیر خواروں کی طرح تھی۔ مجھ سے اور دیکھا نہ گیا۔ میں اندر کی طرف بڑھا تو رگھو میرے پیچھے آ گیا۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آیا۔ میں اندر جا کے ایک طرف پڑ گیا۔ اُس نے بھی مجھ سے معترض نہیں کیا۔ درد مشترک ہو تو زبان عذر لنگ کی سی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی کچھ خود بہ خود ہی کہے، بنا سنے ہو جاتا ہے۔ سن بھی لیا جاتا ہے، سنا بھی دیا جاتا ہے۔ رگھو مجھے کمرے میں چھوڑ کے خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اور اس کے باہر نکلتے ہی دروازہ کھلنے کے چھن سے دو در آئی۔ وہ صد فیصد گوری ہی تھی۔ میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا تھا۔

دن ڈھلے تک میں بے خبر پڑا رہا۔ دھیارا نے مجھے آ کے اٹھایا۔ بٹھل نے بلوایا تھا۔ دھیارا نے بتایا کہ بٹھل میں جھنک رہا تھا۔ میں نے اُسے منع کیا کہ بخار کا ذکر باہر کسی سے نہ کرے۔ میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ صحن کا رنگ روپ ہی بدلا ہوا تھا۔ گلاب کی خوشبو چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ صحن میں سفید چاندنی بچھی تھی۔ دیوار کے ایک طرف عنابی گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے تو دوسری دیواروں پر سنہری پتوں کی بل کھاتی ہوئی جھالریں جھول رہی تھیں۔ قندیلوں سے روشن فیاضی سے پھوٹ رہی تھی۔ ادھر سے اُدھر، اُدھر سے ادھر کارندے دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ درمیانی تکیے پر ٹیک لگائے بٹھل راجا بنا بیٹھا تھا۔ یہ وہ صبح والا بٹھل نہیں تھا۔ پژمردہ و ویران کھنڈر۔ بٹھل نے کورے لٹھے کا سفید کرتا پاجاما زیب تن کر رکھا تھا۔ خوب نکھرا اور اُجلا اُجلا لگ رہا تھا۔ نوابین کے سے وقار سے سنہری نے بار بار منہ سے لگاتا چھوڑتا بھلا لگ رہا تھا۔ اس کے برابر میں چھیلا تھا۔ سرخ چغہ پہنے گرتے اور سفید پاجامے میں ملبوس۔ اس کے دائیں رگھو بیٹھا تھا کھویا کھویا سا۔ بائیں طرف ایک جگہ خالی تھا۔ غالباً مجھے وہاں بیٹھنا تھا۔ سامنے ہی جمرو، زورو، دو جیسے تھے۔ دھیرا بٹھل کے پاؤں داب رہا تھا۔ بٹھل بڑے استغنا میں یوں بیٹھا تھا جیسے دھیرا اس کے پاؤں نہیں، بلکہ کسی بھگوان کے پوتر قدموں کو دھو رہا ہے۔ ان کے سامنے میووں سے بھرے تھال رکھے تھے۔ بادام، پستے، الائچی، سونف، بتاشے، ایک تھال میں چاندی کے ورق میں گتنی گلوریاں پڑی تھیں۔ ان سے آگے ساز اور کلاونت شوخ زرد رنگ کے کرتوں پاجاموں اور سیاہ رنگ کی واسکٹ میں ملبوس بے چین و مضطرب بیٹھے تھے۔ سارنگی نواز سوت سے رخصہ صاف کر رہا تھا۔ یہیں تیرگی میں ایک چاند بھی چمک رہا تھا۔ تکلف میں کاڑھے گئے گھونگھٹ سے جھلکتا سفید چہرہ، تیکھی اور کجلائی آنکھیں، اونچی پیشانی، اس پر چھیڑ چھاڑ کرتی ایک آوارہ لٹ، خط کشیدہ مژگان کے درمیان ایک ننھی سی بندیا۔ مؤدبانہ خم سے جھکی ہوئی گردن، وہ بڑے رچاؤ سے بیٹھی تھی۔ نہ جانے کس نے بالا خانوں میں یہ اُڑا دی تھی کہ غزل سہاؤ از بیدو حسین لگتا ہے۔ وہ بھی سہمی سہمی سی بیٹھی تھی۔ چھلیا نے بازار گرم کر رکھا تھا۔ جسے دیکھ کر سب کے چہرے کھل پڑے۔

"ہم بھی سوامی جی ادھر آنے کا ہے۔" میں زورا کے پاس بیٹھنے لگا تو چھلیا نے آواز لگائی۔ وہ خوب ترنگ میں تھا۔ میں بٹھل کے برابر جا کے بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی چھلیا نے پاس بیٹھے ایک بڑے میاں کو اشارہ کیا تو انھوں نے بانسری اٹھائی کہ بانسری گنگنانے لگی۔ نہ جانے وہ کون سی دھن تھی جو بڑے میاں نے بانسری سے چھیڑی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں تماشا بین بے حال ہونے لگے۔ ایک سانس کرتا تو دو دو سر اٹھا دیتے۔ دوسرے پر تیسرا۔ بٹھل بھی سر دھننے لگا۔ چھلیا دو گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر جھوم رہا تھا۔ بڑے میاں کی آنکھوں سے پانی رسنے لگا تو انھوں نے دھیرے دھیرے بانسری کو زمین پر اتارنا شروع کر دیا۔ پھر تو جیسے سب کچھ طے تھا۔ دھیرا نے تھاپ دی اور وہ شرمیلی ادا سے بل کھاتی ہوئی اٹھی۔ اُدھر ڈھولچی نے ہاتھ رد کے ادھر اس کے پیروں میں جھنجھرا جنا چھن، چھن چھن، چھن چھن چھن کرنے لگے۔ رقص کر رہی تھی کہ شاعری۔ اُس کے اعضا کی حرکت میں بے باکی اور شرماہٹ کا عجیب بیڑوں کا... اس نے مقامی زبان میں نغمہ چھیڑا۔ سچ کہا ہے کسی نے موسیقی کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ یہ ہر زبان کی زبان ہے... سب سمجھتے ہیں۔ یہ سب کو بھاتی ہے۔ یہ سب کی ہے۔ کچھ دیر قبل بانسری نواز بڑے میاں کا جادو چل رہا تھا اور گمان تھا کہ اس سے خوب بھی جاتا ہوگا۔ اب لگتا تھا کہ بڑے میاں نے وقت ہی گنوایا۔ وہ مغنیہ ایسی تھی کہ سنا کیجیے، رقاصہ ایسی کہ بس دیکھا کیجیے۔ ڈھولچی کی تھاپ سے تو گویا اس کے قدموں کی ڈور بندھی تھی، مجال ہے کہ تھاپ سے ایک جھنکار بھی زیادہ بج سکے۔ وہاں تو ہنگامہ برپا ہو گیا۔ سب سے پہلے جھومتا ہوا چھلیا اٹھا۔ پھر تو سبھی مچلنے لگے۔ زورا تڑپ تڑپ جا رہا تھا۔ نوٹوں کی گڈیوں پر گڈیاں کھلنے لگیں۔ خدام سے زپیا سمیٹا نہیں جا رہا تھا۔ آخر چھلیا نے ہاتھ پکڑ کے بٹھل کو بھی گھسیٹ لیا۔ بٹھل نے بھی ٹھمکے لگانے شروع کر دیے۔ رات گئے تک ہنگامہ چلتا رہا۔ رقاصہ تانگا ہے ہو لی گئی تھی۔ وہ جس تانگے میں آئے تھے واپسی کے لیے بھی اسی کو پابند کر دیا گیا تھا۔ اب اس تانگے والے کو جلدی تھی، ورنہ یہ مجرا صبح تک ہی چلتا۔

میں صبح تک جاگتا ہی رہا۔ میں نے رگھو سے شاکر بھائی کا پتا سرسری طور پر پوچھ لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ نما شہر ہی تھا، بلکہ یہ قصبہ ہی تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ شاکر بھائی کو تلاش کرنے کے لیے یہاں کسی سے پتا پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اڈے میں سب سوئے پڑے تھے۔ دوپہر سے پہلے کسی کے جاگنے کا امکان نہیں تھا۔ میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔ بس ایک جگہ مجھے پوچھنا پڑا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں شاکر بھائی کے دروازے پر کھڑا تھا۔ گلیارے کا سب سے نمایاں مکان یہی تھا۔ بیرونی دیوار سرخ بیل سے ڈھکی ہوئی تھی۔ دروازے پر ایک مشٹنڈا کھڑا مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اُس نے سر تا پا میرا بغور جائزہ لیا اور حقارت سے منہ بگاڑ کے بولا۔

"اے کیا رے، تیرے کو دیکھنے کا نئیں اے کیا۔"

اُس نے نہ جانے مجھے کیا سمجھ لیا تھا۔ یا ہو سکتا ہے شاکر بھائی خود کو لوگوں کی دست رس سے دور رکھتا ہو۔ میں نے اُسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"شاکر بھائی نے پتا نہیں ڈالا گلتے۔ اسے جا کے بول راجا استاد آیا ہے۔"

"اے چھٹنے کا ہے ادھر سے۔ چل نکل سالا... راجا استاد!" اُس نے ایڑیوں کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی نچاتے ہوئے کہا۔ "شاکر بھائی ادھر نئیں اے بھاؤ۔"

"شاکر بھائی کے بھلے کی بات ہے اسے بولو بمبئی سے راجا استاد آیا ہے۔" میں نے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا۔ وہ بھی کوئی افلاطون ہی تھا۔

"دور چونا لگانے کا نئیں شاکر بھائی نئیں اے۔ ابھی نکلنے کا ہے ادر سے۔"

"تو پھر ادھر ہے شاکر بھائی۔" میں نے تیور ذرا تیکھے کر لیے۔ وہ ایک دم اچھل کے اکڑ گیا۔ ہاتھی کی طرح قد آور تھا۔ اُس نے اچانک میرے سینے پر دو ہتڑ جمایا۔ مجھے اس قدر جلدی اس سے یہ توقع نہیں تھی۔ میں لڑکھڑا کے پیچھے الٹ پڑا۔

"تیرے جیسا کا نوکر نئیں ہے شاکر بائی۔ بڑا آیا سالا۔ ابھی نکل ادر سے۔" مجھے دھکا دے کے اس نے اطمینان سے ہاتھ جھاڑا اور کرسی پر جا کے بیٹھ گیا۔

کوئی خاص بات لگتی تھی۔ دروازے پر آئے ہوئے ہر آدمی سے ایسا سلوک نہیں کیا جاتا۔ ممکن ہے شاکر بھائی کی طرف سے ہنگامی حکم دیا گیا ہو۔ اسے میرے بارے میں کوئی سن گن کہاں سے مل سکتی تھی۔ ممکن مجھے خیال آیا کہ بھوانے ہی جاسوسی میرے نام کر دی ہو، اس علاقے میں کوئی چھوٹی موٹی بات نہیں تھی۔ سبھی کو خبر ہو جاتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ بھوانے دم آخر کوئی پیغام شاکر بھائی کے لیے بھی چھوڑا

ہو۔ بہرحال، اس ڈشکرے کے رویے سے گمان یہی پڑتا تھا کہ شاکر بھائی نے ہر عام کے لیے دروازہ بند کر رکھا ہے۔

میں نے نہایت اطمینان سے اٹھ کر کرتا جھاڑا اور ایک مرتبہ پھر دروازے کی طرف قدم اٹھا دیے۔ وہ ٹھٹکا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوے اوے... ابھی تین سال بجنور میں کاٹنے کا ہے۔" اُس نے چاقو کھول لیا۔ "تو اور کا نہیں پڑتا... میرے کا جانے کا نہیں اے... اسے دکھانے کا نہیں چلانے کا ہے... جان بچا... نکلنے کا ہے۔" اُس نے چاقو کو مشاقی سے دونوں ہاتھوں میں تولا۔ استاد والا لگتا تھا۔ میں نے اُس کی بھبکیوں کو یکسر نظر انداز کر دیا اور بے نیازی سے قدم اٹھا دیے۔ اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ بڑی مستعدی سے اُس نے ایک قدم بڑھا کے چاقو کو میرے چہرے کے سامنے گھمایا۔ اتنے قریب سے کہ چاقو بس مجھے چھو نہیں اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ یہ ایک قسم کی تنبیہ تھی اور اپنی ماہرانہ قوت کا خوب صورت اظہار بھی۔ اس کے خیال میں اس حرکت پر مجھے سرپٹ دوڑ جانا چاہیے تھا۔ میں نے قدم آگے کی طرف اٹھایا تو اُسے موسے کی تیلی کا ...

"...ے بول کون ہے تو... سا کر بھائی سے کیا کام ... کو۔"

"کام تیرے کو جاننے کا نہیں ہے تو ... بھی ... جا کے بول بمبئی سے راجا استاد آیا ہے۔ تیرا کام ... کر۔" میں نے کہا، قدم بڑھاتے ہوئے ... کے بیدار ہونے سے قبل اڈے پر پہنچنا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ ہم آج ہی بمبئی کے لیے روانہ ہو جاتے۔

"تیری تو سالے... ابھی ڈاکٹر سے ملنے کا ہے۔" اُس نے چابک دستی سے چاقو دائیں ہاتھ میں تولا اور میرے دائیں پہلو میں گھونپنے کے لیے آگے بڑھایا۔ اگر میں اُس کی مہارت کا اندازہ نہ کر چکا ہوتا تو چاقو میری ایک آدھ انتڑی باہر نکال لاتا۔ اُس نے دائیں طرف کا جھانسا دے کر بجلی کی سی تیزی سے چاقو بائیں ہاتھ میں تھاما اور نشانے پر گھونپ دیا۔ وہ بھی مقابل کو کسی درجے میں رکھ رہا تھا، ورنہ ایسا پُرپیچ داؤ نہ آزماتا۔ کُھل کی تربیت کا بنیادی جز وہی یہ تھا کہ بدن کا ہر جز نظر کے تابع ہونا چاہیے۔ حرکت نظر کے اشارے پر حرکت کرنے لگ جائے تو شاگرد، استاد ہو جاتا ہے۔ اُس نے جیسے ہی بائیں ہاتھ میں ترازو تولا، میرا جسم خود بہ خود ہی بل کھا گیا۔ اب اُس کے پاس دوسرے موقع کی گنجائش نہیں تھی۔ میرا دایاں ہاتھ اُس گھماؤ کے زور میں اُس کی کلائی پر پڑا۔ اگلے ہی لمحے اُس کا چاقو میرے ہاتھ میں تھا۔ وہ اپنی جھونک میں آگے نکل رہا تھا، لیکن اُس کا ہاتھ میری گرفت میں تھا۔ جوابی جھٹکے سے اُس کے کندھے کا جوڑ ضرور ہل گیا ہوگا۔ وہ گھومتا ہوا واپس میری طرف آ گیا مگر اب میں اپنی جگہ پر نہیں تھا، نتیجتاً منہ کے بل زمین پر گر پڑا۔ کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوا وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بکھری ہوئی نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔ میں نے چاقو بند کر کے واپس اُس کی طرف اُچھال دیا۔

"ابھی چلانا سیکھ... جا کے شاکر بھائی کو میرا بول۔" میں نے اُس کی کیفیت سے دانستہ اغماز برتتے ہوئے کہا۔

وہ ہوش و حواس سے بیگانہ بس مجھے گھورا کیا۔ کبھی اپنے ہاتھ کو تو کبھی چاقو کو دیکھتا۔ پھر اُس نے اپنی کلائی پر پوری شدت سے دانت گاڑ دیے۔ اُس کے لیے یہ انہونی تھی۔ معاً اُسے کچھ ہو گیا۔ اُس نے دیوانوں کی طرح سر دائیں بائیں جھٹکا، چاقو وہیں پھینکا اور سیدھا میرے پیروں میں پڑ گیا۔

"... باپ میرے کو ماپھی دینے کا ہے۔ ... تیرے ... کا ہے استاد ... بھول گیا استاد ... بھول گیا۔" وہ پیروں سے لپٹ کے بڑبڑانے لگا۔

میں نے بہ مشکل اُسے اٹھایا۔ "استاد بولتے ہو تو مجھے ... شاکر بھائی سے ملنا ہے جلدی۔"

"... باپ ابھی تیرے کو ... جانے دینے کا ہے۔ ایسا استاد جندگی میں کہیں ملا ... ماں قسم جندگی میں نہیں ملا۔" وہ دونوں کان ہاتھوں سے پکڑنے لگا۔ "اپنا نام سرپھرا ہے۔"

"دیکھو، مجھے بہت جلدی ہے، یہ باتیں میں تم سے بعد میں کر لوں گا۔ مجھے شاکر بھائی سے بہت ضروری ملنا ہے۔"

"استاد ابھی ساکر بھائی نے سختی سے منع بولا ہوا ہے۔ پر اپُن تیرے کو بتانے کا ہے۔ ساکر بھائی تین دن پہلے ہڑاہڑی میں ادھر سے بمبئی گیا۔ ابھی اور سب کو اے ای بتایا ہے کہ وہ دلواڑا میں ہونے کا ہے۔"

شریف نے فوراً اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"بمبئی میں وہ کدھر گیا ہے۔" میں نے سنسناتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ میں وہیں کھڑے کھڑے بمبئی پہنچ چکا تھا۔

"ابھی اپُن کو اُس کے ٹھکانے کا تو نہیں پتا پر اُدھر کسی مل کا مالک دوست ہونے کا ہے۔ بمبئی میں اس کا بنگلہ ہے۔ بس ادھر ہی رہنے کا ہے۔"

”بنگلے کا پتا ہے تمھیں۔“

”ابھی اے لکشمی مل والے کو پتا ہونے کا ہے۔“

شریف مجھ سے غلط بیانی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کی بات مکمل ہونے سے قبل میں وہاں سے مڑ آیا۔ شریف دُور تک میرے پیچھے آیا۔ گڑگڑاتا رہا، منتیں کرتا رہا کہ مجھے ساتھ رکھ لیا جائے۔ میں نے اُس سے دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے بہ مشکل جان چھڑائی۔ میں کس کس کو اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔ یہاں تو جو ساتھ ہوتا ہے وہ مارا جاتا ہے۔ مخمل اٹھ گیا ہوگا۔ مجھے وہاں نہ پا کر اُس نے سر پکڑ لیا ہوگا، لیکن میرے میرے کہاں رہے تھے۔ خود بہ خود ہی لکشمی مل کی طرف قدم اٹھ رہے تھے۔ ایک راہ گیر نے تفصیلی پتا سمجھا دیا۔ وہ جگہ لکشمی مل آبادی سے قدرے ہٹ کر تھی، وہاں تک تانگے جاتے تھے۔ دن کی چہل پہل خوب جم چکی تھی۔ لوگ بائی سائیکلوں پر اور پیدل اوزار اپنے کندھوں سے ٹانگے رواں دواں دکھائی دیتے تھے۔ دلواڑا کا اکلوتا بازار سڑک کے دونوں اطراف بنائی گئی چوبی دکانوں پر مشتمل تھا۔ چھابڑیوں اور ٹھیلے والوں کی وجہ سے بازار گنجلک نظر آتا تھا۔ وہیں اس ہجوم کے بیچ تانگے بھی کھڑے تھے۔ نہ جانے وہ تانگے یہاں کیسے آئے تھے اور نہ جانے وہ یہاں سے کب گئے کیسے۔ میں ایک تانگے کے پچھلے حصے میں بیٹھ گیا اور کوچ وان سے کہا کہ لکشمی مل چلو۔ وہ آنکھیں چڑھا کے بولا۔

”بابو صاحب دو آنے سے ایک پائی کم لینے کا نہیں اے۔ تانگا بھرنے کا ہے تو چلنے کا ہے۔“

میں نے خاموشی سے ایک رُپیا نکال کے اُسے دیا تو وہ حیرت سے پھٹنے لگا۔ ”ابھی چار آنے تو نا نہیں اے صاحب۔“

”رُپیا سارا رکھاو، مگر جلدی چلو۔“

اس کے بعد وہ بھیڑ تو وہاں تھی ہی نہیں۔ وہ تیر کی طرح بیچ سے تانگا نکالتا چلا گیا۔ میں لکشمی کے بارے میں سوچنے لگا۔ ممکن ہے وہ مل میں آئی ہوئی ہو اور اُس سے ملاقات ہو جائے۔ لکشمی کو سمجھایا جا سکتا تھا، رگھو سے بہتر اُسے کیا ملتا، لیکن مجھے ان جھمیلوں میں الجھ کر پھر کوئی نئی مصیبت مول نہیں لینی تھی۔ ہو سکتا ہے شاکر بھائی سیٹھ کو تفصیل بتا کر گیا ہو۔ ہو سکتا ہے سیٹھ بمبئی میں اپنے بنگلے کے وجود ہی سے انکار کر دے۔ ایسا سوچنا ہی بیکار تھا۔ کسے خبر تھی کہ وہاں معاملہ کس طرح نبٹنا تھا۔ اب تک ہوتا تو یہی آیا ہے کہ سیدھی سی بات بھی الجھ جاتی ہے۔ بہتر یہی تھا کہ میں پہلے لکشمی سے مل لوں اور اسی کے ذریعے اس کے باپ سے بات کروں، لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا کرنا مناسب نہیں لگا۔ بچونا تھا۔ پہلے لکشمی کے باپ سے ملنا مناسب ہوگا۔

”ساب آپ ناراج نہیں ہونے کا ہے... ابھی میرا تانگا بھاڑے کا ہے۔ بیاج کا قرجا ہے۔ سام کو روٹی پانی کے پیسے نہیں بچتے ساب۔“ کوچ وان نے گھوڑے کو چابک رسید کرتے ہوئے کہا۔ تانگا بازار سے نکل کے کھلی جگہ پر آ گیا تھا۔

”قرضہ کیوں لیا تھا۔“

”قرجے سے اپنا تانگا بنانے کا تھا۔ گھوڑے کو جہر دے دیا، پتا نہیں کس نے۔ گھوڑا نہیں تو نہیں چلنے کا تھا۔ بیاج میں تانگا بکنے کا تھا۔ بس ابھی سام کو آنے دو آنے بچوں کے لیے لے جانے کا ہے ساب... سواری لوگ پیسا نہیں دینے کا ہے ساب... ابھی دو آنے مانگے تو ایک آنا ملنے کا ہے۔“ کوچ وان دکھیارے لہجے میں بولا۔ اُس نے کھینچ کھینچ کے گھوڑے کو چابک رسید کیے۔

”اس غریب کو کیوں مارتے ہو! بیاج کا قرضا کتنا ہے۔“

میں نے اس سے پوچھا۔ میری پشت بہ دستور اس کی طرف تھی۔

”ابھی پورے تین سو ہونے کا ہے ساب... اپنا جھونپڑی بکنے کا ہے اب۔“

"اس تانگے کی کتنی قیمت ہے جو تم چلا رہے ہو۔"

"ساب یہ پورے ساڑھے پانچ سو کا ہے۔ بھگوان کرپا کرنے کا ہے ساب۔ آپ کا ہے چنتا کرنے کا ہے۔"

"نہیں، میں ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ لکشمی مل کتنی دور ہے۔"

"یہ آگیا ساب... آپ بھی اچھا پوچھنے کا ہے۔ مل تو آگیا ساب۔"

میں نے مڑ کے دیکھا مل واقعی آگئی تھی۔ چمنیوں سے گاڑھے سیاہ رنگ کا دھواں نکل رہا تھا۔ کوچ وان نے تانگا عین مل کے دروازے پر روکا۔ میں نے اُسے وہیں ٹھیرنے کا کہا۔ معاً مجھے کچھ خیال آیا۔ بٹھل نے کچھ پیسے میری جیب میں ٹھونسے تھے۔ جانے اُس کے پاس کہاں سے آئے۔ شاید چھلیا سے لیے ہوں، مگر وہ کافی رُپے تھے۔ سو سو کے کئی نوٹ تھے۔ میں نے جیب سے نکال کے دیکھے تو دو ہزار سے زیادہ کی رقم لگتی تھی۔ کیا خبر اندر سے واپس کس حال میں آتا ہوں، میں نے ایک ہزار رُپے گن کے کوچ وان کو دیے۔

"یہ رکھ لو! قرضہ بھی لوٹا دینا، تانگا اپنا خرید لینا۔"

کوچ وان کھڑا کھڑا لرزنے لگا۔ اس کی آنکھیں جھر جھر بہنے لگیں۔ وہ زیرِ لب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے رُپے اسے تھمائے اور مل کی طرف چل دیا۔ بے رنگ زنگ آلود فولادی دروازہ بند پڑا تھا۔ بغل میں ایک چھوٹی سی طاقچی کھلی تھی، سڑک کی مٹی بھی تیل میں چپڑی ہوئی سیاہ ہو رہی تھی۔ فضا میں مرداری بساندرچی ہوئی تھی۔ میں طاقچی کے قریب گیا تو اندر سے ایک پیر مرد نے جھانکا۔ اُس نے قلم کان میں اُڑس رکھا تھا۔ وہ منشی وغیرہ لگتا تھا۔

"ہاں بھائی صاحب فرمائیں۔" اُس نے شستہ لہجے میں دریافت کیا۔

"سیٹھ سے ملنا ہے۔" میں نے وضع دارانہ مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا؟ کس سے ملنا ہے؟" اُس نے مصنوعی حیرانی سے پوچھا۔

"سیٹھ سے ملنا ہے۔" میں نے اُسی کے لہجے کی نقل اتارتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"دلّی سے آئے لگتے ہو... اماں سٹھیا گئے ہو کیا۔ یہاں چار کی دن پہلے نام کھاتے میں چڑھوانا پڑتا ہے۔"

"بڑے میاں، میں دلی سے نہیں آیا۔ مجھے آج اور ابھی ملنا ہے۔"

"بڑے میاں ہوویں گے تمھارے باوا حضور۔ سیٹھ ایرے غیرے نتھو خیرے نہیں ہیں۔ نام چڑھوا جاؤ، چار کی دن بعد آجانا۔" بڑے میاں یک دم تھے سے اُکھڑ گئے۔

بٹھل کہتا تھا کہ جیت کا پہلا دروازہ اسی وقت کھل جاتا ہے جب مقابل کی کوئی کم زوری تمھارے ہاتھ لگ جائے۔ جسمانی کم زوری سے کہیں زیادہ سود مند نفسیاتی کم زوری ہوتی ہے۔ کم زوری دریافت ہوتے اسے مقابل پر آزمانے کے طریقے پر غور شروع کر دینا چاہیے۔ بڑے بڑے سورما صرف زبان سے چت ہو جاتے ہیں۔

"حضور، آپ دلی کے لگتے نہیں۔ ہم نے سنا تھا کہ ادھر بڑے میاں عزت اور احترام کے القابات میں سے ایک ہے۔ بڑے میاں نوابوں کو بھی بولتے ہیں۔ آپ غلط سمجھے ہیں ہماری بات۔ آپ اور ہم برابر ہی کے دکھتے ہیں۔"

میری بات سن کے بڑے میاں کی آنکھیں مسکرائیں، مگر انھوں نے اپنے لہجے میں تیکھاہٹ برقرار رکھی، بولے۔

"دیکھیے، سیٹھ صاحب کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ باہر راہ دیکھتے رہو۔ مان جاویں تو مل لیو۔ باقی اوتن کی طاقت میں کچھ ہے نہیں۔" یہ کہہ کے بڑے میاں نے پھپاک سے طاقچی بند کر دی۔ اپنے تئیں انھوں نے بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا تھا کہ سیٹھ صاحب کی آمد کا بتا دیا۔ کوئی اور چارہ کار بھی نہ تھا۔ میں وہیں ایک طرف کو کھڑا رہا۔ سر اندر سے جی متلا رہا تھا۔ کوچ وان نے مجھے یوں کھڑا دیکھا تو گرتا پڑتا بھاگا آیا۔ اُس پر ابھی تک لرزہ طاری تھا۔ اُس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اُس نے قریب آتے ہی بڑے سبھاؤ سے اپنے کندھے کا رومال کھولا اور میرے سر پر سایہ کرنے لگا۔

"ساب، آپ اور کھڑا ہونے کا نہیں ہے۔ تانگے میں بیٹھنے کا ہے۔ ساب دھوپ ہے۔" کوچ وان بچھا جا رہا تھا۔ مجھے کوفت ہونے لگی، مجھے اسے ابھی رُپے نہیں دینے چاہیے تھے۔ رخصت کرتے وقت دیتا تو بہتر تھا۔ میں اُس کے بے حد اصرار پر تانگے میں آکے بیٹھ رہا۔ گھنٹے دو گھنٹے، کئی گھنٹے گزر گئے۔ دوپہر ڈھلنے کو آرہی تھی، مگر سیٹھ کی کار نہیں آئی۔ میں کئی مرتبہ طاقچی میں بڑے میاں کے پاس بھی گیا۔ انھوں نے بڑے پیار اور خلوص سے کہا کہ اس سے زیادہ انھیں کچھ نہیں معلوم۔ البتہ وہ یہ بات پوری دیانت داری سے کہہ رہے تھے کہ سیٹھ اس وقت کارخانے میں نہیں ہے۔ بٹھل جھلا رہا ہوگا۔ مجھے کسی نہ کسی کو بتا کے آنا تھا۔ آ...

نے سیٹھ کی کوٹھی پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں لکشمی کا سامنا کرنے سے احتراز کر رہا تھا، مگر اب کوئی اور چارہ کار بھی نہ تھا۔ اسے کم سے کم اپنے باپ کے بمبئی کے بنگلے کا ضرور علم ہوگا۔ کوچ وان کو سیٹھ کی کوٹھی کا علم تھا، میرے اشارے کی دیر تھی اُس نے تانگا ہوا کر دیا۔ یہ دیکھ کے میری حیرت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا کہ ساکر بھائی کے عین برابر میں سیٹھ کی کوٹھی تھی... ساکر بھائی کے مکان پر شریف اس وقت نظر نہیں آرہا تھا۔ سیٹھ کی کوٹھی تھی... کیا عالی شان محل تھا۔ پوری عمارت پر سنگ ابیض برتا گیا تھا۔ حبشی دروازے پر چوب داری کا خوب کام کیا گیا تھا۔ جس پر روپہلا روغن خوب بھلا لگ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دستک دی۔ ایک بندوق بردار سکھ باہر آیا۔ وہ چوکی داروں کی انگریزی وردی میں ملبوس تھا۔ میں نے اُس سے بلا جھجک کہا کہ مجھے لکشمی دیوی نے بلوایا ہے۔ اُن سے کہنا بابر زمان آیا ہے۔" اُس نے بہ غور میرا جائزہ لیا اور مجھے وہیں کھڑا رہنے کی تاکید کر کے چلا گیا۔ وہیں کھڑا رہنے کی تاکید وہ یوں کر گیا تھا جیسے میں نے ایک قدم بھی ہلایا تو اندر ہی سے ایک گولی داغ دے گا۔ میں ابھی اس کی ہدایات پر سختی سے عمل کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ سوئی ہوئی کوٹھی جاگ اٹھی۔ گمان پڑتا تھا کہ دیواروں کے پیچھے ہڑ بونگ مچی ہے۔ بہت سے لوگ اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ پھر دھم سے وہ روپہلا پھاٹک کھلا۔ لکشمی ننگے پیروں بنا آنچل کے دوڑی چلی آرہی تھی۔ اُس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ وہ زخمی نظروں مجھے دیکھے گئی۔ وہ سادگی میں بھی بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ اُس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں زخموں کے ساتھ ساتھ بے اعتباری بھی جھلک رہی تھی۔ اس کے اطوار بتا رہے تھے کہ وہ مجھ سے لپٹنے کے لیے آئی تھی، مگر لجا گئی۔

"موہن جی، وشواس نہیں پڑ رہا۔ بھگوان سے دن رات پرارتھنا کی تھی آپ کو بلانے کی۔"

میں نے کہنا چاہا کہ میں تمھاری وجہ سے نہیں آیا۔ تمھارے پتا سے ملنے آیا ہوں، ایک کام ہے ان سے، مگر میں کچھ کہہ نہ سکا۔

"میں نے کہا تھا دوبارہ آؤں گا تو تم سے ضرور ملوں گا۔" نہ جانے کیوں میں نے وہی کہا جو وہ سننا چاہتی تھی۔

"میں نے پتاجی سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ وہ آپ کی چنتا میں بیٹھے ہیں۔ بستی بھی ایک مورکھ کو دوڑایا تھا جو دل جلانے والی آگیا... لے آیا تھا۔ آپ ٹھیک تو ہیں نہ...

موہن جی۔ بھوا جی کی ہتیا۔" معاً اُسے بہت کچھ یاد آگیا۔ اُس تک ساری خبریں پہنچ چکی تھیں۔ وہ اُچک کے محتاط نظروں سے میرے عقب میں دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

"آپ جلدی سے اندر آجائیں، چنتا کی کوئی بات نہیں، سب خیر ہو جانے گا۔ پولیس اس دروازے کا پالن نہیں کر سکتی۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ نہ ہی میں مفرور ہوں اور نہ ہی پناہ..."

اُس نے مچل کے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "دوشی نہ کرو موہن جی، داسی ہوں آپ کی۔ آپ آئے نہیں ہیں، میں نے بھگوان سے کہہ کر بلوایا ہے۔" وہ وہیں پر مجھ سے بے اختیار لپٹ گئی۔ میں گھبرا گیا اور آہستہ سے علاحدہ کیا۔ لکشمی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اندر کھینچ لیا۔

"مویا! مویا!" وہ چلانے لگی۔ وہ گھر کی منہ چڑھی دکھتی تھی۔ وہ بلا کسی خوف و خطر اور بلا کسی جھیل وجحت کے میرا ہاتھ پکڑ کے اندر کو دوڑی جا رہی تھی اور میں چل نہیں رہا تھا گویا پھسل رہا تھا۔ بیرونی دیوار اور عمارت کے درمیان باغیچہ تھا جس کے بوٹے رنگ بارنگ کے پھولوں اور بھانت بھانت کی خوش بوؤں سے اٹے پڑے تھے۔ مہک کی لپٹیں پوری کوٹھی کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ کوٹھی ولایتی طرز پر بنی ہوئی تھی۔ مہمان خانے میں پہنچ کے اندازہ ہوا کہ تزئین و آرائش بھی ولایتی طرز پر کی گئی ہے۔ نرم نرم گدوں والی مخملیں کرسیاں تھیں، جنھیں انگریز سوفا کہتے تھے۔ برقی قندیلیں ہر محراب پر تھیں اور ایک بیضوی قمقمہ عین وسط میں لٹک رہا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے یہ بجلی حاصل کر رہے تھے۔ بمبئی میں بھی ہماشما کی بجلی تک رسائی نہیں تھی۔ مہمان خانے کی پشتی دیوار پر ایک قدِ آدم تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔ یہ یقیناً سیٹھ ہی تھا۔ اتنے میں سرخ ساڑھی میں ملبوس ایک باوقار خاتون بوکھلائے قدموں سے اندر داخل ہوئیں۔ لکشمی انھی کا پرتو تھی۔

"مویا، یہ موہن جی ہیں، ہم نے جن کا بتایا تھا۔ رگھو کا سروناش کرنے آئے ہیں۔" لکشمی نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا... ان کا ماحول خاصا آزاد لگتا تھا۔

"موہن جی، یہ مویا ہیں ہماری ماتا جی۔"

میں نے انھیں ہاتھ جوڑ کے نمسکار کیا۔ جواباً انھوں نے بھی نمسکار کیا۔

"کی آپ کا بہت جلکر کرتی ہے۔ رگھو پاپی نے ہمارا جیون ناس کر رکھا ہے۔" کسی کا وچار ہے کہ رگھو کا سروناس آپ ہی کر سکتے ہو۔"

"یہ لکشمی کی ذاتی رائے ہے۔ مجھ میں ایسا کوئی گن نہیں ہے۔" میں انھیں کیا بتاتا کہ میں رگھو کے اڈے ہی پر رہائش پذیر ہوں۔

"مویا پتاجی کدھر ہیں، موہن جی کو پتاجی سے ملوانا ہے۔"

"بابر جمان نام ہے تمھارا..." کسی نے بتایا تھا۔ لکشمی کی ماں نے بڑی محبت سے کہا۔ انھوں نے لکشمی کے سوال کو سنا اَن سنا کر دیا تھا۔

"جی بابر زمان!" مجھے وہاں گھٹن ہونے لگی۔ مجھے جھل کی فکر کھا رہی تھی۔ وہ سو سو گالیاں بک رہا ہوگا۔

"موہن جی آپ مویا جی سے باتیں کریں، ہم پتاجی کو بلا کے لاتے ہیں۔" لکشمی نے اب جا کے میرا ہاتھ چھوڑا تھا۔ وہ جانے لگی تو اُس کی مویا جی نے اُسے منع کرتے ہوئے کہا۔ "تمھارے پتاجی آج سویرے بمبئی گئے ہیں۔ اُدھر سے مستری لینے گئے ہیں۔"

لکشمی کی ماں کا یہ جملہ سن کے میرے تو گویا قدموں سے کسی نے زمین کھینچ لی۔ بمبئی میں ایسا کیا تھا کہ سب وہاں دوڑے جا رہے تھے۔ ممکن ہے مولوی صاحب کی مالا میں سیٹھ بھی دل چسپی لے رہا ہو، لیکن مجھے ٹھاکر بھائی اور سیٹھ کا بہت گہرا یارانہ لگتا تھا۔ دونوں کے مکان بھی پہلو بہ پہلو تھے۔

"مجھے تانگے والا بتا رہا تھا کہ بمبئی میں تمھارے پتا کا اپنا بنگلا ہے۔ بمبئی میں میرا گھر بھی ہے۔"

"ہائے رام تانگے والے کو کیسے پتا چل گیا۔ کلسی کو بھی نہیں پتا۔ اس کے پتا جی نے مجھے بھی چند دن پہلے اِتنا بتایا تھا کہ اُنھوں نے بمبئی میں مکان لیا ہے۔ ابھی کسی کو بولنا نہیں۔ بالکوں کو بھی نہیں۔ ہائے رام تانگے والے کو بھی... کسی تانگے والے کو بلوا کر پوچھوں... او راجا... تانگے والا باہر کھڑا ہو تو بلا لاؤ اُسے۔" لکشمی کی مویا یک دم بوکھلا گئی اور اس سے زیادہ میں بوکھلا گیا۔ میں نے روا روی میں ایسے ہی جھوٹ بولا تھا اور وہ تانگے والے کو بلوا رہی تھی۔ کوچ وان یقیناً باہر ہی کھڑا ہوگا۔ وہ میرے بغیر کہاں ٹلنے والا تھا۔ راجا نامی ملازم بھی چلا آیا۔ اُس نے بتایا کہ تانگے والا مجھے چھوڑتے ہی چلا گیا تھا۔ وہ باہر نہیں ہے۔ مویا جی میرے پیچھے پڑ گئیں کہ اتنی راز کی بات تانگے والے کو کیسے پتا چل گئی۔ ان کی باتوں سے مجھے اِتنا پتا چل گیا تھا کہ بمبئی میں سیٹھ کے بنگلے کا ان میں سے کسی کو علم نہیں ہے۔ سیٹھ جی قریب بمبئی میں ایک بڑی مل لگانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اب میرا یہاں رُکنا بے کار تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے اجازت دیجیے۔ میرے کچھ دوست راہ تک رہے ہوں گے۔"

"ہائے ہائے... دیا کرو موہن جی... ایسے کیسے چلے جاؤ گے۔" لکشمی مچل کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔ غضب کا سحر تھا اُس کی آنکھوں میں۔

"مجھے ابھی جانا ہے لکشمی۔ میں دوبارہ آؤں گا۔ تمھارے پتاجی سے کچھ ضروری کام بھی ہے۔"

"بتایا ہوتا۔ مجھے بتاؤ کیا کام ہے۔ سمجھو موہن جی کام ہو گیا، مگر جانے نہیں دوں گی۔" وہ سامنے آ کے کھڑی ہو گئی اور گھورنے لگی۔

اُس کی بلا خیز آنکھوں میں کچھ تھا۔ مجھے از خود ہی خیال آیا۔ "میں اپنے دوستوں کو بتا کے واپس آ جاؤں گا۔"

"نہیں موہن جی، میں جانے نہیں دوں گی۔" وہ اپنی مرضی پر اڑ گئی۔

"تو پھر ساتھ چلو... میں ساتھ ہی واپس آ جاؤں گا۔" میرے دل میں خواہش اُمڈی کہ وہ انکار نہ کرے۔

"راجا ڈرائیور سے کہو موٹر نکالے... چلیں موہن جی۔" وہ جھٹ تیار ہو گئی۔ اُس نے ماں سے اجازت لینے کا تکلف بھی روا نہیں رکھا۔ جو کھڑی اُسے تذبذب سے دیکھ رہی تھی۔ پھر شانے اچکا کے اندر چلی گئی۔ اُس نے لکشمی سے کسی قسم کا استفسار نہیں کیا۔ مجھے اُن کی معاشرت کا بہ خوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ لکشمی پھر میرا ہاتھ پکڑ کے باہر کو آ گئی۔ مہمان خانے کے دروازے سے ڈرائیور نے موٹر لگا دی تھی۔ سفید رنگ کی چمچماتی موٹر اور سفید چمچماتی وردی میں ملبوس ڈرائیور خوب جچ رہے تھے۔ مودب ڈرائیور نے آگے بڑھ کے پچھلا دروازہ کھولا۔ میرے ایما پر لکشمی سوار ہو گئی۔ ڈرائیور بھاگتا ہوا آ گیا، اُس نے جھٹ دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ مجھے خواہ مخواہ ہنسی آ گئی اور میں مسکراتا ہوا موٹر میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور تیزی سے موٹر کوٹھی سے نکال لے گیا۔ تانگے والا بہ دستور باہر جما کھڑا تھا۔ راجا نے کام چوری دکھائی تھی یا پھر اس وقت کچھ دیر کے لیے کوچ وان اِدھر اُدھر سرک گیا ہوگا۔ کوچ وان نے مجھے موٹر میں بیٹھا دیکھ لیا تھا اور ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اس سے آگے کا منظر میں نہیں دیکھ سکا۔ ڈرائیور موٹر تیزی سے بڑھا گیا تھا۔ یہ چھوٹا سا قصبہ تھا، میں نے رگھو کے اڈے کا پتا بتا دیا۔ ڈرائیور نے جھٹکے سے موٹر روک دی۔ وہ ٹھٹک گیا تھا۔

"صاحب آپ نے واقعی اُدھر جانا ہے...؟ مالکن اُدھر رگھو دادا کا اڈا ہے۔" ڈرائیور نے عقبی شیشے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے ماتھے سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔

"جدھر موہن جی بول رہے ہیں اُدھر ہی چلو۔" بس میرے کسی جواب سے پیش تر لکشمی نے بڑے اطمینان سے کہا۔ اس کے انداز میں کوئی تلاطم نہیں تھا، کوئی ہیجان، کوئی طوفان کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے اُسے توقع ہو کہ میں اُسے وہیں لے جاؤں گا۔

چند منٹوں میں موٹر رگھو کے اڈے کی گلی میں داخل ہو گئی۔ ڈرائیور کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ دھیارا اور کالو گلی کی نکڑ پر کھڑے تھے۔ دھیارا نے مجھے دیکھ لیا تھا اور شور مچا دیا۔ دوڑتا ہوا موٹر کے پیچھے آنے لگا۔ پھر تو گلیارے ہی نے انگڑائی لی اور جاگ پڑا۔ موٹر جب رگھو کے دروازے سے لگی تو ستے ہوئے چہرے کے ساتھ سب سے پہلے جھل آیا پھر چھلیا اور پھر رگھو!

ڈرائیور نے دروازہ کھولا تو لکشمی شانِ بے نیازی سے نیچے اتری۔ میں خود ہی دوسری طرف کا دروازہ کھول کے اتر آیا تھا۔ رگھو پتھر کا ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہاں بیش تر لوگ لکشمی کو پہچانتے تھے۔ میرے آنے سے جو تھرتھل مچی تھی وہ یک دم تھم گئی تھی۔ رگھو کی آنکھیں پھٹے پھٹے باہر نکلنے کو آ رہی تھیں، مگر اس کے جسم میں ذرا بھی حرکت نہ ہوئی تھی۔ چھلیا نے دو قدم پیچھے ہٹ کے رگھو کے کان میں سرگوشی کی، مگر رگھو کچھ کہاں سن رہا تھا۔ وہ تو بس دیکھ رہا تھا۔ لکشمی نے یہاں آنے سے متعلق پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

"موہن جی، یہاں کیوں لے آئے ہو۔"

"رگھو کا سروناش کرنے۔ آؤ میرے ساتھ، ڈرو نہیں۔" میں نے ڈپٹ کے کہا اور تیز آواز میں کہا، تاکہ سب سُن لیں۔

"آپ کے ساتھ تو سوامی جی میں نرکھ میں بھی چلی جاؤں گی، چلیے۔" اُس نے بھی تیز ہی آواز میں جواب دیا۔ وہ رگھو کو ڈھونڈ رہی تھی۔

میں نے از خود اُس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے چلا۔ جھل مجھے کینہ توز نظر والے [illegible] پڑ رہا تھا۔

"موہن جی اِدھر کی نرکھ ہی میں آ رہے ہیں۔" جھل نے جھنجھناتے ہوئے کہا۔ غصے میں اُس کا چہرہ ستا ہوا تھا، مجھے ڈر لگنے لگا۔

"تم راستے سے ہٹ جاؤ، اِس لفڑے سے تمھارا کوئی واسطہ نہیں استاد۔" میں نے جھل کو مخصوص انداز میں آنکھ سے اشارہ کیا۔

"تیرے راستے کی متا... ذرا خوش نہیں دیکھ سکتا رے... بول کے چلا جاتا۔" جھل یک دم مدھم پڑ گیا۔

"سوامی جی، استاد سویرے سے پریشان بیٹھنے کا ہے۔ ابھی سارا دلواڑا ڈھونڈنے کا تھا۔ تانگے والا بھی غائب سوامی جی غائب۔" چھلیا دھیرے سے بولا۔

"کدھری گیا تھا۔" جھل نے سوچتی نظروں سے لکشمی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ بعد میں بتاؤں گا..." پھر میں نے ذرا تیز آواز میں کہا۔ "ابھی رگھو دادا سے دو دو ہاتھ کرنے کا ہے۔" جھل کھلکھلا کے ہنس پڑا اور راستہ چھوڑ دیا۔ سب دائیں بائیں سمٹ گئے، مگر رگھو وہاں تھا ہی نہیں۔ وہ کہیں پہنچا ہوا تھا۔ میں نے چاقو کھول لیا اور لکشمی کا ہاتھ پکڑ کے اڈے میں داخل ہو گیا۔ جھل مسکرا رہا تھا، باقی سبھی ایک دوسرے کو حیران و پریشان نظروں سے گھور رہے تھے۔ میں لکشمی کا ہاتھ پکڑ کے سیدھا رگھو کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ایک بھیڑ ہمارے ہمرکاب تھی۔ اب لکشمی بھی کچھ کچھ گھبرانے لگی تھی۔ رگھو کے کمرے تک پہنچنے میں مجھے شدید کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔ دروازہ مقفل تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو دھیارا پیچھے آنے والی بھیڑ میں سب سے آگے تھا۔ ان کی

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کہیں میرا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ چاقو کھول کے شہر کے امیر کبیر شخص کی بیٹی کو میں یہاں کھینچتا ہوا کیوں لایا ہوں۔ میں نے دھیارا سے رگھو کے کمرے کی تالی لانے کا کہا تو کالو نے جواب دیا۔

"استاد کے کمرے میں کوئی اور نہیں جاتا۔ تالی وہ کسی کو نہیں دیتا۔"

"استاد کو میرا نام بولو اور تالی مانگ لاؤ۔" میرے منہ سے الفاظ نکلتے ہی دھیارا دوڑتا چلا گیا۔

اتنے بہت سارے لوگ اور وہ بھی اڈّے پاڑے کے آدمی۔ "لکشمی گھبرانے لگی ہو، تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو، جاؤ اپنا کام کرو۔" میں نے درشتی سے کہا تو ایک ایک کرکے سب دائیں بائیں ہو گئے، مگر اپنی نظریں وہیں چھوڑ گئے تھے۔ دھیارا تالی لے آیا تھا۔ لکشمی سن چکی تھی کہ دھیارا اس کمرے میں کسی کو داخل نہیں ہونے دیتا۔ مجھے خود سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں۔ میں جو کچھ کر رہا تھا از خود مجھ سے سرزد ہو رہا تھا۔ میں نے تالی سے دروازہ کھولا اور لکشمی کو ہاتھ کے اشارے سے اندر داخل ہونے کا کہا۔ وہ ذرا جھجکی، مگر اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی لکشمی دیوی کی مورتی تھی۔ وہ اس شاہکار کو دیکھ کے مبہوت ہو گئی اور کچھ دیر دیکھتی رہی۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ "مورتی کیسی ہے؟"

"سندر ہے موہن جی، کیا میں اتنی سندر ہوں۔" اُس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"تم سندر ہو، مگر اس مورتی کی سندرتا اسے بنانے والے ہاتھ ہیں۔"

"میں نے سنا تھا کہ مورتی بنانے والے کے لیے مہینوں مورت گر کے سامنے بیٹھنے کی تپسیا کرنی ہوتی ہے۔ یہ کیسی مورتی بنائی۔"

"مجھے نہیں معلوم کیسے بنائی ہے، مگر اتنا معلوم ہے کہ اسے رگھو کے ہاتھوں نے بنایا ہے۔ آؤ میرے ساتھ آج رگھو سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔" مجھ پر جنون سوار ہو گیا تھا۔ لکشمی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا اور میرے ذہن میں بھی سب واضح تھا۔ میں لکشمی کو لے کے چوکی پر چلا آیا۔ دالان میں سب جمع تھے۔ ایک طرف چارپائی پر بھٹل پڑا تھا۔ دھیارا اُس کے پاؤں داب رہا تھا۔ میں نے باآواز بلند کہا۔

"ریت کے مطابق اڈّے کا راج بل سے ہے۔ چوکی پر وہی بیٹھے گا جو دم رکھتا ہوگا۔" میری آواز سن کے کچھ ہڑبڑا کے کچھ سٹپٹا کر مجھے دیکھنے لگے۔ رگھو ایک کونے میں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ اس طرح بیٹھنے سے کسی کو تشویش لاحق نہیں تھی، جس کا مطلب یہی تھا کہ رگھو کا یہ طور ان کے لیے نیا نہیں تھا۔ میری بات سن کے بھٹل کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ چھلیا کے چہرے پر تردّد آیا تھا، مگر وہ بھٹل کو دیکھ کے شانت ہو گیا تھا۔ بھٹل نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

"جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ لکشمی دیوی اور رگھو دادا کے درمیان کیا تنازع چل رہا ہے۔ لکشمی دیوی میرے پاس فریاد لے کر آئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ رگھو دادا نے دھمکی لگائی ہے جو لکشمی سے شادی کرے گا رگھو اُسے مار دے گا۔ لکشمی نے مجھے مجبور کیا ہے کہ میں اس سے شادی کر لوں اور میں نے ہامی بھر لی ہے۔" میں نے رگھو کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا توقف کیا۔ رگھو نے ایک جھٹکے سے گھٹنوں میں دیا ہوا سر اٹھایا اور مجھے خشمگیں نظروں سے گھورا۔ میں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ "میں رگھو سے معاملہ صاف کرنے آیا ہوں۔" میں نے اندازے سے چاقو فضا میں اُچھالا اور اندازے ہی سے لپک کے پکڑ لیا۔ اس دوران میری نظر ایک پل کے لیے بھی رگھو سے نہیں ہٹی تھی۔ میں نے رگھو سے دیانت داری سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ محبت کرنے والوں سے کیا بعید۔ میرے ذہن میں اب تک یہی تھا کہ رگھو سے دانستہ شکست کھاؤں، لیکن جب رگھو چاقو کھول کر دیوانگی سے اٹھا تو میرے اندر ایک شخص رشک و حسد میں تلملا اٹھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ رگھو کو زیادہ دیر تک کھڑا رہنے نہیں دوں گا۔

"بازی گر" سب رنگ کا سب سے مقبول سلسلہ
اُمنگوں، حوصلوں، آنسوؤں اور آہوں کی داستان
پانچویں درویش کا بیان
ایک سرفراز سینہ فگار نوجوان کا سفر نامۂ زندگی
باقی واقعات آئندہ